سچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں
ماہنامہ
سرگزشت
کراچی
اپریل 2018
نگران اعلیٰ
معراج رسول
بجیا: قلم کی فسوں گری سے ایک عالم کو مسخر کرنے والی ادیبہ کا زندگی نامہ
اماوس کا مسافر: وسیب کے مشہور شاعر کی دکھ بھری داستان
انناس کا پھول: آنکھوں میں آنسو بھر دینے والی سچ بیانی

سرگزشت
آفتابِ عظیم آباد — 07
ادارہ
ایک صفحہ میں مکمل، مختصر ایک نادر روزگار کا تعارف

گفت وشنید
شہرِ خیال — 08
مدیر اعلیٰ
آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

شخصیت
بجیا — 16
ڈاکٹر ساجد امجد
روشن شمع کی مانند شخصیت کا زندگی نامہ

ذکرِ خاص
اماوس کا مسافر — 39
زویا اعجاز
ناموافق حالات میں بھی اوج حاصل کرنے والے کی روداد زندگی

ایمان افروز
ادراک — 61
زریں قمر
ایک بڑی شخصیت کے اسلام قبول کرنے پر بھارت میں تہلکہ

خصوصی تحریر
یادِ ماضی — 66
اقبال ہاشمانی
کراچی کے بھولے بسرے مقامات کا ذکر خاص

روداد
نمک لاہوری — 75
شکیل صدیقی
اردو ادب کے ایک بڑے قلمکار و شاعر کا تذکرہ

سفر کہانی
شمشال سے ٹورنٹو — 93
ندیم اقبال
جانبازی کا شہکار ایک الگ انداز کی داستان

عزم و حوصلہ
کیوبا سے فرار — 113
ولید چیمہ
اس نے اپنے بیوی بچوں کو فرار کرانے میں اپنی زندگی داؤ پر لگا دی

فلم نگری
انمول موتی — 118
انور فرہاد
پاکستان کی فلمی صنعت میں اس نے بنیاد کا کام کیا

عالمی ادب
مونا عمیدی — 135
سلمیٰ اعوان
جل کر خاک ہوتے ہوئے ملک شام کی شاعرہ کا تذکرہ

معلومات
ٹائیگر — 141
سید جاذب
بنگال ٹائیگر کی خوں آشامی کی روداد

خراجِ تحسین
مہذب گالیاں — 153
محی الدین نواب
مہذب حضرات نامناسب الفاظ کا استعمال کیسے کرتے ہیں

معاشرت
ناسور — 156
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
ایک معصوم نوجوان کی خوں رنگ لہو گرما دینے والی داستان

پہلی سچ بیانی
اناس کے پھول — 192
محمد ظفر حسین
غربت و افلاس انسان کو کس طرح ذلیل کراتا ہے

دوسری سچ بیانی
مشورہ — 211
میمونہ اختر
ایک ایسا مشورہ جس نے محبوب کو برانگیختہ کردیا

تیسری سچ بیانی
وعدہ — 222
محمد فاروق انجم
اس نے اپنے شوہر سے ایک انوکھا وعدہ لیا تھا

چوتھی سچ بیانی
ہیروئن — 239
ناصر
ایک چپراسی کے عشق کی داستان

پانچویں سچ بیانی
چہرہ — 251
محمد مکرم حیات
ہر چہرہ اندر کی کہانی بخوبی بیان کر دیتا ہے

چھٹی سچ بیانی
مفید غیر مفید — 255
انجم پرویز کیانی
ان کرداروں کا ذکر جنہیں وفا عزیز ہے

ساتویں سچ بیانی
ادھورا حسن — 259
حبیب الرحمٰن
چہرہ چاند سا تھا مگر اس میں ایک داغ بھی تھا

آٹھویں سچ بیانی
بدروحیں — 271
عرشی
انا کی خاطر رشتے ٹھکرانے والیوں کا انجام

نویں سچ بیانی
زندان — 281
ملک رحمت
وڈیرے، چودھری کس طرح انسانیت کی تذلیل کرتے ہیں

سوغات
پارچے — **
قارئین / ادارہ
دنیا بھر سے مختلف موضوعات پر معلومات، انکشافاتی پارچے

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بےحرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 28 ❖ شمارہ 03 ❖ اپریل 2018ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرۂ اعلیٰ : عذرا رسول

مدیر : پرویز بلگرامی

نائب مدیرہ : نبیلہ اظہر

◆◆◆

منیجر اشتہارات

محمد شہزاد خان

0333-2256789

◆◆◆

سرکولیشن منیجر

سید منیر حسین

0333-3285269

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 70 روپے ❖ زرِ سالانہ 900 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

بعض مٹی کہانیاں دل کو چھو لیتی ہیں۔ یہ بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے۔

ہُوا... یوں کہ کرنل آصف کمال کی دلی تمنا تھی کہ وہ کراچی جا کر عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر فاتحہ پڑھیں۔ جہاں چاہ وہاں راہ، ریٹائرمنٹ کے دو سال بعد انہیں دوست کے بیٹے کی شادی میں کراچی آنا پڑا۔ وہ کراچی پہنچے اور دوست سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ دوست نے اپنی کار دے دی۔ وہ سیدھے کلفٹن پہنچے۔ اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر پارکنگ کے لیے جگہ دیکھنے لگے۔ انہوں نے سامنے کھڑے سپاہی کی طرف دیکھا پھر پوچھا۔ ”پارکنگ کس طرف ہے؟“ سپاہی نے جواب دیا کہ ”تعمیراتی کام جاری ہے، جگہ دیکھ کر کھڑی کر دیں۔“ کرنل صاحب نے ایک کنارے جا کر کار کھڑی کی اور سیڑھیاں چڑھ کر فاتحہ پڑھنے کے لیے چلے گئے۔ واپس آئے تو ایک دوسرے سپاہی کو کار کے پاس کھڑا دیکھا۔ انہوں نے کار کا دروازہ کھولا تھا کہ سپاہی نے آگے بڑھ کر کہا کہ ”پچاس روپے دیں۔“ کرنل صاحب نے پوچھا۔ ”کس بات کے؟“ سپاہی نے جواب دیا۔ ”غلط جگہ پارک کرنے کے ورنہ میں چالان بنا دیتا ہوں۔“ کرنل صاحب نے غصے میں اس کی طرف دیکھا پھر کہا۔ ”مجھ سے رشوت مانگ رہے ہو۔“ تو اس نے کہا کہ ”یہ رشوت نہیں، تلافی ہے۔ میں نے تمام امتحان پاس کرنے کے بعد بھی نمبر بڑھانے کے لیے زمین بیچ کر پچاس ہزار روپے دیے تھے۔ اس زمین کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے مجھے رقم کی ضرورت ہوگی۔ پھر کہیں اچھی جگہ پوسٹنگ کرانے کے لیے بھی رقم خرچ کرنا ہوگی۔ یہ سب تنخواہ سے ہونا ناممکن ہے۔“ کرنل صاحب نے سب کچھ سن کر فرمایا۔ ”کبھی تم نے فوجیوں کی زندگی پر غور کیا ہے؟ تھر کے ریگستان میں لڑیں تو کئی کئی دن پیاسے بھی رہتے ہیں۔ پختو نخواہ کے پہاڑوں میں دشمن کا مقابلہ کریں اور رسد ختم ہو جائے تو پتے، پودوں کی جڑیں کھا کر شکر اللہ کریں۔ سیاچن کے محاذ پر پہنچیں تو خود بخود ان کی آدھی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ پریشانیاں اور الجھنیں کہاں نہیں ہوتیں۔ اگر جوائنگ کے وقت رشوت نہ دی ہوتی تو آج تم مانگنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے۔ میرا مشورہ ہے کہ آج سے تم ٹھان لو کہ نہ رشوت دوں گا اور نہ لوں گا۔ تمہارا یہ عہد تمہارے بچوں کے کام آئے گا، ورنہ ان کے سامنے مسائل کا ایک پہاڑ ہوگا۔“

سپاہی نے جھکے سر کو اٹھایا اور نمناک لہجے میں کہا۔ ”آہ، میں نے مستقبل کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا۔ یہ سلسلہ تو آنے والی نسل پر قیامت بن کر ٹوٹے گا۔ نہ میں رشوت لوں گا نہ دوں گا۔“

معراج رسول

آفتابِ عظیم آباد

صوبہ بہار کے شہر پٹنہ جو اس وقت عظیم آباد کہلاتا تھا اس کے محلہ پورب دروازہ میں جنوری 1846ء بمطابق 19 محرم 1264 کو اس نے جنم لیا۔ اس خانوادے کو مشرقی ہند میں قدر و منزلت حاصل تھی۔ پہلی وجہ تو سادات ہونا اور دوسری وجہ دہلی و پانی پت کے خاص خاص امرا کا اس خاندان سے تعلق تھا۔ مرد ہی نہیں اس خاندان کی عورتیں بھی تعلیم یافتہ تھیں۔ گو کہ عورتیں کسی مدرسے سے فارغ التحصیل نہ تھیں لیکن گھریلو تعلیم انہیں ذی علم بناتی تھی۔ پیدائش سے پانچ سال کی عمر تک وہ بچہ انہی لوگوں کے درمیان رہا جو اس کا ننھیال تھا۔ اس طرح اس کی زبان دانی خوب نکھر گئی پھر جب وہ پانچ برس کی عمر میں محلہ حاجی گنج میں واقع اپنے ددھیال منتقل ہوا تو وہاں بھی علم و دانش کا ماحول تھا۔ وہاں بھی عورتیں علم زبان دانی میں یکتا تھیں۔ فرق اگر تھا تو بس اتنا کہ ددھیال کے لوگ تجارت میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ عرب و عجم کے تاجر آتے تو انہی کے ہاں مہمان ٹھہرتے، لمبے عرصے تک مہمان رہنے والوں میں میر سید محمد فیض آبادی جیسا علم داں بھی شامل تھا۔ وہ عرصہ تین سال تک اس گھرانے کے مہمان رہے۔ ان کی صحبت میں اس بچے کی زبان دانی مزید نکھرتی گئی۔ بچے کو سب سید صاحب کہہ کر پکارتے تھے کیونکہ والد کا نام سید عباس مرزا اور دادا کا سید تفضل علی خان تھا۔ ان کا تعلق سادات بارہہ سے تھا۔ نانا نواب مہدی علی خان خاندان سادات سے نہ تھے۔ انہوں نے نواسے کو سید صاحب کہہ کر پکارنا شروع کیا تھا جو اب زبان زد عام تھا۔ ننھیال اور ددھیال دونوں جگہ علم کو اہمیت حاصل تھی اس لیے سید صاحب کا شوق تعلیم کی طرف مبذول ہوتا گیا۔ بزرگوں کی نشست سے متصل کمرا مکتب کے لیے مختص تھا جہاں مولوی سید فرحت حسین تعلیم دیتے تھے۔ خاندان کے بیس پچیس بچے اوقات مکتب میں آ جاتے اور شام تک سبق لیتے۔ مطبخ سے کھانا آتا اور سب مل جل کر مولوی صاحب کی نگرانی میں دوپہر کا کھانا کھاتے۔ شام کے وقت گھر کے وسیع صحن میں بزرگوں کے سامنے کھیلتے، لٹو گھماتا، پتنگ اڑانا بھی صحن میں سب کی نظروں کے سامنے ہوتا۔ میر سید محمد فیض آبادی زبان داں اور تہذیب پرور تھے۔ سید صاحب ان کے قریب زیادہ رہتے۔ غور سے ان کی بات چیت سنتے، لب و لہجہ دیکھتے۔ میر صاحب کی عادت تھی کہ غلط لہجے اور محاورے پر فوراً ٹوک دیتے تھے۔ اہل عرب و عجم جب آتے تو سید صاحب ان سے بھی گھل مل جاتے۔ ایران کے حاجی محمد رضائے شیرازی جب مالِ تجارت لے کر آتے تو ان سے سید صاحب کی خاص نبھتی تھی اور وہ ان سے فارسی میں گفتگو کی کوشش کر کے فارسی سیکھتے۔ نو برس کی عمر میں سید صاحب کو باقاعدہ پڑھنے کے لیے بٹھا دیا گیا۔ رائج رسوم کے تحت عربی کی تعلیم شروع کی گئی۔ مولوی سید فرحت حسین اتالیق مقرر ہوئے پھر مولوی شیخ آغا جان پدر مولوی شیخ باقر علی باقر آبادی اور مولوی سید عبداللہ فاضل کشمیر تعلیم کے لیے مقرر ہوئے۔ شرح ملا جامی و میزان منطق ابوالفضل، مینا باز، پنج رقعہ ظہوری پڑھی۔ اسی دوران 1857ء آ گیا اور پہلی جنگ آزادی چھڑ گئی۔ دہلی خون سے نہا گیا۔ اس جنگ آزادی کا بھرپور اثر پٹنہ پر بھی پڑا۔ خاندان کے کئی افراد کی جاگیریں ضبط ہو گئیں۔ سید صاحب کم سنی سے شعر موزوں کر رہے تھے۔ سات سال کی عمر میں پہلا شعر کہہ چکے تھے۔ ”جو کوئی اس تلنگی کو لوٹے۔ گر پڑے، ہاتھ پاؤں ٹوٹے“ اتنی سی عمر میں مشاعرے میں بھی پڑھنے لگے تھے۔ 1876 میں سید صاحب نے ایک ناول بھی لکھ لیا۔ اسے شائع کیا گیا تو لوگ ماننے پر تیار نہ تھے کہ یہ ناول کسی کم عمر نے لکھا ہے۔ چند سال بعد اس ناول کا دوسرا پھر آخری حصہ بھی لکھ دیا۔ 1889 میں انہیں آنریری مجسٹریٹ کا عہدہ مل گیا۔ لندن سے ولی عہد حکومت برطانیہ ایڈورڈ ہفتم پٹنہ کے دورے پر آئے تو سید صاحب نے تاریخ صوبہ بہار لکھ کر شائع کرائی۔ اسے اردو میں بہار کی تاریخ پر پہلی کتاب ہونے کا اعزاز حاصل ہوا پھر تین جلدوں پر مشتمل صورۃ الخیال کے عنوان سے ایک اور ناول لکھ دیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ نصابی کتابیں بھی لکھتے جا رہے تھے۔ چھ سات نصابی کتابوں کے بعد ذخیرۃ الادب لکھی جس میں فن شاعری اور زبان دانی پر بحث تھی۔ تصنیف کردہ کتابوں کی فہرست بہت لمبی ہے۔ اسی طرح شاعری میں بھی کمال دکھایا کہ سو سال سے زیادہ عرصہ گزرنے پر بھی ان کے بے شمار اشعار زبان زد عام ہیں مثلاً ”ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں“ ”ہم“ ”تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں۔ کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں۔“ اس معروف مصنف و شاعر کو ہم شاد عظیم آبادی کے نام سے پہچانتے ہیں جو آفتاب عظیم آباد بھی کہلاتا ہے۔

☆☆☆

شہرِ خیال

مدیرِ اعلیٰ

☆ نزاہت افشاں گاؤں مہورہ تحصیل فتح جنگ ضلع اٹک سے لکھتے ہیں۔

"27 فروری کو ماہنامہ سرگزشت مل گیا۔ اداریہ ہمارے بدلتے رویوں کی خوب صورتی سے عکاسی کر رہا تھا۔ واقعی میں آج ہم اپنے اسلاف کی اخلاقی قدریں بھولتے جارہے ہیں اور اجتماعی بے حسی ہم پر غالب آچکی ہے۔ یک صفحی سرگزشت اس بار اورنگزیب عالمگیر کے بارے میں تھی۔ یقیناً اس پر مغلیہ سلطنت ختم ہوگئی تھی۔ 1857ء تک بس رسمی بادشاہت رہی۔ حضرت میاں میرؒ کے بارے میں ڈاکٹر ساجد امجد نے کافی تفصیل سے لکھا۔ یقیناً ان جیسے اولیائے کرامؒ ہی کی زندگی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ "تلاش" زویا اعجاز کی بہترین تحریر تھی۔ سلویا پلیتھ کے متعلق جان کر اچھا لگا اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی عیاں ہوگئی کہ شعراء ادبا کرام صرف ہمارے معاشرے ہی میں نہیں بلکہ جس معاشرے میں بھی ہوں مسائل کا شکار رہتے ہیں۔ "فرار" سید احتشام کی زبردست کہانی تھی۔ جنرل جیراڈ کو داد دینی چاہیے کہ اکسٹھ برس کی عمر میں وہ خطرناک دشمنوں کی قید سے بحفاظت بھاگ نکلا۔ "بلبل بنگال" انور فرہاد کی محنت اور سحر کاری کا مکمل نمونہ تھی۔ سانحہ مشرقی پاکستان نے ہم سے کئی باصلاحیت افراد چھین لیے اور جو بچے وہ تقسیم کا شکار ہوگئے۔ "شمشال سے ٹورنٹو" ان دنوں ندیم صاحب کی جرأت عاشقانہ اور نسرین کی صحبت ساحرانہ کی بدولت خوب عروج پر ہے۔ اب تک تو رنگ میں بھنگ نہیں پڑی لیکن شاید ندیم صاحب کی بیوی اور بچوں کی آمد یہ کام کردے۔ "ناسور" اس بار بالکل اچھا نہیں لگا بلکہ کرداروں کا جمعہ بازار بنتا چلا جارہا ہے۔ "پچھتاوا" اس بار سرِ فہرست تھی۔ میرا کی ماں نے اسے اپنے حالات بتا کر اسے راہ راست پر لائی .... یوسف تو واقعی میں بہت گھٹیا نکلا اور سراج گیلانی جیسے لوگ وہ شکاری ہوتے ہیں جو دوسروں کی مجبوریوں کی قیمت وصول کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ "شکست" دوسری بہترین سچ بیانی تھی اور ساتھ ساتھ سبق آموز بھی، شائستہ نے فرزانہ سے جو سودا کیا یقیناً فرزانہ کو اس کا بہت فائدہ ہوا۔ پوری کہانی کا مرکزی نکتہ آخری تین سطروں میں کھینچ دیا گیا تھا کہ "ہر شادی شدہ لڑکی کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ شادی کے بعد بھائی کی حویلی نہیں بلکہ شوہر کی جھونپڑی ہی اس کا اصل گھر ہے۔ جہاں وہ صحیح معنوں میں راج کرسکتی ہے۔" "اس پار" بھی زبردست تحریر تھی۔ بابا نظیر کی کہانی واقعی میں بہت دکھی تھی۔ صغریٰ کی وفا اور محبت لائقِ تحسین ہے۔ "خالہ خالدہ" میں ایک بات پر بہت غصہ آیا کہ وہ دو شوہروں کے ساتھ رہ رہی تھی جب کہ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ "نوحہ" درحقیقت نوحہ تھی۔ ہمارے معاشرے میں ایسے شکاریوں کی کمی نہیں۔ اردو ادب کے معروف شاعر مصحفی (1824-1751) بھی غمِ معاش کے ہاتھوں مجبور ہوکر اپنا کلام فروخت کرتے تھے۔ گناہ بے لذت، شجرِ عشق اور قاتل لکیر بھی سبق آموز کہانیاں تھیں۔ "شہرِ خیال" میں سیف خان کوئٹہ سے صدارت پر تھے۔ رانا محمد شاہد، مختصر اور جامع تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ عبدالحکیم ثمر، ظفر ندیم دہرہ، رضا احمد اعوان، منشی محمد عزیز مے، عبدالجبار رومی، نصر اللہ خان داؤ خیل میانوالی، شاہد ذوالفقار ہری پور اور ناصر حسین رند کے تبصرے بھی بہترین تھے۔ کوثر اسلام صوابی سے مکمل اور بھرپور تبصرہ لیے حاضر تھے۔ سدرہ بانو ناگوری سسٹر بھی اپنے انداز میں حاضر تھیں لیکن مجال کہ ہمیں یاد کیا ہو۔ آخر پر ایک غلطی کی تصحیح کرتا چلوں کہ محترم زین مہدی نے اپنی تحریر "مزار بیکسی" میں صفحہ نمبر 82 پر سطر نمبر 12 پر یہ مشہور شعر بہادر شاہ ظفر سے منسوب ہے۔ "نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں۔ کسی کام ..... نہ آسکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں۔" جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہ شعر ظفر نہیں بلکہ "مضطر خیر آبادی" کی غزل کا ہے۔ اس بات کی وضاحت آج سے کئی برس پہلے یوسف حسینی نے ماہنامہ نگار جنوری 1963ء میں

ایک مضمون "شاعر ظفر نہیں مضطر خیر آبادی" لکھ کر دی تھی۔ 1938ء میں جب "نگار" آل احمد سرور کی ادارت میں چھپا کرتا تھا۔ اس وقت جان نثار اختر نے بھی اپنے ایک مضمون میں اس غزل کو اپنے والد صاحب کا بتایا تھا۔ جان نثار اختر کے پاس جو مطبوعہ دیوان ہے مضطر خیر آبادی کی اس میں یہ غزل موجود ہے۔ اس کے علاوہ نواب فاروق حسین گوپاموں نے بھی مضطر کے کلام کا ایک انتخاب شائع کیا تھا۔ اس میں بھی یہ غزل موجود ہے۔ یہ غزل سب سے پہلے فلم "لال قلعہ" میں شامل کی گئی اور فلم میں اس کو بہادر شاہ ظفر کی زبان سے ادا کیا گیا یوں آج تک یہ غزل ظفر سے منسوب چلی آتی ہے۔ انجمن ترقی اردو ہند نے فروری 1958ء میں "نوائے ظفر" کے نام سے ظفر کے کلام کا انتخاب شائع کیا تھا۔ غلط فہمی کی بنا پر اس غزل کو بھی ظفر کا سمجھ کر "نوائے ظفر" میں شامل کردیا گیا۔ اگر فاضل مرتب ماہنامہ نگار 1938ء میں شائع ہونے والا جان نثار اختر کا مضمون پڑھتے تو یہ غلطی نہ ہو پاتی۔ فیصلہ کن بات یہ کہ منشی نولکشور نے 1887ء میں کلیات ظفر کا جو پہلا ایڈیشن چھاپا تھا اس میں بھی یہ شعر شامل نہیں اور موجودہ دور میں جو کلیات ظفر [illegible] ہے اس میں بھی یہ شامل نہیں۔ مضطر خیر آبادی کے کلام کا جو انتخاب نواب فاروق حسین گوپاموی نے شائع کیا تھا وہ [illegible] بیٹی بیگم سعیدہ حسن کے پاس بھوپال میں آج بھی محفوظ ہے۔ اس غزل کے مقطع سے پتا چلتا ہے کہ یہ مضطر کی ہے۔ [illegible] میں مضطر ان کا رقیب ہو۔ جو بگڑ گیا وہ نصیب ہوں جو اجڑ گیا وہ دیار ہوں۔" یہ تصحیح ضرور شائع کریں [illegible] کہ یہ غزل مضطر خیر آبادی کی ہے۔ دسمبر 2010ء میں ذرہ حیدر آبادی نے بھی [illegible] مضطر خیر آبادی کا ہے اور اس بارے میں سرگزشت میں ایک تحریر پہلے بھی [illegible] بہادر شاہ ظفر کا قرار دیا ہے، اسی زمین پر ان کی ایک غزل میں شعر شامل کردیا ہے جس کی وجہ سے سہواً یہ شعر متواتر بہادر شاہ کا قرار دیا جارہا ہے۔)"

☆ مرزا طاہر الدین بیگ نے میر پور خاص سے لکھا ہے جو فروری کے شمارے پر ہے لیکن اب ملا ہے۔ "شہرِ خیال" میں اوّل نمبر پر اعجاز حسین ہیں اور دوسرے نمبر پر شیخ صاحب ہیں دونوں ہی خوب ہیں اس شمارہ میں سدرہ بانو ناگوری غیر حاضر تھیں دعا ہے جہاں ہو خوش خرم رہیں آباد رہیں (آمین)۔ ڈاکٹر صاحب کا "معلم ثانی" بہترین معلوماتی مضمون تھا۔ "شعلہ صفت" بھی خوب رہا۔ اب "باغی" کا ذکر ہوجائے۔ زویا اعجاز کی "باغی" خوب صورت بدیسی کہانی ہے۔ دیسی رنگ میں زبردست طریقے سے سرگزشت میں لکھی گئی اور خوب لکھی گئی۔ انور فرہاد صاحب کا "سپر رائٹر" زخمی کانپوری کی تحریر نیر حسین کے فلمی رسالے میں پڑھتا رہا ہوں۔ زخمی صاحب نے گمنام شاعروں کے زبردست نغمے ڈھونڈ نکالے تھے۔ فرہاد صاحب نے اب کی دفعہ انتخاب اچھا کیا تھے۔ "نہ یہ چاند ہوگا" یہ شرط فلم کا گانا جوں کا توں فلم میں آپ کو ملے گا۔ اب کیوں ملے گا اس کی کہانی فرہاد صاحب ہی سنائیں گے۔"

☆ حنیف ادیب کا مراسلہ لاہور سے۔ "مارچ کا شمارہ پیشِ نظر ہے۔ سفر نامہ اپنی جگہ، اس کے علاوہ جس سچ بیانی نے اپنی طرف توجہ مبذول کرائی وہ محترمہ شائستہ کی لکھی ہوئی سرگزشت "شکست" ہے۔ اس آپ بیتی میں انہوں نے شادی شدہ زندگی کے بعض غور طلب حقائق کو اجاگر کیا ہے۔ آخر میں رائٹر کے یہ الفاظ ہر شادی شدہ لڑکی کے لیے ایک پیغام کی حیثیت رکھتے ہیں کہ "ہر شادی شدہ لڑکی کا شادی کے بعد اس کے بھائی کی حویلی نہیں اس کے شوہر کی جھونپڑی ہی اس کا اصل گھر ہے۔ جہاں وہ راج کرسکتی ہے۔" اس شمارہ کی دوسری تحریر زویا اعجاز کی "شاعرہ" ہے جسے میں نے دلچسپی سے پڑھا۔ ایک عظیم تر شاعرہ کہ شہرت نے جس کے قدم چومے۔ تکلیف دہ حالات کا شکار رہی۔ اس کی یہ دکھ بھری کہانی یقیناً ہر قاری کے لیے دکھ کا تاثر چھوڑ گئی ہوگی۔ شاعری اپنی جگہ مگر حالات نے ہمیشہ اسے اپنے نرغے میں رکھا، افسوس ناک ہے۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ازبر کہ بعض اوقات ناگوار حالات ہی انسان کو شاعر بنا دیتے ہیں۔ غالب بھی حالات کی شکست و ریخت سے دوچار تھے یہی وجہ ہے کہ بلبلا کر پکار اٹھے "سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری۔ کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے" تاہم اس کے ساتھ ایسا نہیں وہ تو بچپن سے ہی شاعرہ تھی، ناگوار حالات سے تو اسے بعد میں واسطہ پڑا۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے عظیم صوفی بزرگ حضرت میاں میرؒ پر ایک جامع تحریر لکھ کر اپنا حق ادا کردیا۔ ان کی ہر کاوش قابلِ تحسین ہوتی ہے۔ آخر میں ایک وضاحت کہ جنوری کے شمارہ میں سالانہ تجزیہ میں میرا نام ڈاکٹر حنیف ادیب درج تھا۔ اس سے پہلے بھی چند مراسلہ نگاروں نے میرے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا لاحقہ لگا رکھا تھا۔ حالانکہ ڈاکٹر تو بھلا کجا میں تو مریض بھی نہیں (آپ سے گزارش ہے کہ ذرا صاف صاف لکھیں اور مارکر استعمال نہ کریں جس کی وجہ سے تحریر پڑھی نہیں جاتی۔ کمپوزر اندازے سے کمپوز کرتا ہے)"

☆ سدرہ بانو ناگوری ملیر کراچی سے تشریف لائی ہیں۔ "موبائل فون، انٹرنیٹ، فیس بک اور سوشل میڈیا دورِ جدید کی ایسی

لعنت ہیں جس نے انسانیت کو دنیا بھر کے سامنے برہنہ کر کے رکھ دیا ہے۔ ایکسیڈنٹ، حادثے، جھگڑے، سانحے ہر جگہ ویڈیو، کیمرے، سیلفیاں لی جاتی ہیں۔ لمحے بھر میں پوری دنیا تماشائی بن کر ان تماشوں کو دیکھتی ہے، مزے لیتی ہے داد دیتی ہے، ہنستی ہے قہقہے لگاتی ہے، یہ ہم کس طرف جا رہے ہیں؟ شرم، لحاظ، تہذیب روایات تربیت کہاں کھو گئی۔ ہم کہاں کھو گئے ہیں۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' پر نظر پڑی تو حیران رہ گئے۔ ارے یہ کیا تیسواں حصہ ہو گیا یوں لگتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہو جب یہ سفرنامہ شروع ہوا تھا۔ کینیڈا میں برسوں سے بسنے والے بھی شاید کینیڈا کے حسن کو اس طرح بیان نہیں کر پاتے ہوں گے جس طرح ندیم بھائی ٹورنٹو اور اس کے گرد و نواح کو پرت در پرت کھول رہے ہیں۔ ندیم بھائی آپ کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ آپ کسی بھی ملک کے کسی بھی مقام کا ذکر کریں۔ آپ پاکستان کو نہیں بھولتے، آپ کی اسی اچھائی کے سبب میں نہ صرف یہ سفرنامہ دلچسپی سے پڑھتی ہوں بلکہ اس کی ساری اقساط بھی سنبھال کر رکھی ہیں۔ نسرین کے لیے آپ کی محبت کا یہ سلیقہ بہت منفرد اور بہت انوکھا ہے۔ پاکیزگی، چاہت، عقیدت احترام بھی کچھ ہے اس میں۔ ''ناسور'' کی یہ قسط گزشتہ ساری اقساط پر بازی لے گئی۔ ''رونا لیلیٰ'' کا صرف نام ہی سن رکھا تھا، ان سے پہلا اور مکمل تعارف پہلی بار ہوا تو ہمیں ''بلبل بنگال'' کی یہ سانولی سلونی سی گلوکارہ بے حد بھائی۔ ''سخت جان'' ایک خوب صورت ملک کا مختصر تذکرہ ہوا۔ اہل ناروے واقعی محنتی اور جفاکش ہیں، ان کی کامیابیوں اور صلاحیتوں کی تازہ تر دلیل یہ ہے کہ حال ہی میں ہونے والے پیونگ چانگ کے گیمز میں امریکن، جرمن اور کینیڈین پلیئرز کی موجودگی میں ناروے نے میڈلز کا ڈھیر لگا کر ان تمام ممالک کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ زویا اعجاز ہمیشہ عمدہ اور شاہکار تحریریں لاتی ہیں اور چھا جاتی ہیں دکھوں اور الجھنوں کے تانے بنتی ''تلاش'' کا اختتام دکھی کر گیا۔ ڈاکٹر ساجد امجد کا ''تحفۂ خاص'' خوب رہا۔ ''پچھتاوا'' کی مصنفہ کے لیے میرا ایک چھوٹا سا پیغام کہ محترمہ کبھی کبھی کچھ پچھتاوے، اُمید اور یقین کا سبب بھی بن جاتے ہیں۔ کچھ غلطیاں اور کچھ کوتاہیاں آنے والے وقتوں میں بہت اچانک سے خوشیوں کے لمحے کشید کر جاتے ہیں۔ آپ کے شوہر کے ہوتے ہوئے بھی آپ کی بیٹی کوئی غلط حرکت کر جاتی تو آپ اسے روکتیں، یوں سمجھ لیجیے کہ آپ کی دکھوں بھری زندگی نے ہی اسے زندگی بھر کے دکھوں سے بچایا ہے، جو ہوا اسے بھول جائیے لیکن جو آپ سے غلطی ہوئی اس کی معافی رب تعالیٰ سے طلب کیجیے کہ وہی بخشنے والا اور مہربان ہے۔ ''خالہ خالدہ'' جیسا کردار پہلی بار نظروں سے گزرا اور دو شوہروں کے ساتھ ان کی محبت ''عجب پریم کی غضب کہانی'' کی طرح لگی۔ (بلال شیخ کی سچ بیانی اقتدار کہیں اور بھی چھپ چکی تھی اس لیے انہیں بین کر دیا گیا ہے)''

☆ اعجاز حسین سٹھار نور پور تھل سے لکھتے ہیں۔ ''خطوط کی محفل میں ناصر حسین رند کا بھرپور شکوہ پڑھ کر ہنسی آگئی۔ بھائی میں معذرت خواہ ہوں۔ ہم ٹھہرے جٹ آدمی، اپنا نقطہ نظر سمجھاتے ہوئے کہاں سے کہاں نکل جاتے ہیں۔ تعلق بنانا اور نبھانا بھی جانتے ہیں۔ میں پورے چالیس سال سے متواتر تبصرے لکھ رہا ہوں، اگر سارا تجربہ آزمانے پر آگیا تو یہ کالم بوجھ برداشت نہ کر پائے گا۔ ''بلبل بنگال'' کی رونا لیلیٰ کی سریلی اور میٹھی آواز کے ہم بھی شیدائی تھے لیکن ریڈیو، ٹی وی کا زمانہ گیا، ہر طرف ہڑبونگ مچی ہوئی ہے، بیزاری اور شرمندگی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ جیسے روایتی فنکار کونوں کھدروں تک محدود ہو گئے ہیں۔ ہم بھی پرانی یادیں سینے سے لگائے بیکاری کا وقت گزار رہے ہیں، سوائے آہیں بھرنے کے کوئی کام نہیں ہے۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' میں بھی لگتا ہے ابھی اظہار محبت، وعدوں اور جذبات کے باغی ہونے کا وقت آیا چاہتا ہے لیکن سارے اندازے غلط ثابت ہوتے ہیں۔ کسی جوان، خوب صورت اور غیر محرم عورت کے ساتھ تنہائی کے لمحات اس شرافت سے گزارنا انسان کے فرشتہ ہونے کی دلیل ہے۔ خود کو اتنی کڑی آزمائش سے سرخرو لے کر نکلنا جہاد سے کم نہیں ہے اب یہ بات طے ہے کہ دونوں فریقین حالات کی نزاکت کو سمجھ رہے ہیں، اچھے دوستوں کی طرح رفاقت سے لطف لے رہے ہیں اپنی ذات پر اعتماد ہے لیکن یہ طے ہے کہ بچھڑنے کے بعد یادوں کی کسک بہانے بہانے سے چٹکیاں بھرتی رہے گی۔ ندیم اقبال نے سفر کہانی میں رومان ڈال کر تحریر کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ الفاظ پر گرفت اور واقعات کی روانی پر جتنی داد دی جائے کم ہے۔ ''ناسور'' میں نعمان ضمیر سے دو دو ہاتھ کرتے ہوئے جیسی کیفیت سے دوچار ہوا، انتقام میں کوئی صورتِ حال واضح نہ تھی، جذبات میں وہ اپنی فطرت سے ہٹ کر فیصلہ کر سکتا تھا۔ تب وہ ہوش و حواس سے بیگانہ تھا اور دیوانگی میں بندہ درندہ بن جاتا ہے لیکن بغدا کی موجودگی میں جب حالات کنٹرول میں تھے۔ انتقام نہ لے کر انسانیت کو معراج پر پہنچا کر سر فخر سے بلند کر لیا ہے۔ یہاں جیسا ماحول بنا ہوا ہے ایسی غیر یقینی صورتِ حال میں آنے والے وقت کا کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن نعمان کے کردار پر انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی، وہ مزاحمتی جنگ لڑ رہا ہے۔ دیکھنا ہے آنے والے دن اسے کس راستے پر لے جاتے ہیں اس کے لیے ہمیں صبر سے طویل فاصلے تک ساتھ چلنا ہوگا اور مجبوری میں یہ آبلہ پائی مسکراتے چہرے کے ساتھ برداشت کرنا ہوگا۔ اب سچ بیانیوں کی طرف بڑھتے ہیں اور زندگی کے بکھرے مختلف رنگوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ ''پچھتاوا'' میں میرا نے عقل مندی سے سوچا اور ماں کے بیتے حالات سے سبق سیکھ کر فراز کا باب ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔ وہ بھی بھنورا کی طرح پھولوں کی دلکشی سے دل بہلانا چاہتا تھا۔ موسم کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ غائب ہو جاتا اور میرا در در کی ٹھوکریں کھانے کے لیے تنہا رہ جاتی، ہر

معاملہ میں خوش قسمتی ساتھ نہیں دیتی، کبھی انہونیاں بھی راہیں کھوٹی کر دیتی ہیں تب خود کو نوچنے گھسیٹنے کے علاوہ چارہ نہیں ہوتا۔ والدین اور بہن بھائی الگ شرمندگی اور جگ ہنسائی سے گھر کی چار دیواری تک محدود ہو جاتے ہیں جو زیادہ حساس اور غیرت مند ہو وہ اپنی جان سے گزر جاتا ہے یا دوسرے فریق سے مار کٹائی کر کے پابند سلاسل ہو جاتا ہے۔ یہاں ماں بیٹی نے ایک راہ دکھائی ہے جس نے تقلید کی ٹھان لی وہ ہر لحاظ سے نفع کا مال سمیٹتا رہے گا۔ ''شکست'' میں شائستہ نے زندگی کی حقیقتوں کو تسلیم کیا ہے۔ کاشف کا موقف سچا اور کھرا ہے اس میں انا، ضد اور ہٹ دھرمی کی بات نہیں ہے۔ وہ اتنی بڑی ذمہ دارانہ سیٹ پر بیٹھا ہے تو زمانے کا سرد گرم خوب جانتا ہے یہی وجہ ہے وہ حوالوں سے شائستہ کو قائل کرتا رہا اور کامیاب ٹھہرا اور گویا سب کی عزت بچ گئی، اب اپنی من مرضی سے زندگی کی لطافتوں سے لطف لے رہے ہیں جو روپے پیسے سے ہٹ کر مزاج آشنائی، ایثار ذات اور پُرامن سوچوں کی مرہون منت ہوتی ہے۔ ''اس پار'' کے نظیر کی کہانی بھولنے والی نہیں ہے۔ یہ ایک مشن ہے جو زندگی کی آخری سانس تک رہے گا اور محبت ہو تو ایسی کہ پینتیس سال سے یادوں کا غبار دل میں بسیرا کیے ہوئے ہے۔ دکھ کی اذیت کم ہوئی ہے نہ بیتے دنوں کا خمار ذہن سے اترا ہے بلکہ زندگی کے ماہ و سال آگے بڑھے نہیں ہیں بس وہیں ابتدائی ایام کے ارد گرد چکر میں ہیں ایک محبوب تک سوچیں، جذبات اور روز و شب محدود کر دینے والے کردار کم ہی ملتے ہیں جو نظروں کے معیار میں آ جائیں انہیں تعظیم دیجیے کیونکہ وہ غیر معمولی انسان ہوتے ہیں جن کا مقام و مرتبہ ہماری سوچ سے بھی اونچا ہے۔ ''خالہ خالدہ'' نفس قصہ کہانی کے علاوہ کچھ نہ ہے، دو شوہروں کا پڑھ کر تجسس پیدا ہو گیا تھا۔ تحریر کرنے میں کمی نہیں لیکن واقعات بوریت کے سوا کچھ نہ دے سکے۔ ''نوحہ'' میں ظفر کے حالات پڑھ کر حیرانی کے ساتھ دکھ ہوا۔ لوگ کتنے چالباز ہو گئے ہیں، مجبور کو کیسے لوٹ رہے ہیں، شرمندگی نے سر جھکا دیا۔ خالی تعریفوں سے معاشی مسائل حل نہیں ہوتے جو دھوکا بازی اور منافقت سے رزق کماتے ہیں اس میں بھلا کہاں برکت ہوتی ہوگی، جب ضمیر بیدار ہو کر سرزنش کرے گا شاید تب ایسے چلن سے توبہ کر لیں۔ ''گناہ بے لذت'' کی فوزیہ بچی، کھری ہونے کے ساتھ بھولی بھی تھی۔ دوسروں کے رویوں کی سمجھ نہ رکھتی تھی تبھی ان کے بچھائے جال کا آسانی سے شکار ہو گئی۔ کتنے ہنسی خوشی اور بے فکری کے دن تھے، گھر میں اولاد کی نعمت سے سکون تھا لیکن اپنوں نے محرومیوں کا انتقام اس معصوم سے لیا اور خوامخواہ اپنی قبر کو دہکتے انگاروں سے بھر لیا اور مرنے سے پہلے عذاب بھگت کر انجام سے دوچار ہوئے لیکن فوزیہ جو بھری جوانی میں منوں مٹی تلے جا سوئی وہ واپس نہ آسکے گی۔ اب سب اس کی موت کا غم بھلا چکے، منال بھی اسی گھر بیاہ دی گئی لیکن یہ خوشیاں فوزیہ نے نہ دیکھنی تھیں، کوئی تو ایسا ہو جو اس کے گناہ کا تعین کر سکے، کس قصور کی پاداش میں اتنی بڑی سزا کی حقدار ٹھہری، یہ کہہ سکتے ہیں کہ قدرت کے کاموں میں دخل نہیں دینا چاہیے جو بہتر ہو وہی انجام ہوتا ہے۔ ''اقتدار'' حاصل کرنے کے لیے کسی کو پیچھے ہٹانا پڑتا ہے تب ہی جگہ بنتی ہے کہ قدم آگے بڑھائے جا سکیں۔ عاطف نے اسی فارمولا پر عمل کیا اور کامیاب ٹھہرا۔ جب اس نے ضد پکڑ لی اور راستہ نہ دیا تو اپنے انجام پر کس سے گلہ کرے گا کیونکہ یہ رواج ڈالنے والا وہ خود ہے۔''

☆ عبدالحکیم شمر کا خط کراچی سے۔ ''درست فرمایا آپ نے کہنے کو یہ ایک کہانی ہے لیکن اصل میں یہ ایک زبردست طمانچہ ہے، بلکتی سسکتی انسانیت کا انسانوں کے مردہ ضمیر پر۔ یہ طمانچہ شاید مردہ ضمیر کو جگا دے مگر افسوس! مردے نہیں جاگتے۔ سڑکوں پر آج بھی لاشیں گر رہی ہیں۔ عدم تحفظ کی فضا بدستور قائم ہے۔ سرگزشت کے زیر نظر شمارے میں گوناگوں دلچسپیوں، معلومات کے ساتھ ہمارے ذوق مطالعہ کی تسکین کے لیے بہت کچھ موجود ہے۔ یک صفحی سرگزشت ''ناصح'' ڈاکٹر ساجد امجد کا ایمان افروز تحفہ ''میاں میر'' ایم راجپوت کا ''مرگ تنہا'' زین مہدی کا ''مزار بیکسی'' واقعی اپنی بے کسی پر نوحہ خواں ہے۔ انور فرہاد کا فلم نگری میں ''بلبل بنگال'' رونا لیلیٰ کی حکمرانی بے مثال رہی۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' اپنی دلچسپ طرز تحریر کے ساتھ مقبولیت کے جھنڈے گاڑ رہی ہے۔ ندیم اقبال صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں۔ انہوں نے نسرین کے سامنے چند انسانی رشتوں کی تشریح کی ہے۔ میں انہیں دہرانا چاہوں گا۔ ''ہم اپنی زندگی میں بہت سے رشتوں کے ساتھ بندھے ہوتے ہیں۔ کچھ مذہبی کچھ معاشرتی، کچھ قانونی اور کچھ لوگ آپس میں مل کر خود بنا لیتے ہیں جیسے تم اور میں۔ کچھ رشتے اللہ کی دین ہوتے ہیں جیسے تمہارا اور سعد کا رشتہ۔'' اگر اس تناظر میں دیکھا جائے تو میاں بیوی کا رشتہ بھی اللہ ہی کی دین ہے۔ اگر کوئی چاہت سے مغلوب ہو کر اس رشتے کے متوازی رشتہ استوار کر لے تو اسے کیا کہیں گے؟ غیر اخلاقی؟ یا ناجائز؟ چاہت اگر جذبات پر غالب آجائے تو بہت سے آشیانوں پر بجلیاں ٹوٹ پڑتی ہیں۔ فضہ خان کی سچ بیانی ''پچھتاوا'' گلیمر، چاہت اور امنڈتے جذبات کے لہروں پر بہہ جانے والوں کے لیے درس عبرت ہے۔ کچھ لڑکے اور لڑکیاں ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا سمجھ بیٹھتے ہیں، کچھ کو دور کے ڈھول سہانے لگتے ہیں۔ کوئی کھڑا تو ہے زمین پر مگر آسمان چھونے کی تمنا رکھتا ہے پھر انہیں ہوش تب آتا ہے جب ان کا سب کچھ لٹ چکا ہوتا ہے۔ پھر تو وہ گھر کے رہتے ہیں نہ گھاٹ کے۔ فہمی فردوس کی ''خالہ خالدہ'' کیا کہوں اسے، سچ یا غلط بیانی؟ وہ کہہ رہی ہیں کہ ''میں نے اپنی آنکھوں سے ایسی عورت دیکھی ہے جو دو شوہروں کے ساتھ ایک گھر میں ایک ہی چھت کے تلے زندگی گزار رہی ہے۔ حالانکہ انہوں نے بیک وقت دو شوہروں کو نہیں دیکھا ایک سابق شوہر کے وفات کے بعد وہ خالہ کے گھر گئیں۔ ویسے وہ تو یقیناً جانتی ہوں گی کہ شوہر بیوی کو طلاق دیئے

کے بعد اس کا شوہر نہیں رہتا بلکہ شوہر تھا بن جاتا ہے۔''

☆ حاجی عبدالرحمٰن کی فیصل آباد سے آمد ''......... ہم آپ کے ماہنامہ سرگزشت کے باقاعدہ قاری ہیں اور ہم آپ کے اس ماہ نامہ کو بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ ''معلم ثانی'' ابونصر فارابی پر ڈاکٹر ساجد امجد کی لکھی ہوئی تحریر بہت پسند آئی۔ میں کافی عرصے سے ابونصر فارابی پر ایک مکمل مضمون پڑھنا چاہتا تھا جو مجھے آپ کے ماہنامے میں مل گیا۔ ہم سب کی طرف سے التماس ہے کہ آپ حضرت عمر بن عبدالعزیز پر بھی ایک ایسا ہی تحقیقی مضمون لکھ کر اپنے ماہنامے میں قارئین کے لیے شائع کروائیں تاکہ سبھی اس سے استفادہ کرسکیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز اگرچہ بہت بعد میں ہوئے لیکن مورخ ان کے عہد کو خلافت راشدہ میں ہی شمار کرتے ہیں۔ مورخ ان کو عمر ثانی بھی کہتے ہیں۔ یہ امت کی متفقہ شخصیت ہیں اور کسی کو ان سے اختلاف نہیں۔''

☆ ظفر ندیم وہرہ کا خلوص نامہ حیدرآباد سے۔ ''مارچ کا پرچہ حسب روایت اپنے تمام رنگوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ دیدہ زیب سرورق، عمدہ طباعت اور معیاری مواد دیکھ کر دل خوش ہوا۔ امید واثق ہے کہ آپ کی رہنمائی میں یہ سلسلہ فکروادب رواں دواں رہے گا۔ حضرت میاں میرؒ جیسے باکمال صوفی اور برگزیدہ ہستی کے حالاتِ زندگی پڑھ کر ایمان کو تازگی ملی۔ ان کی ذات باصفات کے بارے میں صرف اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ اس نے پیغمبری کی مگر دعویٰ نہ کیا۔ ''مزار بے کسی'' سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار کی عبرت اثر کہانی ہے۔ اس پر اپنی ہی بادشاہت کے خلاف سازش اور بغاوت کا الزام تھا۔ حالانکہ یہ عالم وصوفی گلستان سعدی کا مفسر اور شاعر بے بدل تھا۔ اس کا کردار ایسا تھا کہ جیسے ہمالہ کی چوٹی مگر قسمت کھوٹی تھی۔ دستِ قدرت نے لکھ دیا تھا کہ یہ سلطنت مغلیہ کا آخری مگر سب سے بدقسمت بادشاہ ہوگا۔ ندیم اقبال کا سفرنامہ خوب جارہا ہے۔ ایک اچھا لکھنے والے میں یہ لیاقت اور صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ نئی چیزوں کو مانوس بنا کر پیش کرتا ہے اور مانوس چیزوں کو نئی چیزیں بنا کر قارئین تک پہنچاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ قارئین کے ذوقِ جمال کی کامیاب عکاسی کررہے ہیں۔ سرورق کی کہانی ''پچھتاوا'' ایک سبق آموز کہانی تھی۔ رقیہ کو ایک مالی کے ساتھ طوفانی رومانس پروان چڑھانے سے پہلے اس کے مضمرات پر غوروخوض کرلینا چاہیے تھا۔ یہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ جن بچیوں کو والدین بچانا چاہیں وہی بچنا نہ چاہیں جن کو والدین عزت سے زندہ رکھنا چاہیں، وہی آسودگی کے ساتھ زندہ رہنے پر آمادہ نہ ہوں تو کوئی کیا کرسکتا ہے۔ ''شکست'' ایک خودسر، خودرائے اور نخوت زدہ لڑکی کی سرگزشت تھی اس کی بے جا ضد اور بے پناہ غرور نے اسے کہیں کا نہ چھوڑا۔ اس نے فرزانہ اور کاشف کی معصوم محبت کی راہ میں جو کانٹے بچھائے، وہ اسے اپنی پلکوں سے چننے پڑے۔ ''خالہ خالدہ'' شیر کی خالہ تھی جس نے ایک نئی مثال قائم کرڈالی۔''

☆ امیر حمزہ کوٹ ربنواز ملتان سے رقمطراز ہیں۔ ''مارچ کا شمارہ اپنی تمام تر رنگینیوں، رعنائیوں اور حشر سامانیوں کے ساتھ 25 فروری کو پلیٹ میں بجی کسی مزیدار ڈش کی طرح ملا جسے ہم ایک ہی دم کھانے کے حق میں بالکل نہیں ہیں بلکہ اسے ندیدوں کی طرح تھوڑا تھوڑا کر کے کھانے میں مزہ آتا ہے۔ بصورت دیگر 20 یا 25 دن ہمیں انتظار جیسی کوفت میں گزارنا پڑتا ہے جو ہمیں گوارا نہیں۔ فہرست میں نظر دوڑائی۔ سلمٰی اعوان کا نام نہ پا کر مایوسی ہوئی۔ سلمٰی اعوان صاحبہ ہماری فیورٹ رائٹر ہیں۔ ان کی ہر تحریر ذوق وشوق سے پڑھتے۔ اداریہ میں انکل کی باتیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کررہی تھیں۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی ''ناسور'' میں اس دفعہ بھی کافی ہنگامہ خیزی دیکھنے کو ملی۔ شاہ میر کی ہٹ دھرمی پر بہت غصہ آیا۔ 28 فروری کو معروف بولی ووڈ اداکارہ سری دیوی کی موت افسردہ کرگئی۔ سرانور فرہاد سے گزارش ہے کہ پلیز سری دیوی کے متعلق بھی لکھیں۔ ''تلاش'' پڑھتے ہوئے مجال ہے جو ہمارا دھیان اِدھر اُدھر ہوا ہو۔ زویا اعجاز کی کوئی بھی تحریر ہو اسے ایک ہی نشست میں پڑھنا ہم فرض اوّلین سمجھتے ہیں، ویلڈن زویا اعجاز ویلڈن۔ سچ بیانیوں میں ''شجرِ عشق'' پڑھتے ہوئے ایسا لگا جیسے ہم کوئی کالج رومانس پر مبنی فلم دیکھ رہے ہوں۔ ہیرو اور ہیروئن کے کردار افسانوی لگے، اس کے باوجود تحریر اچھا تاثر چھوڑ گئی۔ ''خالہ خالدہ'' بھی دلچسپ لگی۔ ''شہرِ خیال'' میں ''سیف خان'' کرسی صدارت پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔ مبارکاں جی۔ ندیم اقبال بھی امریکا سے حاضر تھے۔ کوثر اسلام نے ایک ایک تحریر پر کیا خوب تبصرہ کیا ہے۔ باجی سدرہ بانو ''شہرِ خیال'' میں ایڈمیشن لیے ہمیں دوسرا سال ہوگیا ہے مگر مجال ہے جو آپ نے اپنے کسی بھی خط میں ہمارا ذکر کیا ہو۔ شاید ''شہرِ خیال'' میں ہماری انٹری آپ کو اچھی نہیں لگی۔ عبدالجبار رومی انصاری یاد رکھنے کا بے حد شکریہ۔ رضا احمد اعوان کا تبصرہ دل دکھی اور آنکھیں نم کرگیا۔ ٹی وی آن کرتے ہی ہر روز اس طرح کی کوئی نہ کوئی خبر ہماری منتظر ہوتی ہے، قانونی اداروں کے ساتھ ہم پر بھی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اپنے اردگرد ہمیں سخت نظر رکھنی چاہیے اس طرح کے درندے ہر گلی محلہ میں پائے جاتے ہیں۔ غیر حاضر دوستوں میں روبینہ ثاقب، صائمہ نور، علی آتش اور فیروز علی عاجز ہیں اور ہاں رانا محمد سجاد مظفر گڑھ والے بھی کافی عرصہ سے غائب ہیں۔''

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی کورنگی کراچی سے مرقوم ہیں۔ ''تین ماہ کی غیر حاضری کو کسلمندی سے تعبیر کرکے درگزر کردیجیے۔

نقصان ہمارا ہی ہوا کہ ''مرگ ناگہاں نمبر'' کے تبصرہ نگاروں میں ہمارا نام نہ آسکا۔ جنید جمشید، طاہرہ نقوی، پروین شاکر، اظہار قاضی، سلطان راہی، منظار رفیع خاور، ارفع کریم، کرکٹر فل ہیوز، خلیل قیصر جیسی شاندار شخصیات اب ہم میں نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے لوگ مرگ ناگہاں کا شکار ہوئے۔ آپ نے خودکشی نمبر کے بعد دل کو چھو لینے والا کام کیا۔ خدا آپ کو ہمیشہ تندرست وتوانا رکھے۔ ''شہرِ خیال'' کے ساتھیوں میں سے ناصر حسین رند، اعجاز حسین لدھیانہ اور سیف خان پہلی سہ ماہی کے کپتان ثابت ہوئے۔ منشی محمد عزیز میمن نے تو کمال کردیا سال بھر کا ریکارڈ مرتب کرکے۔ فروری میں ابونصر فارابی، بروس لی، لارڈ بائرن، جمیل احمد، زخمی کانپوری، رابندر ناتھ ٹیگور محفوظ کررہے تھے۔ بھارت، بنگلہ دیش اور سری لنکا کے قومی ترانے ٹیگور صاحب کی نظموں سے اخذ کیے گئے۔ پڑھ کر حیرت کا پہاڑ تھا جو ہم پر ٹوٹ پڑا اور حیرت کی یہ ضرب ہمیں مارچ کا شمارہ کھولتے ہوئے تو اور بھی زیادہ محسوس ہوئی۔ جب ہم نے حضرت میاں میرؒ کا نام مبارک دیکھا۔ اللہ کے دوستوں سے ہماری انسیت ورغبت ہماری آلودہ زندگی کی جھاڑ پونچھ کا سبب بنتی رہتی ہے اور ڈاکٹر ساجد امجد اور ضیاء تسنیم بلگرامی اس کارِ خیر میں شریک ہوکر نہ صرف ہماری دعاؤں کے دائرے میں رہتے ہیں بلکہ سرگزشت کی مکمل انتظامیہ کے اجر وثواب کے لیے بھی ہم اپنے حصے کا فرض ضرور ادا کرتے ہیں۔ شہزادہ دارا شکوہ کی حضرت میاں میرؒ سے نیازمندی تو تاریخ کا حصہ ہے ہی ان کے علاوہ بھی سینکڑوں کرامات وکمالات اس سے ہٹ کر بھی تاریخ کے اوراق میں زندہ ہیں۔ ہمیں فیض کے اس سمندر سے جو قطرے ملے انہوں نے ہمارے اندر کی غلاظت دھونے میں بہت مدد کی جس نے اللہ کی انا میں اپنی انا کو فنا کیا وہ قابلِ ثنا ہوگیا۔ اللہ کا ہر ولی رفعنا لک ذکرک کی جیتی جاگتی مثال ہے لیکن جس نے اللہ کی انا کے آگے اپنی انا کی ثنا پڑھی وہ فنا ہوگیا۔''

☆ سید امتیاز حسین بخاری چک 36 سرگودھا سے لکھتے ہیں۔ ''ماہ مارچ 2018ء کا شمارہ سرگزشت طویل انتظار کے بعد 24 فروری کو بک اسٹال سے ملا۔ نئی آب وتاب سے مزین شمارہ دیکھ کر دل فرطِ مسرت سے کھل اٹھا۔ نظر کی کمزوری کی وجہ سے اپنے پسندیدہ چیدہ چیدہ صفحات پر سرسری نظر ڈالی اور پھر نیند کی آغوش راحت میں چلا گیا۔ سب سے پہلے آپ کا فکر انگیز اداریہ پڑھا۔ واقعی اس دور میں ہر نوجوان لڑکا لڑکی سیلفی کے جنون میں گرفتار ہے اور اسلامی اقدار کو بھول چکا ہے۔ ہر سو بے حسی ہی بے حسی کا ماحول ہے۔ اب وہ محبت ومروت اخوت بھائی چارہ عنقا ہوگیا ہے۔ ہم نے دین اسلام کی تعلیمات کو فراموش کردیا ہے۔ آگے صفحے پر ''ناصح'' پڑھا۔ شہنشاہ ہند اورنگزیب عالمگیر ایک چالاک کوا تھا جس نے حکومت کے لیے بزرگ والد شاہ جہاں کو قید کردیا اور بھائیوں سے جنگ کرکے ان کو قتل کردیا جو خاندان تیمور اور چنگیزیہ کی رسم نہ تھی۔ بابر ہمایوں سے لے کر شاہ جہاں تک گریٹ مغل اعظم جلال الدین اکبر اعظم نے جہانگیر کو اپنا جانشین بنایا مگر اس کے برعکس عالمگیر نے برادر کشی کی رسم بد کا آغاز کیا۔ فرقہ پرستی کو ہوا دی۔ امراسے جاگیریں واپس لے کر کلیدی عہدوں سے ہٹا دیا اور یہ مفلس غریب ہوگئے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی حکومت ہند پر مستحکم اور قائم رہی۔ اس سے آگے ''شہرِ خیال'' میں وفور مسرت سے داخل ہوا تو سیف خان کو مسندِ صدارت پر جلوہ افروز پایا بہت ہی بے پایاں خوشی ہوئی۔ میری طرف سے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مبارک باد ہو۔ ان کا خط واقعی متاثر کن تھا۔ میں نے ''شہرِ خیال'' کے باسیوں کا ہر خط پڑھا۔ واقعی سب نے متاثر کن خطوط لکھے ہیں جو ''شہرِ خیال'' کی جان اور آن ہیں۔ ندیم اقبال نے تو مجھے فراموش اور نظر انداز کردیا جب کہ میں اپنے ہر خط میں ہر قسط پر تبصرہ کرتا ہوں ان کی تحریر کی شیرینی شگفتگی پختگی کو سراہتا ہوں اور پسند کرتا ہوں۔ ظفر ندیم وہرہ حیدرآباد کی یادآوری کا شکریہ، عبدالجبار رومی انصاری قصور کا خاص طور پر شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے یاد کیا اور دل میرا شاد کیا۔ اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے اور میں یہاں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت کی دعا کرتا ہوں۔ ڈاکٹر ساجد امجد... حضرت میاں میرؒ کے حالاتِ زندگی احوال وآثار مفصل اور تفصیل سے لکھنے میں کمال حد تک کامیاب ہو گئے ہیں۔ بہت سی حیرت انگیز معلومات کا خزانہ انمول ملا ہے۔ فلم نگری میں ''بلبل بنگال'' انور فرہاد کی دلکش معلوماتی کاوش تھی۔ رونا لیلیٰ میری پسندیدہ گلوکارہ ہے۔ انور فرہاد نے ان کا خاندانی پس منظر نہیں لکھا۔ گیت نگاروں کے گیتوں کے ساتھ نام نہیں لکھے۔ تشنگی کا احساس باقی ہے۔ کلیم عثمانی اس گیت کے خالق تھے ''ان کی نظروں سے محبت کا جو پیغام ملا دل یہ سمجھا کہ چھلکتا ہوا اک جام ملا'' مشیر کاظمی اس گیت کے خالق تھے۔ ''دلعل میری پت رکھیو بلا جھولے لعلن سندھڑی دا سیہون دا سخی شہباز قلندر۔ علی دم دم دے اندر'' موسیقاروں کو تو انور فرہاد وقت دیتے رہیں لیکن شعراء کو نظر انداز کردیتے ہیں، ان کی حق تلفی کرتے ہیں حالانکہ شاعر خون جگر کر کے گیت تخلیق کرتے ہیں۔ بہرحال اپنی پسندیدہ گلوکارہ رونا لیلیٰ کے بارے میں انور فرہاد نے بھرپور اور قیمتی معلومات فراہم کی ہیں اس سے پہلے میں ان سے واقف نہیں تھا۔ میں ان کا شکر گزار ہوں۔ ''شجرِ عشق'' جو کہ سید سخاوت (امریکا) کی ایک زبردست اور روایت شکن رومانی وجارحانی داستان محبت تھی۔ میں نے دو نشستوں میں پڑھی۔ ہر نشست میں لطف دوبالا ہوتا چلا گیا۔ ان کے قلم کی سحر آفرینیوں اور جادو بیانیوں نے بہت زیادہ متاثر کیا۔ یہ کہانی اوّل نمبر پر ہے۔ اس کے بعد ''پچھتاوا'' پڑھی جو قضہ خان ہری پور کی کاوش تھی۔ بیٹیاں اللہ کی رحمت ہوتی ہیں اور بیٹے اللہ تعالیٰ کی نعمت ہوتے ہیں۔ بیٹی اور بیٹا پھول ہوتے ہیں جن کی بھینی بھینی خوشبو

سے والدین کے دل خوش اور دماغ معطر ہو جاتے ہیں۔ کاش والدین کے لیے ہر بیٹی رحمت ثابت ہو اور بیٹا نعمت۔ یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے کہ آپ اس کہانی کو اوّل یا دوسرے نمبر پر قرار دیں۔ ''مزار بیکسی'' زین مہدی کی ایک ادبی تاریخی تحقیقی کاوش ہے جو قیمتی معلومات سے بھرپور ہے۔ سراج الدین ظفر بہادر شاہ پر اتنی بیش بہا معلومات فراہم کی گئی ہیں جو واقعی عظیم کارنامہ ہے۔ ظفر ایک عظیم اور منفرد شاعر غزل گو تھے۔ باقی اس بار ''بیت بازی'' میں 99 فیصد اشعار اعلیٰ، معیاری اور بحر وزن کے مطابق تھے اور علم عروض پر پورا اترتے تھے۔ ''علمی آزمائش'' اپنے جوبن پر تھی۔ نئے نئے درست جواب دینے والے پرانے جواب درست دینے والوں کے ساتھ شامل ہو رہے ہیں اور اپنے اپنے علاقے کی نمائندگی کر رہے ہیں اور شہرت دے رہے ہیں۔ یہ خوش آیند بات ہے۔ سوغات پارچے جو قارئین، ادارہ دنیا بھر سے مختلف موضوعات پر معلوماتی انکشافاتی پارچے جمع کر کے شائع کرتا ہے اور ان پر تو کوئی بھی ''معبرِ خیال'' کا دوست تبصرہ نہیں کرتا ہے۔ اس بار پروفیسر سید احمد شاہ پطرس بخاری، پطرس کے مضامین اور سید محمد قاسم خاک میں پنہاں صورتیں کے اقتباسات سارے سرگزشت پر چھائے ہوئے تھے، سرگزشت کی شان بڑھا رہے تھے۔ قدیم اور جدید مرحوم شعراء وادباء کے بارے میں بھرپور معلومات حاصل ہوئی ہیں جو کہ ایک قیمتی خزانہ ہے۔ آپ کا حسن انتخاب قابلِ داد و تحسین، محنت شاقہ اور عرق ریزی قابلِ تعریف و توصیف ہے جس نے سرگزشت کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ مقبولیت و شہرت کے عروج پر پہنچا دیا ہے۔ یہ آپ پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی احسان اور فضل و کرم ہے۔ اللہ اپنا فضل جسے چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے۔''

☆ ناصر حسین رند، بہاولپور سے شریکِ محفل ہیں۔ ''سیلفی کہانی واقعی ایک عبرت انگیز کہانی تھی اس کے بعد۔ یک صفحی سرگزشت میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر جیسی شخصیت پر مختصر آپ بیتی بھی کیا کمال تھی لیکن آپ سے گزارش ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک مکمل سرگزشت لکھی جائے۔ ''معبرِ خیال'' میں کوئٹہ سے سیف خان صدارت پر موجود تھے۔ ان کو مبارک باد پیش کرتے ہیں دوسرے نمبر پر۔ سرگزشت کے پرانے قاری اور ''معبرِ خیال'' کے تبصرہ نگار ایاز راہی صاحب کافی عرصے بعد اپنی محبت ''معبرِ خیال'' پر نچھاور کر رہے تھے، ویل کم ایاز راہی۔ رانا محمد شاہد اپنی والدہ محترمہ کی جدائی کے بعد بہت ہی کم ''معبرِ خیال'' میں نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی پریشانی دور فرمائے، (آمین)۔ ندیم اقبال جیسے بڑے رائٹر کا ''معبرِ خیال'' میں شامل ہونا۔ ہمارے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ کوثر اسلام بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ ویری گڈ تبصرہ اور پُراسرار اور وحشت ناک تحریروں کی مداح سرائی کر رہے تھے۔ اعلیٰ تبصرہ۔ سدرہ بانو ناگوری ''معبرِ خیال'' کو رونق بخش رہی تھیں۔ ہمارے دوست اور بھائی منشی محمد عزیز مے بھی ''معبرِ خیال'' کی رونق بڑھا رہے تھے۔ پُراسرار اور خوفناک کہانیوں کی فرمائش کرتے نظر آرہے تھے۔ عبدالجبار رومی انصاری، شکریہ جناب ہمیں یاد کیا، لیجیے ہم حاضر ہیں۔ شاہد ذوالفقار بھی پراسرار اور تجسس سے بھرپور کہانیوں کو پسند فرما رہے تھے۔ لیکن اس ماہ بھی پراسرار سچی کہانی نہ تھی۔ حصہ اوّل سے ''آتشی موت'' ایک پراسرار اور خاصے کی چیز تھی، واقعی لاجواب تحریر تھی۔ ''مزار بے کسی'' آخری تاجدار شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کی سرگزشت پڑھنے کا مدت سے انتظار تھا جو کہ آپ نے آخر پورا کر ہی دیا۔ بہت بہت شکریہ۔ ''پچھتاوا'' فضہ خان کی ایک لاجواب تحریر تھی جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہوگی۔ آج کل کی لڑکیوں کے لیے نصیحت آموز تحریر ہے اور زبردست میسج پوشیدہ ہے۔ ویل ڈن فضہ خان۔ ''اس پار'' کشمیر کی سرحد پر رونما ہونے والا واقعہ۔ ظلم کی داستان ہمیں آخر میں افسردہ کر گیا۔ منظر نگاری اور کہانی نگاری زبردست تھی۔ ''خالہ خالدہ'' فہمی فردوس صاحبہ نے مختصر تحریر لکھ کر کمال کر دیا اور خالہ خالدہ نے ایک ہی گھر دو شوہر رکھ کر کمال کر دیا۔ آخری کہانی ''قاتل لکیر'' کی جتنی تعریف کی جائے وہ کم ہوگی۔ محترم یاسین صدیقی کی کہانی کی شروعات ایسی لگیں جیسے سعادت حسن منٹو کو پڑھ رہے ہیں اور آدھا آخری حصہ سسپنس تجسس سے بھرپور تھا۔ وہ ایسا لگا جیسے محی الدین نواب کو پڑھ رہے ہیں۔ عبدالجبار رومی کے والد اور نزاہت افشاں کی والدہ کی وفات پر تعزیت۔ ہم سب ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔''

☆ ندیم اقبال کا ای میل امریکا سے۔ ''قارئین سرگزشت کا شکر گزار ہوں کہ وہ مسلسل میری حوصلہ افزائی کر رہے ہیں، خاص کر کوثر اسلام، صوابی۔ منشی محمد عزیز مے، لڈن۔ عبدالجبار رومی، رضا احمد اعوان، اعجاز حسین سٹھار، عمران جونانی، قیصر خان، ظفر ندیم وہرہ، نزاہت افشاں، خالد شیخ طاہری، اعجاز حسین لدھیانہ، سیف خان، شبینہ گل، ایمانے زارا شاہ، رانا محمد شاہد، عبدالحکیم ثمر، سدرہ بانو ناگوری، رضا احمد اعوان، محمد احمد رضا انصاری، انجم فاروق ساحلی، ناصر حسین رند، شاہد ذوالفقار اور دیگر احباب جن کا نام اس وقت ذہن میں نہیں آرہا ہے ان سب کا میں تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ وہ میری کاوش کو سراہ رہے ہیں۔ قارئین کا فیڈ بیک ہی مجھے مہمیز کرتا ہے۔ اب آتا ہوں اس ماہ کے شمارے پر، ڈاکٹر ساجد امجد سینئر قلم کار ہیں۔ ان کے قلم کا جادو حضرت میاں میرؒ کے سوانح کی شکل میں سامنے آیا۔ ''تلاش'' از زویا اعجاز نے دل کو چھولیا۔ خوب لکھ رہی ہیں اور لگتا ہی نہیں کہ وہ نئی لکھنے والی ہیں۔ ''مزار بے کسی'' نے تاریخ کے ان دریچوں میں گھسیٹ لیا جب مسلمانوں کا اقتدار ڈول رہا تھا۔ گو کہ یہ تحریر بہادر شاہ ظفر پر ہے لیکن طمانچہ ہے ان غداروں کے منہ پر جنھوں نے اپنے مفاد کی خاطر انگریزوں کا ہمیں غلام بنایا۔ کاش یہ غداران وطن بخت خان کا ساتھ دے دیتے تو ہند کی تاریخ بدل جاتی۔ ''بلبلِ بنگال'' بھی پسند آئی۔ رونا لیلیٰ کی فسوں ساز آواز سماعت میں گونجنے لگی۔ فضہ خان کا ''پچھتاوا'' بھی زبردست رہی۔ ''اس پار'' بھی اچھی لگی۔ دیگر سچ بیانیاں بھی اچھی تھیں۔''

☆ زاہد شیخ کا ای میل بیڈفورڈ (یوکے) سے۔ ''ہر بار سوچتا ہوں کہ ''معبرِ خیال'' میں اپنا خط بھی دیکھوں لیکن یہاں تک پہنچنے میں سرگزشت آٹھ سے دس دن لگا دیتا ہے پھر اسے پڑھنا اور پڑھ کر تبصرہ لکھنا وقت طلب کام ہے اس لیے ہر بار یہ کام اگلے پرچے پر ٹال دیتا ہوں۔ اس بار جلدی پرچہ موصول ہو گیا تو لکھنے کی ہمت جمع کر لی۔ حضرت میاں میرؒ پر تحریر بہت پسند آئی۔ ڈاکٹر ساجد امجد کا شکریہ۔ ''تلاش'' بھی خاصے کی چیز ہے۔ شکریہ زویا اعجاز، انہوں نے میری پسندیدہ شاعرہ کے حالات کو کہانی کی شکل دی۔ ''مزار بے کسی'' بھی مزہ دے گئی۔ رونا لیلیٰ کی آواز میں جادو ہے۔ ''بلبلِ بنگال'' پڑھ کر اس کے گانے کانوں میں گونج اٹھے۔ لعل میری پت رکھیو بھلا گا کر انہوں نے خود کو زندہ جاوید کر لیا ہے۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' کی کیا ہی بات ہے۔ خوب مزہ دے رہا ہے۔ سفرنامہ کی شکل میں رومان پڑھنے کو مل رہا ہے۔ سچ بیانیوں میں ''پچھتاوا'' از فضہ خان بہت پسند آئی۔ ''شکست'' اور ''اس پار'' بھی اچھی لگی۔ نوحہ، گناہ بے لذت، شجرِ عشق بھی اچھی لگی۔ ''قاتل لکیر'' کا موضوع پسند نہیں آیا۔ خطوط میں سیف خان، کوثر اسلام کا تجزیہ پسند آیا۔''

☆ آفتاب احمد، مظفر گڑھ سے لکھتے ہیں۔ ''اس بار کا شمارہ نت نئے موضوعات کی وجہ سے بہت پسند آیا۔ سچ تخیلی کہانیوں سے زیادہ دلچسپ ہے۔ سچے قصے پڑھنے میں زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ ''تلاش'' پڑھ کر دل دکھ سے بھر اٹھا۔ اتنی بڑی شاعرہ اور ایسی غم زدہ زندگی۔ شاعر اردو کا ہو یا کسی اور زبان کا، دکھ درد اس کی زندگی کا حاصل ہوتے ہیں۔ ''مزار بے کسی'' بھی اسی کی کڑی ہے۔ شہنشاہ ہند بہادر شاہ ظفر ایک بہت بڑے شاعر تھے۔ شاید اسی لیے ان کی زندگی میں اتنے غم تھے، سچ بیانیوں میں ''پچھتاوا'' نے بہت مزہ دیا۔ ''شکست'' اور ''اس پار'' بھی اچھی لگیں۔ ''شجرِ عشق'' بھی اچھی لگی۔ ابھی بہت سی تحریریں پڑھ نہیں سکا ہوں اس لیے باقی تبصرہ باقی رہا۔''

☆ نازلی نازیہ کی آمد ملتان سے۔ ''اس بار کا شمارہ وقت پر موصول ہو گیا۔ سیف خان کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ خوب لکھا ہے۔ ان کے تبصرے کی روشنی میں کہانیوں کو دوبارہ سے پڑھا تو لطف دوبالا ہو گیا، ویلڈن سیف۔ اسی طرح آتے رہیں۔ ایاز راہی کا تبصرہ بھی اچھا لگا۔ رانا محمد شاہد کے تبصرے کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ وہ مختصر الفاظ میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ عبدالحکیم ثمر ہمیشہ سے بہت اچھا تبصرہ کرتے ہیں۔ ندیم اقبال تو الفاظ سے کھیلتے ہیں، اتنے بڑے قلمکار کو اپنے درمیان پا کر دل خوش ہو جاتا ہے۔ ان کا سفرنامہ گویا سرگزشت کی جان ہے۔ مجھے تو بہت پسند آرہا ہے کہ یہ سفرنامہ دیگر سفرناموں سے ہٹ کر ہے۔ کوثر اسلام نے بھی تبصرے کا حق ادا کر دیا۔ خوب لکھا ہے۔ سدرہ بانو ناگوری اس انداز سے تبصرہ کرتی ہیں کہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ رضا احمد اعوان نے بھی خوب خوب تبصرہ کیا ہے۔ احمد رضا انصاری کا خط بھی اچھا لگا۔ اعجاز حسین سٹھار سینئر تبصرہ نگار ہیں اس لیے ان کا ہر لفظ نگینے کی طرح جڑا ہوتا ہے۔ منشی عزیز مے نے بھی ہر بار کی طرح بھرپور تبصرہ لکھا ہے۔ عبدالجبار رومی انصاری اور شاہد ذوالفقار بھی بہترین تبصرہ نگار ہیں۔ ناصر حسین رند کا تو کہنا ہی کیا؟ وہ اتنی باریک بینی سے تبصرہ کرتے ہیں کہ پسند آتا ہی آتا ہے۔ سچ بیانیوں میں پچھتاوا، شکست، اس پار، نوحہ، خالہ خالدہ، شمشال سے ٹورنٹو بہت پسند آئی۔''

☆ مجاہد علی ترمذی، ملتان سے تشریف لائے ہیں۔ ''سرگزشت ہمیں صرف اس لیے پسند ہے کہ عام ڈائجسٹ وقت ضائع کرتے ہیں لیکن سرگزشت علم کی باتیں، معلومات اور زندگی سنوارنے والی کہانیاں دیتا ہے۔ میرے ابو، امی اور بھائی جان بھی اسے دلچسپی سے پڑھتے اور کہتے ہیں کہ اسے ہر طالب علم کو پڑھنا چاہیے تاکہ اس کا آئی کیو بڑھے۔ معلومات کا ذخیرہ بڑھتا رہے۔ ''مزار بے کسی'' مجھے بہادر شاہ ظفر پر مضمون لکھنے میں کام آیا۔''

تاخیر سے موصول خطوط

احمد جاوید، سلطان احمد، نازلی (کراچی)۔ یٰسین احمد (حیدرآباد)۔ فرحت ہمایوں (لندن)۔ باقر حسین (لاہور)۔ ذیشان تبسم (فیصل آباد)۔ رعنا فاطمہ (جھنگ)۔ عباس زیدی (چنیوٹ)۔ فقیر غلام سائیں (سکھر)۔ اسماعیل رند (ملتان)۔ حسن خان حسن زئی (ڈی آئی خان)۔ نرگس شاہ، امداد علی شاہ (خان پور)۔ اکبر علی (شیخوپورہ)۔ شاہد عباسی (نیو ہالہ)۔ ملک ممتاز (رحیم یار خان)

سرگزشت کے شمارہ مارچ 2018ء میں ''اقتدار'' کے عنوان سے بلال شیخ کی ایک سچ بیانی شائع ہوگئی۔ پرچہ شائع ہونے سے قبل کہانی پر درج فون نمبر سے بلال شیخ کو بتایا گیا کہ آپ کی تحریر اس شمارے میں جارہی ہے اس لیے اپنا مکمل پتا ایس ایم ایس کردیں تاکہ اعزازیہ منی آرڈر کیا جاسکے۔ موصوف نے اپنا پتا تو بھیج دیا لیکن نہیں بتایا کہ یہ کہانی ایک دوسرے پرچے میں چھپی ہوئی ہے۔ ان کی اس حرکت کی وجہ سے ہر نیا لکھنے والا مشکوک ہو جائے گا اس لیے ان پر پابندی لگائی جارہی ہے۔

بجیا

ڈاکٹر ساجد امجد

قیامِ پاکستان کی جدوجہد شروع ہوئی تو اس کا خاندان صفِ اوّل میں تھا۔ مسلمانانِ ہند کی اس جدوجہد کا ثمر پاکستان کی صورت میں ملا تو ان کے خاندان نے جاگیریں، عہدے، شان و شوکت سب پر لات ماردی اور ہجرت کر آئے لیکن جب اس نئی مملکت میں پہنچے تو کچھ ایسا منظر تھا، بجھے چراغ، اداس فضا، شبِ تاریک، موج بلا،لیکن حب الوطنی کے جذبے سے سرشار اس خاندان نے حوصلہ نہ ہارا اور تعمیر وطن میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے جدوجہد میں شامل ہو گیا۔ ہر ایک نے اپنے اندر کے علم و فن کو صیقل کیا اور شہرت کے اوج پر پہنچ گیا۔

جہدِ مسلسل کی عملی تصویر، جگت بجیا کی داستانِ زیست

اندازہ تو یہی تھا کہ بیٹا ہوگا۔ تجربہ کار آنکھوں نے یہی نوید سنائی تھی۔ دلوں میں یقین نے ایسی چھاؤنی ڈالی تھی کہ ہونے والے لڑکے کا نام تک تجویز کرلیا گیا تھا لیکن قدرت کے کاموں میں کس کا دخل۔ جب وقت آیا تو سارے اندازے، تمام تجربے الٹے ہو گئے۔ مبارک سلامت کے شور میں بیٹی کی پیدائش ہوئی۔

والد قمر مقصود حمیدی اور نانا سید نثار احمد نواب نثار یار جنگ بھی گھر پہنچ گئے۔ دونوں کی سواریاں ایک ساتھ کوٹھی کے باہر آ کر ٹھہری تھیں۔ ابھی ڈیوڑھی میں قدم رکھا تھا کہ ملازمائیں دوڑی چلی آئیں۔ دونوں حضرات کی جیب میں جو کچھ تھا ان خادماؤں پر نچھاور کر کے صحن میں قدم رکھا۔

رئیسوں کا گھر تھا۔ نوابوں کی زندگی تھی۔ سونے کے کڑے بنوا کر خادماؤں کو دیے گئے۔ کئی دن تک لنگر کی طرح کھانا تقسیم ہوتا رہا۔ جب ذرا مبارک بادوں کا شور تھما تو نومولودہ کے نام پر غور ہوا۔ لڑکا ہونے کی اُمید پر والد کے نام کی مناسبت سے امیر مقصود نام تجویز کرلیا گیا تھا لیکن اب تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ نئے سرے سے غور شروع ہوا۔ کئی نام زیرِ غور آئے اور بالآخر قیصر نام تجویز ہوا اور مذہبی نام فاطمہ زہرا رکھا گیا۔ یہ نام نانا نے رکھا تھا لیکن نانی کچھ اور سوچے بیٹھی تھیں۔ ”ہم تو ثریا نام رکھیں گے۔“

”بھئی وہ کیوں۔ ثریا نام میں ایسی کیا خاص خوبی ہے۔“

”یہ نام ہم نے ملکہ افغانستان ملکہ ثریا سے مستعار لیا ہے۔ ان کے جاہ و جلال کے افسانے ہندوستان تک پہنچے ہیں۔ صورت شکل بھی بے مثال پائی ہے۔ ہم تو ثریا ہی کہہ کر پکاریں گے۔ اب جس کو جو نام رکھنا ہے وہ رکھ لے۔“

”اچھا ایسا کرتے ہیں ثریا کے ساتھ مذہبی نام فاطمہ بھی شامل کیے لیتے ہیں یعنی فاطمہ ثریا۔ کیا خیال ہے آپ کا؟“

”تجویز تو آپ کی اچھی ہے، فاطمہ ثریا پکارنے میں بھی اچھا لگتا ہے۔ باپ کے ساتھ مناسبت بھی ہوگئی۔ قمر کے ساتھ ثریا کا جوڑا اچھا ہے۔“

اس دن کے بعد سے یہ بچی فاطمہ ثریا ہو گئی۔ کسے معلوم تھا کہ یہ بچی ایک دن فاطمہ ثریا بجیا کے نام سے دنیائے ادب میں زندہ رہے گی۔

☆......☆

یہ خاندان گھرانا کم، کتب خانہ زیادہ تھا۔ علوم وفنون کا خزینہ تھا۔ امارات وثروت کے باوجود اس خاندان کا ہر فرد مذہبی روایات پر عمل پیرا تھا۔ تعلیم وتربیت پر خاص طور سے زور دیا جاتا تھا۔

فاطمہ ثریا بجیا کو ننھیال اور ددھیال دونوں طرف سے علمی وادبی ماحول ورثے میں ملا تھا۔ فاطمہ کے والد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انگریزی میں گریجویٹ تھے۔ محکمۂ پولیس میں شوقیہ کام کیا لیکن بعد میں کاروبار کی طرف آگئے۔ والدہ کا یہ حال کہ اردو اور فارسی کی نثر نگار اور شاعرہ تھیں مگر اپنی تحریروں کو کبھی شائع نہیں کرنے دیا۔ نانا حیدرآباد کی ریاست میں چیف کمشنر رہے۔ ریاست حیدرآباد کی جانب سے ان کی سرکاری خدمات کے اعتراف میں انہیں نواب نثار یار جنگ کا خطاب دیا گیا تھا۔ شاعر بھی تھے اور مزاج تخلص کرتے تھے۔ داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ شاہی نوکری اور بے پناہ عزت ومرتبہ ہونے کے باوجود نہایت منکسر المزاج طبیعت کے مالک تھے۔ شاہانہ زندگی اور حکومتی مراعات کے باوجود یہ جملہ گویا ان کا تکیہ کلام بن گیا تھا کہ اپنا کام خود کرو۔ ان کے کتب خانے میں چالیس ہزار سے زیادہ کتابیں موجود تھیں۔ یہی کتب خانہ دوستوں کی بیٹھک بھی تھی۔ ہندوستان کے بڑے بڑے شاعران کے مہمان خانے میں آکر ٹھہرا کرتے تھے۔ کبھی مولانا حسرت موہانی میزبانی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں کبھی مولانا محمد علی جوہر آکر ٹھہرے ہیں۔ فانی بدایونی، ساگر نظامی، سروجنی نائیڈو بھی تو آیا کرتے تھے اور ہفتوں مہمان خانے کی زینت بڑھاتے تھے۔

ننھی فاطمہ ہوش سے بے خبر یہ ماحول دیکھ رہی تھی لیکن فطرت اسے متاثر ضرور کر رہی تھی۔ وہ بے خبر تھی لیکن اس کے بڑے بے خبر نہیں تھے۔

جب وہ ذرا بڑی ہوئی تو اس کی تعلیم کی فکر ہوئی۔ تربیت کے لیے تو گھر کا ماحول ہی بہت تھا لیکن تعلیم کے لیے گھر سے مدرسے تک کا سفر ضروری تھا۔ گھر کے قریب دو اسکول موجود تھے۔

حیدرآباد دکن بڑی ریاست تھی۔ اسکولوں کی کمی نہیں تھی لیکن فاطمہ کے نانا نہیں چاہتے تھے کہ ان کے نواسے نواسیاں اسکولوں میں پڑھنے والے نوابوں کے بچوں کی بری عادتیں اپنائیں لہٰذا یہ طے ہوا کہ تعلیم کا بندوبست گھر پر بڑوں کی نگرانی میں کیا جائے۔

نہ پیسوں کی کمی تھی، نہ تعلقات کی۔ بہترین اساتذہ کا انتظام ہو گیا۔ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی پڑھانے کے لیے علیحدہ علیحدہ ماسٹر گھر آنے لگے۔ میر عاشق علی قرآن پڑھانے کے لیے مقرر ہوئے۔ گویا گھر ہی میں اسکول کھل گیا۔ یہ اسکول صبح ساڑھے سات بجے سج جاتا تھا جب میر عاشق علی عربی اور قرآن پڑھانے آتے تھے۔ نو بجے فارسی اور انگریزی کے استاد آجاتے۔ ڈھائی بجے سے پانچ بجے تک انگریزی، اردو اور عربی کی خوش خطی جاری رہتی۔ شام ہوتی تو وہ نانا کے ساتھ ان کی لائبریری میں چلی جاتی۔ یہ لائبریری گویا اس کی تربیت گاہ تھی۔ یہاں وہ ادب، شاعری اور تاریخ بھی سیکھتی اور نانا کے دوستوں کی صحبت سے بھی فیض یاب ہوتی۔ عالمانہ گفتگو اس کے کانوں میں شہد گھولتی رہتی۔

چھ برس کی عمر میں وہ باقاعدہ کتابت سیکھ چکی تھی اور ایک کتاب کی کتابت کر کے انعام بھی حاصل کر چکی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اس کا منہ کھلا ہوا ہے اور وہ سب کچھ اپنے اندر انڈیلے جا رہی ہے۔ اس کے اس شوق کو دیکھتے ہوئے اس کی نانی نے اسے گھر گرہستی کے کاموں میں بھی طاق کرنے کا ارادہ کیا۔

”فاطمہ کے نانا، یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ فاطمہ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو رہی ہے لیکن لڑکیوں کو بالآخر پرائے گھر جانا ہوتا ہے۔ انہیں گھر گرہستی کے کاموں میں بھی طاق ہونا چاہیے۔“

”آپ بھی بڑی دور کی سوچ رہی ہیں۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔“

”لڑکیاں لوکی کی بیل کی طرح ہوتی ہیں۔ انہیں بڑھتے دیر نہیں لگتی۔ ہماری صغیرہ (فاطمہ ثریا کی والدہ) کو ہی دیکھ لو ہم نے چودہ سال میں اس کی شادی کر دی تھی۔“

”بھئی گھرداری کے معاملات آپ دیکھیں ہمیں کیا سروکار۔“

”دیکھنا تو ہمیں ہی ہے۔ ہم تو آپ سے اجازت مانگ رہے تھے۔“

”اس میں اجازت کی کیا بات ہے۔“

نانا کی طرف سے اجازت ملتے ہی نانی نے اس کی تربیت شروع کر دی۔ کھانا پکانا، سلائی، گھر سنوارنا، میزبانی کرنا غرض ہر فن کی تربیت شروع ہو گئی۔ پڑھائی کی طرح وہ ان کاموں میں بھی خوب دل لگا رہی تھی۔ امبرائیڈری سکھانے کے لیے ایک کرسچن خاتون ملازم رکھ لی گئی۔

انہی دنوں خبر آئی کہ حاجیوں سے بھرا پانی کا جہاز ڈوب گیا۔ جو لوگ تیرنا جانتے تھے وہ کسی نہ کسی طرح بچ نکلے۔ باقی لوگوں کا کچھ پتا نہ چلا۔

یہ حادثہ ایسا تھا کہ پورا ہندوستان سوگ میں ڈوب گیا۔ فاطمہ کے نانا کا بھی دل بہت دکھا۔ سوچنے لگے کہ اگر ہم میں سے کسی کے ساتھ یہ حادثہ گزرے تو کیا ہو۔ آنکھ کا تارا تو فاطمہ تھی۔ انہوں نے بیوی سے مشورہ کیا کہ فاطمہ کو تیراکی سکھائی جائے۔ فاطمہ کی نانی کے لیے یہ ایک بالکل نئی بات تھی انہوں نے ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔

”اوئی یہ کیا بات ہوئی اب لڑکیاں بھی تیراکی سیکھیں گی۔“

”فاطمہ کو جو سکھاؤ وہ سیکھ جاتی ہے۔ اسے تیراکی بھی آنی چاہیے۔“

”جو تمہاری مرضی۔“

فاطمہ کے نانا نے فوراً ایک ہندو خاتون کو مقرر کر دیا جو اسے تیراکی سکھانے لگی۔

آٹھ سال کی عمر میں اسے گھڑ سواری سکھائی گئی۔ نانا نثار احمد کے ایک دوست نواب نذیر جنگ بہادر نے اس کا یہ شوق دیکھا تو ایک گھوڑی اسے تحفہ کر دی۔ یہ گھوڑی پونا ریس کورس میں ہوئی تھی اور نہایت خوب صورت تھی۔

فاطمہ ثریا اور دوسری بہنوں کے لیے ایک کمرا مخصوص کر دیا گیا جس میں پورے ہندوستان کے ہر شہر کے تانبے، پیتل اور چاندی سے بنے برتن سجا دیے گئے تھے۔ ہر سائز کی دیگچی، چمچے، کٹورے، آفتابے وغیرہ رکھے گئے تھے۔ کھانا پکانے اور گھریلو ٹوٹکے سکھانے کا فرض نانی صغیرہ خاتون، پرنانی بسم اللہ خاتون، والدہ اور گھر کے خاص ملازم ادا کرتے تھے۔ برتنوں کا استعمال، کھانوں کی تراکیب، غذائیت اور صحت کے نسخے سکھائے جاتے تھے۔

ثریا بہت جلد کئی اقسام کے مربے، چٹنیاں اور دس بارہ اقسام کی روٹیاں بنانا سیکھ گئی۔

گھر میں بے پناہ لاڈ پیار اور دولت کے باوجود تربیت وتعلیم کے سخت اصول بھی تھے جنہوں نے فاطمہ ثریا کی شخصیت پر گہرا اثر ڈالا۔ گھر میں بناؤ سنگھار پر بالکل زور نہیں دیا جاتا تھا۔ کوئی ہلتا ہوا یا چمکتا ہوا زیور پہننے کا رواج نہ تھا۔ آواز دینے والے زیورات پہننا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ہاتھ پیروں پر مہندی یا کوئی اور رنگ لگانے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔

فاطمہ ثریا ہر کام میں آگے آگے تھی اس لیے سب اسے عزیز رکھتے تھے۔ نانا تو اس پر جان چھڑکتے تھے۔ ہر جگہ اسے ساتھ لے کر جاتے تھے۔ ایک روز وہ نواب علی بہادر جنگ کے گھر جانے لگے تو اسے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ اس نے پہلی مرتبہ ضد کی کہ فاطمہ صغرا (فاطمہ ثریا کی بہن) بھی اس کے ساتھ جائے گی۔ نانا کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ دونوں بہنیں ان کے ساتھ چلی گئیں۔ وہاں انہوں نے ایک بڑے پنجرے میں ڈھیروں پالتو طوطے اور دیگر پرندے دیکھے۔ اس سے پہلے اتنے پرندے ایک ساتھ انہوں نے نہیں دیکھے تھے۔

”باجی یہ پرندے کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔“ صغریٰ نے کہا۔

”ہاں ان کے رنگ دیکھو کتنے خوب صورت ہیں۔“

”ہمیں دیکھ کر کیسے خوش ہو رہے ہیں۔“

”ہم بھی تو کتنے خوش ہیں۔“

”کاش! ہمارے گھر میں بھی ایسے پرندے ہوتے۔“

”نانا سے کہہ کر ہم بھی ایسے پرندے منگوائیں گے۔“

”تم ہی کہنا، وہ تمہاری بات ضرور مان لیتے ہیں۔“

”میں ہی کہہ دوں گی گھر تو پہنچنے دو۔“

دونوں بہنیں خوش خوش گھر آئیں اور آتے ہی فاطمہ ثریا نے اپنی ضد ان کے سامنے رکھ دی۔

”نواب صاحب کے یہاں کتنے اچھے اچھے پرندے تھے۔“ فاطمہ ثریا نے کہا۔

”ہاں انہیں بہت شوق ہے پرندے پالنے کا۔“

”شوق تو ہمیں بھی ہے۔“

”تم کہنا کیا چاہتی ہو۔“

”یہی کہ ہمیں بھی ایسے پرندے لا دیجیے۔“

”پرندوں کو قید کرنا اچھی بات نہیں ہوتی۔“

”قید کہاں ہوں گے۔ پنجرہ بڑا ہوگا۔ اڑتے پھریں گے۔“

”پھر بھی آسمان جیسی وسعت تو نہیں ہوگی۔“

''اگر آپ کو پسند نہیں تو ہمیں بھی پسند نہیں۔'' فاطمہ ثریا نے کہا اور بات وہیں ختم ہوگئی۔

بات ختم ہوگئی تھی لیکن نانا پریشان ہوگئے۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ فاطمہ کی فرمائش کو ٹال رہے تھے۔ ایک دن تو وہ اپنی نصیحت پر قائم رہے لیکن پھر ایک دن فاطمہ سے کہا تیار ہو جاؤ ہم معظم جاہی مارکیٹ چلیں گے۔

''وہاں تو پرندے فروخت ہوتے ہیں۔''

''ہاں ہم تمہیں پرندے دلانے لے جارہے ہیں۔''

''آپ تو کہہ رہے تھے۔''

''لیکن اب ہم نے سوچا اپنی بٹی کو خوش کردیں۔''

وہ اسے لے کر معظم جاہی مارکیٹ پہنچے جہاں جانور اور پرندے فروخت ہوتے تھے۔ بڑے چاؤ سے ایک بڑا پنجرہ اور طوطوں کی ایک جوڑی خریدی گئی۔ اس پنجرے کو گھر کی چھت پر رکھ دیا گیا۔

دو چار دن جب فاطمہ ان طوطوں سے خوب کھیل چکی تو اس کے نانا نے کہا کہ دونوں بچیوں (فاطمہ ثریا اور بہن فاطمہ صغریٰ) کو علامہ اقبال کی نظم ''پرندے کی فریاد'' یاد کروائیں۔

''لو بھلا وہ کیوں، کیا انہیں کسی مقابلے میں جانا ہے۔''

''اس نظم میں قیدی پرندوں کے احساسات رقم ہوئے ہیں۔ بچیاں اس نظم کو پڑھیں گی تو انہیں احساس ہوگا کہ جن پرندوں کو انہوں نے پنجرے میں قید کیا ہے ان پر کیا گزر رہی ہوگی۔''

''اس سے کیا ہوگا۔''

''شاید اس طرح وہ انہیں آزاد کرنے پر تیار ہو جائیں۔ میں اگر کہتا تو وہ سمجھتیں نانا نے فرمائش پوری نہیں کی۔ اب خود احساس ہوگا تو الگ بات ہوگی۔''

یہ تھا ان کی تربیت کا انداز

نانی نے وہ نظم یاد کرانی شروع کی

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ

وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا

چند روز میں یہ پوری نظم اسے یاد ہوگئی۔ جب اس نظم کو بار بار پڑھا اور ذہن نشیں ہوگئی تو اس نظم میں چھپا درد بھی محسوس کیا، یہ احساس ہوا کہ پرندوں پر پنجرے میں قید ہونے کے بعد کیا گزرتی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی اسے ان طوطوں کا خیال آیا جو اس نے پنجرے میں قید کیے ہوئے تھے۔ وہ اسی وقت چھت پر گئی اور پنجرے میں رکھے طوطوں کی جوڑی کو بڑی دیر تک دیکھتی رہی۔ اسے یہ طوطے یاس و نا امیدی کی تصویر نظر آئے۔ اس نے سوچا اگر انہیں آزاد کردیا جائے تو یہ کتنے خوش ہوں گے۔ دوسرے طوطوں کے ساتھ مل کر کیسی دھومیں مچائیں گے۔ محض اپنے شوق کی خاطر کسی کو قید کرنا کوئی اچھی بات تو نہیں۔ وہ اسی وقت نیچے آئی اور اپنی بہن صغریٰ کو سارا ماجرا سنایا۔ اس پر بھی علامہ اقبال کی نظم کا وہی اثر ہوا تھا جس سے فاطمہ ثریا دوچار ہوئی تھی۔ دونوں بہنوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ پرندوں کو آزاد کردیا جائے لیکن اس فیصلے پر عمل کرنے سے پہلے نانا کو آگاہ کرنا ضروری تھا کیونکہ وہی یہ پرندے اس کی فرمائش پر دلا کر لائے تھے۔

''نانا جان ہم ان پرندوں کو آزاد کرنا چاہتے ہیں۔''

''کیوں لڑکی تم تو بڑے شوق سے لائی تھیں۔ اتنی جلدی جی بھر گیا؟''

''جب سے ہم نے علامہ اقبال کی نظم ''پرندے کی فریاد'' پڑھی ہے، ہمیں ان پرندوں پر رحم آنے لگا ہے۔ بے چارے کیا سوچتے ہوں گے کہ ہم نے انہیں قید کر رکھا ہے۔''

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ چلو ابھی آزاد کرتے ہیں۔''

''بس آپ کی اجازت کی ضرورت تھی۔''

دونوں بہنوں نے اسی وقت ان طوطوں کو آزاد کردیا۔ پنجرہ کھلتے ہی یہ طوطے اڑے، کچھ دیر ایک دیوار پر بیٹھے رہے اور پھر آسمان کی طرف اڑ گئے۔ فاطمہ ثریا اس وقت تک انہیں دیکھتی رہی جب تک وہ انہیں نظر آتے رہے۔

اس وقت اسے ایسی خوشی ملی تھی جو اس سے پہلے کبھی نہیں ملی تھی۔

ان پرندوں کے اڑ جانے کا اسے دکھ بھی تھا۔ وہ کئی دن چپ سی رہی اور پھر اپنی کتابوں میں مگن ہوگئی۔

اس نے اسکول کی شکل تک نہیں دیکھی تھی لیکن عربی، فارسی، اردو، ہندی پر اسے عبور حاصل ہوگیا تھا۔ گھر کے علمی و ادبی ماحول نے اس قابلیت کو اور بھی نکھار دیا۔ گھر میں ہر دیوار کے مختلف شیلف پر مختلف زبانوں کی ہر موضوع پر کتابیں موجود ہوتی تھیں۔ نانا کی لائبریری میں بھی ہزاروں کتابیں موجود تھیں۔ وہ بہت جلد شیکسپیئر.... کیٹس، البرونی،

ابن خلدون، میرتقی میر اور غالب کے ناموں سے بخوبی آشنا ہوگئی۔

اتنا کچھ پڑھ لینے کے بعد اسے شوق ہوا کہ وہ بھی کچھ لکھے۔ سوال یہ تھا کہ کیا لکھے۔ وہ بہت سے ناول پڑھ چکی تھی لہٰذا اسے بھی لازمی طور پر شوق ہوا کہ وہ بھی کوئی ناول لکھے۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ کوئی بھی کہانی لکھنے کے لیے کسی پلاٹ کی ضرورت ہوتی ہے، کوئی موضوع درکار ہوتا پھر کرداروں کے ذریعے اس پر عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ادب معاشرے کا آئینہ ہوتا ہے یعنی کہانی ایسی ہو جو معاشرے سے اخذ کی گئی ہو۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں کمیونزم کافی زور پکڑ رہا تھا اور مسلمان بھی اس سے متاثر ہو رہے تھے۔ اس نے اسی نظریے کو موضوع بنایا اور ناول لکھنے کا آغاز کردیا، اپنی تربیت کے مطابق اس ناول میں اس نے اسلامی اقدار اور اصلاحی پہلو پر بہت زور دیا۔ اس ناول کا نام اس نے ”ثوبیہ“ رکھا کیونکہ ذہن میں یہ تھا کہ مسلمان خواتین کو مخاطب کیا جائے۔

خاص بات یہ بھی تھی کہ اس وقت فاطمہ ثریا کی عمر صرف تیرہ سال تھی۔ تیرہ سال کی عمر میں افسانہ نہیں ناول لکھنا کمال ہی تو تھا۔

اس نے اس ناول کو مکمل کرنے کے بعد نانا کو دکھایا۔

”نانا جان، میں نے ناول لکھا ہے۔ چاہتی ہوں آپ اسے ایک نظر دیکھ لیں۔“

”ناول لکھا ہے؟ کیا واقعی۔“

”جی ہاں یہ مسودہ ہے اس ناول کا۔“

”مجھے تم سے امید تو ہے لیکن ناول لکھنا کوئی مذاق بھی نہیں۔“

”اسی لیے تو چاہتی ہوں آپ اسے ایک نظر دیکھ لیں اگر کسی قابل ہوا تو شائع بھی ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ اسے میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ فرصت ملتے ہی اسے دیکھ لوں گا۔“

فاطمہ ثریا کے جاتے ہی نواب صاحب نے مسودہ اٹھایا اور پڑھنا شروع کردیا۔ ارادہ تو یہی تھا کہ وقت گزاری کے لیے چند سطریں پڑھیں گے اور فرصت ملتے ہی پورا مسودہ پڑھیں گے لیکن ایک دو صفحے ختم کرتے ہی ایسے گم ہوئے کہ رات بھر میں پورا مسودہ ختم کرلیا اور صبح ہوتے ہی فاطمہ ثریا کو اپنے حضور طلب کرلیا۔ ”تم نے تو کمال کردیا۔ تم نے موضوع کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے۔ خاص طور پر کردار نگاری کا تو حق ادا کردیا۔“

”مجھے معلوم ہے آپ میرا دل رکھ رہے ہیں۔“

”جو سچ ہے وہ کہہ رہا ہوں۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ تمہاری پہلی تحریر ہے۔ تمہارے قلم کی پختگی دیکھ کر میں تو حیران ہوں۔ مجھے تو فخر ہے کہ ہمارے گھر میں ایسی مصنفہ طلوع ہوتی ہے۔“

”اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کسی قابل ہے تو اس کی اشاعت کا بندوبست فرمادیں۔“

”ایسے نہیں اس ناول کا ایک مقدمہ بھی لکھا جائے گا اور وہ ہم لکھیں گے اس کے بعد یہ شائع ہوگا۔“

”میں بھی یہی چاہتی تھی لیکن آپ سے کہنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔“

”یہ تمہارا حق ہے جو میں تمہیں دوں گا اور یہ نصیحت بھی کروں گا کہ اس ناول کو بچپن کا شوق سمجھ کر بھول مت جانا بلکہ قلم سے اپنا رشتہ کبھی نہ توڑنا، تمہیں جو صلاحیت قدرت نے عطا کی ہے اسے ہمیشہ نکھارتی رہنا۔“

”میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں۔“

”اور ہاں ایک بات اور ہے اگر تم اجازت دو۔“

”نانا جان، آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ میں نے آپ کا کوئی حکم ٹالا ہے۔“

”بھئی اس ناول کا نام ہمیں پسند نہیں آیا۔“

”آپ کوئی دوسرا نام تجویز فرمادیں۔“

”ہم نے تو اس کا نام مسلم سماج رکھ دیا۔“

”آپ بہتر سمجھتے ہیں۔“

”بس تو تم بے فکر ہو جاؤ۔ میں اس کی اشاعت کا بندوبست کردوں گا۔“

”ہم آپ کے شکر گزار رہیں گے۔“

”مسلم سماج“ کے نام سے یہ ناول شائع ہوگیا۔ رشید احمد صدیقی، جگر مراد آبادی اور عبدالماجد دریا آبادی جیسے اکابرین نے اس ناول کے ادبی جائزے تحریر کیے اور عرصے تک اخبارات میں اس ناول پر مضامین شائع ہوتے رہے۔

اس ناول کی اشاعت کے بعد یہ امید کی جاسکتی تھی کہ وہ کسی دوسرے ناول کا ڈول ڈالے گی لیکن وہ کسی ایک جگہ ٹھہرنے والی کب تھی۔

اس کے گھر میں دنیا بھر کے اخبارات و رسائل آتے

تھے۔ انہی میں حیدر آباد دکن سے نکلنے والا ماہنامہ ”پرچم“ اور الٰہ آباد سے نکلنے والا ”نئی زندگی“ بھی تھے۔ ان پرچوں میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مدن موہن مالویہ جیسے بڑے لوگ لکھتے تھے۔ وہ ان پرچوں کو پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچی کہ افسانے اور ناول پڑھنے سے اچھا ہے کہ علمی مضامین لکھے جائیں تاکہ اسے ان معتبر پرچوں میں جگہ مل سکے۔ گھر میں اقبال کا چرچا تھا لہٰذا پہلی نظر اس کی اقبال پر ہی پڑی۔ کتابوں کی کمی نہیں تھی۔ وہ کتابیں لے کر بیٹھ گئی اور جلد ہی ایک مضمون اقبال کے فلسفہ خودی پر تیار کرلیا۔ ایک مرتبہ پھر اسے نانا کے مشورے کی ضرورت پیش آئی۔ اس نے یہ مضمون نانا کی خدمت میں پیش کردیا۔ والدہ بھی فارسی اور اردو کی شاعرہ تھیں۔ انہوں نے بھی اس مضمون کو پسند کیا اور سفارش کی کہ اس کا یہ مضمون اشاعت کے لیے بھیج دیا جائے۔

اس کا یہ مضمون شائع ہوا تو اس کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ بڑی خوشی یہ تھی کہ اسے مولانا ابوالکلام کے ساتھ جگہ ملی ہے، اس ہمت افزائی نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ اس نے ایک مضمون اقبال کے دورۂ اسپین کے بارے میں لکھا۔ وہ بھی شائع ہوگیا۔ اب تو اس کے حوصلے بڑھتے چلے گئے۔ حوصلے کو پر لگ گئے۔ ہر مہینے دو مہینے میں ایک مضمون تیار ہو جاتا اور ان پرچوں میں جگہ پاتا۔

یہ ننھی مصنفہ اس راستے پر گامزن تھی کہ سیاست کی دبی آگ شعلہ بن گئی۔ پاکستان کے قیام کا مطالبہ زور پکڑتے پکڑتے فسادات کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ دل دہلا دینے والی خبریں آرہی تھیں۔ اس کا حساس ذہن ان معاملات کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا لیکن یہ خبر نہیں تھی کہ ایسا بھی ہوگا۔

جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا اس وقت فاطمہ ثریا کی عمر 17 برس تھی۔ انگریزوں کے تقسیم ہند کے قانون کے مطابق مختلف ریاستیں حکومت ہند میں ضم ہو رہی تھیں۔ حیدر آباد دکن بھی ایک ریاست تھی۔ اس کی خودمختاری کا بھی خدا حافظ تھا۔ بھرے پرے گھر میں اندیشے ٹہلنے لگے۔ ریاست ختم ہو تو نہ جانے ہم پر کیا بیت جائے۔ پاکستان کی محبت بھی اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ یہ خیال بھی آتا تھا کہ نئے ملک میں ہم پر نہ جانے کیا بیت جائے۔ یہاں کی نوابی زندگی پھر میسر آئے نہ آئے۔ نواب نثار یار جنگ کے دوستوں کو جب خبر ہوئی کہ وہ پاکستان جانے کا قصد کر رہے ہیں تو انہوں نے ان کو روکنا چاہا۔ ریاست حیدر آباد کے نئے حاکم، کے ایم منشی خود ان سے ملنے آئے اور انہیں طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر روکنا چاہا۔ فاطمہ کے نانا نے ایک شرط ان کے سامنے رکھی۔

”اگر آپ ہمارے خاندان کی بہو بیٹیوں کی جان و عزت کی ضمانت دے دیں تو ہم پاکستان نہ جائیں۔“

کے ایم منشی نے سر جھکا کر حقیقت حال بیان کردی۔ ”ہمارے پاس تو خود اپنے گھر کی عورتوں کی عزت و جان کی کوئی ضمانت نہیں۔“

”پھر آپ میرے جانے کا بندوبست فرما دیجیے۔ زندگی رہی تو آپ سے پھر ملاقات ہوگی۔“

سوانحی خاکہ

نام: فاطمہ ثریا

لقب: بجیا

والد: قمر مقصود حمیدی

والدہ: افسر خاتون

نانا: سید نثار احمد نثار یار جنگ

دادا: قاضی مقصود حسین حمیدی

بھائی: احمد مقصود، انور مقصود، عمر مقصود، عامر مقصود

بہنیں: صغرا کاظمی، سارہ نقوی، زہرا نگاہ، فاطمہ اسماء سراج، زبیدہ طارق

تاریخ پیدائش: یکم ستمبر 1930ء

وفات: 10 فروری 2016ء

پیدائش: حیدر آباد دکن

تدفین: کراچی

چند مشہور ڈرامے

شمع، آگہی، افشاں، عروسہ، انا، زینت، دریا کنارے، کچھ ہم سے کہا ہوتا، گھر ایک نگر، بابر، آخری غلطی، آب اور آئینے، فرض ایک قرض، ماسی شربتے، مٹی کا خمیر، التمش، سلسلے وفا کے، میری بھابی، میراث، حیات جاوید، انارکلی، چندن بھری صورتیں۔

اسٹیج ڈرامے

ذرا بچ، نشانِ منزل، خوشبو کا جھونکا، زبان یار من

اس دل خراش ملاقات کے بعد حیدر آباد دکن میں رہنے کا جواز ختم ہو گیا تھا۔ پاکستان جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ سامان اشیاء سے بھرا گھر اشیائے استعمال بے شمار۔ سب ختم ہوا۔ سارا سامان پرانے ملازموں کے حوالے ہوا۔

حاکم دکن نے چند محافظ ساتھ کر دیے تھے۔ ان محافظوں کی نگرانی میں یہ خاندان بذریعہ ریل بمبئی پہنچا۔ یہ قافلہ ایک دو نہیں سو افراد پر مشتمل تھا جن میں خاندان کے افراد کے علاوہ چار ملازم بھی تھے۔ گھر کے جو بزرگ افراد اس قافلے میں شامل تھے انہوں نے اپنے احباب اور ملازموں کو بمبئی کے دوستوں کے گھروں میں ٹھہرا دیا اور خاندان کے افراد ایک سرائے میں ٹھہر گئے۔

ڈمرہ نامی پانی کے جہاز کی روانگی کا انتظار تھا جس سے انہیں کراچی پہنچنا تھا۔

اس کے نانا تمام قیمتی اشیاء حیدر آباد دکن ہی میں چھوڑ آئے تھے لیکن اسّی ہزار کتابیں نہیں چھوڑ سکے تھے چنانچہ جہاز کی روانگی سے دو دن قبل کتابوں سے بھرے بے شمار لکڑی کے صندوق جہاز پر لادے جانے لگے۔ یہ صندوق جہاز کے عملے کے لیے حیرت کا باعث تھے۔ وہ سوچ رہے ہوں گے یہ کیسے لوگ ہیں جو سامان چھوڑ... کر کتابیں ساتھ لے جا رہے ہیں۔ بہر حال ترک وطن ہوئی۔

18 اکتوبر 1948ء کو یہ جہاز کراچی کے ساحل پر لنگر انداز ہو گیا۔

پاکستان آ کر یہ کتابیں تو حالی مسلم اسکول اردو کالج کو عطیہ کر دی گئیں اور سر چھپانے کے ٹھکانے کی تلاش میں زندگی نے پاؤں رکھ دیا۔

نواب نثار جنگ کا خطاب کہیں پیچھے رہ گیا تھا۔ اب فاطمہ ثریا کے نانا صرف سید نثار احمد تھے۔ اس کے والد قمر مقصود حمیدی حیدر آباد کے کچھ ممتاز لوگوں کے ہمراہ پہلے ہی کراچی پہنچ چکے تھے اور پیلس ہوٹل میں مقیم ہو کر خاندان کے دیگر افراد کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔

غلام محمد، پیر الٰہی بخش اور میر علی تالپور سے قمر مقصود حمیدی کے نہایت گہرے تعلقات تھے۔ پیر الٰہی بخش کے پاس کراچی میں بڑی جائیداد اور زمینیں موجود تھیں چنانچہ انہوں نے جمشید روڈ پر بنی کوٹھیوں کی پیشکش کی۔

”کئی وسیع و عریض کوٹھیاں خالی پڑی ہیں ان میں سے کوئی بھی الاٹ کرائے دیتا ہوں۔ اپنے خاندان کو لے کر بیٹھ جائیے اور نئی زندگی کا آغاز کیجیے۔“

”یہ کوٹھیاں یقیناً وہ ہوں گی جن کے مالکان ہجرت کر کے یہاں سے چلے گئے ہیں۔“

”یقیناً لیکن اب یہ حکومت پاکستان کی ملکیت ہیں۔“

”مجھے تو یہ گوارا نہیں ہو گا کہ میرا خاندان کسی ایسے گھر میں رہے جس کے مکین برے حالات میں اپنے بھرے گھر چھوڑ گئے ہوں۔“

”یہ کوئی جرم نہیں آپ کوئی غلط کام نہیں کریں گے۔ ان کے مکینوں نے بھی ہندوستان جا کر کسی نہ کسی گھر میں قیام کر لیا ہو گا۔ آپ ہامی تو بھریں میں پوری قانونی کارروائی کرا کے دوں گا۔“

”یہ مکان ان لوگوں کے لیے چھوڑ دیجیے جو ہندوستان سے لٹ پٹ کر آئے ہیں۔ ہمارے پاس اللہ کا دیا اتنا ہے کہ ہم کوئی بندوبست کر سکتے ہیں۔“

قمر مقصود حمیدی نے جمشید روڈ پر زمین خریدی اور وہاں تنبو لگا کر نئی زندگی کا آغاز کر دیا۔

برے دن اچھے لوگوں پر ہی آتے ہیں۔ حیدر آباد دکن میں بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر رہنے والے یہ افراد ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ بڑے بڑے گھر خالی پڑے تھے مگر انہوں نے کسی پر قبضہ نہیں کیا۔ زمین خریدی، ٹینٹ لگا کر رہے۔ پی آئی بی کالونی میں رہے۔ عسرت میں رہے۔ ہمت سے رہے اور خوب رہے۔

قیمتی املاک، نادر اشیاء، اعلیٰ عہدے اور انمٹ یادیں چھوڑ کر پاکستان آنا اور یہاں آ کے نئے سرے سے زندگی میں شامل ہونا آسان نہ تھا لیکن اتحاد کی ڈور میں بندھا یہ خاندان بالآخر اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔

مصائب سے ذرا فرصت ملی تو فاطمہ ثریا کو نانا سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا۔ اس نے قلم سنبھال لیا۔ اس وقت جو بھی اخبارات و رسائل میسر تھے ان میں اس کی کہانیاں، ناولٹ اور افسانے شائع ہونے لگے۔

اس نے بچپن ہی سے سنجیدہ موضوعات کو منتخب کیا تھا۔ پاکستان آنے کے بعد اس کے قلم میں مزید پختگی آ گئی۔ اس نے بعض ایسے موضوعات کو اپنی کہانیوں کا حصہ بنایا کہ پڑھنے والوں کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ لکھنے والی نوخیز لڑکی ہے۔ بات یہ تھی کہ وہ کم عمری ہی میں زمانے کے گرم و سرد کا سامنا کر چکی تھی اور کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کا بے پناہ مطالعہ اس کے قلم کو طاقت دے رہا تھا۔

پاکستان آنے کے دو سال بعد اس کے نانا سید نثار

احمد کا انتقال ہو گیا۔ ابھی وہ اس صدمے سے نکلی نہیں تھی کہ دو سال بعد اس کے والد قمر مقصود حمیدی کا بھی انتقال ہو گیا۔ پے در پے ایسے سانحے تھے کہ یہ خاندان سنبھلتے سنبھلتے پھر ڈگمگا نے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ چھوٹے بہن بھائیوں کی ذمہ داری اس پر آن پڑی ہے۔ اس نے ملازمت کی ٹھان لی۔ اس کے پاس کوئی ڈگری نہیں تھی۔ اسکول گئی ہی نہیں تھی۔ اس کی تمام تعلیم گھر پر ہوئی تھی۔ ایسے میں کہیں نوکری کی امید کیا کی جا سکتی تھی لیکن پھر بھی ایک موہوم امید کے ساتھ شہید ملت روڈ کراچی پر واقع پپی ہوم اسکول پہنچ گئی اور اپنا تفصیلی تعارف کرایا۔ اس وقت تک اس کا اتنا نام تو ہو ہی چکا تھا کہ اسکول کی انتظامیہ نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اسے درس و تدریس کی ذمے داریاں سونپ دی گئیں۔ چند ماہ یہاں گزارنے کے بعد اس نے این جے وی اسکول ایم اے جناح روڈ میں ملازمت اختیار کر لی۔ مختلف اسکولوں اور کالجز میں بطور آرٹ ٹیچر بھی خدمات انجام دیں۔

فاطمہ ثریا نے یوں تو باقاعدہ مکتبی تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن اس کے نانا کا گھر خود ایک کثیر الجہتی ملکیت تھا جہاں سارے ہندوستان سے ہر مکتبہ فکر کے علماء، سیاست داں، شاعر، نثر نگار، موسیقار، گلوکار جمع ہوتے تھے اور ہفتوں مہمان رہا کرتے تھے۔ ہزاروں کتابیں گھر میں تھیں، اخبارات و رسائل آتے تھے۔ اسی تربیت اور ماحول نے اسے ہزاروں ڈگری والوں سے زیادہ قابل بنا دیا تھا۔ اس کی یہی قابلیت ان تعلیمی اداروں میں اس کے کام آ رہی تھی۔

وہ اب شہر کے ادبی حلقوں میں پہچانی جانے لگی تھی۔ درس و تدریس کے ساتھ مختلف اخبارات و رسائل میں سلسلہ وار ناول اور افسانے بھی لکھ رہی تھی۔ اس کی چھوٹی بہن زہرا نگاہ فن شاعری میں اپنی پہچان منوا چکی تھی۔

یہ 1956ء کے آس پاس کا زمانہ تھا۔ دہلی میں یوم اقبال کے موقع پر مشاعرہ ہوا۔ اس مشاعرے میں زہرا نگاہ کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔ دعوت نامہ موصول ہوا تو زہرا نگاہ کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ اس نے بڑی بہن کو دعوت نامہ دکھایا۔

”ارے یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے تم پاکستان کی نمائندگی کرو گی۔ یہ کیا کم اعزاز ہے۔“

”اعزاز کی تو بات ہے لیکن بجیا میں اکیلے کیسے جاؤں گی۔ خبر نہیں پاکستان سے کوئی دوسری خاتون شاعرہ مدعو بھی ہے یا نہیں، معذرت کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ یہ مواقع بار بار نہیں آتے۔“

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں تمہارے ساتھ چلوں؟“

”کیوں نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ تیار ہیں تو......“

”ہم دونوں بہنیں ساتھ چلیں گی۔“

وہ زہرا کے ساتھ عازم سفر ہو گئی۔

دہلی میں مشاعرہ ہوا۔ زہرا نگاہ کی غزلوں نے دھوم مچا دی۔ زہرا کی غزلوں کی شہرت وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو تک بھی پہنچ گئی۔ انہوں نے پاکستان کے سفارت خانے کو حکم بھیجا کہ پاکستان سے آنے والی ان لڑکیوں سے ان کی ملاقات کرائی جائے اس حکم پر انہیں پاکستانی سفارت خانے پہنچا دیا گیا۔

پنڈت نہرو، فاطمہ ثریا کے نانا کو جانتے تھے۔ انہیں شاید کہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے اور پاکستان میں ان کے خاندان کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ انہوں نے کچھ دیر زہرا سے باتیں کیں۔ کچھ کلام سنا۔ فاطمہ ثریا سے ان کے مشاغل کے بارے میں پوچھتے رہے اور پھر اچانک ایک پیشکش کر دی۔

”پاکستان میں آپ پر کیا بیت رہی ہو گی اس کا مجھے اچھی طرح اندازہ ہے۔ حمیدی خاندان کی لڑکی اسکول میں ملازمت کرے یہ بات مجھے اچھی نہیں لگ رہی ہے۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے۔ میں چاہوں گا کہ آپ کا پورا خاندان واپس ہندوستان آ جائے۔ ہندوستان کے دروازے اب بھی آپ لوگوں پر کھلے ہوئے ہیں۔ ہندوستانی حکومت ہر طرح سے آپ لوگوں کا خیال رکھے گی۔“

”جناب آپ کی بڑی عنایت کہ آپ نے واپسی کے دروازے ہم پر کھول دیئے لیکن یہ فیصلہ ہم خود تو نہیں کر سکتے ہمیں اپنی محترم نانی اور والدہ کو پاکستان جا کر منانا ہو گا۔ جو کچھ وہ کہیں گی ہم وہی کریں گے۔“

اس واقعے کا علم فوراً حکومت پاکستان کو ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ فاطمہ اور اس کی بہن پاکستان واپس آتیں ارباب اختیار نے اس خاندان کو جمشید روڈ پر ایک فلیٹ عنایت کر دیا۔ اس سے پہلے فاطمہ ثریا کا خاندان پیر الٰہی بخش کالونی میں کرائے کے ایک چھوٹے سے گھر میں مقیم تھا۔

☆......☆

وہ ان دنوں پی ای سی ایچ ایس کالج میں بطور آرٹ ٹیچر ملازم تھی۔ کالج کی انتظامیہ نے کالج میں بزم غالب کا انعقاد کیا۔ بزم غالب کی انچارج فاطمہ ثریا کو بنایا گیا اور تمام انتظامات اس کے سپرد کر دیے۔ وہ زبردست انتظامی صلاحیتوں کی مالک تھی اور یہ کام تو اس کی ادبی تسکین کا باعث تھا۔ اس نے پورے ہال اور اسٹیج کو غالب کی غزل کے ایک شعر "سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں" کی مناسبت گلاب کے پودوں اور پھولوں سے سجایا۔ بزم میں شریک لڑکیوں کے لباس اور ہال کے ہر گوشے کو لالے کے پھولوں سے مزین کیا گیا اور پھر یہ غزل لڑکیوں نے پیش کی۔ اس کی کمپوزیشن خود فاطمہ ثریا نے کی تھی۔

مہمانِ خصوصی وفاقی وزیر اطلاعات خواجہ شہاب الدین تھے۔ ان کے ساتھ پاکستان اسمال انڈسٹریز کارپوریشن کے چیئرمین بھی تھے۔ انہوں نے یہ سجاوٹ دیکھی اور غالب کی غزل سنی تو اپنی تقریر میں بطور خاص دریافت کیا کہ اس غزل کی کمپوزیشن کرنے والا اور ہال کی سجاوٹ کرنے والا کون ہے۔ کالج کی پرنسپل بیگم آمنہ مجید ملک نے انہیں بتایا۔

"ایک لڑکی ہے جس نے یہ پورا پروگرام آرگنائز کیا ہے۔ عمر تو تیس سال ہے مگر کالج کا بوڑھا مالی بھی اسے بجیا کہتا ہے۔"

اسمال انڈسٹریز کارپوریشن کے چیئرمین جنرل شاہد حامد نہایت متاثر ہوئے اور اس سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ پرنسپل کے کمرے میں جنرل صاحب سے اس کی ملاقات کرائی گئی۔ جنرل شاہد حامد نے اس کی انتظامی صلاحیتوں اور ہنرمندی کی بڑی تعریف کی اس کا خاندانی پس منظر جان کر اور بھی زیادہ متاثر ہوئے اور اپنا کارڈ دے کر فرمایا کسی وقت آ کر مجھ سے ملاقات کرنا۔

اس نے اسے ایک رسمی کارروائی سمجھا۔ دو چار دن میں وہ بھول بھی گئی کہ اسے کوئی کارڈ ملا تھا۔ کئی دن گزر گئے تھے کہ ایک دن پرنسپل نے اسے کمرے میں بلایا۔

"جنرل شاہد حامد کا فون ہے آپ کے لیے۔"

"میرے لیے؟"

"جی۔"

جنرل صاحب فون پر اس سے اصرار کر رہے تھے کہ وہ ان کے دفتر میں آ کر ان سے ملے اور پھر دوسرے دن اسے لینے گاڑی آ گئی۔

"میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کی صلاحیتیں اس ملک کی ترقی کے لیے مستعار لی جائیں۔"

"میں کچھ سمجھی نہیں۔"

"ہم آپ کو پاکستان اسمال انڈسٹریز میں چیف ڈیزائنر کا عہدہ سونپ رہے ہیں۔"

"میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا لیکن......"

"میں آپ کی کوئی مجبوری نہیں سنوں گا۔"

اسے زبردستی اسمال انڈسٹریز کی چیف ڈیزائنر مقرر کر دیا گیا۔

وہ تو جس کام میں ہاتھ ڈالتی تھی اسے تکمیل تک پہنچا کر دم لیتی تھی۔ نفاست اور تن دہی اس کے مزاج کا خاصا تھا۔ یہاں بھی اس نے کام شروع کیا اور اس کی کوششوں سے دیکھتے ہی دیکھتے ملک بھر میں کئی اقسام کی چھوٹی بڑی صنعتیں وجود میں آ گئیں۔ مختلف فنون کے ماہر کاریگروں کو ان کے کام کی جانچ پڑتال کے بعد چھوٹے قرضے جاری کرنے کی اسکیم جاری کی، دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے کاریگر خود کفیل ہو گئے۔

پاکستان کے دور دراز علاقوں میں گمنام خواتین جو گل کاری کرتی تھیں اور بے نام تھیں۔ فاطمہ ثریا بجیا کی کوششوں سے ان کا ہنر دنیا میں متعارف ہوا اور ان کے لیے روزگار کے ذرائع پیدا ہوئے۔

کراچی کے مختلف علاقوں میں بنارسی کپڑے کے کاریگر جو در بدر پھر رہے تھے ان کو اکٹھا کر کے خیر پور میں ان کا مرکز منظم کیا۔ بیس ہزار کے لگ بھگ بنارسی کام کے کاریگر جمع کیے گئے جن کی شہرت سن کر بھارت سے بھی ماہر بنارسی ہجرت کر کے پاکستان آنے لگے۔ اس صنعت کو یہاں تک فروغ ہوا کہ پاکستان بنارسی کپڑا برآمد بھی کرنے لگا۔ بنارسیوں کی مستقل رہائش کے لیے کالونی بنوائی گئی اور سرکاری اسکول اور کلینک کا انتظام کیا گیا۔

اسی کی کوششوں سے اندرون سندھ ایرانی سطور (چاندی) سے بنی اشیا کے کارخانے لگائے گئے۔ بجیا نے مختلف علاقوں کی روایتی کڑھائی، دلی کی صنعت، سورتی کڑھائی غرض پاکستان میں جہاں جہاں بھی مثالی کڑھائی ہوتی تھی۔ اسے بڑے شہروں خاص طور پر کراچی کے شورومز میں متعارف کرایا۔

ان کاموں کی تکمیل کے لیے اسے پاکستان بھر کے دور دراز دیہات میں سروے کے لیے جانا پڑتا تھا بلکہ مہینوں وہاں رہنا پڑتا تھا جس نے اس کے مشاہدے کو وسیع کر دیا جسے وہ اپنی کہانیوں میں شامل کرتی رہی۔ ان تجربوں نے اس کے اندر کم عمری ہی میں ایک جہاندیدہ عورت کی پرورش کر دی۔ کردار ایسا رکھا کہ بجیا کے سوا کسی دوسرے نام سے کوئی پکارتا ہی نہیں تھا۔ اس وقت بڑی دلچسپ صورتِ حال پیدا ہو جاتی تھی جب اس سے بڑی عمر کے لوگ اسے بجیا کہہ کر پکارتے تھے۔

☆......☆

صدر ایوب کے دور حکومت میں ملکہ برطانیہ کوئن الزبتھ پاکستان کے سرکاری دورے پر آنے والی تھیں۔ ملکہ نے اس دورے میں پاکستانی دستکاریوں اور گھریلو سطح پر تیار مصنوعات کو دیکھنے کی فرمائش کی تھی۔ فاطمہ ثریا کو حکومتی سطح پر حکم ملا کہ ملکہ کو پیش کرنے کے لیے تحفے تیار کیے جائیں۔ اس حکم کے بعد وہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ اس نے جنوبی ایشیا کے مشہور دستی کام کو تیار کروانا شروع کر دیا۔ وہ ایسے تحفے تیار کرنا چاہتی تھی جو ملکہ کے شایانِ شان اور پاکستان کے نمائندہ ہوں۔ اس وقت وہ تربیت اس کے کام آ رہی تھی جو اس نے حیدر آباد دکن میں اپنے گھر میں حاصل کی تھی۔ بچپن ہی میں اس کی نانی نے اسے گھر سنوارنا، گل کاری، امبرائیڈری غرض ہر فن میں طاق کر دیا تھا۔

ان تحائف کی تیاری بھی وہ خود کر رہی تھی۔ اس کا تخلیقی ذہن مسلسل حرکت میں تھا۔ ایک دن وہ کوئنز روڈ کی ریلوے کراسنگ سے گزر رہی تھی۔ وہاں اسے پٹڑی پر ہرے رنگ کا درمیانے سائز کا پتھر نظر آیا۔ وہ سیدھی ڈرگ روڈ پہنچی۔ یہاں ماہر سنگ تراش بدرالدین رہتے تھے۔ اس نے وہ پتھر سنگ تراش کے سامنے رکھ دیا۔

"تم مجھے اس پتھر سے انگور کا ایک خوشہ بنا دو جو ماربل سے بنائے ہوئے ایک پتے پر رکھا ہو۔"

"اس پتھر کا انتخاب آپ نے خوب کیا۔"

"اس بحث کو چھوڑو۔ بس اب تم اپنا کام شروع کر دو اور جتنی جلدی ہو میرے پاس لے کر پہنچو۔" دو دن بعد وہ سنگ تراش اپنا شاہکار لے کر اس کے پاس پہنچا۔

"ہرے ماربل کے پتے پر انگور کا خوشہ رکھا ہوا تھا۔"

جو کام سنگ تراش نہ کر سکا تھا اس نے کر دکھایا۔ اس انگور کے خوشے کی شاخیں بنانے کے لیے تار پر کتھئی ریشمی دھاگا چڑھا کر انگور کی شاخیں اور ٹہنیاں بنا دیں۔ اب وہ خوشہ کسی شاہکار سے کم نہیں تھا۔

اب تمام تیاریاں مکمل ہو گئی تھیں۔ ملکہ برطانیہ کی آمد کے لیے پورے کراچی میں وزراء اور ان کی بیگمات ہفتوں سے تیاریوں میں مصروف تھیں۔ موسم بھی ٹھیک ٹھاک تھا لیکن عین آمد سے ایک روز قبل رات بارہ بجے بارش ہو گئی۔ چیف گیسٹ ہاؤس کے لان میں جو شامیانے استقبال کے لیے لگائے گئے تھے سب تہس نہس ہو گئے۔ گراؤنڈ میں بھی پانی بھر گیا۔ ایسے میں ملکہ الزبتھ کی میزبان تزئین فریدی کو اس کی یاد آئی وہ گاڑی میں سوار ہوئیں اور اس کے گھر پہنچ گئیں۔

"بی بی اب کیا کیا جائے۔ گراؤنڈ میں ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ ہے اور ملکہ کو صبح 9 بجے آنا ہے۔"

"بارش تو اب تھم گئی ہے۔"

"لیکن اتنی جلدی کیچڑ کیسے خشک ہو گی۔"

"چلیے میں چل کر دیکھتی ہوں کہ اب کیا ہو سکتا ہے۔"

اس نے چلتے چلتے اسمال انڈسٹریز کے عملے کو بھی طلب کر لیا۔ اس نے گراؤنڈ کا جائزہ لیا اور پھر ترکیب سمجھ میں آ گئی۔ ٹمبر مارکیٹ سے لکڑی کا بھوسا ٹرکوں میں لاد کر منگوایا گیا اور استقبالی گراؤنڈ میں بچھوا دیا۔ پانی خشک کرنے کے لیے بڑے بڑے ہیٹر لگا دیے۔ صبح صادق تک میدان خشک ہوا تو گیلی اور میلی دیواروں کو چھپانے کے لیے ان پر چیف گیسٹ ہاؤس کی اندرونی دیواروں کے پردے لگوا دیے اور استقبالیہ دروازے کے برابر میں سندھی کڑھائی کا ایک فریم لگوا کر اس کے نیچے وہی ہلکا سبز انگوری خوشہ ٹیبل پر سجا دیا۔ ابھی کام جاری تھا کہ سائرن بجنے لگے اس کا مطلب تھا ملکہ پہنچ چکی ہیں۔ اسے کچھ اور تو سوجھا نہیں دیوار پر لگے پردے کے پیچھے چھپ گئی۔ اس کی حالت یہ تھی کہ سفید ساڑی کیچڑ میں لت پت تھی۔ ہاتھ مٹی سے بھرے، بالوں میں بھوسا بھرا اور جوتے غائب۔ ایسی حالت میں وہ چھپتی نہیں تو اور کیا کرتی۔

ملکہ استقبالیہ دروازے پر آئی۔ وزراء کی بیگمات سے ہاتھ ملانے کے بعد وہ انگور کے خوشے کی طرف متوجہ ہوئی جو ایک ٹیبل پر رکھا اپنی بہار دکھا رہا تھا۔

"یہ کون سا پتھر ہے۔" ملکہ نے ایک بیگم سے پوچھا۔

اس سوال پر سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگیں۔ اس کا جواب صرف فاطمہ ثریا کے پاس تھا۔ اب پھر سب کو اس کی یاد آئی بوکھلاہٹ میں کسی نے پردہ اٹھایا اور اسے یا؛

نکلنا پڑا۔ ننگے پاؤں، سفید ساڑی پر کیچڑ کے دھبے۔ بال بکھرے ہوئے، سخت حکم ملا تھا کہ ملکہ سے ہاتھ ملاتے ہوئے ہاتھوں میں دستانے ضرور ہوں۔ ملکہ دستانوں کے بغیر کسی سے ہاتھ نہیں ملاتیں مگر اس وقت دستانے تو کجا ہاتھ صاف بھی نہیں تھے۔ اس نے اسی حالت میں ملکہ سے ہاتھ ملایا۔

ملکہ نے اپنا سوال دہرایا۔ ”یہ کون سا پتھر ہے۔“

”اس پتھر کا نام اونیکس ہے۔“

”یہ پتھر میں نے صرف اٹلی میں دیکھا ہے۔“ ملکہ نے بتایا۔

”یہ پتھر دراصل پاکستان کی پیداوار ہے جسے اٹلی برآمد کر کے میڈان اٹلی کہہ کر بیچا جا رہا ہے۔“

یہ ایسا انکشاف تھا کہ ملکہ اور اس کے وفد کی آنکھیں کھل گئیں۔

فاطمہ کی دانش مندی سے ملکہ کا استقبال درہم برہم ہونے سے رہ گیا۔

ملکہ تو اپنا دورہ مکمل کر کے پاکستان سے روانہ ہو گئیں لیکن ایک آئیڈیا فاطمہ ثریا کے ذہن میں چھوڑ گئیں۔ وہ کچھ دن بعد شیر شاہ کے صنعتی علاقے میں گئیں جہاں اونیکس کے پتھر بڑی بڑی چٹانوں کی شکل میں رکھے ہوئے تھے۔ یہ وہی پتھر تھا جو اٹالین ماربل کے نام سے دنیا بھر میں مشہور ہو رہا تھا۔ یہ پتھر خام حالت میں باہر نہ بھیجا جائے بلکہ اس پتھر سے مصنوعات بنا کر باہر بھیجی جائیں تو ملک کو کتنا فائدہ ہو۔ وہ یہ سوچتی ہوئی وہاں سے چلی آئی۔ اس نے حکومت سے سفارش کی۔ اس کی سفارش پر صنعتیں قائم ہو گئیں اور وہ اونیکس پتھر جو اٹالین ماربل کے نام سے اٹلی برآمد کیا جاتا تھا اب پاکستان کی چھوٹی صنعت کے سنگ تراشوں کے ہاتھ آ گیا۔

ان پے در پے واقعات نے اس کی پیشہ وارانہ صلاحیتوں کی دھوم مچا دی تھی۔ ملکہ الزبتھ کے دورے کو اس نے جس طرح سنبھالا تھا اسے اخبارات نے خوب شہرت دی تھی لہٰذا جب راولپنڈی میں امریکی صدر جان الیف کینیڈی کی بیگم کے پاکستان آنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں اسے فون کر کے کراچی سے بلوایا گیا۔

ان دنوں اس نے منسٹری آف انڈسٹریز کے حوالے سے کراچی میں ایک عمارت میں ڈیزائن سینٹر بنایا تھا اور رات دن ایک کر کے کاٹیج انڈسٹریز کو یا تو ڈیزائن کر کے بنوا رہی تھی یا کارخانے کھلوا رہی تھی اور انہیں ڈیزائن کر کے سجا رہی تھی۔ جب اسے اسلام آباد بلوایا گیا تو وہ سب کام چھوڑ کر اسلام آباد آ گئی۔ یہاں ورکس کے وزیر جنرل شیخ نے اس سے ملاقات کی اور اس کے کام کی تعریف کی۔

”آپ کو معلوم ہوگا کہ مسز کینیڈی عنقریب پاکستان آنے والی ہیں۔ ان کے ٹھہرنے کے لیے بچن نو اس ریسٹ ہاؤس راولپنڈی کا انتخاب کیا ہے۔ ہم نے اس کی تزئین و آرائش کے لیے نہایت لائق خواتین کی ایک چالیس رکنی کمیٹی بنا دی تھی لیکن سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا اس ریسٹ ہاؤس کی آرائش تو ایک طرف رہی وہ اب تک جنگل کی طرح ویران پڑا ہے۔ اب مسز کینیڈی کے پاکستان آنے میں صرف چار مہینے رہ گئے ہیں۔ ہم یہ ذمہ داری آپ کو سونپنا چاہتے ہیں اس اعتماد کے ساتھ کہ آپ کے سوا کوئی اور یہ کام نہیں کر سکتا۔

کئی تحفظات کے باوجود وہ صرف اتنا کہہ سکی۔ ”سر، آپ کی بڑی عنایت کہ آپ مجھے اس اہم کام کی ذمہ داری سونپ رہے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو کوشش کروں گی۔“

وہ اس ریسٹ ہاؤس کو دیکھنے گئی تو اپنا سر پیٹ لیا۔ اس کے پاس صرف چار مہینے تھے اور اجڑا ہوا ریسٹ ہاؤس اس کے سامنے تھا۔ عمارت میں ایک بڑا باغ ضرور تھا لیکن جنگل کا سماں پیش کر رہا تھا۔ فرنیچر سب غارت ہو چکا تھا۔ عمارت میں بھی اچھی خاصی ٹوٹ پھوٹ ہو چکی تھی۔ اس نے عمارت کی ٹوٹ پھوٹ کی درستی کے لیے راج مزدور لگا دیے اور خود کراچی میں فرنیچر بنوانے لگی۔ فرنیچر، بستر، برتن، آرائش کی بیسیوں چیزوں کا انتخاب کیا۔ چاندی کا سامان، پھول دان، چاندی کی تھالیاں چائے کی ٹرے وغیرہ کراچی میں بن رہی تھیں۔

تین مہینے گزرے تھے کہ اجڑا ہوا ویسٹ ہاؤس خوب صورت دکھائی دینے لگا۔ اب باری تھی اجڑے ہوئے باغ کو سرسبز کرنے کی۔ باغ کے لیے اس نے لوہے کا فرنیچر بنوایا۔ لوہے کا فرنیچر اس سے پہلے باہر سے منگوایا جاتا تھا۔ یہ پہلی مرتبہ تھا کہ ایسا فرنیچر پاکستان میں بنا تھا۔

اسی عرصے میں ذوالفقار علی بھٹو وزیر خارجہ بن گئے۔ سجاوٹ کے بعد اس ریسٹ ہاؤس کو وزیر خارجہ کے حوالے کرنا تھا لہٰذا حوالگی سے قبل وہ معائنہ کرنے کے لیے آئے۔ ایک ایک چیز کی تعریف کرتے رہے۔ فاطمہ ثریا اسے ایک ایک چیز کی تفصیل بتاتی جا رہی تھی۔ جب وہ باغ میں پہنچے تو لوہے کے فرنیچر کو دیکھ کر سخت حیران ہوئے۔

”یہ آپ نے باہر سے امپورٹ کیا ہے۔“ بھٹو نے فاطمہ سے دریافت کیا۔

”نہیں سر یہ میں نے کراچی میں بنوایا ہے۔“ فاطمہ نے جواب دیا۔

”آپ نے تو کمال کر دیا۔ حکومت کے بہت سے پیسے بچا لیے۔ ایسا فرنیچر بنوایا ہے کہ امپورٹڈ معلوم ہوتا ہے۔“ بھٹو صاحب نے کہا اور پھر ایک وقفے کے بعد بولے۔ ”میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ سندھ میں میرے گھر کے لیے ایک ایسا سیٹ بنوا دیں۔“

”آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ کراچی پہنچتے ہی میں آپ کی فرمائش کی تعمیل کر دوں گی۔“

وہ اس وعدے کو ذہن میں رکھ کر کراچی آ گئی۔ دوسرے دن اپنے دفتر گئی اور ساتھیوں سے بھٹو صاحب کی فرمائش کا ذکر کیا۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا، آپ فرمائش پوری کر دیں لیکن جو اخراجات آئیں گے وہ اپنی جیب سے ادا کرنے پڑیں گے۔ وہاں سے کچھ ملنے والا نہیں۔ محنت بھی کریں اور رقم بھی خرچ کریں۔

”اب جو بھی ہو۔ میں وعدہ کر چکی ہوں۔ فرنیچر بنوا کر تو دینا پڑے گا۔“

اس نے فرنیچر کا آرڈر دے دیا۔ فرنیچر تیار ہو گیا تو اس نے ٹرک میں لادا اور لاڑکانہ روانہ ہو گئی۔ لاڑکانہ المرتضیٰ ہاؤس میں بھٹو صاحب خود موجود تھے۔ فرنیچر دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

وہ تو یہ سوچ کر گئی تھی کہ تعریفوں کے سوا کچھ نہیں ملے گا لیکن فرنیچر کی قیمت کیش میں ادا کی گئی۔ اس کے علاوہ ایک لفافہ اسے یہ کہہ کر دیا گیا کہ یہ آپ کا انعام ہے لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا۔

”میں سرکاری ملازم ہوں۔ یہ میرا کام تھا میرا حق نہیں بنتا کہ انعام لوں۔“ بھٹو صاحب کے چہرے پر ایک مخلصانہ مسکراہٹ ابھری اور پھر خاموشی سے لفافہ جیب میں رکھ لیا۔

وہ کراچی واپس آ گئی۔

اسے آئے ہوئے تین چار دن ہوئے تھے کہ بھٹو صاحب کی طرف سے اسے کچھ تحفے موصول ہوئے جن میں ریشمی کھیس بہت قیمتی بڑے سائز کی رلی، ایک چاندی کی تھالی اور سندھ کی خاص مٹھائیاں تھیں۔ یہ تحفے قبول کرنے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ اس نے وصول کر لیے۔

☆......☆

ایوب خان کے دور حکومت میں صحافت پر بہت سی بے جا پابندیاں عائد تھیں لیکن فاطمہ ثریا کا قلم اس دور میں بھی جرأت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس نے اس مارشل لاء کے دور میں ”بہار کے بندھن“ کے عنوان سے روزنامہ جنگ میں سلسلہ وار ناول لکھا اس ناول کی کہانی ایک طوائف اور چودھری کے گرد گھومتی ہے۔ بجیا نے اس ناول میں ان تمام واقعات اور عصری پابندیوں کو بھی ناول کا حصہ بنایا جو اخبارات کی زینت بن رہی تھیں۔ اس دور میں ایک قانون کے تحت طوائفوں پر پابندی لگائی گئی تھی۔ بجیا نے اس قانون کے ایک دوسرے پہلو کو پیش کیا اور وہ یہ کہ اس پابندی سے ان طوائفوں پر کیا گزری جو اس کاروبار سے منسلک تھیں۔

یہ بڑا حساس اور نازک معاملہ تھا۔ دور بھی مارشل لاء کا تھا۔ ذرا سی لغزش مصیبت کا باعث بن سکتی تھی لیکن اس نے نہایت عمدگی سے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔

اس ناول میں طوائف بہار جان اور چودھری صاحب کے رومانوی رشتے کو لکھا گیا ہے۔ دونوں کرداروں کے درمیان کشمکش اوّل تا آخر کہانی کا حصہ رہی پھر کرداروں اور ایوب خان کے دور کے اصل واقعات کو کہانی کا حصہ کچھ ایسے بنایا گیا کہ قارئین کو حقائق اور بجیا کے قلم کی کاٹ کا اندازہ بخوبی ہو گیا۔ اس نے کہانی کا تانا بانا ایسے بنا کہ وہ طوائف اور چودھری صاحب دو الگ الگ مگر دوستی کے رشتے میں بندھی زندگی گزار رہے ہیں۔ ناول کے کلائمکس میں دونوں کردار بالآخر نکاح کر لیتے ہیں۔ یہاں سے کہانی ایک نیا موڑ لیتی ہے یعنی ناول کے مرکزی کردار چودھری صاحب کے پیچھے ان کی خاندانی نیک نامی اور ان کا بیٹا ہوتا ہے تو دوسری طرف طوائف کے کردار میں اس خاتون کی کوٹھے سے وابستگی اثر انداز ہوتی ہے۔

ملازمت کے ساتھ ساتھ افسانے اور ناول لکھ کر وہ اپنے قلم کا لوہا منواتی رہی۔ اس کی تحریریں مختلف جرائد میں شائع ہو کر داد وصول کرتی رہیں۔ اس نے اپنے افسانوں میں بڑی دلیری سے اپنے قلم کی نوک استعمال کی۔

بجیا معاشرے کی نبض پر ہاتھ رکھتی ہیں۔ اپنے افسانوں اور ناولوں کے ذریعے بجیا نے غیر روایتی موضوعات پر قلم اٹھایا جن سے لوگ کتراتے تھے۔ ایسی شخصیات اور پیشوں کو حقیقت کے آئینے دیے جن پر لوگ بات کرنے سے جھجکتے تھے۔

اس کی عمر کے ساتھ ساتھ اس کی شہرت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ پاکستان میں ٹیلی ویژن آ چکا تھا لیکن ابھی اس نے ٹیلی ویژن کے لیے لکھنا شروع نہیں کیا تھا البتہ اسے یہ شوق

ضرور تھا کہ وہ ٹیلی ویژن اسٹیشن دیکھے۔ یہ دیکھے تو سہی کہ وہاں کس طرح کام ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ انہی دنوں اس کا لاہور جانا ہوا۔ لاہور پہنچ کر اس کے اس شوق نے اڑان بھری کہ وہ لاہور کے پائلٹ ٹیلی ویژن اسٹیشن کا اسٹوڈیو دیکھے۔ وہ ٹی وی اسٹیشن پہنچ گئی۔ وہاں کسی نے بتایا کہ آغا ناصر سے مل لو وہ تمہیں پورا اسٹیشن گھما دیں گے۔

آغا ناصر اس وقت ڈیوٹی روم میں بیٹھے کسی ڈرامے کی ریکارڈنگ میں مصروف تھے۔ اس نے دروازے پر بیٹھے ہوئے چپراسی سے اجازت مانگی۔

”بھیا، ہمیں اندر جانا ہے۔ آغا ناصر سے ملنا ہے۔“

”وہ اندر ہیں تو لیکن مصروف ہیں۔ شاید اس وقت نہ ملیں۔“

”تم اندر جا کر ہمارے آنے کی اطلاع تو دو۔“

”کیا کہوں اپنا نام وغیرہ تو آپ نے بتایا نہیں۔“

”ہمارا نام فاطمہ ثریا ہے۔ شاید وہ ہمیں جانتے ہوں اور بلا لیں تم جا کر بتاؤ تو۔“

”اچھا بتاتا ہوں۔ آگے آپ کی قسمت۔“ چپراسی نے کہا اور اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں باہر آیا اور دروازہ کھول دیا گویا اجازت مل چکی تھی۔

”بھلے آدمی ہیں جو بلا لیا۔“ فاطمہ ثریا نے کہا اور کمرے میں چلی گئی۔

اس نے اندر ایک مہربان صورت آدمی کو بیٹھے دیکھا۔ یہی آغا ناصر تھے۔

”بھیا ہم معافی چاہتے ہیں کہ بغیر کسی تعارف کے آپ کے کام میں حارج ہوئے۔ دراصل ہم لاہور آئے ہوئے تھے اور آپ کا اسٹوڈیو دیکھنا چاہتے تھے۔“

”جی ضرور آپ تشریف تو رکھیں۔ میرا آپ سے غائبانہ تعارف ضرور ہے۔ میں نے آپ کی بہت سی تحریریں پڑھی ہیں۔“

”ارے بھیا بس لکھ لیتی ہوں۔ کچھ پیسے مل جاتے ہیں۔ شوق بھی پورا ہو جاتا ہے۔“

”آپ کسر نفسی سے کام لے رہی ہیں۔“

جب تعارف مکمل ہو گیا تو اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ گفتگو کے دوران یہ بات اس نے شدت سے محسوس کی کہ آغا ناصر کی نظریں اس کے چہرے سے نہیں ہٹ رہی ہیں۔ اسے الجھن سی ہونے لگی تھی لیکن یہ الجھن اس وقت دور ہو گئی جب آغا ناصر حرف مطلب زبان پر لائے۔

”آپ ہمارے ڈرامے میں ایک چھوٹا سا کردار ادا کریں گی؟“

”بھیا ہم نے یہ کام کبھی نہیں کیا۔ ہم تو یونہی ٹی وی اسٹوڈیو دیکھنے آئے تھے۔“

”ہر کام پہلی مرتبہ ہی کیا جاتا ہے۔ ہم میں سے جو کام بھی کر رہا ہے وہ پہلی مرتبہ ہی ہے۔“

”پھر بھی یہ کام ہمارے بس کا نہیں۔“

”دیکھیے بجیا، آپ کی صورت میں مجھے میرے ڈرامے کی ساس مل گئی ہے۔ میرے ڈرامے میں تین کردار ہیں۔ ایک بیوی، ایک شوہر، ایک ساس۔ میں نے دو افراد کا انتخاب کر لیا لیکن ساس کا کردار ادا کرنے کے لیے ایک نئے چہرے کی تلاش تھی۔ آپ کی صورت شکل، وضع قطع اس کردار کے لیے بہت موزوں ہے۔ اگر آپ راضی ہو جائیں تو ہماری بڑی مشکل حل ہو جائے۔ بات یہ ہے کہ لاہور کے فن کاروں نے معاوضے میں اضافے کے لیے ہڑتال کی ہوئی ہے اس لیے کسی نئے چہرے کی تلاش میرے لیے بڑی ضروری ہے۔“

”میں پھر بھی انکار کروں گی۔“

”آپ ایک بار اسکرپٹ پڑھ لیں پھر فیصلہ کر لیجیے گا۔“

بجیا نے اسکرپٹ پڑھا۔ اب خدا جانے اسکرپٹ پسند آیا یا آغا ناصر کی مجبوری کو پیش نظر رکھ کر اس نے اس ڈرامے میں شرکت کے لیے آمادگی ظاہر کر دی۔

ٹی وی اسکرین پر یہ اس کی پہلی حاضری تھی اور وہ بھی بطور اداکارہ نہ کہ بطور ڈراما نویس۔

وہ اس واقعے کو بھول بھال بھی چکی تھی۔ وہ اپنی اس شہرت میں مشغول تھی جو اسے اخبارات و جرائد سے حاصل ہو رہی تھی لیکن ایک نئی دنیا اس کی تلاش میں تھی۔ یہی تلاش اسے اسلام آباد لے گئی۔ اسلام آباد میں وہ اپنی بہن زہرا نگاہ کے گھر ٹھہری ہوئی تھی کہ ایک روز الطاف گوہر زہرا نگاہ کے گھر آئے۔ اس کے بہنوئی ماجد علی سے ان کی گہری دوستی تھی۔ اکثر آتے تھے۔ اس مرتبہ آئے تو فاطمہ ثریا سے ملاقات ہوئی۔ وہ اس کے نام سے بھی واقف تھے اور کام سے بھی۔ غالباً اسی لیے ٹیلی ویژن اور اس کے کاموں کی طرف بات نکل گئی۔

”ٹیلی ویژن نہایت موثر میڈیم ہے۔ اس کی بنیاد اگر اخلاقی اقدار پر رکھی جائے تو نہایت قابل ذکر نتائج سامنے آئیں گے۔“ الطاف گوہر نے کہا۔

”جی بے شک! اور ان اقدار کی بنیاد ہماری قومی زبان

اردو ہی ہو سکتی ہے۔“ فاطمہ ثریا نے کہا۔ ”اس کے لیے ضروری ہے کہ ناظرین کو اردو کے کلاسیکل ادب سے واقف کرایا جائے۔ ٹیلی ویژن اس کے لیے بہترین ذریعہ ہو سکتا ہے۔“

”آپ اس سلسلے میں ہماری کیا مدد کر سکتی ہیں۔“

”جو مجھ سے ممکن ہوا۔“

”تو پھر تیار ہو جائیے۔“

”میرا قلم ہر وقت تیار رہتا ہے۔“

”ہمیں قصہ چہار درویش کی ریکارڈنگ کرنا ہے۔“ الطاف گوہر نے کہا۔ ”آپ کل تک اسکرپٹ لکھ دیں۔ اگر یہ پروگرام مقبول ہوا تو اس طرح کے دوسرے قصوں کو بھی سلسلہ وار پیش کریں گے اور وہ تمام سلسلے آپ لکھیں گی۔“

”مجھے انکار نہیں لیکن یہ کل والی بات ہضم نہیں ہو رہی ہے۔ مجھے یہ قصہ ازبر ہے لیکن پھر بھی لکھنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔“

اس نے لاکھ منع کیا لیکن وہ اصرار کرتے رہے بالآخر اسے ہامی بھرنی پڑی۔

ان کے جاتے ہی دونوں بہنیں کتابیں لے کر بیٹھ گئیں۔ ساری رات کتابوں کا مطالعہ کرتی رہیں۔ اسکرپٹ لکھتی ٹھیک نہ لگتا تو پھاڑ دیتی پھر لکھتی پھر پسند نہ آتا۔ وہ تو شاید پھر بھی بیٹھی رہتی لیکن زہرا جھنجلا گئی۔

”کیا مصیبت ہے۔ جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔ ہم صبح الطاف گوہر صاحب کو فون کریں گے کہ اگر کچھ اور دن دے دیں تو لکھ دیں گے ورنہ کسی اور سے لکھوا لیں۔“

”ہم نے ان سے وعدہ کر لیا ہے۔“ فاطمہ نے کہا۔

”اب نہیں لکھا جا رہا تو کیا کریں۔“ زہرا نے کہا اور سونے کے لیے چلی گئی۔ وہ بھی سونے کے لیے لیٹ گئی۔

آنکھ لگتے ہی وہ خوابوں کی دنیا میں پہنچ گئی۔ اسے یہ محسوس ہوا جیسے کوئی اسکرپٹ اس سے لکھوا رہا ہے۔ صبح آنکھ کھلی تو پورا اسکرپٹ اسے یاد تھا۔ اس نے جلدی جلدی قلم سنبھالا اور پورا اسکرپٹ کاغذ پر اتار دیا اور ٹی وی سینٹر پہنچا دیا۔ تیسرے دن وہ پروگرام آن ایئر ہو گیا۔ اسکرپٹ اتنا پسند کیا گیا کہ الطاف گوہر ایک مرتبہ پھر گھر پہنچ گئے اور یہ طے ہوا کہ اردو ادب کے کلاسیکی ورثے کو مرتب کر کے ڈرامائی تشکیل دی جائے۔ پوری سیریز لکھی جائے۔

”آپ ہی ادب پارے تجویز کریں گی آپ ہی تحقیق کریں گی آپ ہی اسکرپٹ لکھیں گی۔“

”کام تو بہت مشکل ہے لیکن میرے ذوق کے مطابق ہے اس لیے میں تیار ہوں۔“

اس ڈرامائی سیریز کا نام اوراق رکھا گیا۔

اس سیریز کے تحت الف لیلہٰ، گودڑ کا لال، گئو دان، سسی پنوں، نوری جام تماچی، انگوٹھی کی مصیبت تحریر عظیم بیگ چغتائی اور دیگر کلاسیکی ادب کے پروگرام پیش کیے گئے۔

دو برس تک کلاسیکی ادب پر مبنی یہ ڈرامائی تشکیل دی جاتی رہی اور نہایت مقبول ہوئی۔

یحییٰ خان کی حکومت کے ابتدائی دن تھے۔ فاطمہ ثریا نے ہندوستان کی قدیم کہانیوں کی کتاب ”پنچ تنتر“ سے ایک انتخاب کاٹھ کی گڑیا پر پروگرام بنایا۔ کہانی کچھ ایسی تھی کہ حکومت پر چوٹ پڑ رہی تھی اس لیے سب خوفزدہ تھے اور یہ فیصلہ ہونے لگا تھا کہ اسے آن ایئر نہ کیا جائے لیکن فاطمہ کی جراٴت یہاں بھی سامنے آئی۔ وہ اڑ گئی کہ اس کہانی کو ایک لفظ اِدھر اُدھر کیے بغیر اسی طرح نشر کیا جائے گا۔

”کوئی گڑبڑ ہوئی تو جواب دہ میں ہوں گی۔“

ڈراما آن ایئر ہوا تو سب خوف زدہ تھے کہ دیکھیے ردِعمل کیا ہوتا ہے لیکن ہوا اس کے برعکس۔ دوسرے دن ایوانِ صدر سے تعریفی خط آیا۔

اسے بھی یقیناً اس کے قلم کی خوبی سمجھا گیا کہ اس نے ایک نازک کہانی کو اس طرح تحریر کیا کہ اعتراض کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ اب اس کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ جو کچھ لکھتی اسی طرح پیش کر دیا جاتا۔

ان ہی ابتدائی دنوں میں اس نے کئی موضوعات پر معلوماتی ڈاکومنٹری بھی تحریر کیں جن میں زیادہ مشہور ”آرائش خم کاکل“ اور ”گل کاری“ تھیں۔

آرائش خم کاکل میں خواتین کے بالوں کی سجاوٹ بندش اور آرائش کے وہ قدیم نمونے پیش کیے گئے تھے جو برصغیر میں صدیوں سے رائج ہیں جب کہ گل کاری میں مختلف ملکوں کی دست کاری کے وہ نمونے حاصل کیے گئے تھے جو دنیا بھر میں خواتین اپنے ہاتھوں سے بناتی ہیں۔ اس میں پاکستانی امبرائیڈری کے ساتھ جاپانی ایمبیسی کے ذریعے امبرائیڈری کے اعلیٰ نمونے جاپان سے منگوائے گئے۔

”پھول رہی سرسوں“ بھی ایک ڈاکومینٹری پروگرام تھا جو امیر خسرو کی 800 ویں سالگرہ پر پیش کیا گیا۔ یہ پروگرام میوزک اور سوانح پر مبنی تھا۔

”پنڈی سینٹر نے اس کو نام اور اس نے پنڈی سینٹر کو اپنی تحریروں سے پہچان دی۔ یہاں اس نے ادبی کلاسیکل

ڈرامے بھی لکھے۔ ڈاکو مینٹری بنائیں اور بچوں کے پروگراموں کے لیے لاتعداد اسکرپٹ لکھے پھر اسے کراچی منتقل ہونا پڑا کیونکہ اس کا گھر، رشتے دار سب کراچی ہی میں تو تھے لیکن وہ اسلام آباد کے بن باس سے لوٹی تو خالی ہاتھ نہیں تھی۔ اس کا نام اس کی پہچان اس کے ساتھ تھی۔ ٹی وی کے ناظرین اس کے نام سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔

اب اس کے زرخیز ذہن کے سامنے وسیع کینوس تھا جس پر وہ اپنی مقبولیت کے رنگ بکھیرنے والی تھی۔ اس کا موضوع ہمیشہ سے تہذیبی قدریں رہا تھا۔ اب وہ حیدرآباد دکن میں نہیں تھی پاکستان میں تھی۔ پاکستان ایک گھر تھا جس میں مختلف رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ اسے سب ہی رنگ عزیز تھے۔ اسے ان بستیوں سے پیار تھا جن سے وہ دور تھی۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ ان دور دراز کے رنگوں سے لوگ ابھی تک ناواقف ہیں۔ نامعلوم کو معلوم بنانا اس کی فطرت میں تھا۔ وہ ایک خاندان کے ہر فرد کا آپس میں گہرا تعلق دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے اس خواہش کو عملی شکل دینے کے لیے علاقائی تہذیب و روایت پر مبنی ڈرامے لکھے۔ مرزا قلیچ بیگ کے ناول کو سامنے رکھ کر اس نے ایک ڈراما ''زینت'' لکھا۔ اس ڈرامے میں حیدرآباد (سندھ) کے قدیم کلچر کو واضح کیا گیا تھا۔ خاص طور پر تالپوروں کے دور کے سماجی حالات کی خاص طور پر منظر کشی کی گئی تھی۔

بلوچستان پاکستان کا ایک بھولا بسرا صوبہ ہے۔ میڈیا پر تو اس کا ذکر ہی نہیں تھا۔ ثریا بجیا نے بلوچ قوم کی تہذیب پر مبنی ڈراما ''آب اور آئینے'' تحریر کیا جسے بلوچستان کی ثقافت کا بہترین آئینہ دار کہا جا سکتا ہے۔

ان ڈراموں کی مقبولیت نے اسے علاقائی لوک کہانیوں کی طرف توجہ دلائی۔ وہ اپنے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گئی اور ان کہانیوں کو پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ کہانیاں جس دور سے تعلق رکھتی تھیں اس دور کی تاریخ کو کھنگالنا شروع کر دیا۔ ان لباسوں پر تحقیق شروع کی جو اس دور میں پہنے جاتے تھے۔ سنگھار کے طریقے اور سامان پر تحقیق کی اور ان کہانیوں کی ڈرامائی تشکیل کا بیڑا اٹھایا۔ ان کرداروں کا انتخاب کیا جو ان ڈراموں کے لیے موزوں ہو سکتے تھے چنانچہ سسی پنوں ڈرامے میں سندھ کی معروف فنکارہ غزالہ رفیق نے مرکزی کردار ادا کیا۔ سوہنی مہینوال میں سوہنی کے روپ کے لیے بابرہ شریف کا انتخاب کیا جو بعد میں فلم انڈسٹری کی سب سے مقبول اداکارہ بن گئی۔

اس سیریز میں بجیا کی تزئین و سنگھار کی مہارت کام آئی۔ اس کے روایت پسند مزاج نے لوک کہانیوں کی اس پیشکش کے ذریعے پاکستان کے ایک ورثے کو پُرکشش انداز میں عام آدمی تک پہنچایا۔

اس نے ان کہانیوں کے رومانوی پس منظر کے ساتھ ساتھ ان کہانیوں سے جڑے سیاسی اور سماجی حالات کو بھی اجاگر کیا۔

لوک عکس کے عنوان سے اس نے سوہنی مہینوال، عمر ماروی، سسی پنوں اور دیگر کہانیوں کو خوب صورتی سے پیش کر کے اپنا لوہا منوایا۔

بلوچستان کی تہذیب کی روشنی میں اس نے ڈراما ''آب اور آئینے'' تحریر کیا۔ یہ ایک ایسے سردار کی کہانی تھی جو امن پسند اور روشن خیال ہے۔ اسے صدیوں سے چلتی لڑائیوں سے اختلاف ہے۔ اس ڈرامے میں پہلی مرتبہ بجیا نے انور اقبال کو متعارف کرایا جس کی بعد میں ''نانا کی جان قمرو'' کے مکالمے سے پہچان ہوئی۔

یہ ڈراما اگرچہ اردو میں تھا مگر اس میں جا بجا بلوچی اصطلاحات استعمال کی گئی تھیں جس نے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھر دیا تھا۔ بلوچی لباس سے لے کر گھروں میں استعمال ہونے والا مخصوص فرنیچر، لباس کی تراش خراش، نشست و برخاست اور لہجوں کا انداز جاننے کے لیے اس نے نہ صرف بلوچستان کے کلچر پر تحقیق کی بلکہ بلوچ قلم کاروں سے مل کر معلومات حاصل کیں۔ اتنی کدو کاوش کے بعد جب ڈراما نشر ہوا تو بلوچ کلچر پر ایک دستاویز بن گیا۔

اس کی یہ کوششیں نہایت منفرد انداز کی تھیں۔ اس سے پہلے کے ڈرامے خیالوں کی ترجمانی کرتے تھے اس نے پہلی مرتبہ ڈرامے کو تاریخ سے منسلک کر دیا۔

اسے بچپن ہی سے تاریخی شخصیات سے دلچسپی رہی تھی۔ اس نے بچپن ہی میں تاریخی اوراق کو اس شدت سے کھنگال لیا تھا کہ تاریخی اوراق اسے ازبر ہو گئے تھے۔ علاقائی ڈرامے لکھتے لکھتے اچانک ایک دن اسے خیال آیا کہ اگر علاقوں کی سرحدیں عبور کر لی جائیں تو کیسا رہے۔ ابھی وہ اس سلسلے میں کوئی عملی قدم نہ اٹھا سکی تھی کہ ایک روز ٹی وی اسٹیشن سے فون آیا۔ ''بجیا بول رہی ہیں؟''

''جی میں بول رہی ہوں۔''

''اس وقت آپ کو ہرگز زحمت نہ دیتے لیکن بات ایسی ہے کہ فون کرنا پڑا۔''

''فرمائیے۔''

''کل ''امہات المومنین'' کی سوانح کے موضوع پر مشتمل پچاس منٹ کے دورانیے کا ڈراما ہر حال میں آن ایئر کرنا ہے۔ یہ کام آپ ہی کر سکتی ہیں۔''

''بھیا کرنے کو تو ہم ہر کام کر سکتے ہیں لیکن یہ کام ہم نہیں کر سکتے۔ اس میں جو نزاکتیں ہیں ان سے ہم عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔''

''بجیا یہ میری نوکری کا سوال ہے۔ وزیر اطلاعات کا حکم ہے کہ یہ ڈراما آن ایئر ہو۔''

''وہ کیا باؤلے ہو گئے ہیں۔''

''مجھے نہیں معلوم حکمران کا حکم یہی ہے۔''

''اچھا تم فون رکھو۔ میں وزیر صاحب سے بات کرتی ہوں تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔''

یہ جنرل ضیاء الحق کے دور کے ابتدائی دن تھے۔ شراب خانے، کلب وغیرہ بند کرائے جا رہے تھے۔ دو بٹا کلچر کو فروغ دینے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ وزیر موصوف نے بھی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے یہ حکم جاری کیا تھا۔

وہ فون رکھنے کے بعد کچھ دیر سوچتی رہی کہ وزیر اطلاعات کو فون کیا جائے یا نہیں۔ اس نے ہر پہلو سے سوچنے کے بعد ایک جھٹکے سے ریسیور اٹھایا اور وزیر کو فون ملا دیا۔ انہیں ان کا حکم نامہ یاد دلایا اور صاف لفظوں میں انکار کر دیا۔

''اللہ سے ڈرو، ٹی وی پر امہات المومنین کے واقعات کو ڈرامائی شکل میں کیسے پیش کر سکتے ہیں۔ ام المومنین کا کردار کون فنکارہ ادا کر سکتی ہے۔ بھئی ہم سے تو یہ جسارت نہیں ہو سکتی۔ آپ نے غور نہیں کیا ورنہ آپ بھی تسلیم کریں گے کہ ہم ٹیلی وژن پر صحابہؓ، تابعین اور امہات المومنینؓ کو نہیں دکھا سکتے۔ اگر دکھا دیا تو اس کے بعد جو طوفان اٹھے گا اسے کوئی نہیں روک سکے گا۔ ہم آپ کو روک تو نہیں سکتے لیکن ہم لکھ بھی نہیں سکتے۔ اگر کوئی لکھ سکتا ہے تو اس سے لکھوا لیں۔''

وزیر صاحب کی آنکھیں کھل گئیں اور انہوں نے اپنا حکم واپس لے لیا۔

دوسرے دن ٹی وی اسٹیشن گئی تو انتظامیہ اس کی شکر گزار تھی۔ وہ سب کے تبصرے سن رہی تھی لیکن اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ وہ نہ جانے کن خیالوں میں گم گھر چلی آئی۔ کمرا بند کر کے بیٹھ گئی جیسے کسی کو اپنے خیالوں میں شریک نہ کرنا چاہتی ہو۔ ذہن میں جمی تاریکی دور ہونے لگی اور پھر روشنی پھیلنے لگی۔ اس سے کوئی کہہ رہا تھا۔ ''تم امہات المومنین کو تو ٹی وی پر نہیں دکھا سکتیں لیکن عظیم مسلم خواتین کے کردار تو اجاگر کر سکتی ہو۔'' اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ وہ تاریخ بنو عباس کی گرانقدر خواتین اور دیگر عظیم مسلم خواتین کے کردار کو اجاگر کرنے کے لیے سیریز بنائے گی۔

اس نے پوری شدت سے تاریخ بنو عباس پر تحقیق شروع کر دی اور پھر اسے ڈرامائی انداز میں لکھا۔ جب یہ ڈراما نشر ہوا تو اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ بجیا کے قلم میں کتنی طاقت اور تحریر میں کتنی تحقیق کا عرق شامل ہے۔

بجیا کو تحقیق سے خاص شغف تھا۔ یہی شغف اسے عظیم فاتح ظہیر الدین بابر کی سوانح کی طرف لے گئی۔ پوری تحقیق کے بعد اس نے بابر کی زندگی پر مکمل سیریل لکھی۔ یہ اس کی تحقیق ہی کا کمال تھا کہ لباس کی تراش خراش، برتنوں کے ڈیزائن زیورات، خواب گاہ کی سجاوٹ، محل کے نقش و نگار وغیرہ خود اس نے باالتحقیق مرتب کیے۔

تین سو سال پرانی تہذیب کو پیش کرنا ڈراما نویس اور پروڈیوسر دونوں کے لیے کڑا امتحان تھا لیکن بجیا کے مشوروں نے سب کا کام آسان بنا دیا اور یہ ڈراما نہایت کامیاب ثابت ہوا۔ اس کے قلم نے تاریخی کرداروں کو زندہ کر دیا اور انہیں اتنی وضاحت سے پیش کیا کہ کئی سو سال پرانی شخصیت بھی زندہ معلوم ہوتی تھی۔

اس کے تحریر کردہ تاریخی ڈراموں میں آتش، حیات جاوید، آبگینے وغیرہ شامل ہیں۔

ان علاقائی اور تاریخی ڈراموں کی اہمیت اپنی جگہ لیکن اس کی اصل شہرت وہ ڈراما سیریل تھے جو معاشرتی اور گھریلو موضوعات پر مبنی تھے۔ اس کا اس طرف آنا بھی ایک اتفاقی امر تھا۔ اس وقت کے وزیر اطلاعات خواجہ شہاب الدین نے ایک محفل میں اس سے اے آر خاتون کے ناول ''شمع'' کا تذکرہ کیا۔

''آپ نے یہ ناول پڑھا ہے؟''

''میں ناول کم ہی پڑھتی ہوں۔''

''اسے ضرور پڑھیے گا بلکہ میں مشورہ دوں گا کہ اس کی ڈرامائی تشکیل کیجیے گا۔ بہت پسند کی جائے گی۔''

''میں ضرور پڑھوں گی۔''

اس نے گھر پہنچتے ہی ''شمع'' ناول منگوایا اور پڑھنے بیٹھ گئی۔ یہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی ''شمع'' کی کہانی تھی۔ دوسرا کردار اس کا ماموں زاد ہے جو خود بھی ولایت کا تعلیم یافتہ ہے۔ دونوں مل کر روایتی جہالتوں اور نفرتوں کا مقابلہ کرتے

ہیں اور ایک بڑے خاندان کی اعلیٰ ترین روایتوں کو جنم دیتے ہیں۔

اس نے اس کہانی کو برصغیر پاک و ہند میں رہنے والوں کی کہانی اور وقت کی ضرورت سمجھا اور اس کی ڈرامائی تشکیل کرنے بیٹھ گئی۔

سیریل (شمع) ٹی وی میں ایک نئی طرز کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی۔ پاکستان سے لے کر سرحد پار ہندوستان تک مقبولیت کے وہ جھنڈے گاڑے جس کی مثال نہیں ملتی۔ ہندوستان نے اس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے امرتسر ٹی وی سے فلم دکھانی شروع کردی لیکن لوگ بھارتی فلم کے بجائے ''شمع'' دیکھتے تھے چنانچہ مجبوراً امرتسر ٹی وی کو فلم کا وقت تبدیل کرنا پڑا۔

اس کی مقبولیت نے بجیا کا حوصلہ بھی بڑھایا۔ شمع کے بعد گھریلو نوعیت اور معاشرتی موضوعات پر بجیا کے کئی ڈرامے سامنے آئے۔ اس نے عروسہ، افشاں، آگہی، انا، گھر ایک نگر اور اساوری جیسے یادگار سیریل پیش کیے اور ڈرامے کی دنیا میں اپنا لوہا منوایا۔

ڈراما سیریل افشاں میں کئی نامور فنکاروں نے کردار ادا کیا۔ عرش منیر، عشرت ہاشمی، قربان جیلانی، عذرا شیروانی، رضوان واسطی، طاہرہ واسطی، قیصر نقوی، شکیل، قاضی واجد، واجد علی وغیرہ بہت مشہور ہوئے۔ ڈراما سیریل شمع میں بھی فنکاروں کی ایک بڑی فوج نے حصہ لیا۔

''شمع'' کی کامیاب پیش کش کے بعد تو جیسے ڈرامے کی اس نئی طرز کا آغاز ہوگیا اور دیگر ڈراما نویسوں نے بھی خاندانی کہانیوں کے اس کامیاب انداز کو اپنانے کی کوشش کی۔

☆......☆

جب ٹی وی کا میڈیم متعارف ہوا تو دیگر مسائل کے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ نئے چہروں کو کس طرح متعارف کرایا جائے۔ ابتداء میں تو ریڈیو کے فنکاروں سے کام چلا لیا گیا لیکن پھر یہ خیال ہوا کہ ایک سے چہرے دیکھ دیکھ کر لوگ تنگ آجائیں گے۔ اس کمی کو بجیا نے سب سے پہلے اور شدت سے محسوس کیا اور اپنے مختلف ڈراموں میں نئی لڑکیوں کو چانس دے کر انہیں مستقبل کی نامور اداکارائیں بنا دیا۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ گھر گھر جا کر لڑکیاں ڈھونڈتی تھی بلکہ جو لڑکیاں اداکاری کا شوق رکھتی تھیں اور اپنے شوق کا اظہار اس سے کرتی تھیں وہ انہیں مایوس نہیں کرتی تھی بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ اس کا لہجہ ایسا شفیق تھا کہ نئے آنے والے اس کے سامنے اپنے دل کی بات کہتے ہوئے ہچکچاتے نہیں تھے۔ رفتہ رفتہ یہ بات مشہور ہوگئی کہ وہ اپنے سیریلز کے لیے نئی لڑکیاں تلاش کرلیتی ہے۔

اس کے تقریباً ہر ڈرامے میں کوئی نہ کوئی اداکار یا ڈرامے کا ہیرو، ہیروئن کوئی نیا چہرہ ہوتا تھا چنانچہ ڈراما سیریل ''عروسہ'' میں مشی خان کو متعارف کرایا۔ شمع جونیجو کو سندھی ڈراموں سے اردو ڈرامے میں لائی۔ ڈراما سیریل ''شمع'' میں اداکارہ غزالہ کیفی کو متعارف کرایا۔ جاوید شیخ نے بھی ''شمع'' سے ہی اپنا کیریئر شروع کیا۔ اس کے لکھے ہوئے ڈرامے ''آب اور آئینے'' کے ذریعے اداکار انور اقبال کو پہلی بار شہرت ملی۔ غرض ڈراما نگاری کے ساتھ ساتھ اس نے باصلاحیت نئے چہروں سے بھی پی ٹی وی کو نوازا۔ رفتہ رفتہ وہ صرف ڈراما نگار نہیں بلکہ ایک ادارہ بن گئی۔

اس نے اپنے ڈراموں سے اصلاحی اور تعمیری کام لیا لیکن اس خوب صورتی سے کہ ڈرامے کی فنی خوبیوں کو متاثر نہیں ہونے دیا بلکہ اور زیادہ مؤثر ہوگیا۔ اس نے اپنے ڈراموں کے ذریعے معاشرے کی اصلاح اور روشن خیال تعمیری سوچ کو بڑھاوا دیا۔ غیر شرعی رسمیں اور ان کی نفی، نمائش، عیش و عشرت، جہیز کی لعنت، بے جا اصراف یا پھر اخلاقی غلطیاں۔ ان تمام کو یکسر رد کرنے کے لیے بجیا نے ڈرامے کے میڈیم کو بخوبی استعمال کیا۔ وہ اصلاح کا کام مکالموں سے لیتی تھی۔

ایک اہم مسئلہ ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کی بغیر دیکھے بھالے شادی کردینے کا ہے۔ اس کے ڈرامے ''عروسہ'' کے دو کرداروں کے درمیان ہونے والے مکالمے کے ذریعے اسی مسئلے کو پیش کیا گیا۔

☆ انجم پڑھی لکھی عورت ہے۔ صاحب شخصیت ہے۔ وہ تنہا بھی زندہ رہ سکتی ہے۔ کیوں کروا دی تھی ہم نے اس کی شادی۔

☆ جوان بیٹیوں کو گھر میں دیکھ کر ان کے آباد کرنے کی جو ایک وحشت ہم ماں باپ پر ہوجاتی ہے بس وہ......

☆ بغیر سوچے سمجھے لڑکیوں کو بیاہ دینا ہمارے معاشرے کا متعدی مرض ہے جس کا شکار انجم کے معاملے میں ہم دونوں ہوگئے تھے۔

اس کے ڈرامے مقبول ہی اس لیے ہوتے تھے کہ اس کا قلم لوگوں کی دکھتی رگ پر ہوتا تھا۔ ایسی دکھتی رگ پر جس کا لوگوں کو خود احساس نہیں ہوتا۔

مکالموں کے ساتھ ساتھ بجیا کے تخلیق کردہ کردار بھی

لوگوں کے برتاؤ کو متاثر کرنے میں کامیاب رہے۔

معاشروں کے بگاڑ میں بے جا رسوم و رواج کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ ہاں اگر رسم و رواج میں تہذیب کی جھلک ہو اور یہ کسی بے جا فضولیات پر مبنی نہ ہو تو رسم و رواج فائدہ مند بھی ہوسکتے ہیں۔ بجیا نے یہی کوشش کی کہ ان رسم و رواج کو اپنے ڈراموں میں دکھائے جو معاشرے کے لیے مفید ہوں۔ اسی لیے اس نے رسم و رواج دکھائے اور کثرت سے دکھائے مگر سادگی ہر تقریب کا بنیادی عنصر بنا کر پیش کیا۔ اس نے تہذیبی اور ثقافتی ورثے کو اپنے ڈراموں کے ذریعے نئی زندگی دی۔ وہ رسمیں اور تہذیبی رنگ جو برصغیر کے مسلمانوں کا طرۂ امتیاز رہے مگر آہستہ آہستہ ہلکے پڑ رہے تھے۔ بجیا نے اس تہذیب کے رنگ کو اپنے قلم سے اتنا گہرا کردیا کہ جدید دور میں بھی فیشن لگنے لگے۔ وہ رسمیں جو ہندوانہ تھیں مگر اچھی تھیں انہیں قائم رہنے دیا۔

وہ حقوق نسواں کی بہت بڑی علم بردار تھی لیکن بیشتر تعلیم یافتہ عورتوں کی طرح بے جا آزادی کی طرفدار نہیں تھی اس نے خود ایک مرتبہ کہا تھا۔ ''میں عورت کو شتر بے مہار آزادی سے محبت کرنے اور سڑکوں پر حقوق نسواں کے نام پر نعرے بازی کرتے نہیں دیکھ سکتی۔ یہ ہماری عورت کا مزاج ہے اور نہ ہی اس کا خمیر ایسی مٹی سے گوندھا گیا کہ وہ یہ سب کرتی پھرے۔ جو چند فیصد عورتیں ایسا کررہی ہیں انہیں بھی اپنے مرکز پر واپس لوٹنا پڑے گا۔''

اس نے انہی خیالات کو اپنے ڈراموں میں بھی بروئے کار رکھا۔ اس نے عورتوں کو جرأت و بہادری کا نمونہ بنا کر تو پیش کیا لیکن اس کا بھی خیال رکھا کہ مہذب معاشرے کی عورتوں کی حدود کیا ہونی چاہئیں۔ اس نے ڈراما کی تشکیل کے لیے ایسے ناولوں کا انتخاب کیا جن میں بالواسطہ بلاواسطہ سبق دیا گیا تھا کہ عورت کا جائز مقام اس کا گھر ہے۔ اسی طرح وہ عورتوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ دیکھنا چاہتی ہے۔ وہ اپنے مکالموں میں خواتین کی تعلیم و تربیت پر بہت اصرار کرتی نظر آتی ہے۔

☆ علم کے زیور سے مسلمان مرد اور عورت دونوں کو آراستہ ہونا چاہیے۔ استاد بتاتے ہیں فتح محمد کی بیٹی زینت غیر معمولی ذہین لڑکی ہے۔

☆ مگر خود عورتیں ہی اگر تعلیم سے محروم رہنا چاہیں تو......

☆ ذمہ داری بیٹیوں کے مسلمان باپوں کی ہے۔ انہیں اپنی بیٹیوں کو تعلیم دلوانا چاہیے۔ (ڈراما زینت)

وہ عورتوں کو تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ دو بول پڑھ کر عورت ہوا میں اڑنے لگے۔ اپنا عورت پن بھول جائے چنانچہ جب اس سے اس بارے میں پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا۔

''مجھے عورتوں کا جارحانہ کردار پسند نہیں کہ وہ مردوں کی برابری کی بات کریں اگر کوئی عورتوں کی ایسی آزادی چاہتا ہے تو میں اس کی حامی نہیں مگر بہ حیثیت خاتون ادیب میں کم مراعات یافتہ خواتین کی جدوجہد میں ان کے ساتھ ہوں۔''

بجیا نے اپنے ڈراموں میں گھریلو زندگی میں عورتوں کے کردار اور اثر رسوخ کو بڑھا چڑھا کر اسی لیے پیش کیا تاکہ عورتیں طاقتور تو بنیں مگر اپنی حدود کے اندر رہتے ہوئے۔

رومان اور گلیمر ڈرامے کے بنیادی عناصر سمجھے جاتے تھے۔ ایسا گلیمر جس کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ بجیا نے اس رجحان سے بھی اختلاف کیا۔ اس نے بے جا گلیمر سے انحراف کیا۔ اس کمی کو اس نے تہذیبی رنگا رنگی سے پورا کیا۔ اس نے فنکار کی ظاہری خوب صورتی سے زیادہ کردار کی خوب صورتی کو تراشا، ڈرامے کی ضرورت کے تحت سیٹ کی تزئین و آرائش پر زور دیا۔ نت نئے ملبوسات، ساڑیوں اور روایتی ثقافتی فیشن اور تقریبات سے روشناس کیا۔

جب انڈین ڈراموں کی گونج ہوئی تو ان کی نقالی کرتے ہوئے پاکستانی ڈراما نویسوں نے بھی گلیمر پر زور دیا لیکن بجیا نے ہمیشہ اپنا دامن اس روایت سے بچایا۔

عشق و محبت اور رومان جس طرح ناولوں کا خاص موضوع ہے بلکہ زندگی کا موضوع ہے۔ اسی طرح ڈراموں کا بھی خاص موضوع ہے لیکن ڈراما سب دیکھ رہے ہوتے ہیں اس لیے ان معاملات میں توازن رکھنا بڑا ضروری ہوتا ہے۔ بجیا نے اس توازن کا خیال رکھا ہے۔ وہ رومانوی کردار لکھتی ضرور تھیں لیکن والہانہ رومان نہیں۔ اس کے رومان میں شائستگی تھی۔ وہ رومان..... جو خاندانوں کے بیچ اور رشتوں میں پروان چڑھتا ہے جس میں تہذیب اور آداب بھی ہیں۔ ہوسناکی نہیں معصومیت ہے۔

☆......☆

بچوں کے لیے کچھ لکھنا مشکل بھی ہے اور ضروری بھی۔ مشکل اس لیے کہ اپنی سطح سے نیچے اترنا پڑتا ہے۔

بچوں کی نفسیات کو سامنے رکھنا پڑتا ہے۔ وہ زبان لکھنی ہوتی ہے جسے وہ سمجھتے اور بولتے ہیں۔ وہ موضوع اختیار کرنا ہوتا ہے جو ان کے ذہن سے قریب ہو، جس میں تفریح بھی ہو اور اصلاح بھی۔ ضروری اس لیے کہ انتہا کے لیے ابتداء کی ضرورت ہوتی ہے۔ بچوں کی ذہنی صحت درست ہوگی تو یہی بچے آگے چل کر صحت مند معاشرہ تشکیل دیں گے۔

بجیا نے اپنے اصلاحی جذبے سے مجبور ہو کر بچوں کے پروگراموں کے اسکرپٹ لکھے۔ ان ڈراموں میں بھی اس کا انداز منفرد اور سب سے الگ رہا۔ حکایت، ہدایت، تعلیم اور اصلاح کا پہلو پیشِ نظر رکھا۔

اس نے ''نئی پرانی ایک کہانی'' کے نام سے بچوں کے ڈراموں کی سیریز شروع کی جس میں ہر ہفتے مختلف کہانیاں پیش کی جاتی رہیں۔ بعض کہانیاں مشہور حکایات اور بعض دیگر زبانوں کے ادب سے ترجمہ کر کے لی جاتیں جس میں ایک قصہ گو بچوں کو کہانی سناتا اور کہانی کے منتخب حصوں کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا جاتا۔ اس کے علاوہ مشہور تاریخی اور انبیاء کے کارناموں اور زندگی پر مبنی واقعات کو بھی بچوں کے لیے آسان کہانی اور ڈرامائی شکل میں پیش کیا گیا۔

بجیا نے یہ گر سیکھ لیا تھا کہ بچہ بڑوں کی باتیں خشک اور مشکل سمجھ کر جلد بور ہو جاتا ہے اس لیے بچوں کی تحریر میں شرارت بھی ہو مگر انہیں سبق آموز بنانے کے لیے نصیحت بھی ڈالی جائے لہٰذا اس نے ان شرائط کا پورا خیال رکھا۔ کنجوس کے جوتے، ایک وار میں سات، دادا لال بجھکڑ، روتی موتی ہنستے پھول وغیرہ اس کے ایسے ہی ڈرامے تھے جو بچوں میں نہایت مقبول ہوئے۔

وہ ٹی وی ڈراموں میں مشغول تھی۔ یہی دور تھا جب اسٹیج ڈراموں کا غلغلہ بلند ہوا۔ کراچی میں کئی نجی تھیٹر قائم ہو گئے۔ مزاحیہ اسٹیج ڈرامے رفتہ رفتہ جڑ پکڑ رہے تھے۔ عمر شریف اور معین اختر کے مزاحیہ ڈرامے دھوم مچا رہے تھے۔ عمر شریف کے ڈراموں کی تو اتنی شہرت ہوئی کہ وڈیو کیسٹ کی صورت میں گھر گھر دیکھے جانے لگے۔

بجیا کے ڈراما سیریل ''شمع'' فقیدالمثال کامیابی سے ہمکنار ہو چکا تھا اور ایک ٹیم وجود میں آچکی تھی جس میں فاطمہ ثریا بجیا اور قاسم جلالی کے ساتھ دیگر فنکار شامل تھے۔ اس ٹیم کے افراد نے تھیٹر کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے طے کیا کہ مزاحیہ اسٹیج ڈراما تحریر کیا جائے۔ بجیا نے اس ارادے کی تکمیل کے لیے ایک مزاحیہ اسٹیج ڈراما تحریر کیا جس کا نام ''ذرا پچ'' کے تھا۔

اس ڈرامے کی کہانی معروف صحافی نصراللہ خان نے تحریر کی، ڈرامائی تشکیل فاطمہ ثریا بجیا نے کی۔ ہدایات کا فریضہ قاسم جلالی نے ادا کیا۔ اداکاروں میں جاوید شیخ، بہروز سبزواری، عشرت ہاشمی، عرش منیر، رضوان واسطی وغیرہ شامل تھے۔

یہ ڈراما بنیادی طور پر ایک اصلاحی مگر مزاحیہ ڈراما تھا جو ایک ایسے لڑکے کے گرد گھومتا تھا جسے اپنی سوتیلی ماں کے باعث عورت ذات سے نفرت ہو جاتی ہے۔ نہ صرف وہ بلکہ اس کے چند دیگر نکھٹو قسم کے دوست بھی اس کے گھر میں رہتے ہیں۔ یہ لڑکے مختلف اشکال میں عجیب کردار ہیں۔ ایک لڑکا ہکلاتا ہے۔ ایک کو نواب بننے اور لڑکیوں میں مقبول ہونے کا شوق ہے۔

یہ ڈراما اتنا کامیاب رہا کہ اس نے گولڈن جوبلی مکمل کی۔ بعد میں یہ ڈراما لندن کے البرٹ ہال میں بھی اسٹیج کیا گیا۔

اب تک فاطمہ ثریا بجیا کے بارے میں یہ رائے قائم تھی کہ وہ ایک کامیاب ڈراما نگار ہے۔ وہ مزاحیہ ڈرامے بھی لکھ سکتی ہے یہ کسی نے سوچا بھی نہیں تھا۔ تھیٹر کی دنیا بالکل مختلف ہے لیکن وہ یہاں بھی کامیاب رہی۔

ایک ڈراما ''نشانِ منزل'' تحریر کیا۔ یہ ڈراما سیاسی و عالمی معاشرتی موضوع پر مبنی تھا۔ ہدایات ابراہیم نفیس نے دی تھیں۔

ایک اور مزاحیہ ڈراما ''خوشبو کا جھونکا'' تحریر کیا۔ اصلاحی کہانی پر مشتمل یہ شائستہ اور مزاحیہ ڈراما بعد میں ٹیلی وژن پر پیش کیا گیا۔ اس ڈرامے میں اصلاح اور مزاح کا پہلو نمایاں تھا۔ اس ڈرامے کا پیغام یہ تھا کہ بزرگ اکثر نوجوانوں اور ان کی صلاحیتوں پر بھروسا نہیں کرتے۔

اس کے ڈراموں کی مقبولیت نے جاپانیوں کو اس کی طرف متوجہ کیا۔ کراچی میں جاپانی کلچرل سینٹر قائم ہوا تو انہوں نے یہ بھی مناسب سمجھا کہ جاپانی ڈرامے کو پاکستان میں روشناس کرایا جائے۔ ان کی نظرِ انتخاب فاطمہ ثریا بجیا پر پڑی۔ انہوں نے رابطہ کیا اور یوں فاطمہ ثریا کو جاپانی ادب پر کام کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ بجیا کو جاپانی قوم پر کام کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہوا اور جاپانی تہذیب کو قریب سے دیکھنے کا موقع بھی ملا۔

وہ اردو ادب کے کلاسیکی ادب کو ڈرامائی شکل میں پیش کرنے کا تجربہ کر چکی تھی۔ اس طرز پر اس نے جاپان کے کلاسیکی ادب کی ڈرامائی تشکیل کی اور ایک ڈراما ''واکا راگ'' کے عنوان سے اسٹیج کیا۔ اسی طرح جاپان کے معروف شاعر تاکامورا کے شعری مجموعے کا ترجمہ کر کے اس کی ڈرامائی پیشکش ''معجزہ عشق'' کے نام سے اسٹیج پر پیش کی۔ یہ مختلف نظموں اور عنوان پر مشتمل ڈراما سیریز تھی۔

بجیا نے کئی انفرادی نوعیت کے جاپانی ڈرامے بھی تھیٹر میں پیش کیے جن کی کہانیاں کلاسیکل بھی تھیں اور اصل واقعات پر مبنی بھی۔ ان ڈراموں کو جاپانی ثقافتی مرکز کے تعاون سے پیش کیا گیا۔

بجیا کا ایک جاپانی ڈراما ''آیو یاگی'' نہایت یادگار ثابت ہوا۔ اس ڈرامے میں ایک جاپانی شہزادہ شکار کے دوران جنگل میں رہنے والی ایک لڑکی پر عاشق ہو جاتا ہے۔ وہ لڑکی جہاں رہتی ہے وہاں ایک نہایت بڑا درخت ہوتا ہے۔ شہزادہ جب وہاں مستقل رہائش کے لیے اپنا گھر تعمیر کرتا ہے تو تعمیر کے دوران اس ہرے بھرے درخت کی ایک شاخ ٹوٹ جاتی ہے۔ دوسری جانب اس خوب صورت لڑکی کا ایک بازو ٹوٹ جاتا ہے جس کے بعد شہزادے کو اس راز کا پتا چلتا ہے کہ لڑکی دراصل ایک درخت ہوتی ہے۔

''خالی گود'' بھی ایک یادگار اسٹیج ڈراما ثابت ہوا جو کہ دوسری جنگ عظیم میں ہیروشیما پر امریکی ایٹمی بمباری کے بعد رپورٹس کے ذریعے سامنے آنے والی ایک عورت کی حقیقی سرگزشت پر مبنی تھا۔

اسی طرح جاپانی تھیٹر کے تحت اس نے کئی دیگر ڈرامے تخلیق کیے۔

''واکا'' اور ''ہائیکو'' دو جاپانی اصناف ہیں لیکن بجیا نے جاپانیوں کے رابطے سے قبل پاکستان میں ان اصناف پر طبع آزمائی کی جب کہ خصوصاً ہائیکو کو کوئی جانتا بھی نہیں تھا۔ اس صنف کو پاکستان میں مقبولِ عام کی سند دلوانے میں بجیا نے اردو و فارسی غزل، ہندی گیت دوہے کلاسیکل راگنیاں، موسیقی، ادب اور شاعری کے جادو کو جگا کر ہائیکو اور واکا مشاعروں کو بہترین موسیقی سے ہم آہنگ کروایا۔

بجیا کی ان خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے جاپان شاہی حکومت نے انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے جاپان کے سب سے معزز سول اعزاز سے نوازا۔

جاپان کی کلاسیکی شاعروں میں راکا کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ اس کے ایک مجموعے کا انتخاب کر کے کچھ واکا ترجمہ کیے اور انہیں برصغیر کے قدیم راگوں میں ڈھالا اور اردو ہندی کی کلاسیکل شاعری کا ملاپ کیا۔ یہ کارنامہ فاطمہ ثریا کے ہاتھوں عمل میں آیا۔

واکا راگ میں جاپانی، اردو اور ہندی کلاسیکل شاعری کا ملاپ کر کے انہیں سروں اور رقص کے ذریعے تھیٹر پر پیش کیا گیا۔

یہ ثقافتی تھیٹر پاکستان اور جاپان کے سفارتی تعلقات کی گولڈن جوبلی کے موقع پر جاپانی کلچرل سینٹر اور پاکستان جاپان کلچرل ایسوسی ایشن کے تعاون سے کراچی کلب میں پیش کیا گیا۔

یہ ایک انوکھا تجربہ تھا لیکن بجیا کی مشاقی نے اسے کامیابی سے ہمکنار کیا۔ ادب اور موسیقی کے حوالے سے یہ ایک یادگار پروگرام ثابت ہوا۔

☆......☆

آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی میں سالانہ الیکشن ہونے والے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب یاور مہدی سیکریٹری تھے۔ الیکشن کی گرما گرمی تھی کہ کسی نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ سیاسی جماعتیں اپنے حمایت یافتہ نمائندوں کو کھڑا نہ کردیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو آرٹس کونسل سیاست کا گڑھ بن جائے گا۔ تمام ممبران سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ غور یہ ہونے لگا کہ ایسا کون ادیب ہے جو الیکشن لڑے تو سیاسی جماعت یا سیاسی جماعتیں اپنا نمائندہ کھڑا ہی نہ کریں یا اگر کھڑا کردیں تو وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ کئی ناموں پر غور کرنے کے بعد فاطمہ ثریا بجیا کا نام سامنے آیا۔ تمام لوگوں نے اتفاق کیا کہ فاطمہ ثریا ہی اُمید کی کرن ثابت ہوں گی چنانچہ یاور مہدی، اداکار ابراہیم نفیس اور شاعر نقاش کاظمی اس سے ملنے اس کے گھر آئے اور تمام حالات سے آگاہ کیا۔ ''بجیا اگر اس ادارے کو سیاست سے بچانا ہے تو آپ کو الیکشن لڑنا ہوگا۔''

''بھیا اگر بات یہ ہے تو ہم تیار ہیں۔''

اس کا نام ادیب و ثقافت کے حوالے سے ایسا معتبر تھا کہ جب بینر پر آویزاں ہوا تو کسی سیاسی جماعت نے اپنا نمائندہ کھڑا ہی نہیں کیا اور وہ آسانی کامیاب ہو گئی۔

آرٹس کونسل کی ثقافتی اور ادبی سرگرمیاں ماند پڑ چکی تھیں۔ چھ ماہ ہو گئے تھے مالی اور چوکیدار کی تنخواہیں تک ادا نہیں ہوئی تھیں۔ پانی اور بجلی کے کنکشن تک منقطع ہو چکے

تھے۔ تھیٹر ویران پڑا تھا۔
اس کی انتظامی صلاحیتوں سے سب واقف تھے۔ اس نے چارج سنبھالتے ہی چند مہینوں کے اندر اندر آرٹس کونسل کی عمارت کو گل و گلزار کردیا۔ بڑی بڑی سماجی و ادبی تقریبات کروائیں اور اپنے جمالیاتی ذوق سے آرٹس کونسل کو قابل دید بنادیا۔

وہ صرف ذاتی محنت ہی کو بروئے کار نہیں لائی بلکہ ذاتی تعلقات کو بھی آرٹس کونسل کی بہتری کے لیے استعمال کیا۔ ایک واقعہ سب کو یاد رہے گا۔ مصوروں کے فن پارے اسٹور میں کاٹھ کباڑ کی طرح پڑے ہوئے تھے۔ ان کی نمائش کا کوئی باقاعدہ انتظام نہیں تھا۔ بجیا نے اپنی ذاتی کوششوں سے اسلام آباد جاکر ساڑھے آٹھ لاکھ روپے کا فنڈ حاصل کیا۔ ان پیسوں سے باقاعدہ آرٹ گیلری بنی اور تمام نایاب فن پاروں کو نمائش کے لیے رکھا گیا اور پھر ایسی نمائشیں باقاعدہ ہونے لگیں۔

ایسی ہی ایک تقریب میں اس کی ذاتی دلچسپی اور دعوت پر اس وقت کے صدر پاکستان غلام اسحاق خان ایک نمائش کا افتتاح کرنے آرٹس کونسل تشریف لائے۔ آرٹس کونسل میں جامعہ کراچی کے وائس چانسلر احسان رشید کی بیگم کی خطاطی کی نمائش تھی جو کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں پر مشتمل تھی۔ وہ تقریر کرنے کھڑی ہوئی تو صدر پاکستان کو عجیب انداز سے مخاطب کیا۔

”جناب صدر! لوگ اللہ کا نام لے کر صدقہ اور خیرات مانگتے ہیں۔ ہم اللہ کے ننانوے نام لے کر آپ سے اپنے ادارے کے لیے فنڈ مانگ رہے ہیں۔“

اس بات نے ایسا اثر کیا کہ صدر صاحب نے 5 لاکھ روپے فنڈ کا اعلان کیا اور دیگر وزراء کو آرٹس کونسل کی مدد کرنے کی اپیل کی۔

آرٹس کونسل کے فنڈز نہایت محدود تھے لیکن اس نے اپنے ذاتی تعلقات و وسائل سے اتنے فنڈ اکٹھے کرلیے کہ جلسے، مشاعرے اور دیگر ثقافتی پروگرام باقاعدگی سے منعقد ہوتے رہے۔

ایک سال کی مدت پوری ہونے کے بعد بجیا نے اسٹاف کے اصرار پر دوبارہ الیکشن میں حصہ لیا مگر اس بار وہ دو ووٹوں سے ہار گئیں۔ یہ بھی ایک امر اتفاقی ہی تھا۔ جو دو ووٹ کم تھے وہ حکیم سعید اور اردشیر کاؤس جی کے تھے جو اپنا شناختی کارڈ لانا بھول گئے تھے لہٰذا ووٹ نہ ڈال سکے۔

بجیا کو کم اور دوسروں کو زیادہ افسوس ہوا۔ افسوس تو انہیں ہوتا ہے جو عہدوں کے طلب گار ہوتے ہیں وہ تو خدمت کے جذبے سے آئی تھیں۔ یہ جذبہ عہدے کے بغیر بھی قائم رہتا ہے۔

☆......☆

بڑھاپا اپنے جوبن پر تھا۔ وہ بیمار رہنے لگی تھی پھر بستر سے لگ گئی۔ اس کے گلے میں تکلیف تھی۔ وہ ایک سرجری سے بھی گزری لیکن اپنی بیماری کو کسی پر نہ تو ظاہر کیا نہ اپنے اوپر طاری کیا۔ ذرا طبیعت سنبھلتے ہی اٹھ کر کھڑی ہوگئی لیکن بولنے میں دقت تھی۔ آواز بدل گئی تھی۔ ہمت کی پیکر ثریا بجیا اب بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھی۔

حکومت کی نظر ایک مرتبہ پھر اس پر پڑی اور طے کیا گیا کہ اسے وزیراعلیٰ سندھ کی مشیر بنایا جائے۔ اس کے یہاں انکار کی تو گنجائش ہی نہیں تھی لیکن یہ ڈر ضرور تھا کہ کہیں وہ سیاست کا پرزہ نہ بن جائے لہٰذا اس نے ایک شرط سامنے رکھ دی۔

”پاکستان کے تمام لوگ میرا احترام کرتے ہیں۔ مجھ سے کبھی سیاسی بیان دینے کی توقع نہ رکھی جائے۔“ یہ شرط مان لی گئی تو اس نے یہ عہدہ قبول کرلیا۔

اس کا دفتر عام افراد کے لیے کھلا ہوا تھا۔ لوگ بلا روک ٹوک اس سے ملتے اور مختلف کاموں کے لیے کہتے۔ اگر ان کا کام کرواسکتی تو کروا دیتی ورنہ بڑے پیار سے معذرت کرلیتی۔ خود اپنے کاموں کے لیے یہ حال تھا کہ اپنے لیے نہ کوئی زمین لی نہ جایداد بنائی۔ مختلف حکمرانوں نے کئی بار اس سے کہا کہ ہم سے کوئی کام ہو تو بتائیں لیکن اس نے کچھ نہیں لیا اسی لیے وہ عزت ہمیشہ برقرار رہی جس کی وہ حق دار تھی۔ کبھی انکسار کا دامن نہیں چھوڑا ہمیشہ فخر و غرور سے دور رہی۔

وہ جس خاموشی سے کابینہ کا حصہ بنی تھی اسی خاموشی سے واپس آگئی۔

پھر بیماری کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا اور بالآخر 10 فروری 2016ء کو اس سفر پر روانہ ہوگئی جس سے کسی کو رستگاری نہیں۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج ہم کل تمہاری باری ہے

ماخذ: بجیا...... مصنفہ سید عفت حسن رضوی

اماوس کا مسافر

زویا اعجاز

اس کی رگ رگ میں رقصاں تھی، خون کے بدلے ابتلا۔ اس کی مظلومیت پر، تشنہ کام زندگی پر لوگ دل جوئی کرنے کی بجائے تبسم دیز نظروں سے اسے دیکھتے، مذاق اڑاتے۔ انہی رویوں نے اسے مہمیز کیا اور اس نے ایک اہم فیصلہ کرلیا، خود کو آزمانے کا فیصلہ، اپنی معذوری کو رکاوٹ نہ بننے دینے کا فیصلہ اور تب اسے احساس ہوا، بلکہ لوگوں کی واہ واہ نے احساس کرایا کہ وہ ایک منفرد ذہن کا شخص ہے۔ الفاظ اس کے غلام ہیں، وہ حالات کی عکاسی منفرد انداز میں کر سکتا ہے۔ معاشرے کا بخیہ ادھیڑ سکتا ہے۔ اس کے طنز میں ڈوبے شعر ارباب اختیار کے چہرے پرسجے ملمع کو نوچ سکتے ہیں۔

وسیب کے ایک بڑے شاعر کا زندگی نامہ

’وہ چارپائی پر چت لیٹا افق کی لامتناہی حدود پر نظریں جمائے کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔

کچھ روز سے اس کی طبیعت بہت خراب تھی۔ موسمی اثرات کی وجہ سے بدن بخار میں جکڑا تھا۔ اس کی صحت قطعی قابل رشک نہیں تھی۔ اس بخار نے تو رہی سہی کسر بھی پوری کردی تھی لیکن حالات چاہے جو بھی ہوں‘ اسے آسمان اور ان چاند تاروں کو دیکھتے رہنا بہت پسند تھا۔ وہ ان مناظر سے اپنی دلچسپی کے مطابق منفرد معنی و مطالب بھی

نکال لیا کرتا تھا۔
''میرے چن پتر کا کیا حال ہے اب؟'' اس کی سوچ کا ارتکاز ایک شیریں آواز سے ٹوٹا۔
''ٹھیک ہوں اماں!'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ماں اب چارپائی پر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی اور بڑی محبت سے کھانا کھلانے لگی۔ کھانے کے ساتھ اس کی نظریں اب بھی فلک پر ہی بھٹک رہی تھیں۔
''کیا دیکھ رہے ہو وہاں؟''
''چاند۔'' اس نے مختصراً جواب دیا۔
''تمہیں یہ چاند اچھا لگتا ہے کیا؟''
''ہاں! بہت زیادہ۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک راجا ہے اور اس کے آس پاس سب درباری۔ تارے تو لاکھوں ہیں لیکن چاند بس ایک ہی ہے۔ یہ نہ ہو تو دربار بالکل ادھورا ہے۔'' وہ سات سالہ بچہ اپنی عمر سے قطع نظر بہت عقلمند تھا۔
''اور کیا محسوس ہوتا ہے؟''
''میں بھی ایک ایسا ہی چاند بنوں گا۔ میرا وجود بھی روشنی کی علامت بنے گا۔ بنے گا ناں اماں!'' اس نے اپنی گہری چمکدار آنکھیں ماں کے چہرے پر جما کر آس اور اُمید سے پوچھا۔
''ہاں میرے بچے!! ایک روز یہ دنیا تیرے وجود سے ضرور روشنی پائے گی۔'' ماں نے سچے دل سے اس کی پیشانی پر ممتا کی مہر ثبت کرتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں سے دو آنسو سچے موتیوں کی طرح لڑھک کر اوڑھنی میں جذب ہوگئے۔ ''ایک بات یاد رکھنا محمد شفیع! زندگی اونچ نیچ کا دوسرا نام ہے۔ یہ ایک آزمائش بن کر انسان کا حوصلہ آزماتی ہے۔ ان آزمائشوں کے لیے چنے جانے والے لوگ بہت خوش قسمت ہوتے ہیں۔''
''میں خوش قسمت ہوں ناں اماں؟''
''ہاں! لیکن ایک بات کبھی مت بھولنا۔ دکھ اور آزمائش کی کوئی گھڑی طویل ہوجائے تو حوصلہ نہ ہارنا۔ ہمیشہ شاکر اور اپنے رب کی رضا میں راضی رہنا۔''
''میں بالکل ایسا ہی کروں گا۔ میں ہمیشہ شاکر رہوں گا۔'' محمد شفیع نے روشن آسمان کی جانب دیکھ کر کہا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ تاروں نے ٹمٹما کر اس فیصلے میں اپنی حمایت کا بھی یقین دلایا ہے اور چاند کی ضوفشانی بھی یکدم بڑھ گئی ہے۔

چہرے اور بالوں میں ماں کے ہاتھوں کا ممتا بھرا لمس محسوس کرتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے خواب نگری میں داخل ہوگیا جہاں اس کا ناتواں وجود کامل ہوکر چاند ہی کی طرح منور تھا اور تارے نہارتی ہوئی نظروں سے اسے یک ٹک دیکھتے چلے جارہے تھے۔

☆......☆

محمد شفیع نے پیدائش کے بعد دو ہی چیزیں دیکھیں اور اپنی ناتواں ذات پر جھیلی تھیں، غربت اور بیماری۔
(اس کی تاریخ و سن پیدائش میں خاصی متضاد معلومات ملتی ہیں۔ 1955,1958 کے علاوہ کہیں یہ پیدائش 1968 بھی درج ہے۔ تاہم اغلب امکان یہی ہے کہ اصل سن پیدائش 1958 ہے جسے کچھ ناگزیر وجوہات کی بناء پر قومی شناختی کارڈ میں 1955 درج کروایا گیا۔)
محمد شفیع کا تعلق ملتان کی ایک پسماندہ تحصیل شجاع آباد کے علاقے 'راجا رام' سے تھا۔ ممکن ہے کہ اس علاقے کا نام پڑھتے ہی ایسا تصور ذہن میں ابھرے کہ یہ کسی ہندو ریاست یا آبادی کا نام ہے لیکن حقائق یکسر مختلف ہیں۔ تقسیم ہند کے وقت شجاع آباد کے علاقے میں ہندو اور سکھ آبادی کی اکثریت تھی لہٰذا وہاں موجود آبادیوں کے نام بھی اسی مناسبت سے تھے۔ راجا رام بھی ایسا ہی ایک قصبہ تھا جو شجاع آباد کے جنوب مشرق میں سات کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ (1965 کی پاک بھارت جنگ کے بعد اس قصبے کا نام تبدیل کردیا گیا۔ اس جنگ میں ایک مقامی شخص 'محمد ظریف ولد ممتاز علی خان' نے 'چونڈہ' کے محاذ پر بھارتی فوج کے دانت خوب کھٹے کیے اور محض چوبیس برس کی عمر میں جام شہادت نوش کیا۔ اس بہادری کے لیے اسے حکومت کی طرف سے ستارۂ جرأت سے نوازا گیا اور اہل علاقہ نے راجا رام کا نام 'ظریف شہید' میں تبدیل کردیا۔)
محمد شفیع کے آباؤ اجداد کا دینی مدارس و تدریس سے بہت گہرا تعلق تھا۔ اس کے دادا 'مولوی اللہ وسایا' قیام پاکستان سے قبل ہی 'جھنگ' سے ہجرت کرکے 'لودھراں' کے موضع 'شیر پور حویلی' میں آباد ہوگئے تھے۔ وہ بچوں کو دینی تعلیم دینے کے علاوہ کھیتی باڑی کرتے تھے۔ مولوی اللہ وسایا کی چار بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ 'اللہ یار' اس کی سب سے بڑی اولاد تھا جو اپنے والد ہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ننھے بچوں کو دینی شعائر کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ

کھیتی باڑی کرکے رزق حلال کمانے کو ترجیح دیا کرتا۔
اس خاندان کے لیے زندگی بہت پُرآزمائش ثابت ہوتی آئی تھی۔ اللہ یار نے جب سنت رسول ﷺ پر عمل کرتے ہوئے 'مبارک مائی' نامی خاتون سے شادی کی تو 'محمد اکرم' کی صورت میں عطا ہونے والی اولاد نرینہ نے اس کی زندگی خوشیوں سے بھردی۔ ننھے بیٹے کو گود میں بھر کر سرشاری محسوس کرتے اللہ یار کو کہاں معلوم تھا کہ موت گربہ پاؤں اس کی شریک حیات کو دبوچنے کے لیے آن کھڑی ہے۔ مبارک مائی اور اس کی رفاقت بہت مختصر ثابت ہوئی۔
تقدیر ہمیشہ ہی ستم ظریفانہ مراحل میں دل دکھایا کرتی ہے۔ مرنے والے سے بے انتہا محبت و خلوص کے باوجود انسان جینا ترک نہیں کرسکتا۔ رشتے بچھڑ جاتے ہیں' کسک چھوڑ جاتے ہیں اور پھر وقت ایک روز اسی رشتے کے متبادل کوئی اور شخص سامنے لے آتا ہے۔ اللہ یار کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ معاش کی کٹھنائیاں سہتے ہوئے اس کے لیے بیٹے کی پرورش کے مراحل تنہا طے نہیں ہورہے تھے۔ خاندان کے بزرگوں نے اسے مبارک مائی کی بھتیجی 'پٹھانی مائی' سے رشتہ ازدواج میں منسلک کردیا اور زندگی ایک نئی ڈگر پر روانہ ہوگئی۔
پٹھانی مائی نے شوہر کو پانچ بیٹوں اور دو بیٹیوں کا تحفہ دے کر بھرے پرے خاندان کی تکمیل کردی لیکن آزمائش ابھی ختم کہاں ہوئی تھی؟ والدین کے لیے یوں تو اپنے گلشن کا ہر پھول بہت عزیز ہوتا ہے لیکن ایک مشاہداتی و فطری حقیقت یہ بھی ہے کہ پہلوٹھی کے بعد سب سے چھوٹی اولاد بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ پٹھانی مائی کے بطن سے آخری بار جس اولاد نرینہ نے جنم لیا' تقدیر کے ظالم شکنجہ نے اسے تختہ مشق بنانے کے لیے منتخب کرلیا تھا اور اس کا پہلا ہی وار بھرپور اور کاری تھا۔

☆......☆

محمد شریف کی عمر ابھی محض 'چھ دن' تھی کہ اسے سخت بخار نے دبوچ لیا۔
ننھی سی جان بخار میں پھنکتی رہی لیکن علاج کی کہیں کوئی سہولت دستیاب نہیں تھی۔ علاقائی روایات پسماندگی کا شکار تھیں۔ وہاں دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے رہتے تھے۔ ایسی صورت میں کسی اسپتال یا ڈاکٹر کی سہولت میسر ہوتی بھی تو کیسے؟ اس کے والدین نے بھی مقامی روایات اور اپنے آباؤ اجداد کے طور طریقوں کے مطابق دیسی ٹوٹکوں

شاکر شجاع آبادی کے اعزازات

☆ ان کا کلام میٹرک اور انٹر کے سرائیکی نصاب میں پڑھایا جاتا ہے۔
☆ شاکر کو 2007 میں 'پرائیڈ آف پرفارمنس' سے نوازا گیا۔ 2017 میں انہیں بحیثیت نمائندہ سرائیکی شاعر برائے جنوبی پنجاب 'پرائیڈ آف پنجاب ایوارڈ' ملا۔
☆ جاپان میں شاکر شجاع آبادی کی زندگی پر ایک 'ڈاکومنٹری فلم' بنائی گئی جو اٹلی میں بھی ریلیز ہوئی۔ اس بین الاقوامی شہرت کے باوجود یہ عالم ہے کہ یہ عظیم شاعر علاج اور دیگر بنیادی سہولیات سے محروم تاحال کسی مسیحا کا منتظر ہے۔
☆ 'ڈی بی اے بہاولپور چولستان ویلفیئر سوسائٹی' نے شاکر کو 'پوئیٹ آف سنچری' (1900تا2000) کے ایوارڈ سے نوازا۔
☆ شاکر شجاع آبادی نے بہاولپور میں منعقدہ پاکستان کے پہلے عالمی مشاعرہ میں بھی شرکت کی۔ ان کے کلام کی بابت 'خبریں' اخبار میں 'ضمیر جعفری' نے لکھا ''پاکستان کا پہلا عالمی مشاعرہ سرائیکی کی بیچ پر کھیلا گیا جس میں شاکر شجاع آبادی نے آل آؤٹ کردیا۔''
☆ 'بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی ملتان' کے 'سرائیکی ڈیپارٹمنٹ' کے ایک بلاک کا نام شاکر شجاع آبادی سے منسوب کیا گیا ہے۔
☆ جنوبی پنجاب میں شاکر کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ 'خواجہ غلام فرید' کے بعد وہ واحد شاعر ہیں جن کے اشعار امیر' غریب' عوام اور سیاستدانوں کو زبانی یاد ہیں۔
☆ 2001 میں شاکر نے ایک نئی شعری صنف 'بجھاول' متعارف کروائی۔ یہ ایک مشکل اور دلچسپ فن ہے۔ شاکر نے نوجوان شاعروں کو اس صنف پر طبع آزمائی کرنے کی ترغیب بھی دی ہے۔ شاکر شجاع آبادی کے علاوہ 'نظر فرید بوڈلہ' نے پہلی بجھاول لکھی۔

سے بیٹے کا ازخود علاج شروع کر دیا۔ اپنے عقائد اور سوچ کے مطابق انہیں یقین تھا کہ وہ بہت جلد صحت یاب ہو جائے گا۔ ان کا یہ عقیدہ اس وقت مزید پختہ ہو گیا جب گھر میں ایک ایسے بزرگ کی آمد ہوئی جن کا علم و روحانی مرتبہ علاقے میں بے حد مسلمہ تھا۔ محمد شریف کی یہ حالت زار دیکھ کر انہوں نے تاسف سے سر ہلایا اور استفسار کیا۔ ''کب سے ہے یہ حالت؟''

''بیماری تو اس کی پیدائش کے ساتھ ہی دبوچنے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ بخار ہے کہ اترنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ کمزوری بھی بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ اپنے ہم عمر بچوں کے برعکس یہ بہت سست، بیزار اور چڑچڑا رہتا ہے۔''

بزرگ نے محمد شریف کے نام کا زائچہ بنا کر کچھ حساب کتاب کیا اور پھر ایک آسان ترین حل تجویز کیا۔ ''بچے کا نام اس کے ستاروں سے مطابقت نہیں رکھتا۔ یہ نام اس کے لیے بہت بھاری ہے۔ اس کی صحت اور کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ آئندہ 'محمد شریف' کی بجائے 'محمد شفیع' پکارا جائے۔''

''ایسا ہی ہوگا سرکار! بالکل ایسا ہی ہوگا۔'' اہلخانہ نے یقین دہانی کروائی۔

اس صورتِ حال کا اگر حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جائے تو اس طرزِ فکر کی ذمہ داری کسی بھی فردِ واحد پر عائد نہیں کی جا سکتی۔ تعلیم اور بنیادی سہولیات کی عدم فراہمی، شعور کی کمی اور قسمت کی ستم ظریفی جب آکٹوپس کی طرح متعلقہ افراد کے ذہنوں کو جکڑ لیں تو بقاء کے لیے ایسے ہی رستے تلاش کیے جاتے ہیں۔ توہم پرستی اس علاقے کی روایات کا اٹوٹ حصہ تھی اور توہمانہ روایات کو نہایت مقدس فریضہ سمجھ کر نبھایا بھی جاتا تھا۔

'محمد شریف' سے 'محمد شفیع' بننے کے اس سفر نے کچھ اور پڑاؤ طے کیے تو والدین کو علم ہوا کہ بیٹے کی حالت بہتری کی بجائے ابتری کی طرف مائل ہو رہی ہے۔ اس کی جسمانی حرکات و سکنات بہت بے ربط تھیں۔ ٹانگ میں کھنچاؤ اور لنگڑاہٹ کی کیفیت بہت اذیت ناک تھی۔ سوچ بچار کے بعد اسے سرکاری اسپتال لے جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب وطنِ عزیز میں تقسیم کے بعد کا جوش و ولولہ خوابیدگی میں مبتلا ہونا شروع ہو چکا تھا۔ سیاسی افق پر بے یقینی اور آمریت کے بادل چھائے تھے۔ ہر سُو انتشار کی آندھی تھی اور انفرادی مفادات کی ترجیح ایک معمول بننے لگا تھا۔ سرکاری ادارے بھی لامحالہ طور پر اس طوفان کی زد میں آ رہے تھے۔ ایسے میں جنوبی پنجاب کے اس پسماندہ علاقہ کے غربت زدہ افراد کی دادرسی ہوتی بھی تو کیسے؟ ڈاکٹرز نے بھی ان سادہ لوح اور پریشان حال والدین کے ساتھ نہایت غیر ذمہ دارانہ اور پیشہ وارانہ اخلاقیات سے منافی برتاؤ کیا۔

''یہ حالت کب سے ہے اس کی؟''

''بچپن ہی سے جناب۔ پیدائش کے بعد ہونے والے بخار کے بعد مسئلے بڑھتے ہی چلے گئے ہیں۔''

''پہلے کیوں نہیں لائے اسے؟''

''اگر اتنا علم یا وسائل ہوتے تو یہ کوتاہی کرتے ہی کیوں؟ والدین اپنی اولاد کو دانستہ روگی تھوڑے ہی بناتے ہیں۔'' انہوں نے عاجزی سے جواب دیا۔ وہ آس اور یقین کی ڈور تھامے یہاں آئے تھے۔ اپنے بیٹے کے علاج کے لیے کسی بھی ممکنہ حد تک علاج بھی کروانے کے لیے تیار تھے۔

ڈاکٹر بے پروائی سے شفیع کا معائنہ کرنے لگا اور پھر سپاٹ انداز میں گویا ہوا۔ ''اسے پولیو کا مرض ہے۔ مناسب دیکھ بھال اور دوائیاں استعمال کرتے رہو۔''

محمد شفیع کے اہلخانہ مایوسی سے لوٹ گئے اور تقدیر اپنے اس نئے وار اور ان کی لاعلمی پر محظوظ ہوتی رہی۔ اسے پولیو کا مرض تھا دیکھ بھال اور ادویات سے حالت میں بہتری آتی تو کیسے؟ اصل مرض کا علم ہونا تو تھا لیکن وہ وقت ابھی بہت دور تھا۔

☆......☆

محمد شفیع کی زندگی کے ابتدائی آٹھ سال چارپائی کی قید میں بیت گئے۔ اس معصوم اور ننھی سی جان کو سمجھ ہی نہ آتا کہ اس کے اردگرد بسنے والے سب افراد اور ہم عمر بچے چلتے پھرتے، بھاگتے دوڑتے اور کھیل کود میں مگن رہتے ہیں لیکن وہ اپنی جسمانی حرکات پر قادر کیوں نہیں ہے؟ اس کا ذہن الجھ کر رہ جاتا تھا۔ پٹھانی مائی اور مولوی اللہ یار اس کی ہر ممکن دلجوئی کرتے۔ بہن بھائی بھی ڈھارس بندھایا کرتے مگر وہ کبھی اپنے دماغ میں پنپنے والی سوچوں سے فرار حاصل نہ کر سکا۔ اللہ یار نے علاقائی اور خاندانی روایات کے مطابق بیٹے کو قرآن ناظرہ کی تعلیم دی اور بعد ازاں پہلا اور آخری سیپارہ بھی حفظ کروا دیا۔

شفیع کے وجود میں ہمہ وقت ایک جنگ جاری رہتی تھی۔ اسے علم ہو چکا تھا کہ دیگر افراد کی طرح نارمل زندگی گزارنے کے لیے خود محنت کرنی ہوگی۔ بہن بھائیوں اور والدین کی توجہ میں کہیں کوئی کمی نہیں تھی لیکن اس کی خودداری اپنی ذات کو بوجھ بنتے گوارا ہی نہ کرتی۔ اس نے ہوش سنبھالتے ہی پٹھانی مائی کو ان تھک محنت کرتے دیکھا تھا۔ بڑھتی عمر، وسائل کی کمی اور عزیز از جان اولاد کے اس دکھ نے اسے صدیوں کا مسافت گزیدہ بنا دیا تھا اور نتیجتاً اس کی طبیعت بھی ناساز رہنے لگی۔ ان تمام حالات کے پیشِ نظر محمد شفیع نے اپنی تمام تر قوت ارادی اور ہمت بروئے کار لاتے ہوئے چلنے پھرنے کا تکلیف دہ مرحلہ بھی طے کرنا شروع کر دیا۔ کرب اور اذیت اپنی روح و قلب کے نہاں خانوں میں چھپائے اس نے مصائب کا سامنا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کم عمری میں بھی وہ اپنے ارادوں اور دھن کا بہت پکا تھا۔

اس کے معمولات میں یہ تبدیلیاں آتے ہی والدین کی تو دلی مراد بر آئی۔ وہ ایک نئے سرے سے جی اٹھے تھے۔ بیٹے کی ذات سے وابستہ سبھی ارمان بھی ایک بار پھر زندہ ہو گئے۔ دینی تعلیم کے ساتھ اسے دنیاوی علوم سے آراستہ کرنے کا آغاز کرتے ہوئے اسے 'دستی مٹھو' داخل کروا دیا گیا لیکن اس کی آزمائشوں کا سلسلہ ابھی ختم ہی کہاں ہوا تھا؟

یہ وہ وقت تھا جب ہمارے ہمسایہ ملک نے اپنے عسکری غرور میں ملکی سرحدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے رات کے اندھیرے میں طبلِ جنگ بجایا تھا۔ وہ جنگ تو سترہ روز میں ختم ہو گئی تھی لیکن ملک کو ترقی و خوشحالی کی دوڑ میں سترہ سال پیچھے دھکیل چکی تھی۔ غربت و پسماندگی نے حالات مزید ابتری کی طرف مائل کر رکھے تھے۔ اس صورتِ حال میں شفیع نے جب اپنی تعلیم کا آغاز کیا تو حیرت، شوق اور تجسس کا ایک جہان اس کا منتظر تھا۔ بیرونی دنیا سے یہ نیا رابطہ اسے بہت اچھا لگنے لگا۔ ذہنی افق وسیع ہوا تو اس کی حساس سوچ لہولہان کرنے کے لیے بہت سے کانٹے بھی منتظر تھے۔

نئی دنیا میں قدم رکھتے ہی سب سے پہلے امارت و غربت کے فرق نے اس کا استقبال کیا۔ زمینداروں کے بڑے پختہ اور خوبصورت مکانات دیکھ کر علاقے کے دیگر کچے اور بنیادی سہولیات سے عاری گھر یاد آتے تو ذہن میں کئی ایک سوال پیدا ہونے لگتے۔ پروردگار کی تخلیق کردہ

شاکر شجاع آبادی کی ذاتی پسند و ناپسند

☆ شاکر کا پسندیدہ ترین شہر بہاولپور ہے۔ مشہور شاعر 'خواجہ غلام فریدؒ' نے بھی اسی شہر میں لازوال شاعری تخلیق کی۔

☆ شاکر موسیقی کے بھی دلدادہ ہیں۔ انہیں سرائیکی گلوکاروں میں 'منصور ملنگی' کے علاوہ کہروڑ پکا سے تعلق رکھنے والا گلوکار 'اشرف خان' پسند ہے۔ پنجابی گلوکاروں میں 'شوکت علی' کے سوا کوئی نہیں بھایا۔

☆ سیاست کے درپردہ حقائق اور منافقت کے بھرم چاک کرنے والے شاکر شجاع آبادی آج بھی زندگی کا وہ دور نہیں بھول سکے جب 'ذوالفقار علی بھٹو' کے فسوں خیز خطابات اور سچائی و نیک نیتی پر مبنی سیاست نے ان کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ وہ خلوص اور بے باکی آج تک کسی سیاستدان میں انہیں دوبارہ نظر نہیں آئی۔

☆ مذہبی و ادبی لحاظ سے شاکر کی پسندیدہ کتاب 'قرآن مجید' ہے۔ ہلکا سرخ رنگ، گلاب کا پھول، چادر قمیص بطور لباس، نمکین کھانے اور میٹھے میں صرف چائے پسند ہے۔ حلوا انہیں بالکل پسند نہیں۔

☆ شاکر شجاع آبادی کو ہاکی بہت پسند تھی۔ قومی کھیل کے زوال نے انہیں کرکٹ کی جانب راغب کر دیا۔ 'ویراٹ کوہلی' (بھارت)، 'گرانٹ فلاور' (زمبابوے)، 'بریٹ لی' (آسٹریلیا)، 'ڈی کاک' (جنوبی افریقا)، 'ڈینیل ویٹوری' (نیوزی لینڈ)، 'محمود اللہ' (بنگلہ دیش)، 'کمار سنگا کارا' (سری لنکا)، 'پال کالنگ ووڈ' (انگلینڈ) اور 'براوو' (ویسٹ انڈیز) نے اپنی صلاحیتوں سے متاثر کیا۔ قومی ٹیم میں انہیں 'انضمام الحق' اور 'مصباح الحق' بہت پسند ہیں۔

☆ ان کی شاعری میں قارئین کو اکثر 'دریائے ستلج' کا بہت تذکرہ ملتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہیں محض یہی دریا بہت پسند ہے لیکن حقیقت بالکل متضاد ہے۔ انہیں اپنے ملک کے ہر چپے و گوشے سے بے انتہا محبت ہے تاہم ستلج کا بھارتی قبضہ میں ہونا ایک بے عنوان ہڑک میں مبتلا رکھتا ہے۔

کائنات میں انسانوں کی بنائی گئی اس غیر مساوی تقسیم کا کوئی منطقی جواب مل کے ہی نہ دیتا۔ اس معاشرتی ناہمواری نے اس کے اندر اضطراب برپا کرنا شروع کر دیا۔ ان سوالوں کے جواب تلاشتے ہوئے وہ ایک ایسی رہگذر کا مسافر بننے لگا جو بالآخر 'انقلاب' پر ہی منتج ہوتی ہے۔

☆......☆

محمد شفیع کی اس نئی زندگی میں دوسری رکاوٹ ہم مکتب بچے تھے۔

اسے تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ اسکول بھی بہت خوشی سے جاتا تھا۔ وسائل کی کمی اور مسائل کی فراوانی کے باوجود اس نے حصول تعلیم میں کوئی کوتاہی نہیں برتی۔ وہ اپنی معذوری اور مصائب پس پشت ڈال کر ایک نارمل زندگی جینا چاہتا تھا لیکن سب بچے ہر پل یہ احساس دلاتے کہ وہ ان سے منفرد ہے لہٰذا اسے ان کے ساتھ کسی قسم کی برابری کا بھی کوئی حق نہیں۔ قصور شاید ان کا بھی نہیں تھا۔ وہ جس گھٹن زدہ معاشرے اور افلاس میں زندگی گزار رہے تھے' اس کے ردِعمل میں ان سے یہی طرز زندگی متوقع تھی۔ ایسے ماحول میں رہتے ہوئے کسی بھی کمتر کو دیکھ کر احساس برتری کا ناگ پھن پھیلائے جھومنے لگتا ہے اور اس ناگ کے لیے اپنا زہر منتقل کرنے کے لیے شفیع سب سے زیادہ آسان شکار تھا۔

ہم مکتب بچے اسے کچوکے دیتے' طنز کرتے اور کئی ایک تو باقاعدہ پتھر بھی برسانے لگتے۔

''تم لوگ میرے ساتھ یہ برتاؤ کیوں کرتے ہو؟ میں تو تم سب سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔''

''تم ہمارے دوست کیسے بن سکتے ہو بھلا؟ تمہیں تو یہاں پڑھنا ہی نہیں چاہیے۔''

''لیکن کیوں؟ میں بھی تو تم سب جیسا ہی ایک انسان ہوں۔''

''تم کبھی بھی ہم جیسے نہیں بن سکتے۔'' وہ قہقہے لگا کر اس کی معذوری کو نشانہ بناتے۔

''آج میرا وقت نہیں ہے۔ میں اماوس کی تاریکی میں گھرا ہوں لیکن وقت سدا ایک سا نہیں رہتا۔ اماوس کے بعد بھی چاند کا سفر جاری رہتا ہے اور ایک روز روشنی کے دائرے میں دوبارہ داخل ہو جاتا ہے۔'' اس نے کتاب کا وہ جملہ دہرایا جسے اس نے دماغ کی سلیٹ پر لکھ رکھا تھا۔ اس کی بات سن کر بچے ایک بار پھر قہقہے لگاتے پتھر برسانے لگے۔

''وہ وقت بہت جلد آئے گا جب تم سب مجھے سلام کیا کرو گے اور میری عزت کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔'' محمد شفیع نے سینہ تان کر کہا اور نہایت باوقار انداز میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔

☆......☆

پرائمری جماعت مکمل ہوئی تو اسے علاقے کے 'گورنمنٹ ہائی اسکول' میں داخل کروا دیا گیا۔ اس کی محنت اور قابلیت سے اساتذہ بہت خوش تھے۔ اپنی جسمانی معذوری اور ناتوانی کو کبھی بھی پڑھائی کے آڑے نہیں آنے دیا تھا۔ ششم جماعت میں آکر تو جوش وولولہ اور بھی بڑھ گیا تھا۔ آنکھوں میں 'میٹرک' اور پھر مزید اعلیٰ تعلیم کا خواب در آیا۔ اچھی پڑھائی سے ایک بہترین مستقبل وابستہ تھا اس لیے وہ ہر تکلیف پس پشت ڈالے محنت کرتا رہا۔ مشکلات تو اس کی ہم جولی بن چکی تھیں اور اس کے دامن سے علیحدگی کے لیے تیار ہی نہ تھیں۔

نئی جماعت میں آمد کے بعد گھریلو حالات بدترین ابتری کا شکار ہو چکے تھے۔ اس آفاقی حقیقت سے چشم پوشی ممکن ہی نہیں کہ کسی بھی مکان کو گھر بنانے اور اہلخانہ کو ایک لڑی میں پرو کر رکھنے والی ذات صرف 'ماں' ہی کی ہوتی ہے۔ یہ انمول ہستی ایک ایسا مدار ہوتی ہے جس کے گرد اولاد اور گرہستی کا پورا نظام گردش کرتا ہے اور اگر یہی مدار ذرا سا بھی کمزور ہو جائے تو اس سے منسلک سبھی افراد بری طرح بکھر کر رہ جاتے ہیں۔ محمد شفیع کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ غربت اور مسائل کی چکی میں پستی پٹھانی مائی سے زندگی نے جینے کا خراج وصول کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ 'تپ دق' میں مبتلا ہو گئی۔ عین ممکن ہے کہ اگر وہ کسی متمول گھرانے کی رہائشی ہوتی تو بہترین علاج اور خوراک کے ساتھ یہ مرض اس کے وجود پر اپنی گرفت کمزور کر دیتا لیکن وہ تو جنوبی پنجاب کے اس دور افتادہ علاقے کے دیندار اور رزق حلال کے لیے تگ ودو کرنے والے گھرانے سے منسلک تھی جہاں زندگی نے کبھی کوئی رحم نہیں دکھایا تھا۔ محدود آمدن اور علاج کے ساتھ تپ دق سے ہونے والی اس جنگ میں فتح نہایت کروفر سے دور کھڑی ان کا منہ چڑاتی۔

مولوی اللہ یار اور اس کی سبھی اولاد اسے ہر ممکن سہولت فراہم کر رہی تھی۔ اخراجات اور آمدن میں عدم توازن یکدم بڑھ گیا۔ اس صورتِ حال میں شفیع کیوں کر

چپ رہتا؟ اس نے پڑھائی ترک کر کے والدہ کی ادویات کے اخراجات اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی معذوری اور جسمانی نقاہت کے باعث سب ہی اس فیصلے سے ناخوش تھے۔ اساتذہ بھی تعلیم جاری رکھنے کی ہی تلقین کر رہے تھے۔

''یہ وقت بہت سوچ سمجھ کر گزارنا ہو گا۔ جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہ کرو۔ تم پڑھائی کے ساتھ بھی تو کوئی کام جاری رکھ سکتے ہو۔''

''میں اتنا باہمت نہیں ہوں ماسٹر جی! کتاب کھولتا ہوں تو ماں کا چہرہ الفاظ پر حاوی ہو جاتا ہے۔ بچپن سے ہی اس نے مجھے اپنی ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا۔ اب اس مشکل وقت میں اگر میں اس کی خدمت نہ کروں تو تف ہے اس زندگی پر۔''

''میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں شفیع!! پڑھ لکھ کر اچھا مستقبل ملے گا تو گھر والوں کی زیادہ خدمت کر سکو گے۔''

''کل کس نے دیکھا ہے ماسٹر جی؟ جو پیسے میری کتابوں کاپیوں پر خرچ ہوتے ہیں' وہ میری ماں کی دوائی یا اچھی خوراک میں استعمال ہوں تو مجھے زیادہ سکون ملے گا۔'' اس نے ادب سے کہا۔

اس کے بعد محمد شفیع کی زندگی کا ایک ایسا دور شروع ہوا جو محنت ومشقت اور کٹھنائیوں سے عبارت تھا۔ اس کے ہم عمر بچے کھیل کود میں مگن ہوتے تھے اور وہ سبزی فروش بن کر علاقے میں چکر لگایا کرتا۔ اجرت معمولی ہی سہی لیکن اس رقم سے والدہ کی دوائی یا ضرورت کی کوئی بھی چیز مہیا کر دینے سے اسے ناقابل بیان سکون ملتا تھا۔ وہ جب بھی کوئی کام کرنے کی ٹھان لیتا تو کوئی بھی خارجی عنصر اسے اپنے فیصلے سے ایک انچ پیچھے نہ ہٹا پاتا۔ اس نے صرف سبزی فروشی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ پرچون کی دکان بھی سنبھالی۔ کسی 'فالودہ فروخت کرنے کے علاوہ لنڈے کا کام بھی کیا لیکن موت کے ظالم پنچھی کو اس کے کسی بھی عمل پر ذرا ترس نہ آیا۔ دکھ اور بیماری سے لڑتی پٹھانی مائی ایک روز خاموشی سے ان سب کو چھوڑ کر سفر آخرت پر روانہ ہو گئی۔

ماں سے محرومی اس کے لیے بہت بڑا دھچکا تھا۔ وہ روتا رہا' بلکتا رہا مگر کوئی بھی پکار اس کے بے جان وجود میں حرکت پیدا نہ کر سکی۔ رشتہ دار' اہلخانہ اسے صبر کی تلقین کرتے' حوصلہ بندھاتے تو وہ مچلتے ہوئے کہتا۔ ''میری ایک پکار پر ماں لپک کر میرے پاس آیا کرتی تھی۔ اب وہ کیوں

نہیں سن رہی؟''

''وہ اتنی ہی عمر لکھوا کرلائی تھی پتر! بیمار بھی تو تھی۔ اللہ پاک نے اس کی مشکل آسان کردی۔''

''بیمار تھی تو کیا ہوا؟ مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے نظر تو آتی تھی۔ مجھے یہ علم تو ہوتا تھا ناں کہ دن بھر محنت مزدوری کرکے جب گھر جاؤں گا تو اس کی ممتا بھری مسکراہٹ اور بے لوث دعائیں میری ساری تھکان اتار دیں گی۔ میرے ہاتھوں اور وجود پر لگے زخموں میں اس کے ایک ہی بوسے سے ٹھنڈک اتر آتی تھی۔'' اب وہ باتیں بہت گہری کرنے لگا تھا۔ کتابوں کے جملے خیالات اس کی زبان پر مچلتے۔

''حوصلہ کر پتر!! اللہ کی امانت تھی' اس نے واپس لے لی۔''

''نہیں آتا حوصلہ! کیا کروں میں؟ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میری زندگی بے مقصد ہوگئی ہے۔'' وہ بلکتے ہوئے کہتا۔

''ایسا نہیں کہتے پتر!! اللہ پاک نے ابھی تجھ سے بہت کام لینے ہوں گے۔ ایسے کام جو کوئی دوسرا نہیں کرسکتا ہوگا۔'' اہلخانہ اور رشتہ دار اسے بھرپور تسلی دیتے۔

اس کے بعد محمد شفیع کی زندگی میں اداسی ٹھہر گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اندھیری راہوں کا مسافر بن چکا ہے جس کی منزل اور نشان ہمیشہ کے لیے کھو گئے ہیں۔ اس کا دل ہر ایک شے سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ والد اور بہن بھائیوں کا پیار اپنی جگہ مکمل تھا لیکن اس کے وجود میں پیدا ہونے والا خلاء اور تشنگی ہر پل بے چین رکھتی۔ ماں کی خالی چارپائی اور سونا گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ اس محرومی اور اذیت سے لڑتا جب وہ بے حال ہوگیا تو گھر بدری کا فیصلہ کرکے بہاولپور منتقل ہوگیا۔

نئے شہر میں بھی مشکلات اور آزمائشوں نے اس کا والہانہ استقبال کیا اور پھر کچھ ہی عرصہ میں محمد شفیع پر ایک اور حقیقت آشکار ہوئی کہ بلند و بالا' پختہ مکانوں اور عمارتوں کے مکین دراصل 'بونے' ہیں۔ وہ کسی بے بس' مجبور اور معذور شخص کو مزید تکلیف میں مبتلا کرکے خوش تو ہوسکتے ہیں لیکن اس کی مدد تو درکنار دو تسلی بھرے الفاظ بھی ادا نہیں کرسکتے۔ ان کے وضع کردہ اصول و ضوابط کے مطابق ایک مکمل اور بھرپور انسان ہی زندگی سے خوشیاں کشید کرنے کا اہل ہوتا ہے۔ ادھورا وجود اس دنیا میں کسی بھی باعزت مقام کے لیے نااہل ہے۔ حسب سابق اس نے ان سب باتوں کو روح کی گہرائیوں میں جذب کرلیا اور محنت جاری رکھی۔ مزدوری سے آغاز کرنے کے بعد اس نے کچھ ہی عرصہ میں پھلوں کا ٹھیلا لگا لیا۔

اس پردیسی اور مفلوک الحال کے لیے کسی مقامی فرد کے دل میں کوئی مثبت جذبہ پیدا نہ ہوا۔ پھل فروشی سے حاصل ہونے والی رقم بھی ضروریات زندگی پوری کرنے کے قابل کہاں تھی؟ شب بسری کے لیے کسی بھی چھوٹے موٹے کمرے یا جھونپڑی تک کا کرایہ ادا کرنے کی استطاعت نہیں تھی۔ تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق شفیع نے ایک درمیانی راہ نکال لی۔ دن بھر پھل فروخت کرنے کے بعد شام ڈھلے اسی ٹھیلے پر کمر ٹکا کر نیند کی جبلی ضرورت پوری کرتا اور اگلے روز پھر کام میں جت جاتا۔

بڑے شہر میں آنے اور یہاں رہنے کے باوجود وہ کوئی منفی خصلت نہیں اپنا سکا تھا۔ اس کے دل میں احساس محرومی' محبت اور عاجزی ہنوز برقرار تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب ہی بہن بھائی اپنی زندگیوں میں مصروف ہوتے چلے گئے لیکن اس کی رفیق اب بھی تنہائی ہی تھی۔ اس کی انا اور خودداری یہ بات گوارا ہی نہ کرتی کہ انہیں اپنے وجود سے کسی بھی قسم کی کوئی تکلیف پہنچائے۔ رفتہ رفتہ اس کی زندگی کا مرکز صرف والد کی ذات بن گئی۔ وہ اپنی تمام ترکمائی مولوی اللہ یار کو دے آیا کرتا۔

محمد شفیع بہاولپور میں طویل عرصہ قیام کے بعد بھی اپنا ذاتی تشخص تسلیم کروانے میں ناکام تھا۔ کمزور جسامت اور غیر اختیاری معذوری کے باعث لوگ اسے 'مولا جٹ' اور کئی ایک ایسے ہی طنزیہ القابات سے پکارتے۔ زندگی سخت سے سخت تر ہوتی جارہی تھی۔ ہر روز وہ اپنی ذات و شناخت کی دھجیاں اڑتا دیکھتا اور کسی اسفنج کی طرح یہ سب اپنے اندر جذب کرلیتا۔ انہی دنوں اس کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو اکثر اسے ذریعہ معاش میں وسعت پیدا کرنے کا مشورہ دیتا تھا۔

''تم اتنی محنت کرتے ہو لیکن صلہ میں کیا ملتا ہے بھلا؟ اپنے لیے رہنے کی کوئی جگہ تو بنا نہیں سکے۔''

''میں اپنی آمدن والد صاحب کو دے آتا ہوں۔ ان کا حق سب سے مقدم ہے۔'' شفیع کہتا۔

''اچھی بات ہے۔ میں ایسا کرنے سے کب منع کررہا ہوں؟ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ مہنگائی بڑھتی جارہی ہے۔ اسی حساب سے آمدن بھی تو بڑھنی چاہیے ناں؟''

''بڑھنی تو چاہیے۔ اسی سے تو توازن پیدا ہوگا۔''

''شاباش! اب سمجھے ناں میری بات۔''

''مجھے کیا کرنا چاہیے پھر؟''

''کاروبار بڑھاؤ۔ ٹھیلے کی بجائے کسی ٹرک میں مال بھرو اور مختلف دکانوں پر سپلائی کرو۔ اس سے تمہیں منافع بھی کافی ہوگا۔''

اس تجویز نے شفیع کو بہت متاثر کیا۔ اس نے کچھ سوچ بچار کے بعد اپنے شناسا افراد سے رقم ادھار لی اور ذاتی جمع پونجی بھی شامل کرکے ایک ٹرک گاجر' گوبھی سے بھرلیا۔ اب ناتجربہ کاری کہیے یا خرابی قسمت۔ اس نئے کاروبار میں اسے شدید خسارہ کا سامنا کرنا پڑا۔ ناکامی کا یہ دکھ ہی کم نہ تھا کہ قرض خواہوں نے اس کا جینا دوبھر کردیا۔

''ارے! میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ یہ کاروباری صلاحیتیں اس کے بس کا روگ نہیں ہیں۔'' کوئی دل جلا اسے دیکھتے ہی کہتا۔

''خواہ مخواہ اتنے پیسے دے دیئے۔ اب ادائیگی کون کرے گا؟'' دوسری آواز ابھرتی۔

سبزی منڈی میں افواہوں اور چہ میگوئیوں کا ایک بازار گرم ہو چکا تھا۔ وقت کچھ مزید سرکا تو انہوں نے براہ راست مطالبے شروع کردیئے۔ ''ہماری رقم کب لوٹا رہے ہو بھئی؟''

''جلد ہی لوٹا دوں گا۔ ذرا صبر رکھو۔''

''ارے صبر کیسے کرلیں مولا جٹ صاحب!! ساری منڈی جانتی ہے کہ تمہیں خاصا گھاٹا ہوا ہے۔''

''آج گھاٹا ہوا ہے تو کل فائدہ بھی ہوسکتا ہے۔'' اس کا عزم برقرار تھا۔

''بس کرو بھئی! کیا ہم نہیں جانتے کہ بیل کبھی دودھ نہیں دے سکتا۔''

''میں اتنی رقم یکدم کہاں سے لے آؤں؟'' وہ ان کی رکھائی پر حیران ہوتا۔

''یہ تمہارا دردسر ہے۔ اپنا آپ گروی رکھو یا گردے بیچو۔ ہمیں بس اپنی رقم سے غرض ہے۔''

موجودہ صورت حال اس کے لیے جتنی پریشان کن تھی' انسانیت کا یہ نیا روپ اس سے بھی زیادہ بھیانک اور کریہہ۔ غربت و امارت' معذوری و کامل وجود میں فرق کے بعد بے حسی' خود غرضی اور طوطا چشمی کا سبق بھی زندگی نے بہت اہتمام سے پڑھایا تھا۔ محمد شفیع نے حسب سابق یہ سبق بھی سر جھکائے لیکن سینہ تانے سیکھا اور روح کی آبیاری کے لیے اپنے اندر جذب کرلیا۔

شاکر شجاع آبادی کی غزلیات اور مذہبی کلام

☆ شاکر نے صرف سرائیکی ہی نہیں بلکہ اردو اور پنجابی زبانوں میں بھی شاعری کی۔ ان کی شاعری کی ہر صنف ہی شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ چند ایک مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ستم کو اپنے قدرت کا کبھی انداز مت دینا
وہ بے آواز لاٹھی ہے اُسے آواز مت دینا
ستم جب لوٹتے ہیں تو ستم گر پر جھپٹتے ہیں
ستم جیسے عقابوں کو کھلی پرواز مت دینا
وہ تھا محمود جس کو تھی پرکھ سنگ و جواہر کی
اوباما ہو اُسامہ ہو انہیں ایاز مت دینا
تیرے احباب ہیں یا اغیار ہیں تیرے تعاقب میں
کسی کو اپنی مجبوری کا کوئی راز مت دینا
یہ جھوٹا اعتماد بس اپنا اپنے پاس رہنے دو
کسی مجبور کو شاکر یہ دھوکا باز مت دینا

☆

ہے شکر نیکیوں کا ملتا صلہ نہیں ہے
کچھ آخرت کی سوچیں دنیا میں کیا نہیں ہے
ان نفرتوں سے کہہ دو کسی زندگی سے کھیلیں
ڈھانچے سے کھیلنے کا کچھ فائدہ نہیں ہے
کتے سی ہوگئی ہے کچھ آدمی کی فطرت
چپکے سے کاٹتا ہے بھونکتا نہیں ہے
ہجر و وصال دکھ سکھ سب کچھ دماغ میں ہیں
دل ہے دھڑکتا پُرزہ اس کے سوا نہیں ہے
موجود ہو خدا بھی شاکر بھی جھوٹ بولے
ابلیس جتنا مجھ میں تو حوصلہ نہیں ہے

☆......☆

قرض خواہوں کے مطالبات بڑھتے ہی چلے جارہے تھے۔ بدلحاظی اور شکن آلود پیشانیاں خطرناک تیوروں میں تبدیل ہونے لگیں۔ پریشانی اس کے وجود سے جھلکتی نمایاں ہونے لگی تو بڑے بھائی 'محمد اعظم' کی جہاندیدہ نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

''کیا بات ہے شفیع؟ اس قدر الجھے الجھے کیوں رہنے

لگے ہو؟'' انہوں نے خلوص سے پوچھا۔
''ایک بہت بڑے مسئلہ میں پھنس چکا ہوں۔''
''ایسی کیا بات ہوگئی؟''
''کاروبار میں ترقی کے لیے سبزیوں کا ایک ٹرک خرید کر فروخت کیا لیکن یہ گھاٹے کا سودا ثابت ہوا۔ جن لوگوں سے پیسے ادھار لیے تھے وہ میری جان کو آگئے ہیں۔ ان کا بس چلے تو میری بوٹیاں نوچ لیں۔'' اس کی پریشانی جان کر اعظم بھی متفکر ہوگیا۔
''یہ تو بہت گھمبیر صورتِ حال ہے۔''
''ہاں لالہ! یہ لوگ میری جان کے درپے بھی ہوسکتے ہیں۔''
''اللہ خیر کرے!! تم اس جگہ سے لاتعلقی اختیار کرلو۔ اب وہاں جانا اور رہنا کسی صورت بھی مناسب نہیں۔''
''لیکن کام دھندا چھوڑ بیٹھا تو کیسے گزارا کروں گا؟''
''ہم ہیں ناں تیرے ساتھ۔ خود کو اکیلا کیوں سمجھتے ہو؟''
''آپ کی محبتوں سے کب انکار کررہا ہوں؟ مگر میں فارغ نہیں رہ سکتا۔ مجھے آج بھی اس گھر کے چپے چپے سے ماں کی خوشبو آتی ہے۔ سوچ ہر بار یہ فریب دیتی ہے کہ جب بھی گھر آؤں گا' وہ مجھے اپنے سینے سے لگا کر ممتا کی چھاؤں میں بٹھالے گی اور میری ساری تھکن ختم ہوجائے گی۔''
''ماں کی کمی تو کوئی بھی پوری نہیں کرسکتا میرے بھرا!! یہ کسک تو آخری سانس تک یونہی ہم سب کے ساتھ رہے گی۔''
''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ کوئی کام دھندا نہ کیا تو پاگل ہوجاؤں گا۔'' اس نے بوجھل سانس لی۔
اعظم بھی گہری سوچ میں ڈوب گیا اور پھر کسی خیال کے تحت کہنے لگا۔ ''یہاں سے کئی لڑکے لاہور' پنڈی اور کراچی جاکر ملازمت کرتے ہیں۔ معاوضہ بھی اچھا مل جاتا ہے۔ میرے بھی کچھ دوست وہاں گئے ہیں۔ دوسرے شہر میں جاؤ گے تو آب وہوا کی تبدیلی بھی مثبت اثر ڈالے گی۔''
''آپ کی کیا رائے ہے؟''
''کراچی بہتر رہے گا۔ سنا ہے بہت غریب پرور شہر ہے۔ میں تمہاری نوکری کے لیے بھی کوئی نہ کوئی بندوبست کردوں گا۔''
''لیکن اگر وہ قرض خواہ گھر تک آگئے تو؟''
''تو بھی کوئی مسئلہ نہیں!! ہم بات چیت سے مسئلہ حل کرلیں گے اور ہوسکا تو تھوڑی تھوڑی رقم سے قرضہ بھی چکادیں گے۔ تم پریشان نہ ہو۔'' اعظم نے دلاسہ دیا۔ شفیع بھی اس تجویز سے قائل نظر آنے لگا اور یوں اس کی زندگی ایک اور نئے دور میں داخل ہوگئی۔

☆......☆

محمد شفیع دو دہائیوں سے زائد بہاریں دیکھ چکا تھا لیکن اس کے نصیب کی پرچھائی اماوس کی سیاہی کم نہیں ہوسکی تھی۔
کراچی میں اعظم ہی کے توسط اسے بعوض بیس روپے یومیہ ایک زیرِ تعمیر عمارت کی چوکیداری مل گئی۔ اس کی جسمانی حالت' کمزور صحت اور دیگر طبی مسائل کے علاوہ کٹھنائیاں بھی جوں کی توں برقرار تھیں۔ اس یومیہ اجرت میں کھانے اور سگریٹ کے اخراجات بمشکل پورے ہوتے تھے۔ اکثر فاقہ کی نوبت بھی آجاتی۔ ایک بار تو یہ بھی ہوا کہ پانچ روز تک کھانے کے لیے کچھ بھی حاصل نہ ہوسکا۔ اناج کی ایک کھیل بھی اڑ کر منہ میں نہ گئی۔ کمزوری اس قدر ہوچکی تھی کہ جسم بے جان محسوس ہونے لگا۔ بھوک نوکیلے پنجوں سے جب معدہ ادھیڑتی تو اپنا وجود نوچنے کو دل چاہنے لگتا۔ شفیع کی اس کیفیت کا اندازہ تو وہی کرسکتا ہے جس نے بھوک اور فاقوں کی سختی برداشت کی ہو۔ یہی تو وہ حالت ہوتی ہے جب انسان بآسانی جرائم کی دلدل میں دھنسنے کے درپے بھی ہوجایا کرتا ہے۔ شفیع نے بہرحال ایسا نہ کیا۔ جب برداشت کا یارا نہ رہا تو اس نے اردگرد بکھرے سگریٹ کے ٹکرے چبانے شروع کردیئے۔ انسانیت و غربت زدگی کا یہ درجہ کسی بھی دردمند کو خون کے آنسو رلانے کے لیے کافی ہے۔
تلخیِ حیات اس کے دل و دماغ میں مکمل سرائیت کرچکی تھی۔ معاشی عدم مساوات' طبقاتی فرق اور کمزوروں کے لیے زندگی مزید اجیرن کردینے والے اس معاشرے نے اسے تھکن' محرومیوں' دکھ اور اذیتوں کے سوا کچھ بھی تو نہیں دیا تھا۔ یہی مصائب اس کی زندگی کا اثاثہ تھے۔ فطری طور پر ہر انسان کو ہی جینے کے لیے کسی نہ کسی مادی سہارے یا مددگار کی ضرورت ہوتی ہے جس کی ہمراہی اسے اپنی تلخیاں فراموش کرنے پر مجبور کردے۔ محمد شفیع کے پاس سگریٹ کے علاوہ صرف ریڈیو کا ساتھ تھا۔ اس جادوئی ڈبے سے

ابھرنے والی ہر صدا اسے مسحور کردیا کرتی۔ ساز و موسیقی اور شاعری کے پروگرام بہت بھاتے۔ درد و کرب پرمبنی ہر ساز اسے عجیب وجد میں مبتلا کردیتا تھا۔ 'راگ سورٹھ' اور کلاسیکی کمزوری اس کی کمزوری تھی۔ اپنی کمتر تعلیمی قابلیت کے باوجود اشعار میں پنہاں پوشیدہ معانی و مطالب بآسانی سمجھ آجاتے۔ یہ فن اس کے لیے بہت حیران کن تھا۔ مختصر مصرعوں میں ایک گہری سوچ بیان کردینے کا ہنر اسے ایک طویل عرصہ سے ہی سحر زدہ کیے ہوئے تھا لیکن اب یہ الفاظ دل کے کواڑوں پر بھی دستک دینے لگے تھے۔ رگوں میں ایک پارہ مچلتا تھا۔ کبھی کبھی تو اسے اپنے وجود اور ساحل سمندر میں کوئی فرق محسوس نہ ہوتا۔
کراچی میں سمندر سے ملاقات کا تجربہ بھی بہت انوکھا تھا۔ نیلگوں پانی لہروں کی صورت میں ساحل پر مچلتے ہوئے آتا اور واپس لوٹ جاتا۔
''یہ منظر مجھے کیوں مانوس سا لگتا ہے؟ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان لہروں اور تڑپ سے میرا بھی کوئی تعلق ہے۔ لہروں کے اس رقص اور پانی کے مدھم شور سے پیدا ہونے والی موسیقی میری روح میں یہ کیسی تڑپ پیدا کرتی ہے؟ ایسا کیوں لگتا ہے میرے ناتواں وجود نے زندگی بھر طنزیہ الفاظ کی سنگباری برداشت کرنے کے بعد روح میں جو کرب سمویا ہے' وہ ایک طوفان کی صورت میں بہہ کر ہر شے کو نیست و نابود کردینا چاہتا ہے۔ یہ کیفیت مجھے کسی دن پاگل کردے گی۔'' وہ اپنی گہری چمکدار آنکھیں سمندر کی لامتناہی حدود پر جمائے کتنی ہی دیر یہ سب سوچتا رہتا مگر جواب مل کے ہی نہ دیتا۔
یہ وقت اس کے لیے بہت کٹھن تھا۔ محمد شفیع نے زندگی میں ہر کٹھنائی کا سامنا کیا تھا' ہر مشکل کو اپنے آہنی ارادوں سے شکست دی تھی لیکن اس نئی کیفیت سے نمٹنے میں بہت دشواری پیش آرہی تھی۔ مرض سے آگاہی کے باوجود اگر اس کی مکمل نوعیت اور علاج سمجھ نہ آئے تو کسی بھی حساس انسان کی بے بسی و لاچاری ناقابلِ بیان اذیت پر منتج ہونے لگتی ہے۔ شفیع کے ساتھ بھی یہی سب ہورہا تھا۔
ریڈیو اور سگریٹ کے بعد یہ کیفیت ہی اس کی نئی ہمراہی ثابت ہورہی تھی۔ اس عالمِ خود فراموشی میں جانے کتنے موسم بیت گئے۔ ایک روز اس کی طبیعت پہ بے حد بیزاری اور چڑچڑاپن غالب تھا۔ والدہ اور دیگر اہلِ خانہ کی یادستانے لگتی تو کبھی زہر میں بجھے الفاظ کے نشتر روح پر چوکے لگانے لگتے۔ دل کی بستی میں حبس کا موسم تھا۔ گھٹن ایسی تھی کہ سانس لینا بھی دوبھر ہورہا تھا۔ اسی پل جانے کیسے ایک خیال نے چپکے سے دل و دماغ کے بند کواڑوں پر دستک دی اور اس نے غیر اختیاری طور پر اپنے پاس موجود ایک

شاکر شجاع آبادی کی ازدواجی زندگی

☆ شاکر کو بہترین شریکِ حیات کا ساتھ نصیب ہوا۔ اہلیہ کا اصل نام 'غلام فاطمہ' تھا جسے بعدازاں تبدیل کرکے 'شبنم شاکر' رکھ دیا گیا۔ شبنم نے بھی شاعری پر طبع آزمائی کی۔ ان کے شعری مجموعہ پر مشتمل کتاب 'کچ دی ونگ' شائع ہوچکی ہے۔ اپنے شوہر سے دلی محبت اور جذبات کے اظہار میں انہوں نے لکھا ہے:

میں شبنم ہاں پھُل شاکر ہے ونجے پھُل مرجھا میں کیں کم دی
جیندے ناں دے نال ہے ناں میڈا تھیوے نام جدا میں کہیں کم دی

(میں شبنم ہوں اور شاکر میرا پھول۔ اگر پھول مرجھا گیا تو میری زندگی بے مقصد ہوجائے گی۔ میری شناخت اور زندگی کا حسن صرف شاکر ہے۔ اگر یہ نام جدا ہوجائے تو میری حیات بےکار ہوجائے گی۔)

☆ ایک ٹی وی انٹرویو کے دوران شبنم شاکر سے سوال پوچھا گیا کہ کیا کبھی آپ دونوں میں کسی بات پر جھگڑا بھی ہوا؟ شبنم نے جواب میں مسکراتے ہوئے کہا کہ پہلے پہل شاکر کی خواتین پرستار فون کیا کرتیں اور ان سے ملاقات کے لیے گھر آجاتیں تو مجھے بہت غصہ آتا تھا۔

☆ 'آداب عرض رسالہ' کی جانب سے منعقد کردہ ایک مشاعرے میں شبنم نے پہلی اور آخری مرتبہ شاکر کی ترجمانی بھی کی۔ اس وقت یہ ذمہ داری باقاعدہ طور پر ان کے ایک شاگرد 'نظر فرید' کے سپرد ہے۔

کاغذ اور قلم نکال کر چند الفاظ گھسیٹ دیے۔ اس عمل سے ایسا محسوس ہوا کہ حبس اور گھٹن پیدا کرنے والی تاریک گھٹائیں چھٹ گئی ہیں۔ ان بادلوں کی اوٹ سے روشن سورج اپنی جھلک دکھا رہا تھا جس کی کرنیں اسے تراوٹ بخش رہی تھیں۔ بے چینی' افسردگی اور بوجھل کیفیت بھی یکسر غائب ہوگئی۔ اس کے بعد یہ ایک معمول بن گیا۔

ششم جماعت سے اسکول اور کتابوں کو الوداع کہہ دینے والا اور زمانے کی تند و تیز باتیں' رکیک الفاظ سن کر پروان چڑھنے والا محمد شفیع اپنے خیالات صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے پر قادر ہونے لگا تھا۔ تلخیاں اس کے قلم کی روشنائی تھیں اور محرومیاں تخیل کا منبع۔ جنوبی پنجاب کے ایک پسماندہ علاقے کا وہ مزدور اور خوددار انسان کسی بھی جغادری ادیب کی رہنمائی کے بغیر بہترین کلام تخلیق کرنے لگا۔ زندگی بھر درپیش سختیاں اس کی معلم تھیں اور قدرتی ذہانت رہنما۔ ردیف' قافیے' بحر' اوزان سے قطعی ناآشنا محمد شفیع جب اشعار لکھتا تو ریڈیو پر سنی گئی شاعری ایک مثال بن کر لاشعور میں سما جاتی اور قلم کا بہاؤ روکے نہ رکتا۔

فرسودہ روایات اور ظلم و جبر کے خلاف ایک باغی کی پیدائش ہوچکی تھی۔

☆......☆

شفیع کی بے قراری اور اضطراب کو قرار آگیا تھا۔

اس کی پُراثر اور غیر روایتی شاعری احباب کے لیے بہت حیران کن تھی۔ انہوں نے اسے اپنے ہنر کو نکھارنے کے لیے مختلف مشاعروں میں شرکت کے علاوہ کسی تخلص کے انتخاب کی تجاویز بھی دیں۔ یہ مرحلہ اس کے لیے بہت انوکھا اور سنسنی خیز تھا۔ محمد شریف سے محمد شفیع بننے کے سفر کی روداد اس نے اپنے بزرگوں سے سن رکھی تھی۔ حقیقت پسندی سے دیکھا جاتا تو تبدیلی نام نے بھی صحت' زندگی اور مصائب میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔ سوچ کا پنچھی پرواز کرتا ہوا بچپن کی اس رات تک پہنچ گیا جب وہ چارپائی پر لیٹا نجم و قمر کی محفل میں محو تھا۔ یہ منظر یاد آتے ہی پٹھانی مائی کا شفیق چہرہ اور محبت بھری آواز سماعت میں گونج اٹھی۔ "تم ہمیشہ شاکر ہی رہنا۔"

ماں کے مقدس خیال نے لبوں پر ایک درد بھری مسکراہٹ بکھیر دی اور اسی پل فیصلہ ہوگیا کہ اس کا قلمی نام 'شاکر' ہوگا۔ شجاع آباد کے جبر و استحصال زدہ ماحول کی زندہ علامت......شاکر شجاع آبادی۔

☆......☆

سن اسّی کی دہائی اپنا نصف پڑاؤ طے کرچکی تھی۔

شاکر کے معمولات اور مصروفیات قدرے تبدیل ہوچکی تھیں۔ اسی دوران اسے خبر ملی کہ مولوی اللہ یار کی طبیعت بہت ناساز ہے۔ اس کے بعد وہاں رہنا ممکن ہی نہ تھا۔ والد کی تیمارداری اور خدمت کے لیے وہ فی الفور واپس چلا آیا۔ گاؤں کے حالات میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ غربت اور پسماندگی پہلے سے زیادہ ہی دکھائی دے رہی تھی۔ اس صورت حال میں کہیں مزدوری یا کوئی بھی کام کیوں کر مل سکتا تھا؟ والد کو چھوڑ کر بہاولپور یا کسی بھی نزدیکی شہر میں نوکری کرنے کا بھی کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

ابتداً اس نے مقامی درباروں پر اپنا کلام گانے کا آغاز کیا۔ اس امر میں اسے خاطر خواہ کامیابی تو نصیب نہ ہوئی تاہم کلام کی گہرائی خوشبو کی طرح پھیلنے لگی۔ ایک بات تو طے تھی کہ شاکر شجاع آبادی نے روایتی عشق و محبت کی داستانیں کسی صورت بھی رقم نہیں کرنی تھیں۔ اس نے غربت' بیماری اور مایوسی دیکھی تھی۔ علاج کی بنیادی سہولیات کے لیے لوگوں کو اسپتالوں میں ایڑیاں رگڑتے اور سسکتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ وقت شاکر کیسے بھلا سکتا تھا جب مسیحا اپنی ذاتی مصروفیات اور تفریح کے لیے ان کا درد نظر انداز کیے خوش گپیوں میں مصروف ہوتے۔ اسکول' محلے میں دوستی کے لیے بڑھایا جانے والا ہاتھ دھتکار دیا جاتا۔ بقاء کے لیے کی جانے والی ہر کوشش کی ناکامی اور تضحیک آمیز القابات' فاقہ کشی میں سگریٹس چبا کر معدے کو وقتی تقویت دینے کے لمحات اور بڑے شہروں میں رہنے والے مشین نما انسانوں کے دکھ......وہ کچھ بھی تو نہیں بھولا تھا۔

شاکر کی شاعری جب عوامی حلقوں میں پہنچی تو اسے مشاعروں میں بھی مدعو کیا جانے لگا۔ بحیثیت شاعر اس نے ریڈیو پاکستان (ملتان) میں پہلی بار شرکت کی۔ ابتداء میں اس سے نوآموز ادیب جیسا امتیازی سلوک ہی کیا جاتا تھا لیکن تین سال بعد 1989 میں بہاولپور جھوک سرائیکی کی جانب سے منعقد کردہ مشاعرہ نے دنیائے شاعری میں اس

کی حیثیت و مقام کا بھرپور تعین کردیا۔

اس مشاعرہ میں 'جانباز جتوئی'، 'پرفیض' اور 'پرسوز' جیسے نامی گرامی افراد بھی شامل تھے اور روایت کے مطابق انہیں اپنا کلام اختتام پر پیش کرنا تھا۔ آغاز میں نوآموز شعراء کے ساتھ جب شاکر نے ڈائس پر آکر اپنا کلام پیش کیا تو عوام داد دینے کے لیے اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس انداز پذیرائی پر شاکر کا دل جھوم اٹھا لیکن حقیقی حیرت تو ابھی اس کی منتظر تھی۔ سرائیکی زبان کے ایک عظیم شاعر جانباز جتوئی نے نہایت اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈائس پر آکر عوام سے مخاطب ہو کر کہا؛

''اس مشاعرہ میں اب کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ شاکر کے پیش کردہ کلام نے فن کی ایک معراج قائم کردی ہے۔ اس کے بعد یہاں پڑھا جانے والا ہر کلام پھیکا ہوگا۔''

اس عزت اور محبت نے اس کے وجود میں ایک نئی روح پھونک دی اور اس نے مزید محنت کا آغاز کردیا۔ اگلے ہی برس تقدیر نے ایک اور انمٹ گھاؤ دے دیا۔ مولوی اللہ یار کی وفات نے اسے یتیمی کی کڑی دھوپ میں لا پٹخا۔ اس کے بعد اہلخانہ نے شاکر پر شادی جیسے مقدس فریضہ کی ادائیگی کے لیے زور ڈالنا شروع کردیا۔ شریک حیات کا انتخاب بھی مشکل ثابت ہوا۔ 'غلام فاطمہ' سے بہتر شریک حیات کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ شاکر غلام فاطمہ کے والد کا ماموں زاد بھائی تھا۔ اس کی جدوجہد اور خودداری تو یوں بھی خاندان بھر کے لیے ایک قابل تقلید مثال تھی لہٰذا رشتہ منظور کرلیا گیا۔ 1991 میں وہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئے۔

غلام فاطمہ (بعدازاں یہ نام 'شبنم' رکھ دیا گیا) نے اپنے خلوص اور محبت سے اس کے وجود میں گڑے کانٹے چننے شروع کردیے۔ شوہر کے لیے اس کی محبت و اطاعت مثالی تھی۔ وہ تعلیم سے ناآشنا نہیں تھی۔ الفاظ برتنے کا ہنر بھی آتا تھا۔ زندگی بہت خوشگوار موڑ پر آگئی تھی۔ اسی برس ایک اور ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے عوام کے دلوں میں شاکر کا حقیقی مقام واضح کردیا۔

اس روز وہ بہاولپور میں منعقد ہونے والے 'عالمی اردو مشاعرہ اور ادبی کانفرنس' میں بحیثیت ناظر شرکت کے لیے گیا۔ پنڈال میں بیٹھے عوام نے جب اسے اپنے درمیان موجود پایا تو خوشی' جوش اور محبت سے اس کا نام باآواز بلند پکارنا شروع کردیا۔ وہ اس سے ذاتی کلام سننے کے خواہشمند

موجودہ صورت حال اور مصروفیات

شاکر شجاع آبادی کی موجودہ زندگی بھی نہایت دگرگوں ہے۔ بارہا حکومتی اعلانات کے باوجود امدادی رقم مل کے ہی نہیں دیتی۔ ہائی کورٹ نے اس کسمپرسی اور استحصال کا ازخود نوٹس لیتے ہوئے شجاع آباد انتظامیہ کو متعلقہ رقم پابندی سے شاکر کے اہلخانہ تک پہنچانے کی ہدایات بھی دیں۔ سخت بیماری کے عالم میں انہیں عدالت میں پیش بھی ہونا پڑا۔ اس موقع پر بیٹے کا کرب ناقابل بیان تھا۔ "میرے والد کو جھوٹے وعدوں کی نہیں بلکہ حقیقی قدردانی اور امداد کی ضرورت ہے۔ خدارا یہ کھیل بند کردیں۔"

اس کے باوجود اعلانات کا یہ سلسلہ تو گویا ایک مذاق بن کر رہ گیا ہے۔ 2016 میں پنجاب کے حاکم اعلیٰ کی جانب سے 'چھ لاکھ' کا امدادی چیک ارسال کرنے کا ایک اور نوٹس جاری کیا مگر عملی نتیجہ زیرو بٹا زیرو۔

غربت اور بے روزگاری نے اولاد کو بھی اپنے آسیب میں جکڑ رکھا ہے۔ مشاعروں میں ان کی ترجمانی ایک شاگرد کے سپرد ہے۔ تازہ کلام پرنٹ میڈیا' اخبارات کی زینت بنتا ہے۔

شاکر کی داستان کے اس موڑ پر شاعری اور اس کی گوناگوں خصوصیات کا ذکر بھی ضروری ہوچکا ہے۔ اس کی داستان حیات اور شاعری باہم مربوط ہیں اور کسی ایک عنصر کا عدم ذکر دوسرے پہلو میں تشنگی چھوڑ جائے گا۔

شاکر نے صرف سرائیکی ہی نہیں' بلکہ اردو اور پنجابی زبان میں بھی بہترین کلام تخلیق کیا ہے۔ اس کلام پر مشتمل کتابیں مارکیٹ میں بیسٹ سیلر کا درجہ پا چکی ہیں۔ ان کتابوں میں 'لہو دا عرق' 'پیلے پتر' (خزاں رسیدہ پتے) 'بلدین ہنجو' (آتشیں آنسو) 'منافقاں توں خدا بچائے' (منافقت سے خدا محفوظ رکھے)۔ 'روسیں تو دھاڑیں مار مار کے' (تم زار و قطار روؤ گے) 'گلاب سارے تمہیں مبارک'۔ 'خدا جانے' "کلام شاکر" 'شاکر دیاں غزلاں'، 'شاکر دے دوہڑے' شامل ہیں۔

(دوہڑے پنجابی نظموں کی ایک ذیلی شاخ ہے جس میں شاعر دو سطروں میں ایک مکمل اور بھرپور خیال پیش کرتا ہے۔ دونوں مصرعے ایک ہی قافیہ پر مشتمل ہوتے ہیں)

تھے۔اسٹیج سیکرٹری نے اسے چند منٹ کے لیے اسٹیج پر آنے کی دعوت دی۔شاکر کے پیش کردہ کلام نے اس عالمی مشاعرے کا میلہ ہی لوٹ لیا۔بھارت' کینیڈا اور امریکا سے تعلق رکھنے والے شاعر بھی اس سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے اور روانگی سے قبل شاکر شجاع آبادی کو بہترین توصیفی الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔

☆......☆

داستان کی مہار ایک بار پھر وہیں موڑتے ہیں جہاں عالمی اردو مشاعرے میں اپنی اہلیت کے جھنڈے گاڑتا ہوا شاکر رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگیا تھا۔

اس کی زندگی میں یہ نیا موڑ بہت خوش کن تھا۔شبنم (غلام فاطمہ) اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی۔شادی کے تین سال قدرے ہموار انداز میں بیت گئے۔ذمہ داریوں کا بوجھ بڑھا تو تھا لیکن شاکر نے بھی کسی مشکل سے ہار ماننا سیکھا ہی کب تھا؟ وہ اپنی بساط سے بڑھ کر اہلخانہ کو ہر ممکن خوشی اور آسائش فراہم کرنے کی کوشش کیا کرتا۔جسمانی تھکاوٹ یا صحت کے چھوٹے موٹے مسائل معمول کے مطابق جاری رہتے تھے۔بچپن سے لاحق 'پولیو' کا مرض زندگی کا ایک اہم حصہ بن چکا تھا۔شاکر نے اس معذوری کے ساتھ جینا سیکھ لیا تھا مگر گزشتہ کچھ عرصہ سے تھکاوٹ اور کمزوری کچھ زیادہ ہی محسوس ہونے لگی تھی۔کام کے دباؤ کی بدولت ذہنی تناؤ بھی اعصاب میں ہلکی سی کشیدگی پیدا کیے رکھتا۔

پہلے پہل تو اس نے خاطر خواہ توجہ نہ دی۔رفتہ رفتہ اعصابی کشیدگی اور درد کی شدت میں اضافہ ہوا تو اسے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہونے لگا۔کوئی بھی احتیاطی تدبیر اختیار کرنے کی نوبت ہی نہ آئی اور تقدیر نے ایک بار پھر کاری وار کردیا۔

اعصاب میں پیدا ہونے والا دباؤ اس نہج پر پہنچ گیا کہ گردن اور سر کی حرکات وسکنات سے اس کا قابو مکمل ختم ہوگیا۔یہی سنگینی کم نہ تھی کہ قوت گویائی نے بھی ساتھ دینے سے انکار کردیا۔وہ وقت ان سب ہی کے لیے بہت کٹھن تھا۔کسی بھی قسم کی تاخیر کے بغیر اسے اسپتال لے جایا گیا اور ڈاکٹرز کے انکشاف نے حقیقی معنوں میں ان کے پاؤں تلے زمین سرکا دی۔

''Dystonia کب سے لاحق ہے انہیں؟''

''جی؟؟ کون سا مرض؟'' اہلخانہ کو اچھنبا ہوا۔

''Dystonia آثار یہی بتاتے ہیں کہ یہ مرض بچپن ہی سے ان کے اعصابی نظام میں موجود رہا ہے اور اسی لیے یہ اتنا زیادہ نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔''

''لیکن انہیں تو پولیو ہے۔اس تکلیف کا ذکر تو ہم پہلی بار سن رہے ہیں۔''

''اوہ!! ویری سیڈ۔یعنی آپ اب تک لاعلم تھے۔''

ڈاکٹر نے تاسف سے سر ہلایا اور پھر انہیں تفصیل بتانے لگا۔''اگر یہ عارضہ بچپن میں لاحق ہو تو اس کی علامات سب سے پہلے ہاتھ اور پاؤں پر ہی ظاہر ہوتی ہیں۔اعصابی نظام میں ایک مخصوص عدم توازن کے باعث پیدا ہونے والا یہ مرض متاثرہ فرد کا اپنے ہی اعصاب سے قابو ختم کردیتا ہے۔ اس کی جسمانی حرکات وسکنات بے ربط ہوجاتی ہیں۔ٹانگ میں اینٹھن اور لنگراہٹ اس کی ابتدائی اسٹیج ہوتی ہے اور بعدازاں جسمانی مشقت' تھکاوٹ یا ذہنی دباؤ جسمانی نظام میں اس مرض کے خوابیدہ جرثومے بیدار کردیتا ہے اور دوسری بار اس حملہ کی شدت ناقابل تلافی نقصان کا سبب بن جاتی ہے۔''

''اتنی بڑی غلطی کوئی ڈاکٹر کیسے کرسکتا ہے؟''

''ممکن ہے اس وقت انہیں مطلوبہ تشخیصی سہولیات میسر نہ ہوں۔'' ڈاکٹر نے محتاط انداز میں کہا۔

اب حقیقت خواہ کچھ بھی ہو سچائی تو یہی تھی کہ کسی کا بھی تاسف یا ہمدردی گزرا ہوا وقت واپس لاسکتی تھی نہ ہی شاکر کی موجودہ حالت میں کوئی بہتری پیدا کرسکتی تھی۔

☆......☆

نوّے کی دہائی کے باقی ماندہ سال ایک جبر مسلسل کی طرح بیتے تھے۔

سالہا سال سے لاحق اس مرض کے نئے حملے نے اسے کسی بھی محنت ومشقت اور ماضی کی طرح مزدوری سے نااہل کردیا۔شاکر کے لیے اب تخلیقات کے سوا کوئی راہ نہیں بچی تھی۔شریک حیات نے اپنے خلوص اور محبت سے شوہر کا بھرپور ساتھ نبھایا۔اولاد کی تربیت بھی انہی مثبت خطوط پر جاری تھی۔خودداری اور پروقار زندگی کا درس ان کی گھٹی میں شامل تھا۔

یہ وقت شاکر پر بہت سی تلخ سچائیاں آشکار کررہا تھا۔ملکی سیاست ومعیشت بدترین صورت حال کا شکار تھی۔مختصر عرصہ میں دو سیاسی جماعتوں کے مابین اقتدار کی رسہ کشی کے بعد ایک آمری حکومت نے ہرسُو بے

یقینی اور انتشار کی سی کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔عوام کی زندگی دو انتہاؤں کے درمیان گزرنے لگی۔امیر طبقہ مزید امارت کی جانب گامزن تھا اور غریب کی غربت اپنے وجود سے بھی شرمانے لگی۔پہلے سے ہی خوشحال علاقوں میں مزید ترقیاتی منصوبے پروان چڑھنے لگے اور پسماندہ علاقوں میں نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ عوام بنیادی ضروریات کے لیے بھی ترستے تھے۔بدقسمتی سے شاکر شجاع آبادی کا شمار بھی اسی طبقہ میں ہوتا تھا جو ہمیشہ ہی نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔

بیسویں صدی کے اختتام تک اس کی دور اندیشی یہ باور کرچکی تھی کہ نفسا نفسی کی اس لہر کا تھمنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جائے گا۔اس ایٹمی دور میں بے جان مشینوں کی اہمیت جاندار انسانوں سے کہیں زیادہ تھی۔ترقی کی اس دوڑ میں انسانیت اپنا وجود کھونے لگی تھی۔

ایٹمی دور انوکھا تھی گئے
جگ تے جیون اوکھا تھی گئے
ہک بم تے لکھاں روحاں کڈھے
عزرائیل دا کم سوکھا تھی گئے

(ایٹمی دور نے یوں تو زندگی میں بہت سی آسانیاں پیدا کی ہیں لیکن زمین پر رہنا بہت مشکل ہوچکا ہے۔ایک بم سے لاکھوں افراد مرجاتے ہیں۔اب عزرائیل کا کام بہت آسان ہوگیا ہے)

☆......☆

اکیسویں صدی کے آغاز میں عوام الناس کا جوش وجذبہ قابل دید تھا۔

دنیا ایک نئی صدی میں داخل ہوئی تھی۔آنکھوں میں ایک نئے خواب نے بسیرا کرلیا تھا۔وہ سمجھتے تھے کہ ان کے سب مسائل اور آزمائشیں کسی جادو کی چھڑی سے غائب ہوجائیں گی۔شاکر کو علم تھا کہ خوش فہمیوں کا یہ تاج محل بہت جلد چکنا چور ہوجائے گا۔حقائق کی تلخی ان کی زندگی مزید دوبھر کردے گی۔

اور ہوا بھی یہی۔اقدار مردہ ہونے لگیں' احساس نابود ہونے لگا' خودغرضی کامیابی کی ضمانت قرار پائی' غریب طبقہ آریائی دور کا شودر بن گیا۔انہیں کوئی بھی سہولت یا خوشی مل کے ہی نہ دیتی۔شاکر کی نگاہیں یہ سب دیکھتیں' سماعت آنے والے طوفانوں کی مزید آہٹیں سنتی اور قلم اپنے اہل وطن سے مخاطب ہوکر بے اختیار پکار اٹھتا۔

اے پاکستان دے لوکو! پلیتاں کوں مکا ڈیوو

شاکر کی شاعری میں پہلا مرکزی نکتہ 'غربت' ہے۔جنوبی پنجاب میں ہرسُو بکھری افلاس نے اس کی حساس سوچ کو ہمیشہ لہولہان رکھا اور درد کا درماں نظر آیا تو خوبصورت پیرائے میں کچھ اس طرح بیان کردیا۔

ناخواندگی دے اندھارے دیوچ چراغ تعلیم
نال رکھو
بنا دو شاہین غوری لیکن عوام داڈکھ وی نال رکھو

(ناخواندگی اور جہالت کی تاریکی تعلیم کی شمع ہی بجھا سکتی ہے۔شاہین اور غوری میزائل بنانے کے ساتھ عوام کے دکھ درد ختم کرنے بھی ضروری ہیں)

او صاحب اقتدار لوکو! ایہو جیہاں کوئی طریقہ سوچو
تہاڈا ڈھڈ وی بھر تج پوو غریب داوی خیال رکھو

(صاحب اقتدار لوگو! کوئی ایسی درمیانی راہ کیوں نہیں نکال لیتے کہ تمہاری ہوسِ زر بھی تسکین پالے اور غریب انسان بھی اچھی زندگی گذار لے)

☆☆☆

بکھ دے پھٹ کوں سیون ڈیوو
سکھ دا پانی پیون ڈیوو
اساں ہیں مخلوق خدا دی
ظالم لوکو جیون ڈیوو

(بھوک سے زخم خوردہ جسم کا علاج کرنے دو۔ہمیں سکھ اور خوشی کا کوئی امرت پینے دو۔ہم بھی اسی خدا کی مخلوق ہیں۔اے ظالم لوگو! ہمیں بھی جینے دو۔)

شاکر کی شاعری میں غربت زدہ عوام کے دکھ درد بیان کرنے کے لیے کسی ماورائی دنیا یا الفاظ کے ہیر پھیر نہیں ملتے۔سادہ اور موثر پیرائے میں آفاقی سچائیاں بیان کرنے کا فن بھی گویا اسی پر ختم ہے۔

بہتر حور دے بدلے گزارہ ہک تے کرگھنسوں
اکہتر حور دے بدلے اساکوں رج کے روٹی دے

(جنت میں بہتّر حوریں ملنے کی نوید دی گئی ہے۔ہم ایک ہی پر اکتفا کرلیں گے لیکن عرض یہ ہے کہ بقیہ اکہتر کے بدلے پیٹ بھر روٹی نصیب میں لکھ دی جائے)

نتاں اے جنہیں دی ناں رکھئے اے ناں اُوکوں
ولا ڈیوو

(اہلیانِ پاکستان!! ملک سے غلاظت مٹا دو ورنہ ہمیں یہ نام رکھنے کا بھی کوئی حق نہیں۔ یہ نام لوٹا دو)

جتھاں مخلص نمازی ہن اُو مسجد وی ہے بیت اللہ
جو مُلاں دے دکاناں ہن مسیتاں کوں ڈھا ڈیوو

(جس مسجد میں مخلص نمازی ہوں وہ بیت اللہ شریف سے کم نہیں ہوتی۔ جن مساجد میں ملاؤں نے مذہب کی دکان چمکا رکھی ہو انہیں بقاء کا کوئی حق نہیں)

اُتے انصاف دا پرچم تلے انصاف وکدا پئے
ایہو جنہیں ہر عدالت کوں بمع عملہ اُڈہ ڈیوو

(انصاف کے پرچم تلے انصاف ہی فروخت ہونے لگا ہے۔ ایسی عدالتوں کو بمعہ عملہ نیست و نابود کر دینا چاہیے)

پڑھو رحمٰن دا کلمہ، بنڑوں شیطان دے چیلے
منافق توں تاں بہتر ہے جو کافر ناں رکھا ڈیوو

(ہم مسلمان ہیں۔ الرحمٰن الرحیم خدا کا کلمہ پڑھتے ہیں لیکن اعمال و افعال میں شیطان کے پیروکار بن چکے ہیں۔ اس منافقت سے بہتر ہے کہ اپنا نام کافر رکھ لیں۔ کیا ہم مسلمان کہلانے کے حقدار ہیں؟)

جے سچ آکھنڑ بغاوت ہے، بغاوت ناں ہے شاکر دا
چڑھاؤ نیزے تے سر بھانویں میڈے خیمے جلا ڈیوو

(میری بے باک شاعری اکثر حکمران طبقے کو ناگوار گزرتی ہے۔ میں تو محض سچ بولتا ہوں۔ سچائی کا علمبردار ہونا اگر بغاوت ہے تو مجھے اعتراف ہے کہ میں باغی ہوں۔ اس جرم میں سر بریدگی کے بعد میرا سر نیزے پر چڑھا دو خواہ میرے خیمے (گھربار، اسباب) جلا دو، میں سچ سے ناتہ نہیں توڑوں گا۔)

شاکر کا کلام روح جھنجوڑ دیتا تھا اور اس کا نام سچائی و بغاوت کا علمبردار بن چکا تھا۔ پیشہ وارانہ زندگی کی کامیابیوں اور شہرت سے قطع نظر اس کی ذاتی زندگی اب بھی بے انتہا مسائل کا شکار تھی۔ غربت و مسائل میں پستے 2004 کا وہ دن بھی دبے قدموں چلا آیا جب شاکر کے معذور وجود پر "فالج" نے بھی حملہ کر دیا۔ سابقہ مرض کی بدولت جسم میں مدافعتی نظام پہلے ہی بہت کمزور تھا لہٰذا اس نئے حملہ کی شدت برداشت نہ کر سکا اور صورتِ حال مزید ابتر ہوگئی۔

قبل ازیں شاکر اٹک اٹک کر ادا کیے گئے الفاظ سے اپنا مدعا بیان کرنے میں کامیاب ہو جایا کرتا تھا لیکن اب مخاطب کو سمجھانا تقریباً ناممکن ہوگیا۔ یہ اذیت بلاشبہ ناقابلِ بیان تھی۔ کوئی بھی لفظ یا سطر اس کرب کا احاطہ ہی نہیں کر سکتی جو اس وقت شاکر اپنی ذات پر جھیل رہا تھا۔ ولید شاکر نے والد کی ترجمانی کے فرائض سنبھال لیے اور اگر کوئی بات وہ بھی سمجھ نہ پاتا تو شاکر کو کاغذ، قلم کا سہارا لینا پڑتا۔ خوشیوں نے یکدم ہی ان سے منہ موڑ لیا تھا۔

بھلا خوشیاں کھیں کوں چک پیندن
کئی خوشی ٹھکرا پتہ لگ ویندے

(بھلا خوشیاں کسی کو کاٹ کھاتی ہیں؟ تم ایک خوشی ٹھکرا کے دکھاؤ لگ پتا جائے گا)

جیڑھی چیخ پکار کوں پھند آھدیں
ایھو توں چا بنا پتا لگ ویندے

(جس چیخ پکار کو تم ڈھونگ کہتے ہو یہی اگر تم خود کر کے دکھاؤ تو لگ پتا جائے گا)

جے رووَن اپنے وس ہوندے
توں رو ڈکھلا پتا لگ ویندے

(اگر رونا اپنے بس میں ہوتا ہے تو تم رو کے دکھاؤ، لگ پتا جائے گا)

جیویں عمر نبھی ہے شاکر دی
ھک منٹ نبھا پتا لگ ویندے

(جیسے شاکر نے کرب و اذیت میں ساری عمر گزار دی ہے، یہ ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ تم ایک لمحہ اس طرح جی کر دکھاؤ، لگ پتا جائے گا)

☆......☆

شاکر اپنے اہلخانہ کی محبت اور قربانیوں کا بہت قدردان تھا۔ انہوں نے زندگی کے کسی بھی موڑ پر اسے کوئی دانستہ دکھ نہ دیا مگر حقیقت تو یہ تھی کہ غربت و افلاس نے ان کے وجود کو گھن لگا دیا تھا۔ اس کی بیٹی "رابعہ" کو "تپ دق اور الرجی" جیسے امراض نے اپنے شکنجہ میں جکڑ رکھا تھا۔

تپ دق لاعلاج مرض ہرگز نہیں ہے لیکن شاکر کے محدود وسائل میں علاج معالجہ بہت کٹھن تھا۔ گھریلو اخراجات پورے کرنے کا انحصار مشاعروں سے حاصل ہونے والے معاوضہ پر تھا۔ اپنی طبیعت کے پیشِ نظر وہ کلام کی ادائیگی پر قادر نہ رہا تھا لیکن دوست احباب اس کی ترجمانی کے لیے ہمراہ ہوتے اور اسٹیج پر اس کے اشعار پڑھ دیتے۔

اُن مشاعروں سے ملنے والی رقم بھی بہرحال اتنی نہیں ہوتی تھی کہ بیٹی کو جدید ترین علاج کی سہولیات مہیا ہو سکیں۔ اس موقع پر کچھ احباب اور رشتہ داروں نے مدد بھی کی تاہم رابعہ کی موت ٹال نہ سکے۔ شاکر کے جگر کا ٹکڑا غریبی، بااختیار افراد کی مجرمانہ کوتاہی اور معاشرے کے دہرے معیار کی بھینٹ چڑھ گیا۔ بیٹیاں تو یوں بھی فطری طور پر باپ کو بہت عزیز ہوتی ہیں۔ ان کی ذات سے ہزار ہا ارمان وابستہ ہوتے ہیں۔ شاکر کو یہی دکھ کھائے جا رہا تھا کہ وہ رابعہ سے منسلک کوئی ارمان پورے کر سکا، نہ ہی اسے مستند علاج مہیا کر پایا۔

اس مرگِ ناگہاں سے صرف چودہ سالہ رابعہ ہی نہیں بلکہ ایک باپ کا یقین، محبت، پرورش، خواب، ارمان، آس اور دعائیں بھی خاک نشین ہو گئیں۔ اس موت کا اصل ذمہ دار تو جانے کون تھا لیکن اس روز شاکر کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس فرسودہ نظام کو نذرِ آتش کر دے یا سرِعام پھانسی دے دے تاکہ آئندہ کسی مجبور باپ کی بیٹی غربت اور بے حس معاشرے کی سفاکی کا شکار نہ ہو سکے۔

اس لمحہ شاکر کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی زندگی بھی اختتام تک آن پہنچی ہے۔ بیٹی کی وفات کے ساتھ اس کا مقصدِ حیات بھی اپنا وجود کھو بیٹھا ہے لیکن منطقی طور پر ایسا ممکن بھی تو نہ تھا۔ کسی بھی عزیز اور خونی رشتے کی دائمی جدائی پر یہ جذبات فطری سہی، تاہم حقیقت تو یہی ہے کہ جینا کبھی ترک نہیں کیا جا سکتا۔ پٹھانی مائی کے بعد محمد شفیع بھی زندہ رہا تھا اور رابعہ کے بعد شاکر نے بھی جیون کو حسبِ سابق تاوان ادا کرتے ہوئے بہت سا جینا تھا۔

☆......☆

شاکر شجاع آبادی کا قلمی سفر حالات کی تلخیوں کو ایندھن بنائے جاری رہا۔

اس کے قلم کا جادو عوام کے سر چڑھ کر بولتا تھا۔ مشاعروں میں اسے خصوصی طور پر مدعو کیا جاتا تھا۔ پنڈال میں بیٹھے ہجوم کے لیے اپنے محبوب شاعر کی دید ہی بے بہا خوشی ثابت ہوتی۔ وہ اس کے ناتواں وجود میں پوشیدہ چٹانی قوتِ ارادی اور شاعرانہ صلاحیتوں کے بہت معتقد تھے۔ اس کی چمکدار، باوقار آنکھیں اور کاٹ دار الفاظ انہیں جینے کا ایک نیا حوصلہ عطا کرتے۔ شاکر کے لکھے ہر ایک مصرعہ پر پنڈال داد و تحسین اور محبت بھرے الفاظ سے گونج اٹھتا۔

علاقائی اور قومی صورتِ حال کے بعد عالمی حالات پر بھی شاکر کی گہری نظر ہے۔ ان کا قلم ہر ایجنڈا پر نہایت کاٹ دار اشعار تخلیق کرتا ہے۔

صدائے بیت المقدس آندی اے روز کن وچ اذان وانگوں
مدینے مکے دے پاسبانو میڈا وی رشتہ تہاڈے نال اے

(میری سماعت میں ہر روز بیت المقدس سے آنے والی ایک صدا گونجتی ہے کہ مکہ و مدینہ جیسے باحرمت شہروں کے پاسبانو!! کیا میرا تم پہ کوئی حق نہیں؟ ہمارا باہمی رشتہ شاید تم فراموش کر چکے ہو۔)

اک پاسے میرے رھن وہابی، اک پاسے دیوبندی
اگے پچھے شیعہ سنی، ڈاڈھی فرقہ بندی
وچ وچالے ساڈا کوٹھا، قسمت ساڈی مندی
اک محلہ اٹھ مسیتاں، کیدی کراں پابندی؟

(میرے ایک طرف وہابی رہتے ہیں تو دوسری جانب دیوبندی۔ آگے پیچھے شیعہ سنی بھی ہیں۔ ہر طرف بے تحت فرقہ بندی۔ میرا غریب خانہ ان سب کے درمیان یوں گھرا ہے کہ اپنی خرابیٔ قسمت پر دکھ محسوس ہوتا ہے۔ ایک ہی محلہ میں آٹھ مختلف فرقوں کی مساجد ہیں اور میں فیصلہ ہی نہیں کر پاتا کہ مجھے کس کی پابندی کرنی ہے؟)

اس قدر کسمپرسی، توہینِ انسانیت اور تذلیلِ آدمیت کے بعد اقتدار میں بیٹھے حکمرانوں کو جانے شاکر شجاع آبادی پر کب ترس آئے گا؟ خوددار زندگی جینے کی اس قدر سزا کب بھلا کسی نے بھگتی ہوگی؟ شاعروں اور ادیبوں کی یہ بے قدری تو ازل سے جاری ہے لیکن شاکر کے ساتھ ہونے والے اس سلوک کا سلسلہ اگر تھم نہ سکا تو تاریخ شاید ہمیں کبھی معاف نہ کر پائے گی۔

اس دوران چشمِ فلک نے یہ منظر بھی دیکھا کہ لاکھوں کروڑوں دلوں کی دھڑکن میں سموئے ان اشعار پر مشتمل بیسٹ سیلر کتابوں کے ناشرین بے حساب دولت کما رہے تھے، اس کلام کو گانے والے گلوکار لاکھوں میں کھیل رہے تھے لیکن حقیقی کلاکار کے گھر میں کئی دنوں سے چولہا بھی ٹھنڈا تھا۔ وہ اپنے لرزتے، کپکپاتے ہاتھوں سے فون پر

مختلف نمبر ملاتے ہوئے دوست احباب سے مدد طلب کر رہا تھا۔ کہیں کسی نے فون اٹھا کر بند کر دیا تو کسی نے کوئی عذرِ لنگ تراش دیا۔

اس روز بھرم کے کئی پردے چاک ہوگئے اور انسانیت پر یقین نے کچھ اور شرمسار کر دیا۔ مخلص احباب اکثر ایک بات پر اچھنبے کا اظہار کرتے۔ ''شاعر اور ادیب ہر دور میں بہت کٹھن زندگی بسر کرتے آئے ہیں لیکن ایسی عسرت تو کبھی دیکھی نہ سنی۔ تم بااختیار افراد سے رجوع کرو۔ تمہاری اہلیت اور معاشی وسائل کی عدم دستیابی مستقل وظیفہ کی حقدار ہے۔''

''میں کسی سے کیا بات کروں؟'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اکثر افراد رات کے اندھیرے میں آتے ہیں اور دولت کا منہ کھول دینے کی بھی پیشکش کرتے ہیں۔''

''تو پھر بات بنتی کیوں نہیں؟''

''پیش کرنے والے طلب بھی تو کرتے ہیں ناں! اور ان کا مطالبہ... جیتے جی کبھی پورا نہیں کر سکتا۔''

''ایسا کیا کہتے ہیں بھلا؟''

''کوئی میرے الفاظ اپنے مفاد کے لیے خرید لینا چاہتا ہے تو کوئی مشورہ دیتا ہے کہ قلم سے ناتہ توڑ کے وظیفہ خوار بن جاؤں۔ میں شعر کہے بناء نہیں رہ سکتا۔ کسی کے لیے اپنے لفظوں کی مہار تبدیل کرتا تو اس تنگدستی سے بھی بدتر سزا ہے۔ میں اپنی اہلیت کی بناء پر وظیفہ چاہتا ہوں 'خیرات نہیں۔ ضمیر فروشی کرنی ہوتی تو آج کسی محل میں بیٹھ کر سونے چاندی کی پلیٹوں میں کھانا کھاتا۔ نوکروں کی ایک فوج میرے اہلخانہ کی خدمت کرتی اور بچے بیرون ملک تعلیم حاصل کر رہے ہوتے۔''

''ہمیں علم ہے کہ تم یہ راہ کبھی بھی اختیار نہیں کرو گے۔'' احباب کی اس بات پر شاکر کی پُروقار مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک گواہی دیتی کہ وہ ان کے اس یقین پر بہت خوش ہے۔ اس نے ہمیشہ زندگی میں محنت اور لگن ہی کو اپنا شعار بنایا تھا۔ خودداری اس کا سرمایہ حیات تھی۔ اسے کسی مقتدر سے صلہ کی امید نہیں تھی۔

☆......☆

تو محنت کر'تے محنت دا صلہ جانڑے خدا جانڑے
تو ڈیوا بال کے رکھ چا' ہوا جانڑے خدا جانڑے
خزاں دا خوف تاں مالی کوں بزدل کر نہیں سکدا
چمن آباد رکھ 'بادِصبا جانڑے خدا جانڑے

(تم محنت جاری رکھو اور صلہ کی توقع صرف خدا سے رکھنا۔ اپنے حصے کا چراغ جلا کے رکھ دو۔ شمع کی حفاظت خدا کرے گا۔ خزاں کا خوف کسی باغبان کو بزدلی کی جانب مائل نہیں کر سکتا۔ چمن آباد رکھنے کی اپنی سی کوشش جاری رکھو۔ پروردگار کے حکم سے بہار بھی ضرور آئے گی)

شاکر نے ہمیشہ اپنی محنت کو کسی بھی خیرات میں تبدیل ہونے نہیں دیا تھا۔ اللہ پاک کی ذات پر توکل نے مایوس نہیں کیا اور سن 2008 بالآخر ایک تبدیلی لے آیا۔

ملکی تاریخ میں وہ دور بہت اہمیت کا حامل تھا۔ انتخابی عمل کے بعد ایک ایسی سیاسی پارٹی کی حکومت قائم ہوئی جس کا ماضی بہت سی قربانیوں پر مشتمل تھا۔ اس نئی حکومت کی تبدیلی سے عوام نے ایک بار پھر وہی توقعات وابستہ کرلیں کہ اب ان کی زندگیاں تبدیل ہوجائیں گی اور پسماندگی کا آسیب ہمیشہ کے لیے نابود ہوجائے گا۔ اے بسائے آرزو کہ خاک شد! گرہن زدہ زندگیاں مزید اندھیروں کا شکار ہوگئیں۔ شاکر کی زندگی میں ایک تبدیلی آئی تو محض اتنی کہ ایک منتخب نمائندے نے اسے 'دو لاکھ' روپے کا چیک بھجوایا۔

وہ بااختیار شخص ذاتی طور پر شاکر کے کلام اور جدوجہد سے بہت متاثر تھا۔ نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے بعد وہ بے نیازی سے دیگر سرکاری کاموں میں مشغول ہوگیا۔ شاکر اپنے ہاتھ میں وہ چیک تھامے ایک گہری سوچ میں گم تھا۔ تقدیر ایک بار پھر اس کے سامنے دوراستے لے آئی تھی۔

''یہ چیک میں اپنی ذات پر صرف نہیں کروں گا۔'' اس نے فیصلہ کیا۔

''لیکن کیوں؟ اس رقم سے ہمارے بہت سے مسائل حل ہوجائیں گے۔'' اہلخانہ کی حیرانی بھی بجا تھی۔

''بے شک ایسا ہو سکتا ہے لیکن ہمارے مسائل تو صرف وقتی طور پر حل ہوں گے۔ میں اس رقم کو ایک ایسے مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہوں جس سے کئی خاندانوں کی طرف بڑھتے مستقل اندھیرے اور ہولناک غربت دور ہوجائے گی۔'' اس کے پردہ تصور پر یکدم اپنے علاقے کا وہ اسکول لہرایا جہاں سہولیات اور اسٹاف نابود تھا۔

''وہ کہاں بھلا؟''

''یہ رقم اسکول میں بھجوا دو۔ یہ علاقہ ازل سے اندھیروں میں ڈوبا ہے اور اگر اب بھی تعلیمی عمل جاری نہ رہ سکا تو غربت اور افلاس میں گھرے عوام جرائم کی دلدل میں گھر جائیں گے۔ تعلیم کی روشنی ہی مسائل اور پسماندگی کی یہ تاریکی دور کر سکتی ہے۔ اندھیروں کو مزید اندھیرے سے تو ختم نہیں کیا جا سکتا ناں!''

شاکر اور اس کے اہلخانہ اکثر قسمت کی ستم ظریفی سے محظوظ بھی ہوا کرتے تھے کہ اس کے مداح اب خواص بھی تھے۔ کاروبار' صنعت 'شوبز' کھیل 'صحافت اور سیاست غرضیکہ ہر میدان میں لوگ اس کے حالات زندگی سے واقف تھے اور امداد کے لیے کوشاں بھی دکھائی دیتے تھے لیکن ایک معمولی سا نکتہ ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ اس کے مسائل لامتناہی ہیں۔ اس کی ذات سے اولاد کی ذمہ داریاں اور خوشیاں بھی وابستہ ہیں۔ ان کے زبانی جمع خرچ اور میڈیا کے سامنے دی گئی امداد اونٹ کے منہ میں زیرہ ثابت ہوتی ہے۔ اس کی زندگی میں اصل تبدیلی تو اس صورت میں پیدا ہوگی جب آمدن کا کوئی مستقل ذریعہ قائم ہوگا۔ گھر کا چولہا صرف مشاعروں ہی سے جلتا تھا اور وہ رقم بھی کوئی لگی بندھی نہ تھی۔

بااختیار افراد میں اس دوراندیشی کی سخت کمی تھی اور پھر بالآخر جب یہ خیال ایک بااثر منتخب حکومتی نمائندے کے ذہن میں پیدا ہوا تو زندگی کی ڈور میں 'چھ' مزید سال گرہ لگائے گزر چکے تھے۔

☆......☆

فروری 2014 میں شاکر کے پسندیدہ شہر بہاولپور میں 'قائداعظم سولر پارک' کے افتتاح کے موقع پر اس کے لیے چند مراعات کا اعلان کیا گیا۔

''شاکر صاحب ہمارا قومی سرمایہ ہیں۔ سرائیکی ادب کے لیے ان کی خدمات گراں قدر اور ناقابل فراموش ہیں۔ بدقسمتی سے وہ حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہیں۔ ہم ان کی خدمات کے اعتراف میں علاج معالجہ کی بہترین' مفت' سہولیات کے ساتھ 'نوید شاکر' کے لیے سرکاری نوکری اور دیگر خاندان کو زرعی اراضی کی فراہمی کا وعدہ کرتے ہیں۔''

یہ اعلان سن کر اہلخانہ اور احباب میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ نوید شاکر بھی روزگار کے لیے بہت پریشان تھا۔ ایف ایس سی (پری انجینئرنگ) کے بعد اپنے حالات ہی کے

مرے رازق رعایت کر نمازاں رات دیاں کر دے
کہ روٹی رات دی پوری کریندے شام تھیں ویندی

(میرے رازق!! ہم پہ فقط اتنی سی رعایت کر دے کہ نمازوں کے اوقات رات میں تبدیل کر دے۔ دن میں عبادت کیسے کریں گے کہ روٹی کماتے ہوئے شام ہوجاتی ہے)

انھاں دے بال ساری رات روندن بھک توں سوندے نئیں
جنھاں دی کیندے بالاں کوں کھڈیندے شام تھی ویندی

(ان کے بچے ساری رات بھوک سے سو نہیں پاتے' جنھیں دوسروں کے بچوں کی آیاگیری کرتے شام ہوجاتی ہے)

میں شاکر بکھ دا ماریاہاں مگر حاتم توں گھٹ کئی نئیں
قلم خیرات ہے میری چلیندے شام تھی ویندی

(میں شاکر بھوک زدہ ضرور ہوں لیکن کسی حاتم سے کم نہیں۔ قلم میری خیرات ہے جسے چلاتے چلاتے شام ہوجاتی ہے۔)

☆☆☆

شاکر شجاع آبادی نے انفرادی غم سے زیادہ اجتماعی دکھ بیان کیے۔ اپنی قوم کو درپیش مصائب اسے ذاتی آلام بھی فراموش کر دیا کرتے تھے۔

میں سینہ چاک ہر ظالم دا قلم دے نال کر ویساں
امن کیتے میں ہر خطرے دی دوزخ توں گزر ویساں
میڈے حالات دے اُتے میڈے جذبات غالب نئیں
جے میں اجڑیم تاں کئی ڈرنئیں' جے قوم اجڑی تاں مر ویساں

(میں اپنے قلم سے ہر ظالم کا سینہ چاک کرتا رہوں گا۔ امن کے حصول کی خاطر خطرے کی ہر دوزخ عبور کرنے کے لیے بھی تیار ہوں۔ میرے حالات پر جذبات غالب آجاتے ہیں۔ مجھے اپنی بربادی کا غم نہیں لیکن قوم پر آنچ آئی تو میرے لیے موت سے بدتر ہوگی)

باعث وہ اپنی تعلیم جاری رکھ پایا تھا‘ نہ ہی کسی نوکری کا حصول ممکن ہوسکا۔

”اللہ نے ہماری سن لی۔نوکری اور زرعی اراضی ملنے سے سارے مسائل ہی حل ہوجائیں گے۔بزور بازو سخت محنت کر کے معاشی وسائل دستیاب ہوتے ہی علاج معالجہ کا بار ہم خود ہی اٹھالیں گے۔“

☆......☆

شاکر شجاع آبادی کی خدمات کے اعتراف میں کیا گیا پہلا ہی وعدہ ’مالی مدد‘ بھی پورا نہ ہوسکا۔

چند ماہ مزید بیتے تو پنجاب کے ’حاکم اعلیٰ‘ نے ماہانہ پچیس ہزار روپے کی ادائیگی کا نوٹس جاری کردیا۔ آغاز میں تین ماہ تک مبلغ پچیس‘ پچیس ہزار روپے کے چیک دیئے گئے اور اس کے بعد یہ امداد بھی گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہوگئی جو یقینی طور پر محکمہ جاتی افراد کے ذاتی اکاؤنٹ میں جمع ہورہی تھی۔شاکر کے احباب کو اس حالت زار کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے وسائل استعمال کرتے ہوئے ارباب اختیار تک رسائی حاصل کی۔انہی کی کوششوں سے جب ایک سال کی مکمل امدادی رقم (ایک لاکھ پینتالیس ہزار روپے) ملی تو ایک بار پھر وہ سب بھاری قرض کے بوجھ تلے دب چکے تھے۔کریانے کی دکان پر بائیس ہزار روپے ادا کرنے تھے۔اس کے بعد لکڑی والے کو سولہ ہزار روپے دینے کے علاوہ پچیس ہزار روپے کی گندم خرید لی گئی۔بچوں کے لیے چند جوڑے کپڑے اور اپنی ادویات نے کچھ ماہ کے لیے زندگی میں سکون کے لمحات عطا کردیئے۔

اس کے بعد امدادی رقم میں سرکاری سطح پر ہی کٹوتی شروع ہوگئی۔اگلی مرتبہ جب انہیں ’بیس ہزار روپے‘ بھیجے گئے تو بجلی کے بل کے ضمن میں سات ہزار روپے کی تلوار پہلے ہی سر پر لٹک رہی تھی۔شاکر کی مجبوریاں ایک میراث کی طرح اولاد تک بھی منتقل ہوچکی تھیں۔چیک کے حصول کے لیے بیٹوں کو لاہور آمدورفت کا کرایہ (تین ہزار روپے) اپنی ذاتی جیب سے ادا کرنا پڑتا۔چیک پاس کروانے کے لیے سرکاری دفاتر میں درپیش خواری بیان کرنے کے لیے ایک الگ داستان درکار ہوگی۔نوید شاکر کو نوکری دی گئی‘ نہ ہی زرعی اراضی کی فراہمی ممکن ہوسکی۔اب اس فہرست میں صرف ’مفت علاج‘ کی سہولت باقی رہ گئی تھی۔تقدیر نے یہ آخری بھرم بھی جلد ہی چاک کردیا۔

☆......☆

مارچ 2015 میں کرکٹ کے عالمی کپ کی ہنگامہ خیزیاں عروج پر تھیں۔

شاکر بھی ان دنوں انہی سنسنی خیز مقابلوں میں مگن تھا۔نوجوانی میں اسے ہاکی بہت پسند تھی تاہم قومی کھیل کے زوال سے اس کا رجحان کرکٹ کی طرف ہوگیا۔عالمی کپ میں قومی ٹیم کی غیر متوازن کارکردگی کے باوجود وہ بخوشی میچ دیکھا کرتا۔اب اصولی طور پر تو اسے کرکٹ میچز سے لطف اندوز ہونا چاہیے تھا لیکن جانے کیوں ان دنوں طبیعت بہت بوجھل رہنے لگی تھی۔صورتِ حال جب ناقابل برداشت ہوئی تو اسے فوری طور پر لاہور کے ایک بڑے اور جدید سہولیات سے آراستہ اسپتال میں لے جایا گیا۔انتظامیہ نے ابتدائی معائنہ کے بعد ان سے دوٹوک بات کرتے ہوئے کہا۔”مریض کی حالت بہت خراب ہے۔انہیں فوری آپریشن کی ضرورت ہے۔“

”کب تک کرنا ہے آپریشن؟“ اہلخانہ نے دریافت کیا۔

”جب بھی آپ مطلوبہ رقم جمع کروادیں گے۔بیس لاکھ خرچا ہوگا۔“

”بیس لاکھ مگر ہمیں تو حکومت نے یقین دہانی کروائی تھی کہ ان کا علاج بالکل مفت ہوگا۔“

”ایسی یقین دہانیاں تو جانے کس کس کو کروائی جاتی ہیں۔ہم زبانی دعوؤں پر یقین نہیں کرسکتے۔اگر آپ رقم کا بندوبست نہیں کرسکتے تو کسی اور اسپتال سے رجوع کرلیں۔ہمارے پاس ویٹنگ لسٹ میں بہت سے مریض موجود ہیں۔“

اہلخانہ اپنی منتشر انا اور زخمی دل کے ٹکڑے غربت ومجبوری کی ردا میں سمیٹے واپس چلے آئے۔حکمرانوں کی منافقت اور کھوکھلے وعدوں کی تمام تر قلعی اتر چکی تھی۔انہی سیاستدانوں کے لیے تو وہ اکثر کہا بھی کرتا تھا:

سیاست اے بڈھے مکاراں دے ہتھ وچ
اے مکتب ادارے گنواراں دے ہتھ وچ
خدا اس ملک نوں سلامت ای رکھے
اے شیشے دا گھر اے لوہاراں دے ہتھ وچ

(سیاست کی طنابیں بوڑھے مکار سیاستدانوں کے ہاتھوں میں ہے۔تعلیمی اداروں کی سربراہی جہلاء نے ا سنبھال لی ہے۔پروردگار میرے اس ملک کو سلامت رکھے۔یہ شیشے سا نازک گھر لوہار صفت لوگ کیسے سنبھال پائیں گے)

سیاسی شعبدہ بازیوں سے قطع نظر شاکر شجاع آبادی کو مخلص اور بے لوث افراد کا ساتھ بھی نصیب تھا۔وہ انسانیت کے رشتہ سے اسے ہر ممکن سہولت کرتے رہتے تھے۔انہی میں سے ایک نام زمرد خان بھی تھا جو بغرض علاج اسے ’سویٹ ہوم اسلام آباد‘ لے آیا۔مختلف ذرائع ابلاغ میں شاکر کے ساتھ حکومتی سطح پر ہونے والی ناانصافیوں کی خبر پھیل گئی۔اخباری نمائندے ’نیوز رپورٹرز‘ ملک کے دیگر عوام تک اس کے حالات پہنچاتے رہے۔کچھ نمائندے اس سے اکثر استفسار بھی کرتے:

”آپ کے مداحوں کی ملک بھر میں کہیں کوئی کمی نہیں ہے۔آپ کے اشعار زبان زدعام ہیں۔بھٹے پر کام کرنے والا مزدور ہو یا کوئی ریڑھی بان‘ آپ کے اشعار گنگناتا دکھائی دیتا ہے۔“

”ان اشعار میں ان کے دلی جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے۔وہ بھلے ہی میرے نام سے ناواقف ہوں لیکن کلام کی اصل روح مکمل شدت سے محسوس کریں گے کیونکہ وہ آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔“

”آپ مستقل طور پر اسلام آباد منتقل کیوں نہیں ہوجاتے؟“

”کیسے ہوجاؤں بھائی؟ یہ امراء اور حکمرانوں کا شہر ہے۔مجھ جیسے غریب آدمی کا بھلا یہاں کیا کام؟ میری اصل جگہ تو وہیں ہے جہاں سے میرا خمیر اٹھا ہے۔میں نے ساری زندگی ان محروم لوگوں کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔اب عمر کی نقدی ختم ہونے کے قریب ہے۔عصر کے اس وقت میں وہ روزہ کیسے توڑدوں بھلا؟ میرے دکھ‘ محرومیاں اور کرب میری عبادت ہیں۔میں نے تاعمر جرم بے گناہی کا تاوان ادا کرتے ہوئے اپنے لوگوں کے لیے زندگی گزاری ہے تو اب بھلا ان سب کو تنہا کیسے چھوڑدوں؟“

اسلام آباد سے واپسی کے بعد زندگی ایک بار پھر اسی معمول میں لوٹ گئی۔کیلنڈر بدلتے رہے لیکن شاکر کی تکالیف اور معاشی صورتِ حال میں کوئی فرق پیدا نہ ہوا۔نفسانفسی اور انتشار کے دور میں ایک وقت وہ بھی آیا جب سماجی روابط کی ویب سائٹس پر کسی بے حمیت نے پہلے

شاکر کے آباؤ اجداد تقسیم ہند کے عینی شاہد تھے۔اس نے بچپن میں اپنے بزرگوں اور اساتذہ سے علیحدہ وطن کے لیے دی گئی قربانیوں کے بہت سے قصے سنے تھے۔ہمسایہ ملک سے ہونے والی جنگیں اور پاک سرزمین کو دولخت ہوتے تو اس نے خود بھی دیکھا تھا۔اہل وطن نے ان قربانیوں اور نقصانات سے کوئی سبق حاصل نہ کیا اور رفتہ رفتہ بے حسی و مردہ ضمیری کی طرف مائل ہوتے گئے۔حساس دل اور محب وطن شاکر کے قلم کی نوک پر بے اختیار یہ الفاظ مچل جاتے۔

خدایا! خود حفاظت کر‘ میڈا فرمان وکداپے
کتھائیں ہے دین دا سودا‘ کتھائیں ایمان وکداپے
کتھائیں ملاں دی ہٹی تے‘ کتھائیں پیراں دے شوکیس اِچ

میڈا ایمان بدلیا نی مگر قرآن وکداپے
اِتھاں لیڈر وپاری ہن‘ سیاست کارخانہ ہے
اِتھاں ممبر وکاؤ مال اِن‘ اِتھاں ایوان وکداپے
میڈے ملک اِچ خدا ڈالر‘ میڈے ملک اِچ نبی پیسہ
اِتھاں ایمل نہ کئی آوے‘ اِتھاں مہمان وکداپے
ساہ دا کئی وسا شاکر‘ ولا وی کیوں خدا جانڑے
ترقی دی ہوس دے وچ‘ ہر اک انسان وکداپے

(اس ملک کی حفاظت کرنا خدایا! یہاں تیرا فرمان فروخت ہونے لگا ہے۔کہیں دین کا سودا ہوتا ہے تو کہیں ایمان بک جاتا ہے۔ملاؤں اور پیروں نے مذہب کے نام پر اپنی دکانداری چمکالی ہے۔سیاست کے کارخانے میں لیڈر بیوپاری بن چکے ہیں۔ایوان اور ممبر برائے فروخت ہیں۔میرے ملک میں ڈالر خدا اور پیسا نبی ہے۔ترقی کی ہوس اس قدر بڑھ گئی ہے کہ انسان بھی باآسانی بک جاتے ہیں۔)

عاجزی اور انکساری شاکر کی شاعری کا ایک اور اہم پہلو ہے۔اسے اپنی ذات تنکے سے بھی حقیر محسوس ہوتی ہے۔شہرت‘ عزت اور محبت نے بھی اپنا مقام فراموش نہیں ہونے دیا۔غرور و تکبر نے تو ابلیس کو بھی راندہ درگاہ قرار دے دیا تھا تو کیا بشر کی بساط؟

اِتھاں کہیں کوں ناز اداواں دا
اِتھاں کہیں کوں ناز وفاواں دا
اَساں پیلے پتر درختاں دے
ساکوں راہندے خوف ہواواں دا

(اس دنیا میں کسی کو اپنے ناز و انداز پر مان ہوتا ہے تو کوئی اپنی وفا پر اترایا کرتا ہے۔ہم خزاں رسیدہ درخت کے سوکھے پتے ہیں اس لیے ہوا کے جھونکوں سے بھی خوفزدہ رہتے ہیں)

شاکر کے نام سے فرضی اکاؤنٹ بنا کر لاکھوں افراد کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی اور پھر اس کی موت کی جھوٹی خبر شائع کردی۔ ذرائع ابلاغ میں ایک طوفان برپا ہو گیا۔ بعدازاں اس خبر کی تردید تو ہوگئی لیکن اس غیر ذمہ دارانہ، مذموم اور قابل گرفت امر کے اصل مجرم بھی بے نقاب نہ ہوسکے۔ احباب بھی اس صورتِ حال پر بہت دکھی اور ملول تھے۔ وہ اکثر شاکر سے کہتے:

''تمہاری ناقدری ہمیں بہت افسردہ کرتی ہے۔''

اور وہ جواب میں کہتا۔ ''یہ سب تو دستورِ دنیا ہے یارو!! زندگی میں جس شخص کو کبھی قرار واقعی مقام نہیں دیا جاتا، موت کے بعد اس کی ذات کو اپنی ذاتی وجہ شہرت بنالیا جاتا ہے۔ یہی معاشرے کا چلن ہے اور یہی بحیثیت قوم ہمارا دستور۔ یہ سب لوگ میرے مرنے کے منتظر ہیں۔ آج میرے بیوی بچے زندگی کی بنیادی سہولیات سے محروم ہیں۔ میری اولاد کم خوراکی اور مناسب سہولیات سے محرومی کے باعث جگر کے امراض میں مبتلا ہوچکی ہے۔ ابھی کوئی بھی مجھے پوچھنے نہیں آتا لیکن جس روز میں مرجاؤں گا ناں! ہر جگہ ایک کہرام برپا ہوجائے گا۔ دو کمروں کے اس کچے مکان میں رہنے والے محمد شفیع المعروف شاکر شجاع آبادی کے لیے بہترین سنگ مرمر سے آراستہ مزار بنایا جائے گا۔ نیازیں بانٹ کر اپنی محبت اور خلوص کا یقین دلایا جائے گا۔ میرے جیتے جی تو کچھ نہ ہوگا۔ بعدازمرگ یہ سب کچھ تم اپنی آنکھوں سے دیکھوگے۔ میری موت پر بھی سیاست کا بازار گرم ہوگا۔ ایک سیاسی جماعت دوسری کو اس بے پروائی کی ذمہ دار ٹھہرائے گی۔ تیسری جماعت اقتدار میں آنے کے بعد شاعروں اور ادیبوں کو مراعات دینے کے عزم کا اعلان کرے گی۔ چوتھی جماعت میری خدمات کے اعتراف میں اہل خانہ کے لیے کوئی امدادی چیک لے آئے گی۔ کچھ روز میڈیا میں میرا ذکر ہوگا پھر ملک کے کسی کونے میں کوئی اور شاکر کسمپرسی کی زندگی کی قید سے آزاد ہوجائے گا اور یہی عمل ایک بار پھر دہرایا جائے گا۔''

بٹتی ہیں نیازیں اب اس کے مزار پر
کچھ روز پہلے جو کہ فاقوں سے مرگیا

☆......☆

شاکر کا آج اس کے کل سے کسی طور مختلف نہیں۔ کسمپرسی کا یہ عالم ہے کہ تین دن سے زائد ادویات خریدنا ممکن نہیں ہوتا۔ کسی اسپتال جانے کی استطاعت نہ ہو تو گاؤں کے ڈسپنسر سے ہی ڈرپس لگوانی پڑتی ہیں۔ وہ ظلم، جبر اور استحصال کے خلاف جنگ کا استعارہ ہے اور اس کی تمام تر زندگی غالباً اسی کی ایک غزل کی تفسیر ہے۔

غریب کوں کیں غریب کیتے، امیر زادو جواب ڈیوو
ضرورتاں دا حساب گھنو، عیاشیاں دا حساب ڈیوو

(غریب کو کس نے غریب کیا ہے؟ امیر زادو! جواب دو۔ ضرورتوں کا حساب لو اور عیاشیوں کا حساب دو۔)

سخاوتاں دے سنہرے پانڑیں، دے نال جیڑھے مٹا ڈتے نیں
او لفظ موئے ہوئے وی بول پوسن شرافتاں دی کتاب ڈیوو

(سخاوت کے سنہرے پانی سے جو مٹا دیئے ہیں وہ مردہ لفظ بھی بول دیں گے، شرافتوں کی کتاب دو۔)

شراب دا رنگ لال کیوں ہے۔
کباب دے وچ ہے ماس کیندا
شباب کیندا ہے، کیں اجاڑے
حساب کر کے جناب ڈیوو

(شراب کا رنگ سرخ کیوں ہے؟ کباب میں ہے گوشت کس کا؟ شباب کس کا تھا اور کس نے اجاڑا؟ اس کا حساب آخر کون دے گا؟)

زیادہ پھلدا ہے کالا جیکوں
خرید گھن دا ہے او ہو کرسی
الیکشناں (ووٹ) دا ڈرامہ کر کے
عوام کوں نہ عذاب ڈیوو

(جسے کالا دھن راس آتا ہے، کرسی خرید لیتا ہے۔ الیکشن کا ڈراما کر کے عوام کو عذاب نہ دو)

قلم ہے منکر نکیر شاکر جتھاں وی
لکسوا ے تا ڈھن سی
غلاف کعبے دا چھک تے بھانویں
ناپاک منہ تے نقاب ڈیوو

(قلم ہے منکر نکیر شاکر، جہاں بھی چھپوگے یہ ڈھونڈ لے گا۔ چاہے غلاف کعبہ کھینچ کے اپنے گناہگار منہ پر نقاب دے دو۔)

مولوی اللہ یار اور پٹھانی مائی کے اس جیالے سپوت محمد شفیع المعروف شاکر شجاع آبادی کو تو اپنے ان سوالات کے جواب کبھی نہیں مل سکے۔ کیا آپ کے پاس کوئی منطقی جواب موجود ہے؟

ادراک

زرین قمر

وہ پیاس کی ماری تھی اور سامنے سوکھا سمندر تھا، اسے نہ مندر میں سکون ملتا تھا نہ پوجاپاٹ میں اسے توان مورتیوں میں کبھی کوئی دلچسپی محسوس ہی نہ ہوئی بلکہ ان بتوں کے سامنے سر جھکانے میں اسے کوفت ہوتی تھی۔ وہ کوئی معمولی ہستی نہ تھی، اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ بھارت کے بڑے شعراء میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ وہ کتابوں پر کتابیں لکھتی تھی۔ اس کی کتابیں علم کا خزانہ تھیں لیکن اس کے دل کی بے چینی ختم نہ ہوئی۔ اسی لیے اس نے قرآن پاک کا مطالعہ شروع کیا تھا۔ یہ قرآن پاک کا ہی معجزہ تھا کہ اس نے گویا دھماکا کر دیا جس کی گونج بھارت کے کونے کونے میں محسوس ہوئی۔

بھارت کی ایک بہت بڑی شاعرہ کی زندگی کا عکس

وہ گیارہ دسمبر 1999ء کا یادگار دن تھا، جنوبی بھارت کے شہر کوچین میں کیرالہ لائبریری کاؤنسل کا اجلاس ہو رہا تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہاں ایک ایسا اعلان ہونے والا ہے جو اس اجلاس کو نا صرف عالمی شہرت عطا کرے گا بلکہ اسے تاریخ کے صفحات میں بھی محفوظ کردے گا۔ خود اعلان کرنے والی خاتون بھی اپنے اس اعلان سے آگاہ نہ تھی۔ جب وہ تقریر کرنے کے لیے آئی تو اس نے محسوس کیا کہ ایک نور نے اس کی ذات کو اپنی لپیٹ

میں لے لیا ہے اس کے ہاتھ آسمان کی طرف بلند ہوئے اور زبان سے بے ساختہ نکلا۔ ''یا اللہ۔'' اس کے ساتھ ہی وہاں موجود لوگوں پر سناٹا چھا گیا۔ وہ سب حیرت زدہ تھے۔ جو کچھ ہو رہا تھا وہ ان کی توقعات کے برعکس تھا اس کی آواز سناٹے کو توڑتی ہوئی ان کی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی۔ ''اب میں اس کی پرستار ہوں جو اپنی ذات میں یکتا ہے۔''

یہ اعلان کرنے والی کوئی مسلمان خاتون نہ تھی بلکہ انگریزی اور ملیالم زبان کی بین الاقوامی شہرت یافتہ مصنفہ کملا داس تھی اس نے اعلان کیا تھا کہ وہ مسلمان ہو چکی ہے۔

اسلام قبول کرنے کے بعد اس نے اپنے لیے کملا ثریا کا نام پسند کیا۔

کملا داس نے اچانک اسلام قبول نہیں کیا تھا بلکہ اس کی زندگی میں آنے والے اس انقلاب کی ابتداء 37 سال قبل ہوئی تھی جب اس نے امتیاز اور ارشاد نامی دو بچوں کو گود لیا تھا لیکن انہیں ہندو بنانے کی بجائے ان کی تعلیم و تربیت مسلمان گھرانوں اور اسلامی تعلیمات کے مطابق کی تھی جس کی وجہ سے وہ اسلامی تعلیمی کتب کا مطالعہ کرنے لگی تھی۔ انہی کتب کا اثر تھا کہ آہستہ آہستہ اسلام اس کے دل میں گھر بناتا چلا گیا پھر مسلمان گھرانوں سے تعلقات کی وجہ سے بھی دین اسلام کی حقانیت سے اس کا ذہن روشن ہو گیا۔ کملا داس نے اپنے اندر ہونے والی تبدیلیوں سے اپنے شوہر کو آگاہ کیا جو ایک آزاد خیال انسان تھا۔ اس نے کملا کو اسلام کے مزید مطالعے کی اجازت دے دی۔ اسلام کے مطالعے سے کملا کے ذہن کی تاریکی دور ہونے لگی۔ قبول اسلام کے بارے میں کملا خود ایک واقعہ بیان کرتی ہے۔ ''میں مالا بار سے کوچی کی طرف بذریعہ کار سفر کر رہی تھی۔ علی الصباح سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس روز خلاف توقع مجھے طلوع آفتاب کا رنگ غروب آفتاب جیسا لگا۔ سورج میرے ساتھ سفر کرتا رہا اور سات بجے صبح یہ سفید ہو گیا۔ جس نے میرے دل اور دماغ پر عجیب اثر کیا۔ مجھے لگا جیسے میں برسوں سے اس وقت کی منتظر تھی۔ میرا دل شدت سے چاہا کہ میں اس کے تخلیق کار پر ایمان لے آؤں، اسلام قبول کر لوں۔ قدرت نے مجھے سورج کے بدلتے رنگوں سے قبول اسلام کا پیغام دیا تھا۔''

پھر اس نے ایک اور موقع پر اسلام قبول کرتے وقت اپنی کیفیت کچھ یوں بیان کی۔ ''پہلے سے میرا قبول اسلام کا اعلان کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، جب ابتدائی کلمات میرے منہ سے ادا ہو رہے تھے تو مجھے لگا جیسے ایک نور میرے قریب ہوا ہو، اسی لمحے میرے دل نے بذات خود فیصلہ کر لیا اور زبان نے بے ساختہ اس کا اظہار کر دیا، گویا میرے ہاتھ خود بخود آسمان کی طرف اٹھ گئے اور میری زبان سے یا اللہ کا لفظ نکلا اور اسی کیفیت میں تقریباً دس منٹ تک مجھ پر اور حاضرین پر سکتہ طاری رہا۔ ہزاروں کے اس مجمع میں ایک بھی مسلمان نہیں تھا۔ اس وقت میں نے اپنی دیرینہ خواہش پوری کر دی جو ایک زمانے سے میرے سینے میں دبی ہوئی تھی۔''

ثریا کے قبول اسلام پر خلیج ٹائمز نے لکھا۔ ''بھارتی شہر کوچین کے گاندھی نگر میں وائل اسٹیڈیم کے قریب سات نمبر فلیٹ ثریا کے قبول اسلام کے بعد سے اب تک کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ ثریا کے ٹیلی فون کو پانچ منٹ کا بھی وقفہ نہیں ملتا اور دنیا بھر سے انہیں مبارک باد کے پیغام مل رہے ہیں۔''

کملا 31 مارچ 1934ء میں پنور کلم، تھریسور، کوچن، کیرالہ کے ایک مشہور نائر خاندان میں پیدا ہوئی جس کا نام نالا پٹ ہے۔ اس کی ماں بالامنی رما ایک مشہور شاعرہ تھی اور والد وی ایم نائر ملیالم زبان کے مشہور روزنامہ ''ماتر بھومی'' کے ایڈیٹر تھے جو ایک کثیر الاشاعت روزنامہ ہے۔ اس کے تین لڑکے ہیں۔ بڑا لڑکا این ڈی نالا پٹ ہندوستان کا مشہور صحافی ہے۔ دوسرا لڑکا چنین داس ٹائمز آف انڈیا جیسے بڑے روزنامہ کا ڈائریکٹر ہے۔ تیسرا لڑکا پونا سے نکلنے والے ''ٹائمز آف انڈیا'' کا مینیجر ہے۔

کملا نے جو دو مسلمان لڑکے گود لیے تھے وہ دونوں نابینا ہیں۔ انہیں بھی کملا نے اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ ان میں سے ایک کا نام پروفیسر ارشاد احمد ہے اور دوسرے کو لندن میں تعلیم دلوائی جس کا نام بیرسٹر امتیاز احمد ہے۔ اس کے سارے بیٹے ہندوستان کے مختلف خطوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

کملا کا شوہر مادھو داس ایک بینک میں افسر تھا جس کا انتقال 1992ء میں ہو گیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس خوش حال گھریلو پس منظر کے اور ادبی دنیا کے وسیع تعلقات کے باوجود کملا تنہا زندگی گزارتی رہی۔ وہ بھارت کی پہلی عالمی شہرت اور ایوارڈ یافتہ مصنفہ تھی جس نے اسلام قبول کیا۔ بھارت میں اسلام قبول کرنے والی ہندو خواتین پر یہ الزام لگتا ہے کہ انہوں نے خوب صورت مسلمان نوجوانوں سے محبت اور شادی کی خاطر اسلام قبول کیا ہے مگر قبول اسلام

کے وقت کملا داس کی عمر 67 سال تھی۔ وہ نہ تو کسی کی محبت میں گرفتار ہوئی تھی اور نہ اسے شادی کی ضرورت تھی۔

کملا داس نے ایک ایسے وقت اسلام قبول کیا جب بھارت میں تبدیلی مذہب کے خلاف انتہا پسند ہندو بھرپور سرگرم تھے۔ تشدد، قتل اور گھٹیا ہتھکنڈے اختیار کرتے تھے اور انتہائی ظالمانہ حربوں سے مسلمانوں کو ہندو بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی کی بات ہے کہ میرٹھ میں بدترین ہندو مسلمان فساد ہوا تھا جہاں ایک ہندو فوجی افسر نے اپنے ہندو دہشت پسند فوجیوں کے ساتھ مسلمانوں کی بستی ملیانہ میں سرچ کے نام پر چھاپہ مارا اور اس بستی کے تمام نوجوانوں کو ٹرک میں بٹھا کر ایک تالاب پر لے گیا اور ان مظلوموں کو گولیاں مار کر تالاب بھر دیا۔ ابھی مہاراشٹر کے شہر بھونڈی میں ہوئے ہندو مسلمان فساد کو بہت زیادہ دن نہ گزرے تھے، جہاں مسلمانوں کو ایک عمارت میں بند کر کے زندہ جلایا گیا تھا، کئی سو افراد کی سوختہ لاشوں کو عالمی میڈیا سے چھپانے کے لیے حکومت نے تعداد کم سے کم بتائی تھی۔ ابھی بھاگلپور بہار میں ہوئے فسادات کا زخم بھی کہاں بھرا تھا جہاں چندھیری گاؤں کے مسلمانوں کو جمع کر کے پولیس والوں نے گولیوں کا نشانہ بنایا تھا جن کی تعداد بھی کئی سو تھی۔ جہاں کے گاؤں ''لوگائیں'' کے تمام مسلمانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھیت میں دفن کر کے گوبھی کے پودے لگا دیے گئے تھے۔ ایسے وقت میں اس نے اتنا بڑا کام کر دیا تھا۔

بھارت میں رہتے ہوئے کسی تنہا فرد کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اسلام قبول کرنے کا اعلان کرے اور انتہا پسند ہندوؤں کی دشمنی مول لے اس لحاظ سے کملا ثریا کا قبول اسلام کا اعلان نہایت جرأت مندانہ تھا، اسے کسی مسلمان عالم یا سیاسی لیڈر یا کسی دعوتی تنظیم نے اسلام قبول کرنے کی دعوت نہیں دی تھی۔ اس کا قبول اسلام خالصتاً اس کی اسلام سے متعلق تحقیق کے باعث تھا۔

کملا داس کے قبول اسلام کے پیچھے کچھ اور بھی باتیں تھیں اگر ہم اس کی پوری زندگی کا جائزہ لیں تو یہ ہیں کہ اس نے جس دور میں آنکھ کھولی وہ دور سیاسی غلامی کا تھا۔ انڈیا پر برطانیہ کی حکومت تھی۔ مقامی لوگوں سے غلاموں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔ کچھ خاندانوں سے انگریزوں کے دوستانہ تعلقات تھے جنہیں وہ کسی حد تک برابری کا درجہ دیتے تھے لیکن کبھی نہ کبھی کسی موقع پر کمتری کا

رئیس امروہوی (1914-1988)

سید محمد مہدی رئیس امروہوی کا پورا گھرانا چشم بددور شعر و سخن اور صحافت پر مامور چار دانگ عالم میں مشہور رہا۔ سید محمد تقی جنگ کے مدیر، رئیس امروہوی جنگ کے قطعہ نگار، سید محمد عباس عالمی ڈائجسٹ، انشاء کے منتظم اشاعت، سید محمد اصغر جون ایلیا سسپنس ڈائجسٹ کے کالم نگار، شاعر چار مجموعوں کی شہرت۔ چالیس برس کا عرصہ روزانہ قطعہ لکھنے والے ''الف'' سے شعری مجموعہ کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔ بحضرت یزداں، پاس غبار، ملبوس بہار، انجم السحر، قطعات رئیس امروہوی، ضمیر خانہ اور حکایات نے (غزلیں) تک کا سفر شعری سرمایہ دے گیا۔ جنگ میں جنسیات و نفسیات پر مبنی کالموں کے مجموعے عالم ارواح، عجائب نفس، مظاہر نفس، ٹیلی پیتھی، ہپناٹزم کون سا موضوع ان کی گرفت میں آ کے کتاب نہ بنا؟ اچھے مرزا ڈائجسٹوں میں قسط وار پھر کتاب ''المیہ مشرقی پاکستان'' (دو حصے) لکھ گئے۔ صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی کے حامل رئیس امروہوی 12 ستمبر 1914 امروہہ ضلع مراد آباد میں علامہ سید شفیق حسن ایلیا کے گھر پیدا ہوئے اور 22 ستمبر 1988 کو حادثے میں وفات پا گئے۔ سخی حسن قبرستان میں تمام برادران و خویش ایک ہی احاطے میں مدفون ہیں۔

اقتباس: خاک میں پنہاں صورتیں از سید محمد قاسم

احساس دلا دیتے تھے۔ ایسے بہت سے واقعات کملا کی زندگی میں بھی پیش آئے۔

کملا اور اس کا بھائی ایک یورپین اسکول میں پڑھتے تھے وہاں مقامی بچے صرف چھ تھے جنہیں کسی بڑی شخصیت کی آمد پر ان کی سانولی رنگت کی وجہ سے چھپا دیا جاتا۔ وہ بچے اکثر اپنے ہم جماعت انگریز بچوں کے مذاق کا شکار بھی بنتے تھے۔ ایک بار کملا کا بھائی بھی ایسے ہی مذاق کا نشانہ بنا۔ وہ ایک روز گھر آیا تو اس کی سفید شرٹ پر خون لگا ہوا تھا کیونکہ اس کے سفید فام دوستوں نے اس کی ناک میں پنسل چبھو دی تھی۔ اس کی ناک سے خون نکلتے دیکھ کر اس کے دوست ولیم نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا۔ ''ارے تمہارا خون بھی سرخ ہے۔''

وہ کیا جواب دیتا۔ اسکول کے اساتذہ بھی کسی ہندوستانی کو انگریز پر فوقیت دے نہیں سکتے تھے اسی لیے اسے گھر بھیج دیا تھا۔ گھر پہنچنے پر کملا نے غصے سے پوچھا۔ ''تم نے بدلہ نہیں لیا؟''

’’میں نے اس کے چہرے پر کھرونچے مارے تھے لیکن دوسرے اینگلو انڈینز نے اسے بچالیا۔‘‘

کملا اور اس کے بھائی نے اس بارے میں اپنے والدین کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ اسکول میں اکثر کسی خاص موقع پر جب کوئی نظم پڑھی جاتی تو وہ کملا ہی کی ہوتی لیکن ہمیشہ اسے پڑھنے کے لیے شرلے کو دیا جاتا جو ایک اسکاٹش تھا۔ سفید فام ہونے کے ساتھ ساتھ خوب صورت بھی تھا۔ سبھی اساتذہ اس کی ذہانت اور خوب صورتی کے قصیدے پڑھتے۔

کملا چھ سال کی تھی تب سے نظمیں لکھا کرتی تھی جو زیادہ تر اداس ہوتی تھیں۔ انہیں دو استاد ٹیوشن پڑھانے آتے تھے، ایک انگریزی پڑھاتے اور دوسرے مالیالم۔ انہیں مالیالم اس لیے پڑھائی جاتی تھی کہ وہ اپنی دادی سے اچھی طرح بات کرسکیں کیونکہ وہ صرف یہی زبان جانتی تھیں اور بچوں سے بہت محبت کرتی تھیں۔ ان کی یاد میں بعد میں کملا نے ایک نظم My Grandmother`s Home بھی لکھی جس میں اس کی بچپن کی یادوں کا تذکرہ موجود ہے۔

اسکول میں پیش آنے والے واقعات نے اسے خاصا حساس بنا دیا تھا۔ مثلاً ایک موقع پر بچوں کو وکٹوریہ گارڈن میں پکنک کے لیے لے جایا گیا جہاں انہیں گنے کا شربت اور گوشت کے سینڈوچ کھانے کے لیے دیے گئے۔ کملا شاکاہاری یعنی گوشت سے پرہیز کرنے والے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اس نے سینڈوچ نہیں کھائے اور پھولدار پودوں کے سایہ میں جا کر بیٹھ گئی جس پر اس کی ٹیچر نے اسے بہت ڈانٹا۔ بچوں نے بھی اس کا خوب مذاق اڑایا۔ کملا اکثر اسکول کی چھٹی کے بعد چوکیدار کی نظر بچا کر اسکول کے پیچھے واقع قبرستان میں چلی جاتی اور قبروں پر لگے کتبے پڑھتی رہتی جن پر مرنے والوں کے نام اور تاریخ لکھی ہوتی۔

الزبتھ ہارڈنگ 1818-1938 وہ سوچتی الزبتھ کون تھی۔ راجر بٹن کون تھا جو 83 سال کی عمر میں مرگیا تھا۔ روز ایمنڈ کون تھی؟ وہاں زندہ صرف کملا ہوتی تھی یا وہ بندر جو درختوں پر اچھل کود کررہے ہوتے تھے یا پھر سرخ پھولوں والی بوگن ویلیا اور گیندے کے پھول جو ہوا میں لہرا رہے ہوتے تھے، وہ شاید قبرستان اس لیے جاتی تھی کہ اسے معلوم تھا کہ مردہ لوگ کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتے۔ کسی پر اعتراض نہیں کرتے۔ کسی کا مذاق نہیں اڑاتے وہ بچپن ہی سے حساس تھی۔

وہ اپنی شاعری میں اپنے ذاتی جذبات، احساسات اور تجربات بیان کرتی رہی وہ عورت کی آزادی اور حق کے لیے جدوجہد کرتی رہی۔ اس کا انگریزی ادب پر بھی بہت کام تھا۔ اس نے انسانی فطرت کی نئی جہت متعارف کرائی۔ مرد اور عورت کے تعلقات، بچپن کی یادیں، محبت اور بے وفائی کو موضوع بنایا۔ وہ اپنے دور کی ایک طاقتور آواز سمجھی گئی۔

جب اس نے اسلام قبول کیا تو وہ اپنی شہرت کے عروج پر تھی۔ دنیا میں مختلف مقامات پر ہونے والی ادبی کانفرنسوں میں شرکت کرتی تھی۔ اس کا انگریزی میں تخلیق کیا ہوا ادب مختلف تعلیم گاہوں کی نصاب میں اب بھی شامل ہے۔

اس نے پوری زندگی کی جدوجہد کے بعد بڑی بہادری اور جرأت مندی سے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔

بھارت کی خاتون مصنفہ صلاح جوزف نے کملا ثریا کے قبول اسلام پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’مذہبی انتہاپسندی کے دور میں ثریا کا فیصلہ انتہائی فکر انگیز ہے۔ یہ کوئی معمولی یا آسان فیصلہ نہیں ہے۔ خاص طور سے کسی اونچی ذات کے ہندو کا مذہب تبدیل کرنا بہت بڑا فیصلہ ہے۔‘‘

مصنف ایم این وجائن نے کہا۔ ’’سیاسی دیومالائی خرافات جسے ’’ہندوازم‘‘ کہا جاتا ہے۔ میں کملا نے دھماکا کیا ہے۔ میں انہیں ان کے جرأت مندانہ فیصلے پر مبارک باد دیتے ہوئے کہتا ہوں کہ وہ بہت خوش قسمت ہیں۔ بالآخر انہوں نے اپنی آزادی کا بہترین استعمال کیا ہے۔‘‘

اس کے باوجود بہت سے ہندوؤں کو اس کا فیصلہ ہضم نہ ہو پایا اور انتہاپسندوں نے اسے جان سے ماردینے کی دھمکیاں دیں لیکن کملا ثریا اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی قدرت کاملہ پر یقین رکھتی تھی اس لیے اس نے ان دھمکیوں کی کوئی پروانہ کی اور کہا۔ ’’میں اپنا ہر معاملہ اللہ پر چھوڑ چکی ہوں، وہ زندگی کی آخری سانس تک میری حفاظت کرے گا۔‘‘ یہ بات اس نے خلیج ٹائمز کو انٹرویو دیتے ہوئے کہی تھی۔

’’جس طرح قبول اسلام پر کملا ثریا کی پذیرائی کی گئی اسی طرح مخالفین اسلام کی طرف سے بھی اسے بے شمار خطوط آئے، فون آئے، ایس ایم ایس آئے جن میں ہندو قوم میں واپسی کے لیے نصیحت ہی نہیں بلکہ دھمکیاں بھی دی گئی تھیں۔ کچھ لوگوں نے اسے وقت اور دن مقرر کرکے دھمکی دی کہ ا

گر دیئے گئے وقت سے پہلے اسلام کو ترک نہ کیا تو ہم تمہیں قتل کردیں گے۔ شہر کی دیواروں پر کملا کے خلاف نعرے لکھے گئے۔ اس کی ایک سہیلی نے اسے مشورہ دیا کہ اپنے تحفظ کے لیے پولیس میں درخواست دے دو لیکن اس نے کہا کہ اسے کسی کے تحفظ کی ضرورت نہیں موت تک کے لیے اسے تحفظ مل چکا ہے۔ یہ تحفظ اللہ کی جانب سے ہے اللہ جب چاہے وہ مرنے کے لیے تیار ہے۔ رہا مسئلہ ظالموں کے حملے کا تو اس کا خیال آیا کہ اگر وہ ایسے حملے میں ماری گئی تو اسے شہادت نصیب ہوگی جو بہت بڑی سعادت ہے۔‘‘

ایک موقع پر ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل کو انٹرویو دیتے ہوئے اس نے کہا ’’میں نے ہندو دیوتاؤں کی مورتیاں اور تصویریں اپنے کمرے سے اتار دی ہیں۔ ہندوؤں نے مجھے صرف دکھ ہی دیئے ہیں اور اسکینڈل بنائے ہیں۔ اب اسلام قبول کرکے میں نے نیا جنم لیا ہے۔ قبول اسلام سے مجھے جو سکون میسر ہوا ہے وہ بیان کی حد سے باہر ہے۔ میں اسلام کی روح کو سمجھ گئی ہوں۔ میں نے اس وقت اسلام قبول کیا جب مجھے محبت اور تحفظ کی بے حد ضرورت تھی۔ کچھ ساتھی مصنفین مجھ سے ناراض ہیں لیکن مجموعی طور پر ردعمل خراب نہیں ہے۔ میرا یہ احساس کہ اسلام محبت اور ہمدردی کا دین ہے۔ درست ثابت ہوا ہے تمام مسلم ممالک سے مجھے برابر فون آرہے ہیں جن میں میرے لیے دعائیں، محبت اور عقیدت ہوتی ہے۔‘‘

کملا ثریا کو مکہ مکرمہ جانے کی بہت خواہش تھی۔ ایک انٹرویو کے دوران اس نے کہا تھا کہ وہ اس سرزمین پر جانا چاہتی ہے جہاں سے اسلام کا چشمہ پھوٹا تھا۔ اگر اسے اس کی صحت نے اجازت دی اور قسمت میں وہاں جانا ہوا تو وہ ضرور جائے گی۔

اسے تین بار دل کا دورہ پڑ چکا تھا۔ ڈاکٹرز نے اسے بائی پاس سرجری کا مشورہ دیا تھا لیکن اس نے نہیں کروائی آخری عمر میں وہ بیمار رہتی تھی اسے چلنے میں بھی تکلیف ہوتی تھی لیکن اس نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔

فروری 2007ء میں کملا نے اپنے چھوٹے بیٹے جے سوریا داس کے پاس کیرالہ جانے کا فیصلہ کیا اور آخری وقت تک وہیں رہی۔ اس عرصے میں دو بار کیرالہ کے وزیر زراعت و تعلیم اس سے ملنے آئے۔

اس کی وفات کے بعد اس کی وصیت کے مطابق اس کا جسد خاکی کوچی پہنچوانے کے انتظامات کرائے۔ کیرالہ کی گورنمنٹ نے اس کی تدفین کے انتظامات کیے۔

اس کی تدفین کے موقع پر اس کے بیٹے جے سوریا داس نے بتایا کہ وہ کافی عرصے پونے کے جہانگیر اسپتال میں زیر علاج رہی جہاں 31 مئی 2009ء کو ایک بج کر 55 منٹ پر اس کا انتقال ہوا۔ اس کی آخری رسومات اسلامی طریقے سے ادا کی گئیں اور اسے کوچی میں پلائم جمعہ مسجد کے احاطے میں دفن کیا گیا۔

اپنے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے کملا ثریا نے قطر میں ہونے والی خواتین کی ایک کانفرنس میں شرکت کی تھی اس موقع پر اس نے تقریر کا آغاز یوں کیا۔

’’بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ رب العالمین

بہنو اور بھائیو!

مجھے خوشی ہے کہ میں ویمنز کانفرنس میں حصہ لے رہی ہوں لیکن آج ایک نئے مذہب اور نئی دنیا میں قدم رکھ چکی ہوں۔ میں اس سے پہلے بھی ایسی کانفرنسوں میں شرکت کرتی رہی ہوں لیکن آج مجھے قطر کی خواتین نے بہت عزت دی ہے۔ آج میں لٹریچر یا پوئٹری پر بات نہیں کروں گی بلکہ خواتین کے مسائل پر بات کروں گی ہم میں ایسی بھی خواتین ہیں جو بظاہر مسکراتی نظر آتی ہیں لیکن اندر سے وہ بہت اداس ہوتی ہیں۔ مجھ سے تنہائی میں ملنے والی خواتین اکثر مجھے اپنے دکھوں کے بارے میں بتاتی ہیں۔ ان سے میرا کہنا ہے کہ میری طرح اسلام کی طرف آئیں یہاں انہیں قلبی سکون ملے گا۔ میں دیکھتی ہوں کہ دنیا کے مختلف حصوں سے لوگ مکہ مکرمہ جاتے ہیں۔ میں اب تک وہاں نہیں جاسکی ہوں لیکن میں وہاں جانا چاہتی ہوں۔ اسلام قبول کرنے کے بعد مجھے لوگوں کے سخت رویوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن میں محبت پر یقین رکھتی ہوں۔ وہ محبت جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امتوں سے کی، بے لوث اور بے غرض محبت پھر چاہے لوگ آپ کا کتنا ہی مذاق اڑائیں۔ آپ ان کی پروا مت کریں۔ میں نے بھی یہی کیا ہے اور شاید اللہ نے مجھے اسی وجہ سے اسلام کی پیروی کرنے کے لیے چن لیا ہے۔ میں اس فیصلے پر قائم رہوں گی۔‘‘

اور وہ واقعی اپنے فیصلے پر قائم رہی جس کا ثبوت پلائم جمعہ مسجد کے احاطے میں موجود اس کی قبر ہے۔ وہ دنیا کے ہر رشتے سے ناطہ توڑ کر اللہ کی ہوگئی۔

ڈاکٹر اقبال ہاشمانی

مائی کلاچی سے کراچی تک کا سفر، اسے میٹرو پولیٹن شہر بنا تو لیا ہے لیکن گزرتے وقت کے ساتھ اس کے ماضی کو ہم بھولتے جارہے ہیں۔ اس شہر کا ماضی قریب کیسا تھا اسے نہایت فنکارانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

معلومات حاصل کرنے کے شوقینوں کی مدارات

جب کبھی رقص طاؤس اپنے اوج کمال کو پہنچتا ہے تو دلکش پروں کی قوسِ حسین سے دھنک کے تمام رنگ چاروں طرف بکھرنے لگتے ہیں اور پھر ان خوب صورت رنگوں کے امتزاج سے ان گنت نئے خوشنما رنگ تشکیل پانے لگتے ہیں۔ ساری کائنات ان جھلملاتے شوخ رنگوں کی برکھا رُت میں بھیگ سی جاتی ہے۔ تب کائنات کی خوبرو دلہن لجاتی ہوئی ان گونا گوں رنگوں کی اوڑھنی کی اوٹ سے جھانکنے لگتی ہے، یہ رنگ ہی تو ہیں جو کائنات کا جمال ہیں۔ حسن ازل کا کمال ہیں۔ یہ پرندوں کی قطار، وہ خوشنما پھولوں کی مہکار، یہ شوخ و چنچل تتلیوں کا نکھار، وہ نرم و نازک کلیوں کی بہار، وہ ناؤ اور پتوار، وہ کنگن وہ ہار، سب خوشیوں کے تہوار اور یہ اجلے اجلے نکھرے نکھرے رنگ کہ جیسے پریاں قطار اندر قطار اور وہ چمن ہائے مشکبار۔

کالا، پیلا، نیلا، اودا، گیروا، مٹیالا، سانولا، سنہرا، سبز، سفید، سرخ یہ تمام رنگ جگنوؤں کی مانند ہر سو جگمگانے لگتے ہیں۔ تب کائنات کی ہر ایک شے اس ازلی محبوبہ دلنواز کا روپ دھار لیتی ہے کہ جو اپنے محبوب کی ذات میں سما کر اپنی تکمیل ذات چاہتی ہے۔ الفت کی تال پر پریم کے سُروں میں ہولے ہولے گنگنانے لگتی ہے۔

موری لاج شرم سب رکھ لے
موہے اپنے ہی رنگ میں رنگ دے
(امیر خسرو)

یہ رنگ ہی تو ہیں جو کائنات کی ہر شے کو اس کی شناخت دیتے ہیں۔ یہ سبز ہلالی پرچم جو میری قومیت کا نشان ہے۔ وہ سیاہ غلاف کعبہ جو اس جگ میں میری پہچان ہے اور یہ سفید امن کی فاختہ جو میرا ایمان ہے۔ یہ مختلف رنگ جو ہر قبیلے کی پہچان ہوا کرتے ہیں۔ ہر پرچم کی شناخت ہوتے ہیں، ہر شہر کا علامتی نشان ہوتے ہیں۔ اکثر شہر بھی اپنے رنگ سے جانے جاتے ہیں۔ بھارت کا شہر جے پور پنک سٹی کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ مراکش کا مور کو شہر نیلگوں کہلاتا ہے۔ کبھی کبھی میرے دل میں یہ خیال آتا رہا ہے کہ میرے شہر کا رنگ کیا ہے؟ میں ایک عرصہ تک اس سوال کا جواب تلاش کرتا رہا ہوں کہ میرے محبوب شہر کراچی کا رنگ کیسا ہے؟

اس روز میں کبوتر چوک کے پاس بیٹھا، ان معصوم پرندوں کو دانہ چگتے دیکھ رہا تھا۔ کبھی یہاں اکا دکا کبوتر ہوا کرتے تھے اور اب یہ حال ہے کہ یہ پورا چوک ان سے بھرا رہتا ہے۔ یہ آب و دانے کی تلاش ہی تو تھی جو ان سب کو یہاں کھینچ کر لائی رہی ہے۔ کراچی جو کبھی ایک چھوٹی سی بستی ہوا کرتا تھا۔ بندرگاہ کی وجہ سے یہاں لوگ آکر بسنے لگے۔ آہستہ آہستہ اس کی آبادی بڑھنے لگی۔ پھر جوں جوں روزگار کے مواقع بڑھتے گئے لوگ دور دراز کے علاقوں سے یہاں کا رخ کرنے لگے۔ آب و دانہ انسانوں کو اس شہر میں بلاتا رہا۔

لوگ جب آکر کہیں بستے ہیں تو اپنے رہنے کے لیے گھر بناتے ہیں۔ گھر بنتے ہیں تو محلے آباد ہونے لگتے ہیں۔ اشیائے ضرورت کی خرید و فروخت کے لیے دکانیں اور بازار وجود میں آنے لگتے ہیں پھر عبادت گاہیں تعمیر ہونے لگتی ہیں۔ تعلیم کے لیے مدرسے بنائے جاتے ہیں۔ بیماروں کے لیے شفا خانوں کی ضرورت پڑتی ہے اور مختلف ضرورتوں کے لیے بہت سی عمارتیں بنی شروع ہوتی ہیں۔ جے پور پنک سٹی اس لیے ہے کہ وہاں زیادہ تر عمارتیں گلابی رنگ کی ہیں۔ میں نے سوچا کہ ضرور کراچی کی عمارتوں کا بھی کوئی خاص رنگ ہوگا یا اکثر عمارتیں ایک رنگ کی ہوں گی اور یہی رنگ کراچی کا رنگ ہوگا۔ تب کبوتر چوک کے سامنے ہائی کورٹ کی عظیم الشان عمارت پر میری نظر

پڑی۔ سرخ پتھروں سے بنی پرشکوہ عمارت کو دیکھ کر میں نے سوچا شاید یہی رنگ شہر کی دیگر عمارتوں کا بھی ہوگا لیکن ہائی کورٹ کے سامنے سندھ اسمبلی کی عمارت کا زرد مٹیالا رنگ میرے اس خیال کی نفی کرتا نظر آیا۔ میرے دل میں تجسس نے سر ابھارا۔ میں شہر کا رنگ دریافت کرنے کی دھن میں آگے کی طرف چل دیا۔ اگلے چوک پر داہنی جانب آرٹس کونسل کے سامنے ایک خوب صورت طرز تعمیر کی حسین عمارت میری نظروں کے سامنے تھی۔ یہ ہندو جیم خانہ کی عمارت ہے۔ جودھپوری پتھروں سے بنی غالباً کراچی کی پہلی عمارت جو مغل طرز تعمیر اور ہندوستان فنِ تعمیر کا امتزاج ہے، حسین شاہکار ہے۔ اسی سڑک پر بائیں جانب سپریم کورٹ کی زرد مٹیالے رنگ کی عمارت موجود ہے۔ آرٹلری میدان تھانے والی گلی سے چھوٹی سی سڑک عبور کر کے بڑی سڑک پر پولو گراؤنڈ کے برابر میں گورنر ہاؤس کی عمارت ہے۔ سر چارلس نیپئر کی بنوائی ہوئی یہ عمارت بھی اسی طرز تعمیر کی عکاسی کررہی ہے جو اس زمانے کی دیگر عمارتوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ گذری کے زرد پتھروں سے بنی بے شمار عمارتیں شہر کا حسن بڑھاتی ہیں۔

میں خراماں خراماں چلتا ہوا ڈاکٹر ضیاء الدین روڈ تک آن پہنچا۔ پولو گراؤنڈ کی جگہ ایک خوب صورت پارک ہے۔ اس کی تعمیر میں بھی وہی زرد مٹیالا رنگ نمایاں ہے۔ سامنے کی طرف گورنمنٹ کامرس کالج ہے اور اس کے برابر میں جناح کورٹس ہے جہاں اب رینجرز کا قیام ہے۔ وہی زردی مائل پتھروں سے بنی ہوئی شاندار عمارتیں اپنی مضبوطی اور قدامت کا اعلان کررہی ہیں۔ آگے پی آئی ڈی سی سے بھی آگے کراچی کلب اور کراچی جیم خانہ ہے۔ وہیں ذرا اس طرف قدیم برسٹل ہوٹل ہے۔ کراچی جیم خانہ کے سامنے کمشنر ہاؤس اور پھر اس سے آگے کی عمارتیں زردی مائل رنگ کو نمایاں کررہی ہیں۔ ادھر سندھ کلب کی عمارت اور پھر اس کے ساتھ فریئر ہال کی پُرشکوہ عمارت بھی ان ہی زردی مائل خاکستری رنگ کے پتھروں سے بنائی گئی ہیں۔ قائداعظم ہاؤس جو پہلے کبھی فلیگ اسٹاف ہاؤس ہوا کرتا تھا، جسے قائداعظم نے خرید لیا تھا اور جہاں کافی عرصہ تک محترمہ جناح قیام پذیر رہیں۔ آگے ایلفنسٹن اسٹریٹ پر آرمی میس کی عمارت اور اس طرف میٹرو پول کے سامنے کی عمارتیں کہ جن میں سے ایک میں کیفے گرانڈ ہوا کرتا تھا۔ وہی مٹیالا رنگ، وہی طرز تعمیر پھر اسی طرف سروسز کلب کی عمارت اور فوارہ چوک کے ایک کونے پر ٹرینٹی چرچ، یہی نہیں صدر کے علاقے کی اکثر
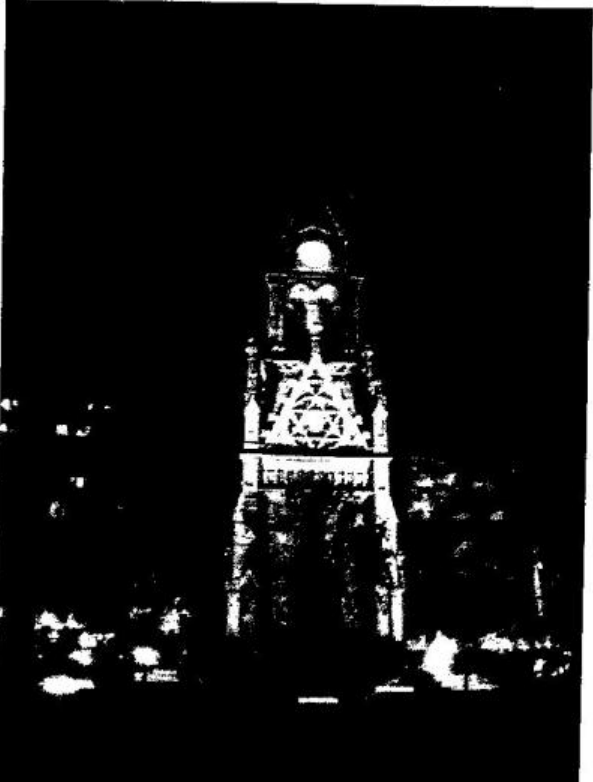
عمارتیں یہی رنگ لیے ہوئے ہیں۔
ایمپریس مارکیٹ، ایڈلجی ڈنشا ڈسپنسری، سینٹ پیٹرک کا خوب صورت گرجا گھر، سینٹ جوزف کالج، جہانگیر پارک، خیبر ہوٹل والی بلڈنگ اور سامنے عظیم الشان سینٹ اینڈریوز چرچ، شہر کے اس رنگ کو ہی معیار قرار دے کر قدیم عمارت کے ساتھ نئی تفریح گاہوں کو بھی یہی پچ دیا جانے لگا ہے۔ کلفٹن پر جہانگیر کوٹھاری پیریڈ کے ساتھ بن قاسم باغ کی تزئین و آرائش اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ تو کیا یہی رنگ اس شہر کا رنگ ہے یا صرف صدر کے علاقے تک محدود ہے۔ مجھے اطمینان قلب کے لیے شہر کے دیگر علاقوں پر بھی نظر ڈالنی پڑی۔
سولجر بازار مارکیٹ، تھیوسوفیکل ہال۔ این جے وی اسکول، ماما پارسی اسکول، بی وی ایس اسکول، ریگل پر وکٹوریہ کراؤنیشین بلڈنگ، بندر روڈ پر سوامی نرائین کا مندر، ٹاور تک بے شمار عمارتیں۔ کراچی کی کسی زمانے کی بلند ترین عمارت لکشمی بلڈنگ کہ جس کا افتتاح مشہور سیاسی لیڈر لیڈی سروجنی نائیڈو نے کیا تھا۔ میری ویدر ٹاور، گارڈن کے چوک پر سیفی بلڈنگ، مشن روڈ پر سی ایم اے اسکول اور اس کے سامنے چرچ اور پھر لی مارکیٹ کی عمارت ادھر مشن روڈ پر سول اسپتال اور اس سے ملحق ڈاؤ میڈیکل کالج، سب کا رنگ روپ شہر کے رنگ کی غمازی کر رہا تھا۔
میں ڈاؤ میڈیکل کالج کی قدیم عمارت کی راہداری میں بیٹھا اس عظیم الشان عمارت کی تعمیر پر غور کر رہا تھا۔ بڑے بڑے پتھروں سے بنی دبیز دیواریں، ہوادار کھلے دریچے اور کھڑکیاں، گرمی میں بھی جہاں ہمہ وقت ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے۔ یہ اناٹومی میوزیم ہے اس کے اوپر ڈائی سیکشن ہال ہے۔ یہ میری مادر علمی ہے۔ یہیں سے میں نے خدمت انسانیت کا علم حاصل کیا یہی وہ جگہ ہے جہاں میری جوانی کے شب و روز علم کی جستجو میں بسر ہوئے۔
ڈاؤ میڈیکل کالج خدمت انسانیت کی درسگاہ جہاں سے نہ جانے اب تک کتنے لوگ علم سے بہرہ ور ہو کر زندگی کی شاہراہوں پر دکھی انسانیت کے درد کا مداوا کر رہے ہیں، جہاں کبھی طالب علموں کی علمی سرگرمیوں کے ساتھ صحت مندانہ ادبی اور سیاسی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ یہی وہ کالج ہے کہ جہاں کئی ادبی شخصیتوں نے اپنی محفلیں سجائیں۔ یہی وہ کالج ہے کہ جہاں سے ایوب خان سے علیحدگی کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی سیاسی کشمکش کا آغاز کیا۔
آج کئی دنوں کے بعد مادر علمی کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھا، اپنے محبوب شہر کے رنگ کے متعلق سوچ رہا تھا۔ سامنے کوتوال بلڈنگ اسکول کی طرف سے نرم ہوا کے جھونکے میری روح تک کو سیراب کر رہے تھے۔ میرے دل و دماغ کو ایک عجیب سا سکون محسوس ہو رہا تھا۔ تب میرے دل کی گہرائیوں سے ایک آوازسی آنے لگی۔
رنگ تو ظاہر ہے کوئی شہر گلابی ہو تو کیا اور نیلگوں ہو تو کیا۔ انسان بھی تو سیاہ، سفید، زرد اور سانولے ہوتے ہیں لیکن سب کا خون ایک ہی رنگ کا ہے۔ یہ جو ہنستی گاتی بستیاں ہوتی ہیں یہ جو زندگی سے لپکتے شہر ہوتے ہیں کہ جن میں لاتعداد انسان اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ شہر ان ہی کے دم سے تو آباد ہوتے ہیں، یہ اگر نہ ہوں تو پھر اینٹوں اور پتھروں کی عمارتیں صرف ویرانہ ہیں۔ شہروں کا اصل رنگ ان ہی انسانوں کا مرہون منت ہوتا ہے۔ ان کی آپس کی محبتیں، الفتیں۔ ان کا پیار، ان کے حوصلے، ان کا علم، ان کا تدبر، ان کا اخلاق، ان کے رویے، ان کا رہن سہن، ان کی آپس میں یگانگت، ان کا میل جول، ان کی رواداری، ان کا خلوص ان کی انصاف پسندی، ان کی مروت، ان کا طرز معاشرت، ان کا بھائی چارہ، ان کے آداب محفل، ان کے فنون لطیفہ، ان کی علمی درسگاہیں ان کا اجتماعی رویہ!
یہ سب مل کر اس شہر کا اصل رنگ ظاہر کرتے ہیں۔ یہی اس شہر کا حسن ہوتا ہے اس کا جمال ہوتا ہے۔ وگرنہ وہ شہر پھر شہر نہیں رہتا۔ بیاباں ہوتا ہے اور جب ایسا ہوتا ہے تو شاعر شہر آشوب لکھتے ہیں، نوحے کہتے ہیں۔

ان دمکتے ہوئے شہروں کی یہ فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے

☆......☆

مجھے ڈاؤ میڈیکل کالج میں گزرا اپنا زمانہ طالب علمی یاد آنے لگا۔ اس زمانے میں کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر صحت مندانہ مشاغل کے ساتھ ادبی اور سیاسی فضا کا بھی غلبہ ہوا کرتا تھا۔ اطباء یونین ہوا کرتی تھیں۔
شہر میں دو ہی طلبہ تنظیمیں تھیں۔ این ایس ایف اور اسلامی جمعیت طلبہ۔ دونوں ہی نظریاتی پارٹیاں تھیں۔ ایک کمیونزم اور سوشلزم کی حامی تو دوسری اسلامی ضابطۂ حیات کی داعی۔ الیکشن زیادہ تر پُرسکون ماحول میں ہوا کرتے تھے۔ تشدد نے ابھی اپنے پاؤں نہیں پسارے تھے۔ یہ طلباء تنظیمیں یونین میں آکر کافی کام کرایا کرتی تھیں۔ یونیورسٹی اور تمام کالجز میں ہفتہ طلبہ منایا جاتا تھا جس میں تقریری مقابلے، شاعری کے

مقابلے، بیت بازی اور نعت گوئی وغیرہ کے مقابلے ہوا کرتے تھے۔
یہ غیر نصابی مشاغل طلباء کی ذہنی ترقی میں کافی معاون ثابت ہوتے تھے۔ ان میں ادبی، سماجی اور شہری شعور پیدا ہوتا تھا۔ ان میں قائدانہ صلاحیتیں پیدا ہوتی تھیں۔ ان طلباء میں آپس میں بھی مختلف مسائل پر گفتگو اور بحث مباحثہ ہوا کرتا تھا۔ اس زمانے کی سیاسی تحریکیں ان طلباء کے تعاون سے ہی کامیاب ہوتیں۔ خصوصاً ختم نبوت تحریک اور اس کے بعد قومی آزادی کی تحریک۔ ان طلباء تنظیموں کی وجہ سے سیاسی رہنما بھی طلباء کے مطالبات پر ہمدردی سے غور کیا کرتے تھے۔ کالج یونین کی سطح پر رہنمائی کرنے والوں میں سے کئی لوگ بعد میں عملی سیاست میں بھی آئے اور ٹھیک ٹھاک نام کمایا۔ جیسے حسین حقانی، سید منور حسن اور معراج محمد خان وغیرہ۔
ڈاؤ میڈیکل کالج میں طلباء یونین کے الیکشن گویا کسی میلے کی طرح ہوا کرتے تھے۔ الیکشن کا اعلان ہوتے ہی ہفتہ بھر پہلے ہی سے انتخابی سرگرمیاں شروع ہو جایا کرتیں۔ روزانہ جلسے ہوتے، دھواں دھار تقریریں ہوا کرتیں۔ سارا کالج رنگ برنگی جھنڈیوں اور بڑے بڑے بینرز سے سج جایا کرتا۔ طلباء اور طالبات اپنی من پسند جماعت کے رنگ برنگے اسٹیکر ایپرن پر لگا کر گھومتے پھرتے نظر آتے۔ خوب ہڑبونگ مچتی، طرح طرح کے نعرے ایجاد ہوتے۔ کبھی تالیاں بجا کر اور کبھی بھنگڑے ڈال کر نعرے لگائے جاتے۔ یہ سب کچھ ہوتا مگر برداشت کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی اپنی جماعت کے حق میں کسی کو کنویسنگ کرتا تو مخالف پارٹی کا حامی ہرگز ہرگز اس میں دخل اندازی نہیں کرتا تھا۔ خاموشی سے انتظار کرتا کہ کب وہ اپنی بات ختم کرے پھر اس کے بعد ہی وہ اپنا نقطہ نظر پیش کرتا۔ سینئرز کا بے حد احترام کیا جاتا، قطع نظر اس کے کہ وہ کس پارٹی سے تعلق رکھتا ہے۔ بعد میں لسانی بنیادوں پر بنی طلباء تنظیموں، یونین پر پابندی اور کلاشنکوف کلچر نے سب کچھ تباہ کر دیا۔

☆......☆

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کالج یونین کے الیکشن کے دنوں میں ہم پارٹی کارکن رات بھر جاگ کر بینرز بنایا کرتے تھے۔ امیدواروں کے نام کی پٹیاں کاٹ کر کپڑوں کے بینرز پر لگائی جاتیں۔ ایک بار میرے ایک دوست جنہیں ہم ناگہانی کے نام سے پکارا کرتے تھے میرے ساتھ رکے ہوئے تھے۔ رات کے کوئی ڈھائی تین بجے پتا چلا کہ پٹیاں چپکانے کے لیے گوند ختم ہوگئی ہے۔ الیکٹرک ہیٹر اور دیگر لوازمات تو موجود تھے مگر

ادلے کا بدلہ

دو دوست کالج کی کینٹین کے بیرے کو تنگ کرتے تھے جب وہ کالج سے اپنی تعلیم مکمل کر کے جانے لگے تو انہوں نے بیرے کو کہا کہ ہمیں معاف کر دو ہم تمہیں تنگ کرتے رہے۔
بیرا۔ مسکرا کر بولا۔ ”آپ بھی مجھے معاف کر دیں کیونکہ میں بھی آپ کو لوگوں کی بچی ہوئی چائے پلاتا رہا ہوں۔“

مرسلہ: ریاض بٹ ۔ حسن ابدال

☆☆☆

☆سب سے زیادہ کاشت کی جانے والی سبزی پیاز ہے۔ ہر سال 9 ارب کلوگرام پیاز دنیا میں کاشت کی جاتی ہے۔
☆سب سے زیادہ کھائی جانے والی سبزی آلو ہے۔
☆سب سے زیادہ کھایا جانے والا پھل کیلا ہے۔
☆ناریل کا پھل اور درخت سیکڑوں طریقے سے انسان کے کام آتا ہے۔
☆صحرائی پودا ”کریکٹس“ ساڑھے تین سال تک پانی کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے۔

مرسلہ: غلام حسین اختر۔ بھچرانوالہ

تار اور پلگ غائب تھے۔ انوار بھائی جو اس تمام کام کے ذمے دار تھے وہ انتہائی پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ میں نے کہا کہ انوار بھائی رہنے دیں صبح دیکھ لیں گے۔ ابھی تو رات کے اس وقت تار اور پلگ ملنا مشکل ہے۔ میری بات سن کر ناگہانی بولے۔ ”انوار بھائی! آپ کے پاس بائیک ہے؟“
”ہاں ہے کیوں؟ کیا کام ہے؟“ انوار بھائی نے کہا۔
”آپ چلیے میرے ساتھ ہم تار اور پلگ خرید کر لاتے ہیں۔“
”رات کے اس پہر کہاں سے ملیں گی یہ چیزیں؟“
”آپ چلیے تو سہی، میں دلواتا ہوں تار اور پلگ۔“ ناگہانی بولے۔
انوار بھائی میرا منہ تکنے لگے۔ میں نے سر کے اشارے سے ان سے کہا کہ وہ ناگہانی کے ساتھ چلے جائیں۔ بے اعتباری کے عالم میں انہوں نے بائیک اسٹارٹ کی اور ناگہانی

کے ساتھ چلے گئے۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد وہ لوٹے تو تار اور پلگ ان کے ہاتھ میں تھے۔ آتے ہی کہنے لگے۔ ''یار! کمال کا آدمی ہے یہ ناگہانی۔ پتا نہیں کون سے علاقے میں لے گیا تھا۔ سارے ہوٹل اور پان کی دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ لوگ تر و تازہ حالت میں کھا پی رہے تھے۔ خوب رونق تھی۔ دن کا سا سماں تھا۔ ایک دکان سے یہ تار اور پلگ بھی مل گیا۔''

ناگہانی ہنسنے لگے کہنے لگے۔ ''یار رنچھوڑ لائن لے گیا تھا اور خمیسے پان والے کے جنرل اسٹور سے یہ چیزیں لی ہیں۔'' پتا تو خیر مجھے بھی تھا کہ رنچھوڑ لائن میں اس وقت رونق ہوگی مگر تار اور پلگ کہاں سے ملیں گے اس کا اندازہ خود مجھے بھی نہ تھا۔

ناگہانی کہنے لگے۔ ''یار! ہوٹل میں ہم نے چائے بھی پی۔'' انوار بھائی حیرت سے وہاں بیٹھے لوگوں کو دیکھتے رہے اور پھر انتہائی رازداری سے پوچھنے لگے۔ ''ناگہانی سچ بتاؤ یہ انسان ہیں یا جن ہیں؟''

''پھر تم نے کیا کہا؟''

''کہنا کیا تھا، میں نے بھی کہہ دیا کہ ہاں یہ سب قوم اجنا سے تعلق رکھتے ہیں۔'' ناگہانی نے ایک آنکھ دبا کر شرارتی لہجے میں کہا۔ ''بے چارے انوار بھائی تمام وقت ڈرے سہمے سے رہے۔''

خود انوار بھائی بھی عرصہ دراز تک لوگوں کو یہ قصہ سناتے رہے اور جنوں سے ملنے کا ذاتی تجربہ بیان کرتے رہے۔

☆......☆

کسی بھی شہر کا اولڈ ٹاؤن اس کا تاریخی اثاثہ ہوتے ہیں۔ سالہا سال قبل جس جگہ سے اس شہر کی ابتداء ہوئی تھی جس قطعہ اراضی پر اس شہر نے آنکھیں کھولیں اور جہاں سے اس نے گھٹنوں کے بل چلنا شروع کیا۔ اس اولڈ ٹاؤن میں اس شہر کا پورا ماضی جگمگا رہا ہوتا ہے۔ کراچی جو پہلے میروں اور تالپوروں کے دور میں میٹھادر اور کھارادر تک محدود تھا۔ انگریزوں کی آمد کے بعد اس نے پھیلنا شروع کیا لیکن تقسیم ہند تک یہ پھر بھی ایک محدود علاقے سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ آزادی کے بعد مہاجرین کی آمد اور پھر صنعتی ترقی نے اس شہر کو بے تحاشا اپنی حدود بڑھانے پر مجبور کر دیا۔ کیماڑی سے لے کر جیل تک اور لیاری سے لے کر باتھ آئی لینڈ تک محدود شہر نے وسعت اختیار کرنی شروع کی اور پھر اس تیز رفتاری سے بڑھا کہ آپے سے باہر ہوگیا۔ ناقص منصوبہ بندی کی وجہ سے اس شہر میں لامتناہی مسائل جنم لینے لگے۔ رفتہ رفتہ شہر کے معاشرتی آداب پر بھی زوال آنا شروع ہوگیا اور وہ شہر جو کبھی امن اور آشتی کا شہر تھا خوف و دہشت کی علامت بن گیا۔

پرانے کراچی میں سکون تھا۔ امن تھا، رواداری تھی اور یہی اس شہر کا حسن تھا، اس کا دل لبھانے والا رنگ تھا۔ اب بھی کراچی کے پرانے علاقے کھارادر، میٹھادر، جوڑیا بازار، رنچھوڑ لائن، رام سوامی اور برنس روڈ اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔ برنس روڈ اب بھی شہر کی مشہور ترین فوڈ اسٹریٹ ہے جہاں کے خوش ذائقہ اور چٹ پٹے پکوان دور دور سے لوگوں کو یہاں آنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ میٹھادر، جوڑیا بازار کے کاروباری علاقے، میکلوڈ روڈ پر واقع دفاتر ملک بھر کی معیشت کی شہ رگ ہیں۔ کھارادر اور رنچھوڑ لائن کی جاگتی ہوئی راتیں آج بھی جوں کی توں قائم ہیں۔ اولڈ ٹاؤن کے علاقوں میں شہر اور ملک کی کتنی نامور شخصیات نے جنم لیا۔ یہاں اپنا بچپن گزارا۔ اگر ان کی فہرست مرتب کی جائے تو اس کے لیے ایک الگ مضمون درکار ہوگا۔

کھارادر اور رنچھوڑ لائن اولڈ کراچی کے وہ علاقے ہیں کہ جہاں ہر وقت رونق جمی رہتی ہے۔ اس میں بھی رنچھوڑ لائن کا علاقہ کئی لحاظ سے قابل ذکر ہے۔ جیسا کہ ہمارے دوست انوار بھائی نے یہاں آکر ایک نیا ماحول دیکھا۔ ہوٹل میں لوگوں کو رات کے آخری پہر میں بھی کھاتے پیتے، گپ شپ کرتے دیکھا اور یہی سمجھے کہ یہ شاید انسان نہیں قوم اجنا سے تعلق رکھتے ہیں۔ صرف انوار ہی نہیں جو بھی یہاں پہلی بار آتا ہے اسے حیرت ہوتی ہے اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں۔ شہر کے اور علاقوں میں تو رمضان کے مہینے میں سحری جگانے والے آتے ہیں لیکن رنچھوڑ لائن میں سحری سلانے والے آتے ہیں کہ بھائی لوگو سحری کا وقت ختم ہوا۔ خدا کو مانو اور اب تو سو جاؤ!

یہ ہے رنچھوڑ لائن اور یہ ہے اس کی رونقیں اور بہاریں، جو اب بھی قائم ہیں لیکن اصل مزہ تو اس زمانے میں تھا جب کراچی اپنے سنہرے دنوں سے گزر رہا تھا تو پھر کیوں نہ ہم ماضی میں جا کر اس دور کا لطف اٹھائیں۔

☆......☆

آج ہفتے کی شب ہے۔ کل اتوار ہے اس لیے چھٹی ہے۔ رنچھوڑ لائن کے لکھ پتی چوک پر ویسے تو ہر رات رونق رہتی ہے لیکن ہفتے کی شب کچھ زیادہ ہی رونق میلہ ہوتی ہے۔ لکھ پتی ہوٹل میں تل دھرنے کی جگہ نہیں۔ باہر کے باکڑے بھی فل ہیں۔ سامنے ایرانی ہوٹل، کیفے ملی میں بھی ہر میز بھری ہوئی ہے۔ کیفے ملی میں چائے کے ساتھ بسکٹ، نان ختائی وغیرہ بھی

رونق ہیں جب کہ لکھ پتی ہوٹل میں کھانا بھی سرو کیا جاتا ہے۔ صبح گرما گرم قیمے کے سموسے تو اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ایک کاؤنٹر مٹھائی کا بھی ہے لیکن رمضان میں یہاں کے مال پوڑے کھانے کے لیے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ باہر بند دکانوں کے چبوتروں پر بزرگ حضرات کی ٹولیاں براجمان ہیں۔ دھاری دار کپڑے کا پاجامہ، اس پر سفید قمیص اور سر پر پرانی سی جالی ٹوپی پہنے یہ جو بزرگ دیسی بیڑی کے کش لگا رہے ہیں۔ یہ کراچی کے بازاروں کے تاجر ہیں جوڑیا بازار، جونا مارکیٹ، صرافہ بازار، بولٹن مارکیٹ کے نامی گرامی تاجر ہیں۔ لاکھوں کا بزنس کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ اسٹاک ایکسچینج سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ اس وقت بھی ممکن ہے کچھ سودے چل رہے ہوں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ کراچی کو کراچی بنانے میں انگریزوں اور پارسیوں کے بعد میمن برادری کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہ تجارت پیشہ لوگ ہیں۔ کہتے ہیں کہ سندھ سے نقل مکانی کرکے یہ انڈیا کے علاقے کاٹھیاواڑ میں جا بسے تھے۔ تجارت ان کی گھٹی میں ہے۔

رنچھوڑ لائن کراچی کا سب سے گنجان آباد علاقہ ہے۔ اسکول کے زمانے کا ذکر ہے، معاشرتی علوم کے استاد نے جاپان کے متعلق بتانے کے لیے بچوں سے سوال کیا کہ کیا آپ جانتے ہیں کہ دنیا کا گنجان ترین علاقہ کون سا ہے۔ عبدالقادر نامی ایک لڑکے نے جب جواب دینے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھایا تو معاشرتی علوم کے استاد کو اچنبھا سا لگا کہ عبدالقادر کلاس کے گئے گزرے طالب علموں میں شمار ہوتا ہے اس لیے انہوں نے [illegible] ہو کر کہا۔ ''ہاں عبدالقادر تم بتاؤ شاباش۔''

عبدالقادر نے کھڑے ہو کر باآواز بلند جواب دیا۔ ''سر! رنچھوڑ لائن۔''

پہلے تو استاد جی بھونچکے سے رہ گئے پھر ان پر نہ رکنے والی ہنسی کا دورہ پڑا۔ ان کے ساتھ پوری کلاس ہنسنے لگی۔ عبدالقادر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے جواب پر یہ سب کیوں ہنس رہے ہیں حالانکہ اس نے تو اپنی دانست میں بالکل صحیح جواب دیا تھا۔ کسی حد تک اس کا جواب ٹھیک بھی تو تھا کہ یہ واقعی [illegible] کا گنجان آباد علاقہ ہے۔ کراچی پاکستان کا واحد کاسمو پولیٹن شہر تھا اور اب بھی ہے۔ یہاں ہر برادری اور مذہب کے لوگ آپس میں شیر و شکر ہو کر رہا کرتے تھے اور اب بھی رہتے ہیں۔ رنچھوڑ لائن ان برادریوں اور مذاہب کے سارے رنگ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ یہاں کسی زمانے میں ہندو، سکھ، یہودی، پارسی اور مسلمان بسا کرتے تھے۔ یہودی تو خیر اب یہاں نہیں رہے لیکن دوسری تمام قومیں اب بھی یہاں سکون سے رہتی ہیں۔ ایک طرف ہندو برادری اور عیسائی برادری کے علاقے ہیں تو اس طرف این جے وی اسکول کے عقب میں اب بھی پارسی کالونی موجود ہے۔ مسلمانوں میں یہاں اکثریت سلاوٹ برادری کی ہے۔ جیسلمیر سے نقل مکانی کرکے یہاں آنے والی یہ برادری فن تعمیر میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ کراچی کی بیشتر قدیم عمارتیں ان ہی کے فن کا شاہکار ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد ہندو اور سکھ بھارت چلے گئے لیکن پھر بھی ہندو برادری کی ایک بہت بڑی آبادی اب بھی یہاں موجود ہے۔ انڈیا سے ہجرت کرکے آنے والوں نے یہاں کے رنگ روپ میں ایک نیا اضافہ کیا۔ دہلی اور یوپی سے تعلق رکھنے والے گجرات اور کاٹھیاواڑ سے آنے والے میمن اور دیگر دوسرے گجراتی، رنچھوڑ لائن جو پہلے ہی سے اپنے مختلف روایتی اور ثقافتی رنگوں کی وجہ سے کراچی کے ممتاز علاقوں میں سے ایک علاقہ تھا۔ اب ان برادریوں کے آنے کی وجہ سے جہاں گلی گلی میں دہلی کی چٹخارے دار اشیائے خورونوش کی فراوانی ہوئی، نہاری پر تڑکا لگنے کی خوشبو پھیلی۔ وہیں گجراتی لوگوں کے من بھاتے پکوان گاٹھیے، پھاپھڑے اور نمکو کی مہک سے پورا علاقہ مہکنے لگا۔ امان اللہ بیکری اور آدم بیکری کے مچھی پاؤ کے شوقین دور دور سے اس ایک الگ ذائقے والے بن لینے کے لیے آنے لگے۔ کہتے ہیں کہ یہ مچھی پاؤ کہ جن میں سے مچھلی کی ہلکی ہلکی مہک آتی ہے۔ سمندر پار بسنے والے گجراتی آنے جانے والوں سے فرمائش کرکے منگواتے ہیں۔ رنچھوڑ لائن کے پکوانوں اور یہاں کی رونق شب کے لیے ایک الگ مضمون درکار ہے۔ فی الحال تو ذکر ہو رہا ہے آج کی شب کا۔ کل اتوار ہے۔ چھٹی کا دن۔ کل کہاں تفریح کرنے جانا ہے۔ اس کا پروگرام بنانے کے لیے ہم سب دوست یہاں جمع ہوئے ہیں۔ لکھ پتی ہوٹل کی ایک میز خالی ہوئی تو ہم جھپٹ کر اس پر قابض ہوگئے۔ تمام دوست آگئے ہیں۔ بس ایک عزیز نامی دوست کا انتظار ہے۔ وہ آجائے تو کورم پورا ہو جائے اور پھر یہ طے کیا جائے کہ کل شام کہاں جانا ہے۔

''بھئی یہ عزیز کیوں نہیں آیا اب تک؟'' ایک دوست نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''پتلون پہن رہا ہوگا۔'' دوسرے نے جواب دیا۔

پانچ منٹ بعد پھر یہی سوال کیا گیا جواب میں پھر کہا گیا۔ ''پتلون پہن رہا ہوگا۔''

پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ کون سے سنیما میں

کون سی فلم چل رہی ہے۔ کس فلم کی رپورٹ اچھی ہے۔ نئی فلموں کے متعلق کہ جو اسی جمعے کو نمائش کے لیے پیش ہوئی ہیں۔ ضروری معلومات ان لوگوں سے حاصل کی جانے لگیں جو فرسٹ ڈے فرسٹ شو کے قائل ہیں تبھی کسی نے پھر پوچھا۔
"یار یہ عزیز اب تک کیوں نہیں آیا؟"
"پتلون پہن رہا ہوگا۔" پھر وہی جواب۔
ایک دوست جو نیا نیا ہمارے گروپ میں شامل ہوا تھا، وہ زچ ہو کر بولا۔ "یار یہ عزیز کون سی پتلون پہن رہا ہے کہ اتنی دیر لگا دی؟"
"آئے تو خود دیکھ لینا۔" ایک نے جواب دیا۔ "لو وہ آ گیا۔"
عزیز نے ایک زوردار سلام کے ساتھ ہوٹل میں انٹری دی۔ ہمارا نیا دوست عزیز کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ حیرت سے آنکھیں پٹ پٹا کر بولا۔ "یار یہ تم نے پہنی کیسے؟" اس نے عزیز کی پتلون کی طرف اشارہ کیا۔
عزیز سمجھ گیا کہ ہم نے اس کے دیر سے آنے کی کیا وجہ بیان کی ہے۔ ہماری طرف ترچھی نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔ "جیسے سب پہنتے ہیں۔"
لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کو پتلون پہننے کے لیے ایک بے حد سائنٹیفک طریقہ اپنانا پڑتا تھا۔ دراصل یہ ٹیڈی پتلون کا زمانہ ہے۔ چھوٹے پائنچوں کی پتلون کو ٹیڈی فیشن کا نام دیا گیا ہے۔ ہم بھی اس فیشن کے مطابق پینٹ پہنتے تھے لیکن عزیز کی پینٹ اس قدر ٹائیٹ ہوا کرتی تھی کہ لگتا تھا بندوقوں پر غلاف چڑھا دیا گیا ہو۔ اس قدر چھوٹے پائنچے پاؤں میں چڑھانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ عزیز پلاسٹک کی ایک تھیلی پاؤں پر چڑھا کر یہ پتلون پہنا کرتا تھا۔ پلاسٹک کی پھسلن کی وجہ سے پتلون اوپر چڑھ جایا کرتی تھی۔ یہ اس کا اپنا مخصوص طریقہ تھا جسے ایجاد کرنے کا سہرا ابھی اسی کے سر جاتا ہے۔
ادھر رنچھوڑ لائن کی رونقیں اپنے شباب پر ہیں۔ نوجوان ٹیڈی پتلون پہنے، وحید مراد اسٹائل کے بال بنائے پان چبا رہے ہیں۔ الگ الگ ٹولیاں ہیں۔ کچھ نوجوان جہانگیر پارک جا کر اتوار کے دن تاش کھیلنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ کچھ لوگ کسی تفریح گاہ جانے کے منصوبے بنا رہے ہیں لیکن اصل عوامی اور سستی تفریح فلم بنی ہے اس لیے زیادہ تر گروپس فلم دیکھنے کے پروگرام بنا رہے ہیں۔ کس سنیما میں کون سی فلم چل رہی ہے۔ انگریزی فلم دیکھنی ہے یا اردو فلم۔ کون سا شو دیکھنا ہے۔ ادھر ہم بھی اسی اہم موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں۔ مختلف پروگرام ڈسکس کرنے کے بعد تان اس پر ٹوٹی کہ کیپٹل میں شام چھ بجے والا شو دیکھا جائے چونکہ فلم انگریزی ہے اور دوسرا ہفتہ چل رہا ہے اس لیے زیادہ تر امکان یہی ہے کہ ٹکٹ مل جائے گا اگر نہیں ملا تو پھر منہ لٹکا کر جہانگیر پارک جا کر تفریح کریں گے لیکن کچھ بھی ہو جائے بلیک سے ٹکٹ نہیں خریدیں گے۔ یہ ہمارے گروپ کا ایک اور سنہری اصول ہے جس پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے اگر ہمارے پاس کوئی فالتو ٹکٹ ہوا بھی اور فلم ہاؤس فل جا رہی ہو تب بھی یہ فالتو ٹکٹ کسی ضرورت مند کو اسی قیمت پر فروخت کیا جائے گا۔

☆......☆

اتوار کی سہ پہر کو چار بجے سے تیاریاں شروع ہیں۔ کپڑوں پر استری کی جا رہی ہے کریز بالکل پرفیکٹ ہونی چاہیے۔ جوتوں پر پالش کی جا رہی ہے لیکن صدر کے ایرانی ہوٹل کے باہر جوتے پالش کرنے والوں کے اس دعوے تک نہیں پہنچ سکے کہ صاحب شیشہ کی طرح جوتا چمکائے گا۔ آپ اپنی شکل دیکھ سکے گا۔
شیو بنا کر نہا دھو کر کپڑے بدلے۔ ایک دوست نے آواز دی۔ اس کے ساتھ ہو لیے۔ پیدل چلتے چلتے پلازہ سنیما کے سامنے کیفے یونین میں آ گئے۔ یہ ہمارا میٹنگ پوائنٹ ہے کیونکہ یہ دوسرے تمام دوستوں کے گھروں کے بالکل درمیان میں پڑتا ہے۔ جوبلی کوارٹر والا دوست بھی یہاں آتا ہے اور رینگل پر رہنے والا بھی۔ یوں کسی کو شکایت کا موقع نہیں ملتا۔ وقت کی پابندی از حد ضروری ہے۔ یہ ہمارے گروپ کا دوسرا سنہرا اصول ہے۔
کیفے یونین بھی کراچی کے ان ایرانی ہوٹلوں میں سے ایک تھا کہ جن کی تعداد سو سے بھی زیادہ تھی۔ یہ ایرانی جن میں بہائی مذہب کے ماننے والے بھی شامل تھے، کراچی میں کئی برسوں سے آباد ہیں اور ہوٹل کے کاروبار سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیفے یونین پلازہ سنیما کے سامنے والی گلی کے کونے پر ہے۔ اس کا سیٹ اپ کچھ ایسا ہے کہ باہر سے دیکھنے والے کو یہ ہوٹل سے زیادہ بار دکھائی دیتا ہے۔ بڑی بڑی شیشے کی کھڑکیاں، اندر رکھی میز کرسیاں اس کے ایک الگ ہی منظر پیش کرتی ہیں۔
یہ شاید کراچی کے ان اولین ہوٹلوں میں سے ایک ہے جہاں سبز چائے کانچ کے چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں لیموں کے ساتھ سرو کی جاتی ہے۔ اس کیفے کے ساتھ تھوڑے دنوں پہلے لطیفہ یہ ہوا کہ حیدرآباد سے ہمارا ایک کزن آیا تھا۔ وہ گھر پہ گیا تو اسے بتایا گیا کہ ہم سب دوست کیفے یونین میں ہوں

...وہ بے چارہ وہاں تک آیا بھی۔ کھڑکیوں سے جو اندر ... تو ہم لوگ کانچ کے چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں سبز ... پیتے نظر آئے۔ وہ بوکھلا کر انہی قدموں واپس لوٹ گیا۔ ... جا کر گھبرائے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔ "پتا نہیں، وہ لوگ وہاں بیٹھے ہوئے کوئی کالی کالی چیز کانچ کے گلاسوں میں پی ... ہیں۔ وہ ہوٹل نہیں کچھ اور ہے۔"
گھر والے سمجھ گئے کہ وہ کیا سمجھ بیٹھا ہے اس لیے وہ سب ہنسنے لگے۔ بڑی مشکل سے اسے باور کرایا گیا کہ جسے وہ ... سمجھ رہا ہے وہ محض ایک ہوٹل ہے اور وہ کالی کالی شے جو کانچ کے چھوٹے چھوٹے گلاس میں ہے۔ شراب نہیں سبز چائے ...
اب سب دوست جمع ہو گئے ہیں۔ فلم کا شو شروع ہونے میں ابھی نصف گھنٹا باقی ہے۔ ہم سب اٹھے اور بندر روڈ کراس کر کے وکٹوریہ روڈ پر آ گئے۔ وکٹوریہ روڈ سنسان پڑا ہے۔ جو اکا دکا نیں ہیں وہ بند پڑی ہیں۔ شاہنواز موٹر شوروم بھی بند پڑا ہے۔ آگے بی وی ایس اسکول کے فٹ پاتھ سے چلتے ہوئے ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔ بی وی ایس اسکول کے عین سامنے ایک چھوٹی سی بلڈنگ کی پہلی منزل پر کیفے شیزان ہے۔ اسی طرف آگے ایک گلی میں دی لیب ہے جو سلیم لیب کے نام سے مشہور ہے۔ اسی گلی کے نکڑ پر امریکا نو ڈرائی کلینرز ہے۔ اس سے آگے چرچ کی باؤنڈری ہے لیکن اس طرف والے فٹ پاتھ پر کیفے پائنیر کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ یہ کیفے بھی ایک منزلہ عمارت کی پہلی منزل پر واقع ہے۔ اس کا فالودہ کافی مشہور ہے۔ اب کیفے جارج والا چوک آ گیا ہے۔ صدر پوسٹ آفس کے ساتھ والی گلی میں کیپٹل سنیما ہے جس کی وجہ سے اس گلی کو کیپٹل والی گلی کے نام سے ہی یاد کیا جانے لگا ہے۔
کیپٹل سنیما، کسی پارسی کی ملکیت ہے۔ سنا ہے اس کا ایک اور بھی سنیما گھر ہے۔ کیپٹل میں اکثر انگلش فلمیں لگتی ہیں۔ اس لیے زیادہ رش نہیں ہوتا۔ اکثر ٹکٹ آسانی سے مل ہی جاتا ہے۔ ہمیں بھی ٹکٹ آسانی سے مل گیا۔ کہتے ہیں کہ اس کی پہلی منزل پر جو کیفے فلیمنگو ہے اس کی کولڈ کافی بے حد مزیدار ہوتی ہے لیکن ہم لوگ کیپٹل کے سامنے کیفے گلوریا میں جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ سنا ہے کہ کیفے فلیمنگو بھی گلوریا والے ہی چلاتے ہیں۔ ہمیں اس سے کیا ہمیں تو کیفے گلوریا کے مسکہ بن اور چائے کا چسکا ہے ہمیں ہی کیا، لگتا ہے آدھے سے زیادہ شہر کو ان کے مسکہ بن اور چائے نے اپنا دیوانا بنا رکھا ہے۔ ایک مسکہ بن پر ہی کیا منحصر، شہر میں ایرانی ہوٹلوں نے اپنا ایک مسحور کر دینا والا طلسم بچھا رکھا ہے۔ انیسویں صدی کے شروع میں ایران سے آنے والے پارسیوں اور بہائیوں نے کراچی میں اپنے ریسٹورنٹ کھولنے شروع کیے۔ بعد میں کچھ مسلمان ایرانی بھی اس بزنس میں آ گئے۔ کراچی میں ان ایرانی ریسٹورنٹس نے اپنا ایک معیار پیش کیا۔ کراچی کے لوگوں کو یہ ایرانی ریسٹورنٹ بھا گئے۔ ان میں سے کئی ایک ریسٹورنٹ اپنی مخصوص ڈشز کی وجہ سے شہریوں کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ لکی اسٹار کے پاس کیفے سبحانی اپنے چلو کباب کی وجہ سے اور گلوریا اپنے مسکہ بن کی وجہ سے شہرت حاصل کر گئے جب کہ کیفے جارج اپنے پیٹیس کی وجہ سے مشہور ہے۔ طارق روڈ کا کیفے لبرٹی تو اس قدر مشہور ہے کہ اس چورنگی کو لبرٹی کے نام سے جانا جانے لگا ہے۔
فلم کا شو ختم ہو چکا تھا۔ ہم گلوریا میں مسکہ بن اور چائے پینے کی غرض سے آئے تھے لیکن ابھی ہوٹل میں اچھا خاصا رش ہے۔ یہ مسکہ بن اور چائے ایک آدمی کا پیٹ بھرنے کے لیے کافی ہے اس لیے نوجوان کم پیسوں میں رات کا کھانا سمجھ کر کھاتے ہیں اور کچھ یونہی اسنیک کے طور پر لیتے ہیں۔
ہم گلوریا سے باہر نکلے تو اس کے قریب ہی کرسی پر بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے شخص کی طرف اشارہ کر کے عزیز نے ہم سے پوچھا کہ کیا ہم جانتے ہیں کہ یہ کون ہے۔ ہم نے کہا نہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ یہ کون ہے۔ تب اس نے بتایا کہ یہ شخص کسی زمانے میں انڈیا کی فلموں میں ہیرو آیا کرتا تھا۔ اس کا بھی ایک وقت تھا۔ آج یہ ماضی کا ہیرو صادق علی فالج کا مریض بن کر کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ روزانہ شام کو یہاں آ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے قدر دان ادھر آتے ہیں اور حسب توفیق اس کی امداد کرتے ہیں۔ وقت انسان کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔ (صادق علی کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ یہ فلمی اداکارہ رینا رائے جس کی شادی پاکستانی کرکٹر محسن علی سے ہوئی تھی کے والد تھے)۔
ہمارے نئے دوست نے عزیز سے پوچھا۔ "تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟"
"مجھے شفیع بھائی نے بتایا ہے۔"
"اور شفیع بھائی کو کس نے بتایا؟" نئے دوست نے پھر سوال کیا۔
"انہیں نگار سے پتا چلا۔" عزیز کا جواب تھا۔
ہم کیپٹل والی گلی سے نکل کر ایلفنسٹن اسٹریٹ پر آ گئے اور پریڈی اسٹریٹ کی طرف چل پڑے۔ درمیان میں

آکسفورڈ ریسٹورنٹ پڑتا ہے۔ آکسفورڈ ریسٹورنٹ میں بھی خاصا رش ہے۔ یہ ایرانی ہوٹل تو نہیں لیکن یہاں کی چائے کا جواب نہیں۔ یہاں کے مچھلی کے کباب بہت لذیذ ہیں۔ یہاں چھوٹی چھوٹی پلیٹوں میں قیمہ فرائی چھوٹے چھوٹے ڈبل روٹی کے نان کے ساتھ سرو کیا جاتا ہے۔ مزے کی بات یہ کہ اس قیمہ نان کو یہاں قیمہ چانپ کہا جاتا ہے۔

اگلے کونے پر شین ہوٹل اور اس کے ساتھ پریسٹن بیکری ہے۔ سامنے چرچ ہے اور جہانگیر پارک کی طرف والے کونے پر خیبر ہوٹل ہے جو رہائشی ہوٹل ہے اور نیچے گلزار ہوٹل ہے۔ گلزار ہوٹل بہت ہی مشہور ہے اور لوگ یہاں بیٹھ کر گپ شپ کرتے ہیں۔ کافی دانشور بھی یہاں جمع ہوتے ہیں۔ آج پتا نہیں عزیز پر کیا موڈ سوار تھا کہ وہ اپنی معلومات کے دریا بہانے پر آمادہ نظر آرہا تھا۔

''بھئی یہ گلزار ہوٹل بھی خوب ہے۔ تمہیں پتا ہے انڈیا سے حال ہی میں ایک مشہور گلوکار سی ایچ آتما تشریف لائے تھے۔ انہوں نے کراچی میں دو جگہوں کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ ایک تو عبداللہ شاہ غازی کا مزار اور دوسرا یہ گلزار ہوٹل۔''

''یہ سی ایچ آتما کون ہے بھائی؟'' سوال کیا گیا۔

''سی ایچ آتما، حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ جوانی کراچی میں گزری، پھر بمبئی چلے گئے اور وہاں گلوکار بن گئے۔ تم نے وہ مشہور گانا سنا ہوگا ''پریتم آن ملو'' یہ ان کا ہی گایا ہوا ہے۔'' عزیز نے سی ایچ آتما کی بائیوگرافی بیان کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟'' نئے دوست نے عالمانہ سوال پوچھا۔

''مجھے شفیع بھائی نے بتایا۔''

''اور ان کو کیسے پتا چلا؟''

''انہیں نگار سے معلوم ہوا۔'' عزیز نے کہا۔

''ارے بابا، یہ نگار ہے کون کہاں رہتی ہے۔ کیا کرتی ہے۔'' ہمارے نئے دوست نے پریشان ہوکر پوچھا۔

اس کی بات سن کر ہم سب دوستوں کا ہنس ہنس کر برا حال ہوگیا۔ وہ بے چارہ بھونچکا سا ہوکر ہمیں دیکھتا رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر ہم اتنا کیوں ہنس رہے ہیں جب ہنسی کا سیلاب تھما تو ہم نے اسے بتایا کہ بھائی یہ نگار کوئی خاتون نہیں بلکہ ہفت روزہ اخبار ہے۔

☆......☆

ہفت روزہ نگار کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے پاکستان میں فلمی صحافت کا آغاز کیا۔ عمر آزاد نامی ایک صحافی جو دہلی میں ایک اخبار نکالا کرتے تھے۔ وہ تقسیم کے بعد اپنے خاندان سمیت کراچی ہجرت کر کے آگئے۔ الیاس رشیدی ان کے چھوٹے بھائی تھے۔ الیاس رشیدی اپنے بھائی سے بے حد متاثر تھے اور وہ بھی ان کی طرح صحافت کے میدان میں دلچسپی لیتے تھے۔ کراچی کے ایک شام کے اخبار آغاز کے بانی محمد عمر فاروقی اور حالیہ ایڈیٹر جناب انور فاروقی ان کے قریبی رشتے دار ہیں۔

نگار کے اجراء کے لیے الیاس رشیدی نے اپنے دوست ابن حسن نگار سے میٹروپول کے سامنے والا دفتر خریدا اور نگار کی اشاعت شروع کی۔ چونکہ یہ پاکستان کا پہلا فلمی اخبار تھا اس لیے اسے خاطر خواہ پذیرائی ملی۔ نگار کی مقبولیت سے متاثر ہوکر اور بھی بہت سے فلمی اخبار اور رسالے نکلنے لگے اور تا حال نکل رہے ہیں لیکن نگار کو جو مقام حاصل ہے اس تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔ اس کی وجہ الیاس رشیدی کی ان تھک محنت اور صاف ستھری صحافت رہی۔ پچاس کے شروع میں نگار فلمی ایوارڈز کے اجراء نے اس کو فلمی صحافت کا ایک معتبر نام ثابت کردیا۔

نگار ایوارڈز شاید اب تک فلمی دنیا کا واحد ایوارڈ ہے جس کو حاصل کرنا فلمی دنیا کے ہر فنکار کی آرزو ہے۔ پاکستان میں جہاں سرکاری سطح پر اس قسم کے کسی باقاعدہ ایوارڈ کے نہ ہونے سے فلمی صنعت کو مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملتا، وہیں نگار ایوارڈ کی وجہ سے فلمی صنعت کو یک گونہ دلاسہ سا رہتا ہے۔ عوام ہر ہفتے نگار بڑے شوق سے پڑھتے اور فلمی دنیا کی گہما گہمی اور نئی فلموں کے بارے میں آگہی حاصل کرتے۔ فلمیں ہی اس زمانے کی سستی تفریح تھی اور نگار پڑھنے سے ان کو فلمی دنیا کے ستاروں کی زندگی کے بارے میں پتا چلتا رہتا۔ اس زمانے میں کراچی میں سو سے اوپر سنیما گھر ہوا کرتے تھے۔ فلموں کا معیار بھی اچھا تھا پھر فلمی صنعت کے زوال کے ساتھ یہ سنیما گھر ویران ہوتے چلے گئے۔ کراچی کی دو رونقیں یعنی سنیما گھر اور ایرانی ہوٹل آہستہ آہستہ کم ہونے لگے۔ اب یہ حال ہے کہ گنتی کے سنیما گھر اور چند ایک ایرانی ہوٹل باقی بچے ہیں۔ پرانے سنیما گھروں اور ہوٹلوں کی جگہ شاپنگ مال وغیرہ بن گئے ہیں۔ کچھ سنیما گھر اور ایرانی ہوٹل بند پڑے ہیں اور ان کی خالی اور ویران عمارتیں وحشت کا منظر پیش کرتی ہیں جیسے زبان حال سے کہہ رہی ہوں۔

اے دل وہ شاید خواب ہی تھا، کب گھر کوئی میں نے بسایا تھا
کوئی رنگ تھا اور نہ خوشبو تھی، سناٹا بولنے آیا تھا

(عبیداللہ علیم)

نمک لاہوری

شکیل صدیقی

قیام پاکستان کے بعد جن شعراء نے گلشن اردو ادب کی آبیاری کی ان میں ایک بڑا نام اس تحریر کے مرکزی کردار کا بھی ہے۔ انہوں نے اردو ادب کی خاطر کیسے کیسے حالات کا مقابلہ کیا یہ سبق آموز بھی ہے، خاص کر ان لوگوں کے لیے جو ادب کی دنیا میں قدم رکھ رہے ہیں۔

ایک شاعر کی زندگی کے ایسے ابواب جو دلچسپ بھی ہیں

ان کا اصل نام عبدالمجید چوہان جبکہ قلمی نام مجید لاہوری اور نمک لاہوری تھا۔ وہ 1913ء میں گجرات میں پیدا ہوئے۔ ڈیڑھ برس کی عمر میں والدین کے ساتھ کراچی آگئے۔ ابتدائی تعلیم کھتری اسلامیہ ہائی اسکول میں اور اس کے بعد وہ کراچی اکیڈمی میں پائی۔ اسی دوران والد کی وفات ہوگئی تو کراچی چھوڑ کر گوجرانوالہ چلے گئے۔ 1935ء میں انقلاب لاہور کے عملے میں شامل ہوکر صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور 1947ء میں کراچی آگئے۔

جثے کے اعتبار سے لحیم شحیم اور قد آور تھے۔ سفید کرتہ اور شلوار میں ملبوس رہا کرتے تھے۔ پان کثرت سے کھاتے تھے۔ پاؤں رکشے میں مشکل ہی سے سوار ہو پاتے تھے۔ (پاؤں رکشے میں سواری پیچھے بیٹھتی تھی اور اس سے جڑی ہوئی سائیکل کے پیڈل پر پاؤں مار کر رکشے والا اسے چلاتا تھا۔ صدر ایوب نے اسے بند کر دیا)۔ جب رکشا رکوا کر اس میں بیٹھتے تو رکشا چلانے والا ان کا قد و قامت دیکھ کر دہشت زدہ ہو جایا کرتا تھا۔ جب وہ رکشے میں سوار ہو جاتے تو دوسری سواری کے لیے رکشے میں مشکل ہی سے جگہ بچ پاتی تھی لیکن وہ دوستوں کو اصرار کر کے ساتھ بیٹھنے کو کہتے تھے۔ چنانچہ وہ بھی ٹھنس ٹھنسا جاتا۔

یہ گرمی کے دنوں کا واقعہ ہے کہ وہ اپنے ایک دوست ماجد کے ساتھ رکشے میں محوِ سفر تھے۔ بیچارہ رکشے والا سر تا پاؤں پسینے میں شرابور تھا اور ہانپ ہانپ کر پیڈل پر پاؤں مار رہا تھا۔ گرمی کی شدت سے وہ مجید کا وزن اٹھانے سے قاصر دکھائی دیتا تھا۔ اچانک مجید کو پان کی ایک دکان نظر آئی تو انہوں نے کہا۔ ”اے لڑکے! رکشا روکو۔“ رکشے والے نے رکشا روک دیا۔ وہ پان والے کی دکان کی طرف چلے گئے۔ ماجد بھی چلچلاتی دھوپ سے پریشان تھا، لہٰذا رکشے سے اتر کر ایک درخت کے سائے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔

رکشے والا رکشے پر سوار ہوا اور جلدی جلدی پیڈل پر پاؤں مارتا ہوا وہاں سے رفو چکر ہونے لگا۔ مجید نے آواز دی۔ ”ٹھہرو، اپنے پیسے تو لیتے جاؤ۔“

وہ بولا۔ ”زندگی رہی تو کہیں اور سے کما لوں گا۔ اب تمہارا بوجھ مزید اٹھاؤں گا تو جنازہ نکل جائے گا میرا۔“ اس کے بعد یہ جا اور وہ جا۔

ایک روز فٹ پاتھ پر کھڑے کسی رکشے والے کا انتظار کر رہے تھے۔ اتفاقاً ایک رکشا وہاں آ گیا۔ اس میں فوراً ہی نہیں بیٹھے بلکہ ساتھ کھڑے ہوئے دوست انوار احمد سے کہنے لگے۔ ”آج رکشا چلانے کی تھوڑی سی مشق کیوں نہ کر لی جائے؟“

”ٹھیک ہے۔ چلا کر دیکھتے ہیں۔“ انوار بولا۔

”تم بیٹھو۔“ مجید نے اس سے کہا۔

وہ رکشے میں بیٹھ گیا تو رکشے والا ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ صاحب لوگ مذاق کر رہے ہیں۔ جب مجید نے اسے پیڈل مارنا شروع کیے تو وہ چلنے لگا۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد موڑ کر واپس اسی جگہ پر آ گئے۔ پھر انوار کو اشارہ کیا کہ اترو۔ وہ اتر گیا تو خود بیٹھ گئے اور اسے چلانے کو کہا۔ انوار نے پیڈل مارے تو رکشا کچھ کھنچ گیا۔ جسے چلنا نہیں کہا جا سکتا۔ وہ فوراً ہی اتر گیا اور اس نے توبہ کر لی۔

”کیوں؟ کیا بات ہے؟“ مجید نے سوال کیا۔

”میں کسی ہاتھی کو نہیں گھسیٹ سکتا۔“ انوار نے جواب دیا اور رکشے والے کو اشارہ کیا کہ وہ اسے چلائے۔ مجید کسمسا کر رہ گئے۔

مجید میں یہ صفت تھی کہ وہ کفایت شعار بھی بہت تھے جس کے ڈانڈے کنجوسی سے جا ملتے تھے۔ وہ رکشے میں بیٹھنے کے بعد دھیمی آواز میں فاصلے کا تعین کرتے اور کہتے چار آنے یا چھ آنے۔ رکشے سے اترنے کے بعد جب چار آنے دیتے تو وہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتا (اسے اتنا بوجھ گھسیٹنا پڑتا تھا اور دہاڑی کم مل رہی ہوتی تھی) وہ کہتے کہ میں نے تو رکشے میں بیٹھنے سے پہلے ہی اجرت بتا دی تھی۔ نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ رکشے والوں میں اور ان میں مشکل ہی بن پاتی تھی۔ اگر کوئی ساتھ ہوتا تو دو آنے دے کر ان کی جان چھڑاتا۔

جب تک انگریزوں کی ملازمت کی گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ جا کر نوجوانوں کو فوج میں بھرتی کرنے پر آمادہ کرتے رہے۔ دوسری جنگ عظیم اپنے عروج پر تھی اور برطانیہ کو جرمنی سے جنگ کرنے کے لیے آدمیوں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس نے یہاں ایک محکمہ ”پبلسٹی سانگ“ قائم کر دیا تاکہ پنجاب سے افرادی قوت حاصل کر کے جنگ میں جھوک دی جائے۔ جب جنگ ختم ہو گئی تو یہ محکمہ بھی ختم کر دیا گیا۔

مجید نے کالم نگاری کی ابتدا روزنامہ ”انقلاب“ سے 1938ء میں کی۔ وہ معاشرے کے ہر موضوع پر لکھتے تھے لیکن ان کا ہر لفظ طنز و مزاح میں ڈوبا ہوا ہوتا تھا۔

وہ 1947ء میں لاہور سے کراچی آ گئے اور انہوں نے روزنامہ ”انجام“ سے اپنی کالم نگاری دوبارہ شروع کی۔ اس کے بعد وہ روزنامہ ”انصاف“ اور پھر ”خورشید“ میں لکھنے لگے۔ انہوں نے سندھ اخبار ہفت روزہ بلوچستان اور ہفت روزہ ملت میں بھی کام کیا۔ اکتوبر 1948ء میں وہ روزنامہ ”جنگ“ سے وابستہ ہو گئے اور ”حرف و حکایت“ کے عنوان سے کالم نگاری کرنے لگے۔ کالم نگاری کے ساتھ ساتھ وہ اپنا پندرہ روزہ میگزین ”نمکدان“ بھی شائع کرتے رہے۔ وہ روز کالم لکھتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے بڑے ادبی جرائد میں سنجیدہ مضامین بھی لکھے مثلاً عالمگیر، شاہ کار اور ادب لطیف۔ ان کی کتاب ”نمکیات“ بھی ایک یادگار ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کراچی میں ٹراموے چلا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ تانگے اور پاؤں والے رکشے۔ آٹو رکشا اور ٹیکسیاں شاذ ہی تھیں۔ سنیما گھر اور شراب خانے تھے، جہاں جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ (شراب پر پابندی ضیا الحق نے لگائی تھی اور سنیما گھر خود بخود بند ہو گئے)

اپنا کالم ”حرف و حکایت“ لکھنے کا ان کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا تھا، اس لیے کہ ان کے دوست انہیں گھیرے رہا کرتے تھے۔ دوست بھی ایسے کہ چائے کی ایک پیالی پینے کے لیے ان کے پاس بیٹھ جاتے۔ نہایت فضول گفتگو کرتے تھے۔ مجید چونکہ اپنی تعریف سن کر ریشہ خطمی ہو جایا کرتے تھے۔ اس لیے کسی سے یہ نہیں کہتے تھے کہ اٹھو اب چلتے بنو۔ جو چاہے جب تک بیٹھا رہے۔ ان کے جانے کے بعد احساس ہوتا کہ وقت ضائع ہو گیا۔ چنانچہ پیٹھ پیچھے برائیاں بھی کرتے اور کہتے کہ ”سالے آ گئے، وقت مٹی میں ملا گئے۔ اب آئے تو دھکا مار کر باہر نکال دوں گا۔“ یہ عہد وہ غصے میں کرتے تھے، لیکن جب ان کی مداح سرائی میں لوگ جمع ہونے لگتے تو کسی سے کچھ نہیں کہتے، بلکہ ان کی باچھیں کھل جاتیں۔

جب جنگ سے فون پر فون آنا شروع ہو جاتا تو کالم لکھنا شروع کر دیتے۔ مگر لکھتے کہاں؟ اس کے لیے انہوں نے میکدے کا انتخاب کر رکھا تھا۔ وہ پیتے جاتے تھے اور کالم لکھتے جاتے تھے۔ اس معاملے میں وہ کسی کو دعوت نہیں دیتے تھے۔ کوئی شناسا وہاں بھولے بھٹکے آ جاتا اور ان کی طرف گرسنہ نظروں سے دیکھتا تو کہتے۔ ”اپنی تو جیب بالکل خالی ہے۔ میں اس وقت قلاش اور مفلس ہوں۔ کسی اور وقت آنا میں وھسکی کے ڈرم سے نہلا دوں گا۔ جیب میں پیسے ہوں تو ویٹر سے کچھ منگوا لو۔ دل ہلکا ہو جائے گا۔“

نمکدان کا دفتر ہی ان کا دوسرا گھر تھا، جہاں وہ بیشتر وقت دکھائی دیتے تھے۔ رات گئے گھر کو جاتے تھے۔ بعض اوقات نہیں بھی جاتے تھے۔ اس لیے کہ اپنی لکھی ہوئی کوئی غزل یا نظم آنے والوں کو سنانے لگتے۔ اگر اس پر داد مل جاتی تو پھر غزلوں کا ریلا سا بہنے لگتا۔ رات کیسے گزر جاتی اور صبح کب ہوتی، یہ انہیں پتا ہی نہ چلتا۔ اگر چلتا بھی تو وہ اسے نظر انداز کر دیتے۔ اپنی تعریف و توصیف سننے کا انہیں بڑا شوق تھا۔ سڑک چلتے اگر کوئی اپنے ساتھی سے کہتا۔ ”ارے! وہ دیکھو مجید لاہوری جا رہا ہے۔“ تو وہ ٹھنک جاتے اور اپنے ساتھ چلنے والے سے کہتے۔ ”یار میں اتنا مشہور ہوں، یہ تو مجھے پتا ہی نہیں تھا۔“

یہی حال ان کے نثری کالموں کا تھا۔ دفتر میں آنے والے کسی دوست سے کہتے۔ ”تم نے آج کا ”حرف و حکایت“ پڑھا۔ میں نے اس میں وہ لفظ استعمال کیا ہے۔“

دوست ہونقوں کی طرح منہ کھول کر پوچھتا کہ کون سا لفظ تو اسے پہلے تو وہ لفظ مع جملے کے سناتے اس کے بعد پورا کالم ہی سنا دیتے۔ جنگ کا کالم لکھنے کے بعد نمکدان کے کالم کی باری آتی۔ وہ بھی دشواری سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتے۔ ان میں کاہلی کی عادت بہت تھی۔ آج کا کام کل پر اور کل کا پرسوں کرنے کے عادی تھے۔ یوں تو نمکدان پندرہ روزہ تھا لیکن ان کی تساہلی کی وجہ سے ماہنامہ بن جاتا۔ کوئی دوست اعتراض کرتا تو کہتے ”مٹی پاؤ۔ لعنت بھیجو۔“ یہ ان کا تکیہ کلام سا بن گیا تھا۔ ہر وہ بات۔ جس پر انہیں جھنجلاہٹ ہونے لگتی تھی اس پر مٹی ڈال دیا کرتے تھے اور لعنت بھیج دیتے۔

”جب لکھنے سے اکتا جاتے تو جنگ کے پرانے کالم نمکدان میں بھی استعمال کر لیتے۔ ان کے دوست اعتراض کرتے تو کہتے لوگوں کی یادداشت اتنی تیز تھوڑی ہوتی ہے۔ چلنے دو۔“

معاملہ یوں ہی چلتا رہا۔ حد یہ ہو گئی کہ پھر صرف نمکدان کا اداریہ ہی لکھا کرتے تھے۔ لوگ بہرحال اسے پڑھتے تھے اس لیے کہ وہ سنجیدہ مشکل ہی سے ہوتے تھے ورنہ نمکدان میں لطیفے، کارٹون اور دلچسپ واقعات ہوتے تھے۔ وہ اپنی نوعیت کا منفرد میگزین تھا۔ اس کی وجہ مجید لاہوری خود تھے۔ اس لیے کہ وہ پیدائشی مزاح نگار تھے۔ مگر تساہلی کی وجہ سے کالم چھوٹے ہوا کرتے تھے۔ مگر چھوٹے ہونے کے باوجود وہ جو بات کہنا چاہتے تھے کہہ جاتے تھے۔ اس لیے کہ وہ لفظوں کو چابکدستی سے استعمال کیا کرتے تھے۔

خیر سے ایک رفاہی تنظیم کے صدر بھی تھے۔ اس کا کلرک رجسٹر یا کسی سرکولر یا اہم کاغذ پر دستخط کرانے آتا تو فوراً ہی دستخط نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اس سے کہتے کہ بیٹھو۔ وہ بیٹھا رہتا۔ مجید کام میں مصروف رہتے۔ نہ بھی کر رہے ہوتے تو کاہلی کی بنا پر گھنٹوں دستخط کرنے کا ان کا موڈ ہی نہیں بنتا۔ کلرک یہ سوچ کر بیٹھا رہتا کہ آدھے یا ایک گھنٹے میں اس کا کام ہو جائے گا۔ مگر مجید اسے شام تک بٹھائے رکھتے۔ اگر کسی کو ان سے کوئی کام پڑ جاتا تو اسے وعدے کر کے ٹہلاتے رہتے۔ وہ بیچارہ ہفتوں اور مہینوں چکر کاٹتا رہتا۔ ادھر مجید وعدوں پر وعدے کیے جاتے۔ یہ بھی نہیں کہتے کہ یہ کام مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ اگر اتفاق سے کسی کا کوئی کام ہو جاتا تو

کہتے۔ منٹوں میں کام ہوگیا۔ اپنی شخصیت ہی کچھ ایسی ہے کہ لوگوں سے نہ کرتے نہیں بنتی۔ اس کے بعد شہر بھر میں اپنا ڈھنڈورا پیٹتے۔ جو دفتر میں آتا اسے اپنا کارنامہ سناتے۔

عملی طور پر بھی ان کی زندگی ہنسی ٹھٹے میں گزرتی تھی۔ اہم سے اہم کام سر پر لدا ہوا ہے، لیکن وہ ہیں کہ فضول اور عامیانہ گفتگو کر کے وقت ضائع کر رہے ہوتے۔ نہ معلوم کہاں کہاں کے قصے لے کر بیٹھ جاتے۔ گاؤ تکیہ لگا ہوا ہے اور پانوں کی ڈبیا تکیے کے نیچے رکھی ہوئی ہے۔ قصے، کہانیاں ہیں کہ ختم ہی نہیں ہونے میں آرہی ہیں۔ قہقہے لگا رہے ہیں اور گفتگو کا تار ہے کہ ٹوٹنے میں نہیں آرہا۔ پان پر پان کھائے جا رہے ہیں اور پاس رکھے ہوئے اگالدان میں پیک تھوکتے جا رہے ہیں۔ وقت ختم ہو جاتا لیکن لطیفے ختم ہونے میں نہیں آتے۔ اگالدان ہے کہ پان کی پیک سے بھرا جا رہا ہے۔ پھر یہ انکشاف ہوتا کہ پانوں کی ڈبیا ختم ہوگئی۔ اس وقت محفل بھی درہم برہم ہو جاتی۔ ان کا موڈ آف ہو جاتا تھا۔ ہاتھ ہلاتے تھے کہ اب تم لوگ یہاں سے کھسک جاؤ۔ کوئی ڈھیٹ بنا بیٹھا رہتا تو کہتے کہ گھر جاؤ، کوئی کام نہیں ہے کیا؟

بلا کے محتاط تھے جس کے ڈانڈے خساست سے جا ملتے تھے اور دوسروں پر فوری اعتبار نہیں کرتے تھے بلکہ اسے شک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ڈاکیہ نمکدان کے منی آرڈر فارم لے کر آتا تو پہلے خود حساب لگاتے اس کے بعد رقم گنتے۔ پھر ان کا کوئی دوست بیٹھا ہوتا تو اس سے کہتے کہ حساب لگاؤ۔ وہ حساب لگا کر بتاتا کہ ٹھیک ہے تو ایک بار پھر حساب لگانے بیٹھ جاتے۔ دلچسپ بات یہ کہ ڈاکیے کے ہاتھ سے سارے فارم لے کر انہیں بھی چیک کرتے کہ نمکدان کا کوئی فارم رہ تو نہیں گیا۔ اس کے بعد رقم کو نہایت سرعت سے جیب میں رکھ لیا کرتے تاکہ کوئی مانگ نہ بیٹھے یا پیسوں کو نظر نہ لگ جائے۔

ہر آنے جانے والے کا اپنی نگاہوں کی ایکسرے مشین سے جائزہ لیتے رہتے۔ ڈاکیہ جس وقت منی آرڈر یا وی پی کی رقم لے کر آتا تو مضطرب ہو جاتے، اس لیے بعد میں یہ ہونے لگا تھا کہ جب ڈاکیہ آتا تو اسے لے کر نزدیکی ہوٹل میں چلے جاتے اور وہاں منی آرڈر فارموں کا حساب کتاب کرتے تھے...... اور کئی بار کرتے تھے۔ اپنے میگزین نمکدان کے سارے کام خود کرتے تھے۔ سوائے کتابت کے۔ نمکدان کے لیے ایک کاتب رکھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ چپراسی تک نہیں تھا۔ کاتب سے چپراسی کا کام لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔ ”ارے بھئی ریاض! ذرا ملباری کو چائے تو بول آؤ۔“ واپس آکر وہ دوات میں قلم ڈبو کر دو سطریں ہی لکھ پاتا کہ اسے پھر آواز دیتے۔ ”ارے بھئی ریاض! ذرا پان تو لا دینا۔ میرا موڈ آف ہو رہا ہے۔“ وہ بیچارا پھر اپنی جگہ سے اٹھ جاتا۔ شفیع عقیل جنگ کے علاوہ چونکہ ان کے رسالے میں بھی کام کرتے تھے چنانچہ وہ جاتے ہوئے جھاڑ دے دیا کرتے تھے۔ صبح آکر مجید یہ کام خود انجام دے دیا کرتے تھے۔

دفتر میں فضول سے آدمیوں کا جمگھٹا سا لگا رہتا تھا اس لیے شفیع عقیل پریشان رہتے تھے اور اجنبی آنے جانے والوں سے کہہ دیا کرتے کہ مجید لاہوری نہیں ہیں، حالانکہ وہ سامنے ہی میز پر بیٹھے کام کر رہے ہوتے تھے۔

اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ یہ ہوا کہ ایک دن ایک صاحب عجلت میں آئے اور پوچھنے لگے۔ ”مجید لاہوری ہیں؟ ضروری کام ہے۔“

”وہ تو نہیں ہیں۔“ شفیع نے جواب دیا۔ جب کہ مجید دوسری میز پر بیٹھے کام کر رہے تھے۔ وہ جانے لگے تو شفیع نے پوچھا۔ ”کیا کوئی کام تھا؟“

”ہاں، مگر ان سے ہی بات کرنا تھی۔“ وہ بولے۔ پھر جانے لگے۔

”آپ کا نام کیا ہے؟“ شفیع نے سوال کیا۔

”چہ خوش۔“ انہوں نے چمکتی آنکھوں سے جواب دیا۔ ”اور آپ کا؟“ انہوں نے پوچھا۔

”دریں چہ شک۔“ شفیع سے پہلے مجید نے جواب دیا۔

وہ صاحب ذوق معلوم ہوتے تھے، اس لیے لپک کر ان کی میز کے قریب گئے اور کہنے لگے۔ ”مجھے یقین ہے کہ آپ ہی مجید لاہوری ہیں۔ آپ کے علاوہ کوئی اور مجید لاہوری نہیں ہوسکتا۔“

مجید نے اثبات میں سر ہلایا تو انہوں نے گپیں ہانکنا شروع کر دیں۔ اِدھر اُدھر کی بے مقصد باتیں۔ مجید نے گفتگو کے دوران چالاکی سے یہ معلوم کر لیا کہ بے روزگار ہیں اور کام کی تلاش میں آئے ہیں۔ دو تین روز تک وہ آتے جاتے رہے اور اپنی لچھے دار گفتگو سے خوب وقت ضائع کرتے رہے۔ بلاشبہ وہ گفتگو کرنے کے فن سے واقف تھے۔

ایک روز مجید نے شفیع سے کہا یہ بندہ چالاک معلوم ہوتا ہے اس لیے اسے نمکدان کے لیے اشتہارات لانے پر لگائے دیتے ہیں۔ سو روپے مہینا تنخواہ دے دیں گے۔ شفیع نے ان کی بات سے اتفاق کیا اور حسبِ معمول اثبات میں گردن ہلا دی۔

دوسرے دن مجید نے شفیع کو ہدایت دی کہ وہ ساری

ایجنسیوں میں جا کر ان کا تعارف کرائیں۔ شفیع نے ایسا ہی کیا۔ انہیں لے کر وہ ساری فرموں اور اشتہار دینے والی ایجنسیوں میں گئے۔ دو روز گزر گئے تو مجید لاہوری نے چہ خوش صاحب سے کہا کہ اب وہ جائیں اور نمکدان کے لیے اشتہارات جمع کر کے لائیں۔ وہ صاحب لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور اپنی ہر موضوع کا سلسلہ لکھنؤ سے جا کر ملا دیتے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ بادیوان شاعر بھی ہیں، لیکن وہ ہندوستان میں شائع ہوا تھا۔ اب اس کا ایک بھی نسخہ ان کے پاس نہیں ہے۔ اگر کبھی ان سے شعر سنانے کی فرمائش کی جاتی تو کہتے۔ ”واللہ سچ کہہ رہا ہوں، اب ایک بھی شعر یاد نہیں۔ فسادات میں یادداشت نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ بڑی مشکل سے اس کیفیت کرب وبلا سے نکل پایا ہوں۔“

بہر حال وہ نمکدان کے لیے اشتہار لینے کے لیے صبح گئے اور شام کو لوٹے۔ مجید نے ان سے پوچھا۔ ”کہیے چہ خوش صاحب کچھ بات بنی؟ کتنے اشتہار لے آئے؟“

بس اتنا پوچھنا مصیبت ہوگیا۔ جھٹ سے بولے۔ ”مجید صاحب قبلہ کیا عرض کروں۔ جب میں صبح آیا تو شفیع صاحب تھے اور آپ نہیں تھے۔ میں نے آپ کے بارے میں دریافت کیا تو پتا چلا کہ کچھ دیر میں آئیں گے۔ اس لیے کہ رات گئے تک کام کرتے ہیں، اس لیے صبح دیر ہو جاتی ہے۔ واللہ آپ کی باتیں......“

”مگر میں تو آپ سے اشتہارات کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔“ مجید نے ٹوکا۔

”جی ہاں، وہی بتا رہا ہوں۔“ انہوں نے رسانیت سے کہا۔ ”جب معلوم ہوا کہ آپ تاخیر سے آئیں گے تو میں دفتر سے نکلا اور زینے اتر ہی رہا تھا کہ میرے بچپن کے ایک دوست فیاض مل گئے۔ فیاض بے حد پُرخلوص اور محبت کرنے والے انسان ہیں۔ آج آپ کے طفیل ان سے ملاقات ہوگئی۔ چشم بددور بہت اچھے شعر کہتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ان کا ڈنکا بجتا تھا، جہاں دیکھو لوگ گھیرے کھڑے ہیں۔ فلاں غزل سنا دیجیے۔ مجھے دیکھتے ہیں استفسار کرنے لگے کہ لکھنؤ سے کب آئے؟ کہاں قیام ہے؟ اب تک ملاقات کیوں نہیں کی؟“

”حضرت آپ اشتہار والوں کے پاس گئے تھے؟“ مجید نے انہیں پھر ٹوکا۔ اب ان کے چہرے پر جھلاہٹ غالب تھی۔ چہرے پر تشنج پیدا ہوگیا تھا۔ زیادہ غصے کی کیفیت میں چہرہ سرخ بھی ہو جایا کرتا تھا۔

اجت کھدا نے دیا

جاتی تو نہیں فر بھی سوچو جرا
پانچ چھ چوپڑی تو پڑھیلا ہے ہم
پانچ چھ چوپڑی پڑھ کے کمتی میں بھی
لاکھوں کا بج نس کریلا ہے ہم
ہم کو اجت یہ سارا کھدا نے دیا
آج موٹر کے اوپر چڑھیلا ہے ہم
ہم کو دولت یہ سارا کھدا نے دیا
ہم کو اجت یہ سارا کھدا نے دیا
ہم نے مٹی کو سونا بنا کر دیا
اس میں بھی کھوب پیسہ کھدا نے دیا
بلیک ہم نے کیا تو یہ موٹر، یہ مل
یہ زمین اور بنگلہ کھدا نے دیا
ہم نے پیسہ لگایا ڈبل ٹوٹ میں
دولت اس میں بھی اچھا کھدا نے دیا
ہم کو دولت یہ سارا کھدا نے دیا
ہم کو اجت یہ سارا کھدا نے دیا
وہ یہ بولا صدارت بڑی چیج ہے
اس نے بولا وجارت بڑی چیج ہے
تم نے بولا سفارت بڑی چیج ہے
اور وہ یہ بولا حکومت بڑی چیج ہے
ہم نے بولا دولت ہے سب سے بڑی
سب نے بولا کہ دولت بڑی چیج ہے
ہم کو دولت یہ سارا کھدا نے دیا
ہم کو اجت یہ سارا کھدا نے دیا

”جی ہاں وہی تو بتانے جا رہا ہوں۔ فیاض سے معذرت کر کے میں اسٹاپ پر گیا اور ایک بس میں بیٹھ گیا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کر ڈالی۔ وہ ازدحام تھا کہ بس کچھ نہ پوچھیے۔ لوگ ایک دوسرے کو رگڑے ڈال رہے تھے۔ سانس لینا دشوار تھا۔ بے پناہ گرمی اور بے پناہ رش۔ میں تو کہتا ہوں کہ حکومت کو چاہیے کہ اب بسوں کی تعداد بڑھا دے تاکہ آمد و رفت میں کچھ تو سہولت پیدا ہو۔“

”چہ خوش صاحب کوئی اشتہار بھی ملا؟“ مجید نے جھنجلا کر پوچھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ چہ خوش کو تھپڑ مار

دیتے اور سارے دانت باہر کر دیتے۔

"ابھی عرض کرتا ہوں۔" انہوں نے سانس لینے کے لیے قدرے وقفہ دیا اور پھر کہنے لگے۔ "بس سے اترا تو پیاس کے مارے حلق خشک ہوا جا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ ٹھنڈا پانی پی لوں تو آگے بڑھوں۔ یہاں کا پانی بھی کوئی پانی ہے۔ لکھنؤ کا وقت یاد آتا ہے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اپنے گھر میں تو صراحی ہوا کرتی تھی جس کا پانی......"

وہ بک بک بند کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ مجید اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے شفیع سے کہا۔ "یار اس کی طلسم ہوشربا سن کر مجھے بتا دینا کہ کوئی اشتہار ملا یا نہیں۔" پھر وہ دفتر سے نکل گئے۔ حالانکہ انہیں بہت سے کام کرنا تھے۔ غالباً وہ اس مسخرے سے جان چھڑانا چاہتے تھے، جس کا نام چہ خوش تھا۔

شفیع نے اس کی کتھا سن لی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اسے کوئی اشتہار نہیں ملا۔ دوسرے دن بھی اسے کوئی اشتہار نہ ملا۔ البتہ مجید کو طلسم ہوشربا کا حصہ دوم ضرور سننا پڑا۔ تازہ تازہ اور لچھے دار۔ وہ روز جاتا تھا اور شام کو واپس آ جاتا تھا۔ مجید خوف کے مارے اشتہار کے بارے میں کوئی سوال نہ کرتے۔ اس لیے کہ انہیں چہ خوش کی پیچیدہ اور چیستانی کہانیاں سننے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ وہ بہر حال ادیب تھے اور انہیں کچھ نہ کچھ لکھنا ہوتا تھا۔

ایک روز مجید نے شفیع سے کہا۔ "شفیع! ایہہ کھوتی کتھوں آ گئی اے؟"

"آپ ہی نے ان کی کوئی صلاحیت دیکھ کر رکھا ہے۔" شفیع نے جواب دیا۔

پھر جب مہینا پورا ہو گیا تو مجید نے انہیں سو روپے دے کر رخصت کر دیا۔

مجید کو گھومنے کا بھی شوق تھا۔ سیر سپاٹا، غالباً وہ لکھنے کی ٹینشن سے فرار حاصل کرنا چاہتے اور دماغ کو تازہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ رات کو اچانک شفیع سے کہتے۔ "آؤ گھومنے چلیں۔" شفیع ساتھ ہو جاتے۔ رات کو سڑکیں ناپ رہے ہیں۔ کبھی اس فٹ پاتھ پر کھڑے ہیں تو کبھی پان والے کی دکان پر صورت حال پر گفتگو ہو رہی ہے۔ کبھی پشاوری ہوٹل سے نہاری کھائی جا رہی ہے۔ ایرانی ہوٹل سے سبز چائے پی جاتی۔ کبھی کیماڑی کے پل پر پہنچ گئے۔ کبھی کلفٹن۔ بے مقصد گھومتے تھے لیکن نئی نئی جگہوں پر جاتے تھے۔ کچھ نہیں تو کسی لچر اور عامیانہ فلم دیکھنے کا موڈ طاری کر لیا۔ شفیع کہتے ہیں کہ وہ فلم کے بارے میں قطعی بدذوق تھے۔ مگر وقت پاس کرنا مقصود ہوتا، اس لیے کوئی پروا نہیں کرتے۔

گھومنے میں یہ پروگرام بھی شامل تھا کہ کیماڑی جا کر سمندر کی ٹھنڈی ریت پر بیٹھ جاتے۔ شلوار کے پائنچے اٹھا لیتے اور کرتہ کہیں لٹکا دیتے اور پانی کے ریلوں سے لطف اندوز ہوتے۔ اس وقت سارا ماضی کھنگال ڈالتے۔ شفیع اس کیفیت میں کبھی اختر شیرانی کو یاد کرتے اور کبھی پنڈت ہری چند کے واقعات گوش گزار کراتے۔ پھر چراغ حسن حسرت کے چٹکلے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ گفتگو کرتے کرتے سو جاتے تھے۔ چنانچہ شفیع اکتاہٹ کا شکار ہونے لگتے۔ اس لیے کہ گفتگو کا سلسلہ جاری نہ رہتا اور وہ منہ پھاڑے مجید کو تکتے رہتے۔ اس لیے کہ سڑک کی طرف سے موٹروں اور گاڑیوں کی آوازیں آتی تھیں جن پر مجید کے خراٹے غالب آ جاتے تھے۔ شفیع ڈر جاتے تھے۔ مجید کے لیے مشہور تھا کہ وہ جاگتے میں قہقہے اور سوتے میں خراٹے لگاتے تھے۔

نمکدان لیتھو پر چھپتا تھا ایک روز نہ جانے کیوں انہوں نے فیصلہ کیا کہ اسے ٹائپ پر شائع کیا جائے۔ انہوں نے اپنے دوست غزالی سے اس ارادے کا اظہار کیا۔ غزالی ایک پرنٹنگ پریس میں ملازم تھا اس لیے اسے چھپائی کے معاملات کا تجربہ تھا۔ اس نے سمجھایا۔ "ٹائپ کرانے سے آپ زیر بار ہو جائیں گے۔ خرچا بڑھ جائے گا۔"

"ارے یار۔ ساری زندگی اسی سود و زیاں میں گزر جائے گی۔ پرچا تو خوبصورت ہو جائے گا نا؟" انہوں نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔ "پھر کاتبوں سے بھی جان چھوٹ جائے گی۔ یہ کاتب نہیں کراماً کاتبین ہیں۔ دعا لکھو تو دغا پڑھتے ہیں۔"

غزالی کیا بحث کر سکتا تھا۔ خاموش ہو کر سامنے والی دیوار کو گھورنے لگا۔

اگلے ہفتے کاتب کی چھٹی کر دی گئی اور نمکدان ٹائپ پر آ گیا۔ مگر بیشتر حصہ پڑھنے میں نہیں آ رہا تھا، اس لیے کہ سندھی خط میں تھا۔ یوں کہنا چاہیے کہ اس سے مماثل۔ شفیع عقیل نے چونک کر پوچھا۔ "اسے کون پڑھے گا؟ ہمارے قاری تو سندھی سے واقف نہیں ہیں۔ خط سندھی سے بہت ملتا جلتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں نا؟"

"پریشان نہ ہوں۔ اگلے ہفتے ٹھیک ہو جائے گا۔" انہوں نے تسلی دی۔ چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ صدمہ تو انہیں بھی پہنچا ہے۔

اگلے ہفتے پھر وہی ہوا۔ تین چار ہفتوں تک یہ ڈراما جاری ہوتی رہی اس کے بعد اردو ٹائپ پر نمکدان آیا تو قارئین نے اطمینان کا سانس لیا۔ مگر اس وقت شفیع کا سانس چار مہینے کے بعد رکنے لگا جب مجید لاہوری نے جھنجلا کر کہا۔ "یار شفیع! اخراجات زیادہ ہو گئے ہیں۔ نمکدان کو لیتھو پر ہی لانا پڑے گا۔"

شفیع کیا کہہ سکتا تھا۔ کاندھے ہلا کر رہ گیا۔ نمکدان کے کاتب کا نام اکرام الدین تھا۔ ناظم آباد میں رہتا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ کسی طرح سے دفتر ہی میں سو جائے۔ بعض اوقات کئی کئی دن گھر ہی نہ جاتا۔ جب اس کا لڑکا آتا اور کہتا۔ "امی نے بلایا ہے۔" تو چلا جاتا۔

اسے نمکدان کے چھوٹ جانے کا صدمہ تھا۔ اس لیے جب اسے آفر دی گئی تو فوراً رضامند ہو گیا۔ نمکدان پھر لیتھو پر شائع ہونے لگا۔ لوگ اسے مجید کی تحریروں کی بنا پر خریدتے تھے اور اس کی اشاعت رفتہ رفتہ بڑھ رہی تھی۔

نمکدان کی اشاعت بڑھ گئی تھی، اس لیے ان کے حالات بھی اچھے ہو گئے تھے۔ پاکستان بننے سے پہلے انہوں نے شراب نوشی ترک کر دی تھی۔ اس کی بڑی وجہ ان کی تنگ دستی تھی۔ ورنہ وہ زاہد بن کر بیٹھنے والے انسان نہیں تھے۔ جب پینے کا موڈ ہوتا تو پیتے نہیں تھے، البتہ پینے کی باتیں کرنے بیٹھ جاتے۔ لاہور میں چراغ حسن حسرت کا جب تک ساتھ تھا۔ ان کے ساتھ جام پہ جام لنڈھاتے تھے۔ وہی حسرت جب کراچی آ گئے تو مجید ان کے ساتھ شراب خانے جانے لگے۔ ایک بار کسی دوست نے اعتراض کیا تو بولے۔ "میں تو حسرت کو لے جاتا ہوں۔ خود کہاں پیتا ہوں۔"

ان کی توبہ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ مے خانے جا کر خود پر کہاں تک پابندی عائد کی جا سکتی ہے؟ خود بھی پینے میں مصروف ہو گئے۔ جب کسی نے ٹوکا تو کہنے لگے۔ "نہیں یارا انگلش پینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بس دیسی گڑ بڑ کرتی ہے۔ اس لیے اسے ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔"

پینے میں پہلے تو حسرت کا ساتھ دیتے رہے اس کے بعد انہیں بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ انگلش میں کسی کو کیا مزہ آتا ہے۔ وہ پھر سے ٹھرے پر اتر آئے۔ ایک زمانہ تھا کہ دو پیگ پی لیتے تھے تو طمانیت ہو جاتی تھی۔ سرور میں آ جاتے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ ایک گلاس پر آ گئے۔ جب اس سے بھی کچھ نہ ہوتا تو آدھا پینے لگے۔ آدھے سے بوتل تک کب پہنچے، یہ انہیں خود بھی پتا نہیں چلا۔ انگلش کا پھیکا پن انہیں قطعی اچھا نہیں لگا۔ چنانچہ انہوں نے ٹھرے میں پناہ ڈھونڈ لی۔ اس زمانے میں کہتے تھے۔ "گھریلو صنعت کی سرپرستی کرنا چاہیے۔ اب ملکی مال ہی چلے گا۔ انگلش کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔"

رمضان آنے پر بہت پریشان ہوتے تھے۔ اتفاق سے ان کے ایک دوست شاکر بھی ان دنوں لاہور سے آئے ہوئے تھے۔ دفتر آ کر بیٹھے تو چہرے سے کبیدگی ظاہر ہو رہی تھی۔ مجید نے پوچھا کہ ماجرا کیا ہے تو کہنے لگے۔ "یار! جہاں جاؤ رمضان۔ کسی ایسی جگہ چلتے ہیں جہاں رمضان نہ ہو۔"

"کہاں چلنا چاہیے؟" شفیع نے پوچھا۔

شاکر نے پروگرام بنا ڈالا کہ کیماڑی سے سینڈز پٹ کی طرف چلتے ہیں اور راستے میں مچھلیاں پکڑیں گے۔ چولہا ساتھ لے چلیں گے اور مچھلیاں بھون کر کھائیں گے۔ اگر اس کے ساتھ کچھ پینے کو ہوگا تو یادگار سیر ہو جائے گی۔

چنانچہ بیئر کی دس بارہ بوتلیں ایک تھیلے میں بھری گئیں اور ایک عدد اسٹو بھی لے لیا گیا، تاکہ مچھلیاں بھونی جا سکیں۔ کیماڑی پر پہنچ گئے۔ وہاں سے ایک کشتی والے کو سینڈز پٹ چلنے اور واپس آنے پر بھی آمادہ کیا۔ وہ راضی ہو گیا۔ پندرہ منٹ بعد اس نے بلند آواز سے کہا۔ "اب آپ لوگ مچھلی پکڑو۔ پانی گہرا ہو گیا ہے۔"

شغل ہوتا رہا اور مچھلیاں پکڑنے کی کوششیں بھی جاری رہیں۔ شام کو جب سورج غروب ہو گیا اور رمضان کو بھی ساتھ لے گیا تو مجید کو واپسی کی سوجھی۔ جائزہ لیا گیا تو پتا چلا کہ مچھلیاں تو نہیں البتہ ایک مچھلی پکڑی جا سکی ہے۔ وہ بھی ایک پاؤ وزن کی۔ بیئر کی خالی بوتلوں کے ساتھ وہ واحد مچھلی اس ملاح کو دے کر سب وہاں سے واپس آ گئے۔

کچھ عرصے بعد ان کی زندگی ایک دائرے میں قید ہو کر رہ گئی۔ گھر سے دفتر آئے۔ جنگ کے لیے کالم لکھا۔ اس کے بعد پندرہ روز گزر جانے کے بعد نمکدان کے لیے اداریہ لکھا۔ کچھ آب جو سے شغل کیا۔ کھانا کھایا اور گھر جا کر سو گئے۔ انہیں سونے اور خراٹے لینے کا بہت شوق تھا۔

انہیں مطالعہ کرتے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ انہیں مطالعے کا شوق ہی نہیں تھا۔ اس لیے کہ ان کی تعلیم واجبی سی تھی۔ تعلیم کے بارے میں کسی کو کچھ بتاتے اور کسی کو کچھ۔ اگر کچھ لکھتے تھے تو مشاہدے، تجربے کی بنا

پر۔ البتہ کلیات نظیر ان کے تکیے کے نیچے دبی رہتی تھی۔ جس کی کسی نظم کی پیروڈی وہ جمعہ کو کرتے پھر اتوار کے کالم میں چھپنے کے لیے جنگ بھیج دیتے تھے۔

خودستائشی کی بنا پر اپنی تعریف آپ کرنے کے فن سے واقف تھے۔ اپنی نظمیں اور کالم لوگوں کو سناتے تھے۔ کسی بڑے ادیب یا شخص سے ملاقات ہوجائے تو دوستوں کو بتاتے تھے۔ اتنی بار بتاتے تھے کہ سننے والوں کو اکتاہٹ ہونے لگتی تھی۔ اپنے بارے میں خبریں چھپوانے اور اپنی تصاویر اتروانے کا شوق بھی تھا۔ کوئی فوٹو گرافر نظر آجاتا تو بضد ہوجاتے کہ ان کی تصویر کھینچی جائے۔ چاہے فوٹو گرافر سے ان کی واقفیت ہو یا نہ ہو۔ جب شہر سے باہر جانے لگتے تھے تو شفیع عقیل سے کہتے کہ خبر بنا کر اچھی جگہ لگا دینا۔ جب خبر نہیں لگتی تھی تو باقاعدہ تحقیق کرتے کہ کسی نے ان کے خلاف سازش تو نہیں کی۔

شفیع عقیل نے ان کے پندرہ روزہ نمکدان میں آٹھ برس کام کیا تھا۔ جس کا آفس ڈینسو ہال کے قریب تھا۔ جب شفیع نے جنگ میں ملازمت کرلی اور وہاں کے آفس میں بیٹھنا شروع کر دیا تو نمکدان چھوڑ دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ مجید کی بعض باتیں بہت دلچسپ ہوا کرتی تھیں جن کا تجزیہ میں نہیں کرپایا۔ مثلاً وہ دوپہر کو دو بجے کے قریب آتے اور پوچھتے۔ "کیا کر رہے ہو؟ آؤ دفتر میں کھانا آیا ہوگا کھانا کھائیں گے۔"

شفیع ٹال مٹول کرتے اور کام کا عذر پیش کرتے لیکن مجید نہ مانتے اور انہیں رکشے میں بٹھا کر دفتر پہنچ جاتے۔ شفیع بیٹھتے تو کیا۔ ان کے بیٹھنے کے بعد تھوڑی سی جگہ میں پھنس جاتے تھے۔ جب دفتر پر اترتے تو کہتے۔ "رکشے والے کو پیسے دے دو۔ میرے پاس کھلے نہیں ہیں۔"

اس کے بعد دفتر میں داخل ہوتے ہی ملازم سے پوچھتے۔ "کھانا لے آئے؟"

جواب اثبات میں ملتا تو ٹفن کیریئر کھول کر بیٹھ جاتے۔ اگر سالن گوشت ہوتا تو ساری بوٹیاں نکال کر روٹی پر رکھ لیتے اور اپنے ہاتھ میں دبا لیتے اور کہتے۔ "سالن کم ہے۔ تھوڑا سا منگوالیں؟"

پھر شفیع کا جواب سنے بغیر ملازم کو آواز دے کر کہتے۔ "بھئی دیکھو یہ شفیع صاحب کیا منگوا رہے ہیں۔"

شفیع پیسے دیتے تو سالن اور روٹی ایرانی کے ہوٹل سے آجاتی، جو نزدیک ہی تھا۔ شفیع اپنے ہی پیسوں کی روٹی کھا کر جنگ واپس آجاتے۔ مگر دوسرے ہی دن مجید پھر شفیع کے پاس پہنچ جاتے۔

"کیا کر رہے ہو؟ آؤ دفتر کھانا کھائیں گے۔"

مجید کی حالت 1956ء میں ابتر ہوگئی تھی۔ بیک وقت کئی بیماریوں نے آن گھیرا۔ جس میں ذیابیطس، عارضۂ دل اور بواسیر شامل تھی۔ جبکہ پینے سے ان امراض میں شدت پیدا ہوگئی تھی۔ بواسیر کے معاملے میں انہوں نے آپریشن کرایا اور اسپتال سے گھر آگئے۔ مگر ڈاکٹر نے انہیں متنبہ کر دیا تھا کہ اگر انہوں نے شراب کو ہاتھ لگایا تو زخم نہیں بھریں گے۔ اور وہ جلد ہی انتقال فرما جائیں گے۔ ڈاکٹر کے کہنے کا انہوں نے سنجیدگی سے اثر لیا اور پینا چھوڑ دی۔ جب بھی ملاقات ہوتی تو کہتے۔ "قرآن کی قسم چھوڑ چکا ہوں۔"

ان کی توبہ زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکی اس لیے کہ ان کے جسم میں جو امراض پل رہے تھے اس کی وجہ سے درد ہونے لگا تھا۔ جب نہیں پیتے تھے تو درد بڑھ جاتا تھا۔ گویا شراب ان کی لازمی غذا بن چکی تھی۔ پھر پینا شروع کی تو اس قدر شدت کے ساتھ کہ بالکل آؤٹ ہوجاتے تھے۔ بہکی بہکی باتیں کرنے لگتے تھے۔ جسم پر ورم ہوگیا تھا۔ اگر جسم پر کہیں انگلی سے دباؤ ڈال دیا جاتا تو گڑھا پڑ جاتا، جو کچھ وقت کے بعد ہی درست ہوتا۔ مجید کہتے تھے کہ دوست فکر نہ کریں اس لیے کہ اب وہ ربڑ کے بن چکے ہیں۔

اس کے بعد ان کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا۔ اس لیے کہ پینا انہوں نے نہیں چھوڑا تھا اور یہ احساس بھی ان کے دل میں جاگزیں ہوگیا تھا کہ اب وہ ختم ہونے والے ہیں۔ وہ پیتے جاتے تھے اور دھاڑیں مار کر روتے بھی جاتے تھے کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہیں گے۔ ان سے پہلے کے لوگ روانہ ہوچکے ہیں، لہٰذا اب ان کی باری ہے۔ شفیع سے کہتے تھے کہ اب تم لوگوں کا زمانہ آگیا ہے۔ تم زندہ رہو۔

ان کا آخری کالم کچھ اس طرح سے تھا۔

"میں انفلوئنزا کی لپیٹ میں آگیا ہوں۔ اس لیے نہیں چاہتا کہ اس حالت میں کالم لکھ کر جراثیم آپ تک پہنچاؤں۔"

کراچی ان دنوں اس وبا کی شکل میں پھیلا ہوا تھا۔ آخری روز انہوں نے اپنے کالم میں لکھا، جو ان کی وفات کے روز شائع ہوا۔ "آج دوسرا دن ہے۔"

پھر 26 جون کو ان کی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی۔ ان کے ملازم نے دوستوں اور غم خواروں کو ٹیلی فون پر اطلاع دی کہ اب وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوچکے ہیں۔ شفیع عقیل جب آٹو

رکشا میں ان کے گھر پہنچے تو وہ خالق حقیقی سے جا کر مل چکے تھے۔ انہیں یقین نہ آیا وہ یہ کہتے تھے کہ مجید کیسے مر سکتا ہے؟ کیا قہقہوں کو بھی موت آسکتی ہے؟ موت کے وقت ان کی پہلی بیوی ان کے سرہانے تھی۔

اپنی وفات سے کچھ قبل انہوں نے دو غزلیں کہی تھیں۔ پہلی یہ ہے۔

مان لیا میں بھول چکا ہوں وہ چاہت کا ڈھنگ چلو
لیکن یہ دوری بھی کیا، کچھ دور تو میرے سنگ چلو
سوہنی بھی بے چین ہے اب تک ہیر بھی بیکل پھرتی ہے
اور کہاں ہم جائیں گے، گجرات چلو یا جھنگ چلو

☆☆☆

دوسری غزل یہ تھی

ویرانے کیوں راس آئے ہیں ویرانوں کی بات کرو
فرزانوں کے ذکر کو چھوڑو، دیوانوں کی بات کرو
ہنستے ہنستے موت کے منہ میں جانا کتنا مشکل ہے
کتنے جیالے ہیں پروانے، پروانوں کی بات کرو

مجید نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی 1943ء میں دوسری ستمبر 1956ء میں۔

☆☆☆

اب تک آپ نے جو کچھ پڑھا وہ دوسروں کی رائے تھی۔ جس نے جیسا دیکھا بیان کر دیا۔ مگر وہ خود اپنے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

محمد طفیل مدیر نقوش نے کہا کہ میں آپ بیتی لکھوں۔ اس ضمن میں یہ عرض کرتا ہے کہ میں پیدا ہوگیا۔ اگر پیدا نہ ہوا ہوتا تو موجود نہ ہوتا۔ میری موجودگی اس بات کا ثبوت ہے۔ چنانچہ نہ تو میں آسمان سے گرا نہ زمین سے اگا۔ بالکل اس طرح سے پیدا ہوا جیسے حضرت آدم سے لے کر اب تک لوگ پیدا ہوتے چلے آئے ہیں اور اسی طرح سے مرجاؤں گا۔ اس جینے اور مرنے کے درمیان کیا ہے؟ اس کو اب تک میں خود نہ سمجھ سکا اور جب سمجھ لیا تو شاید وقت گزر جائے گا اور میں آپ کو نہ سمجھا سکوں گا۔ زندگی میں کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ ایک زمانے میں آرزو تھی کہ سرکاری ملازمت مل جائے۔ اب یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آزادی کی موت دے۔ ضمیر بہت مجروح ہوچکا ہے اور اب تو وہ قابلِ ملامت بھی نہیں رہا۔ شاعری میں نے اخبار کی خالی جگہ کو پُر کرنے کے لیے کی تھی۔ خبروں میں جہاں جگہ بچ جایا کرتی تھی وہ شعر لکھ دیا کرتا تھا۔ اب یہ گلے کا ہار ہوگئی ہے۔ صبح اٹھتا ہوں تو غریب بچوں کی طرح کالم منہ پھاڑے کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کا پیٹ بھرتا ہوں اور اس سے میرا پیٹ بھرتا ہے۔ دفتری نظام یہی ہے کہ تم مسل کا پیٹ بھروگے تو مسل تمہارا پیٹ بھرے گی۔

اوّل اوّل سنجیدہ شعر کہتا تھا۔ یہ جب کی بات ہے جب آتش جوان تھا۔ اس کے بعد "سیفٹی قوانین" کی عنایت سے اظہار خیال کے لیے طنز و مزاح کو اپنایا۔

"سیفٹی آرڈی نینس" کی کوئی لاکھ مخالفت کرے لیکن میں تو اسے "رحمت خداوندی" سمجھتا ہوں۔ سیفٹی آرڈی نینس کا یہ احسان کیا کم ہے کہ اس نے مجھے مزاح نگار بنا دیا۔ اوّل اوّل جب انگریز کا اقتدار تھا اور جب بات پر زباں کٹتی تھی۔ اس دور میں لکھنے والے قانون کی زد سے بچنے کے لیے طنز کا سہارا لیتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ جب ملک کی آزادی کی تحریک چلی اور اس کے ساتھ لوگوں نے جرات سے اجنبی راج کی لوٹ کھسوٹ اور ان کے مظالم کے خلاف آواز بلند کی

الیکشن کا زمانہ

اے ملت بیضا تیرا خادم ہوں پرانا
افسوس کہ تونے مرے رتبے کو نہ جانا
ہر کوہ کو ناپا ہے ہر اک دشت کو چھانا
انگریز نے لوہا میری چھترائی کا مانا
پھر خیر سے آیا ہے الیکشن کا زمانہ
میں خان بہادر ہوں مجھے بھول نہ جانا
عہدوں کا ہمیشہ ہی طلبگار رہا ہوں
کرسی کا بہرحال پرستار رہا ہوں
سب جانتے ہیں حامیٔ سرکار رہا ہوں
حاکم ہو کوئی اس کا وفادار رہا ہوں
پھر خیر سے آیا ہے الیکشن کا زمانہ
میں خان بہادر ہوں مجھے بھول نہ جانا
چندہ بھی دیا جنگ میں بھرتی بھی کرائی
دادا نے مرے کے پہ گولی بھی چلائی
اور باپ نے انگریز سے جاگیر بھی پائی
ہمت نے مری جیتی تھی جرمن کی لڑائی
پھر خیر سے آیا ہے الیکشن کا زمانہ
میں خان بہادر ہوں مجھے بھول نہ جانا

تو جو تلوار نیام میں تھی باہر نکل آئی۔ اس زمانے میں لوگوں نے بڑی بے باکی اور جرات سے تنقید شروع کی۔ اگرچہ اس راہ میں قید و بند کی صعوبتیں تھیں، ضمانتیں تھیں اور ضمانتوں کی ضبطیاں بھی تھیں لیکن پھر بھی جب تک آزادی کی یہ لڑائی جاری رہی لوگوں نے اس راہ سے ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹایا۔ اور وہ بڑھتے ہی گئے حتیٰ کہ ہم آزاد ہوئے۔ ملک دو حصوں میں تقسیم ہوا اور تقسیم کے فوراً بعد اب اپنا ملک بھی ہے اور راج بھی اپنا ہے۔ حکومت بھی اپنی ہے اور قوم بھی اپنی ہے۔ اس نے مجبور کیا ہے کہ اپنوں سے اپنوں کی طرح بات کی جائے۔ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ اصلاح بھی ہو اور تنقید بھی۔ گو تنقید میں وہ زہر نہ ہو جو اجنبی اقتدار کے دور میں ہوتا تھا۔ جہاں تک عام لوگوں کی جنہیں میں "رمضانی" کہتا ہوں، کی زندگی کا تعلق ہے ان کا معیار تقسیم کے بعد بھی اونچا نہ ہو سکا۔ پہلے غیر لوٹتے تھے اب اپنوں نے لوٹنا شروع کیا۔ دعویٰ یہ کیا گیا کہ پاکستان عام لوگوں کے لیے بنا ہے۔ گویا اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مٹھی بھر افراد نے زیادہ سے زیادہ دولت اپنی تجوریوں میں بھر لیں۔ اسمگلنگ میں، بازاری رشوت، ناجائز نفع غرض یہ کہ جو اخلاقی گراوٹ بھی ہو سکتی تھی اس کا مظاہرہ انہوں نے کیا۔ ظاہر ہے کہ اس کے خلاف آواز اٹھانا ایک لکھنے والے کا فرض ہے۔ اس طبقے نے حکمراں طبقے سے گٹھ جوڑ کر لیا ہے، لہٰذا ان پر تنقید کا مطلب حکومت پر تنقید سمجھا گیا۔ ان حالات میں معاشرے کی ان برائیوں اور طبقاتی تقسیم کی ان لعنتوں کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے بہترین حربہ میرے نزدیک طنز و مزاح کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ میں نے اسی کو اپنایا ہے۔

میرے نزدیک کامیاب طنز نگار وہ ہے جو اس انداز سے بات کہے کہ گویا اس نے بات کہی ہی نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ اس کا کمال یہ ہو کہ لوگ اس کے اشاروں کو سمجھیں اور مفہوم کو پا لیں جو وہ کہنا چاہتا ہے۔ طنز میں اگر نفرت اور بغض و عناد کی جھلک موجود ہو تو میں اسے طنز نہیں سمجھتا۔ کیونکہ طنز آلہ جراحی کا نام نہیں ہے بلکہ اس نشتر کا نام ہے جس سے [illegible] چبھن محسوس ہو۔ اور احساس بیدار ہو سکے۔ جو شخص اس فرق کو محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، میرے نزدیک وہ کامیاب طنز نگار ہے۔

میں سب سے زیادہ کنہیا لال کپور سے متاثر ہوا ہوں۔ اگرچہ طنز و مزاح میں جہاں تک فن کا تعلق ہے، میں رشید احمد صدیقی کو عظیم فنکار سمجھتا ہوں۔ لیکن ان کی اپروچ ایک محدود دائرے سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ ابراہیم جلیس کو میں اس لیے پسند کرتا ہوں کہ وہ بھرپور طنز کرتا ہے اور جہاں تک عوام کے مسائل اور ان کے دکھوں کا تعلق ہے ان سے الگ نہیں رہتا۔ وہ اس انداز سے سوچتا ہے جس انداز سے دکھی لوگ سوچ سکتے ہیں۔ شفیق الرحمٰن متوسط طبقے کی زندگی کی عکاسی کرتا ہے، وہ نہ آسمان پر ہے اور نہ زمین پر بلکہ ہوا میں معلق ہے۔ شوکت تھانوی کے متعلق میری رائے یہ ہے اگر وہ "سودیشی ریل" کے بعد کچھ نہ لکھتا تو یہ ادب پر بہت بڑا احسان ہوتا۔

اکبر (الہٰ آبادی) کو اپنا پیر و مرشد اور نظیر اکبر آبادی کو سب سے بڑا عوامی شاعر سمجھتا ہوں۔ صرف یہی ایک مسئلہ ہے جس میں مسلم لیگ اور عوامی لیگ دونوں متحد ہیں۔ اور اکبر اپنے مقام پر تنہا کھڑا ہے۔ الہٰ آباد اور اکبر آباد کے دوراہے پر امید و بیم لے آئی ہے۔ دعا کیجیے کہ "دیر و حرم" نہیں تو گھر کا راستہ مل جائے۔ اکبر کی خوبیاں یہ ہیں کہ وہ سلیس لکھتا ہے۔ نظیر کی طرح عوامی سطح پر لکھتا ہے۔ اگرچہ بعض جگہ وہ بالکل قدامت پسند ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے وہ ہمیں ہوائی جہاز سے گرا کر چھکڑے میں لے جانا چاہتا ہے۔ خصوصاً پردے کے بارے میں اکبر کے جو خیالات ہیں یا جہاں وہ جدید تعلیم سے نفرت پیدا کرتا ہے۔ اس سے مجھے اختلاف ہے۔ جہاں تک اسلوب نگارش، بندش الفاظ کے انتخاب اور حسن بیان کا تعلق ہے وہ اس میں یقیناً اپنے مقام پر تنہا نظر آتا ہے۔ بہت سے لوگوں نے اس کی تقلید کی لیکن وہ اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکے۔ حتیٰ کہ اقبال جیسا شاعر جو بلاشبہ اپنے دور کا عظیم فنکار ہے، جہاں تک اکبر کی تقلید کا تعلق ہے۔ اس میں وہ اکبر کے معیار تک نہ پہنچ سکا۔

جب سنجیدہ شعر کہتا تھا تو مولانا عبدالمجید سالک سے اصلاح لیتا تھا۔ مزاح میں میرے استاد انعام الحق قدسی ہیں، جنہیں لسان العصر اکبر الہٰ آبادی سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ مولانا عبدالباری آسی لکھنوی مرحوم نے مولانا انعام الحق کا تذکرہ **"خندۂ گل" میں تفصیل سے کیا ہے۔**

☆☆☆

مجید لاہوری لطیفے باز تھے، مزاح نگار تھے اور شاعری بھی کرتے تھے۔ ان کا مزاح عوامی سطح کا تھا۔ لوگ ان کا نام پڑھ کر اخبار خریدتے تھے۔ پھر کالم پڑھ کر محظوظ ہوتے تھے۔ کالم نویسی آسان کام ہے، لیکن اس کے ذریعے خود کو

منوانا آسان نہیں ہے۔ مجید کے کردار عوامی تھے، چنانچہ عوام نے انہیں پسندیدگی کی سند عطا کی۔ بعض اوقات کردار اپنے خالق پر بازی لے جاتا ہے۔ سند باد، ٹارزن، جیمز بانڈ، رستم و سہراب، چچا چھکن، خوجی، قاضی جی اور حاتم طائی، مرزا وودو بیگ ہماری کہانیوں میں رچے بسے ہوئے ہیں، لیکن بہت سے کرداروں کے خالقوں کے نام تک سے ہم واقف نہیں۔

کردار تخلیق کرنے کا مقصد و منتہا یہ ہے کہ وہ بات جو مصنف براہ راست نہ کہہ سکے۔ اپنے کرداروں کے ذریعے کہہ دے۔ ہر مصنف کا مقصد تحریر یہ ہوتا ہے کہ وہ معاشرے کی اصلاح چاہتا ہے۔ لوگوں کو شر سے خیر کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ خیر و شر کی جنگ برسوں سے جاری ہے اور غالباً جاری رہے گی۔

مجید نے بھی کردار تخلیق کیے تھے، جن میں رمضانی سے مقبول کردار تھا۔ وہ محنت کش طبقے کا نمائندہ تھا۔ سبزی فروش، ٹھیلا لگانے والے، مستری یا بوٹ پالش کرنے والے۔ یہ طبقہ محنت کرتا ہے اور محنت کرتے کرتے مر جاتا ہے لیکن اس کے حالات نہیں بدلتے۔ وہ محنت کر کے محل تعمیر کر دیتا ہے لیکن خود جھونپڑی میں رہتا ہے۔ رمضانی لوگوں کو آسائش فراہم کرتا تھا لیکن خود بنیادی سہولتوں سے محروم تھا۔ مجید نے اپنے اس کردار کی خود ایک جگہ تشریح یوں کی ہے۔ "عام آدمی ہے، جسے آپ سڑک چھاپ، یا کامن مین کہہ سکتے ہیں۔ یہ محنت کرتا، مشقت کرتا، اپنا خون پسینا ایک کرتا ہے۔ اس کی محنت سے سرمایہ دار عیش کرتے ہیں۔ اس کے بچے ننگے، بھوکے اور جاہل رہتے ہیں۔ اس کی تصویریں اخباروں میں نہیں آتیں، یہ پارٹیوں میں نہیں جاتا، کاروں میں نہیں گھومتا۔ یہ تمام زندگی روٹی کے حصول کے لیے گھومتا رہتا ہے اور گھومتے گھومتے مر جاتا ہے۔"

دوسرا کردار مولوی گل شیر ہے جو ان کے بقول۔ "یہ جاگیرداری کے حق میں فتوے جاری کرتا ہے۔ یہ مذہب کی آڑ لے کر اپنا حلوا مانڈہ سیدھا کرتا ہے۔ یہ اوپر کے طبقے کی دلالی کرتا ہے۔ اسے آپ مقدس دلال بھی کہہ سکتے ہیں۔"

مجید کا تیسرا کردار سائیں سلیمان بادشاہ ہے۔ ایسا کردار ہے جو کہتا ہے اور کہے چلا جاتا ہے اور خود کسی کی نہیں سنتا۔ اس کے بارے میں مجید نے یوں وضاحت کی ہے۔ "یہ فراری کردار ہے۔ زندگی سے کوسوں دور بھاگتا ہے۔ اس کا [illegible] ہے۔

یہ دنیا آنی جانی ہے...... یہ دنیا رام کہانی ہے

یہ ہر چیز کو دیکھتا ہے اور کہتا ہے کہ جو کچھ نظر آتا ہے، وہ بظاہر تو ہے، لیکن حقیقت میں نہیں ہے۔ یہ چرس کا دم لگا کر دنیا سے الگ ہو جاتا ہے۔ اسے جدوجہد سے ازلی بیر ہے۔ یہ پیدا ہوتا ہے اور مر جاتا ہے۔ یہ قناعت و صبر کو جز و ایمان سمجھتا ہے اور کہتا ہے۔ "اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

مجید کا ایک اور کردار سیٹھ ٹائر جی ٹیوب جی بہت مشہور ہوا۔ اس کی مقبولیت اس کے عجیب نام کی وجہ سے تھی۔ یہ سرمایہ داروں کا نمائندہ ہے۔ اس کے بارے میں مجید نے یوں وضاحت کی ہے۔ "لوگ چاہے بھوکے مریں، تباہ ہوں۔ ملک بھاڑ میں جائے۔ قوم جہنم میں جائے۔ لیکن دنیا بھر کی وراثت اس کی جیب میں آ جائے۔ ٹائر جی ٹیوب جی اسی طبقے کی نمائندگی کرتا ہے، جو بلیک مارکیٹ اور اسمگلنگ کرتے ہیں۔ اور جن کی زندگی کا مقصد دولت حاصل کرنا ہے۔ اس کی ٹانگیں پتلی اور پیٹ پھولا ہوا ہے۔"

اس کے علاوہ بینک بیلنس جی، تجوری بھائی، جو امیر طبقے کی نمائندگی کرتا تھا۔ بندو، جمن شاہ برساتی اور شیخ حماد اللہ تھے جو زیادہ مقبول نہ ہو سکے۔

مجید لاہوری سارے مزاح نگاروں مثلاً پطرس بخاری، شوکت تھانوی، ابراہیم جلیس، رشید احمد صدیقی اور چراغ حسن حسرت وغیرہ میں شامل ہو کر بھی ان سب سے علیحدہ نظر آتے ہیں۔ ان کا لہجہ منفرد ہے۔ ان کا راستہ جدا ہے۔ شیریں بیانی، ہلکا طنز، سلیس اور چھوٹے جملے اور ہلکا پھلکا انداز، جو پڑھنے والوں کے دل میں آسانی سے اتر جاتا ہے۔ وہ زبان ہمیشہ درست لکھتے تھے۔ "حرف و حکایت" کا انداز سادہ اور دلکش تھا کہ خاص و عام چٹخارے لے کر پڑھتے تھے۔

اپنی مزاح نگاری کے بارے میں وہ خود کہتے تھے۔ "میرے نزدیک مزاح وہ ہے جس میں ابتذال نہ ہو یعنی گراوٹ کی کوئی بات نہ ہو۔ سائیکل چلانے والی بات ہے۔ یہ معاملہ مصروف ٹریفک سے زیادہ الجھا ہوا ہے۔ یوں سمجھیے کہ ایک طرف کھڈا ہے دوسری طرف کھائی۔ ان کے بیچوں بیچ ایک پگڈنڈی پر سائیکل چلانا ہے۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں ایک بار بھی گرا نہیں۔ کیونکہ تقاضۂ بشریت بھی ساتھ ہے۔ اگرچہ فحاشی آج کل آرٹ کا دوسرا نام ہے۔ لیکن اس سلسلے میں آپ مجھے قدامت پسندی کی گالی دے کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیجیے۔

میں جو کچھ دیکھتا ہوں، لکھتا ہوں اور جس طرح بولتا

ہوں اسی طرح لکھتا ہوں۔ کسی تکلف، کسی بناوٹ، کسی تصنع سے کام نہیں لیتا۔ کیونکہ میری تحریروں میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ میرا نہیں بلکہ ماحول کا ہوتا ہے۔ ماحول سے جو کچھ لیتا ہوں۔ اسے واپس کردیتا ہوں۔

ایک دوست نے کہا۔ ''یوں لکھتے لکھتے تمام موضوع ختم ہوجائیں گے۔ پھر تم کس پر لکھو گے؟'' میں نے کہا۔ ''میرے بھائی میرا موضوع زندگی ہے۔ میرے اردگرد اتنی چیزیں ہیں جو کہتی ہیں مجھے بھی لکھ لو۔ مگر میں کہتا ہوں تمہاری باری بھی آئے گی۔ مگر اطمینان سے کیو میں کھڑی رہو۔ بہت سی چیزیں ایک دوسرے کو دھکیلتی ہوئی بالکل اسی طرح جیسے بس میں سوار ہوتے ہیں، میری طرف بڑھتی ہیں اور میرے دماغ پر سوار ہوجاتی ہیں۔ کبھی تو میں انہیں معاف کردیتا ہوں۔ کبھی بس کے کنڈکٹر کی طرح انہیں ذہن سے اتار دیتا ہوں۔''

اگر مجید کے اچھے کالموں کا انتخاب کیا جائے تو شاید وہ کئی جلدوں پر محیط ہو۔ کیونکہ انہوں نے لکھا بہت ہے۔ مگر وہ ہمیشہ یاد رکھے جانے والے کالم ہیں۔ ان کا ایک نمائندہ کالم پیش خدمت ہے۔ جس کا عنوان ہے۔ ''استرے کے سائے میں''۔ یہ 6 جنوری 1956ء میں جنگ میں طبع ہوا۔

میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ چاہے ادھر کی دنیا اُدھر ہوجائے میں کسی ہیئر کٹنگ سیلون میں شیو نہیں بنواؤں گا۔ البتہ بال ترشوانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اگرچہ میں ہمیشہ غسل خانے میں گنگناتا رہا ہوں۔ جی ہاں اقبال کا یہ شعر میں نے اکثر غسل خانے میں گنگنایا ہے۔

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے
خنجر ہلال کا ہے، قومی نشاں ہمارا

لیکن عملی طور پر ایسا نہیں ہوا۔ یہ تیغ کا سایہ ہے۔ مجھ میں استرے کے سائے میں بھی جواں ہونے کی ہمت نہیں۔ اپنی کمزوری کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب میں ایک ہیئر کٹنگ سیلون میں شیو بنوا رہا تھا۔ باربر نے صابن کے جھاگ کی تہ جمائی اور کہنے لگا۔ ''بابو جی جماعت اسلامی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ارے بھئی ہم تو داڑھی منڈے ٹھہرے۔ ہم کیا جواب دیں۔''

پھر اس نے خود ہی کہا۔ ''صاحب ہم اس کے حامی نہیں ہیں۔ سب سے زیادہ آمدنی ہمیں شیو بنانے سے ہوتی ہے۔ یہ ہماری روٹی کا سوال ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں بھئی تم ٹھیک کہتے ہو۔''

یہاں تک تو خیریت تھی کیونکہ ابھی صابن جھاگ پھیر رہا تھا، برش پوری رفتار سے چل رہا تھا۔ جھاگ کی تہ جم رہی تھی۔ اب باربر نے استرا تیز کرنا شروع کیا۔ یہ مرحلہ بھی خیر و عافیت سے طے ہوگیا۔ باربر نے کہا۔ ''ذرا ٹھیک سے بیٹھیے۔'' میں ٹھیک سے بیٹھ گیا۔ اب استرا چلنے لگا۔ باربر نے کہا۔ ''بابو جی ذرا گردن جھکایئے۔''

میں نے کہا۔ ''اے میرے پیارے باربر کون ہے جو تیرے سامنے گردن جھکانے سے انکار کردے؟ بڑے بڑے لوگ جن کی گردن شاید خدا کے آگے بھی نہیں جھکی تیرے سامنے جھکتے ہیں۔ اے میرے پیارے باربر تیرے حکم کے سامنے سر تسلیم خم ہے۔''

یہ کہہ کر میں نے گردن جھکالی۔ استرا چلتا رہا۔ میری گردن جھکی تو باربر کی گردن خوشی سے تن گئی۔ خیر یہ مرحلہ بھی خیریت سے گزر گیا۔ میں آئینے کی طرف دیکھ رہا تھا باربر نے کہا۔ ''بابو جی کون سی اچھی پکچر چل رہی ہے، آج کل؟''

میں نے جواب دیا۔ ''بھائی میں سنیما کم دیکھتا ہوں۔ اور یہ میرا اصول ہے کہ ایک وقت میں ایک گناہ کروں۔ مولوی گلشیر خان نے کہا ہے کہ سنیما دیکھنا گناہ ہے۔ پیر علی محمد راشدی نے کہا ہے کہ اخلاق بگڑتا ہے عریاں تصویریں دیکھ کر۔ خیر میں مانتا ہوں کہ یہ گناہ ہے۔ لیکن میرے خیال میں پیسے خرچ کر کے سنیما دیکھنا گناہ کبیرہ ہے۔ ایک تو سنیما دیکھنے کا گناہ۔ دوسرے اسراف کا گناہ۔ اس لیے اگر پاس مل جائے تو میں ایک گناہ کرلیتا ہوں۔ دوسرے گناہ یعنی اسراف کا مرتکب نہیں ہوتا۔''

باربر نے کہا۔ ''چلیے آپ نے سنیما نہیں دیکھا، مگر سنا تو ہوگا کہ کون سی اچھی پکچر چل رہی ہے۔''

''دیکھو بھائی سب سے اچھی پکچر کراچی کارپوریشن میں چل رہی ہے، جس کا نام ہے۔ ون یونٹ اسمبلی الیکشن عرف کالی منڈی۔ یہاں ہر دوسرا سٹی فادر امیدوار ہے۔ بہرحال دیکھیے اونٹ کے وزن پر یونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اب تو لوگ...... اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی کے بجائے یونٹ رے یونٹ تیری کون سی کل سیدھی کہہ رہے ہیں۔ اچھی پکچر تو بس یہی ہے۔ اور ایک جگہ نہیں بلکہ ایک ساتھ کئی جگہوں پر اس کا نام ہے۔

مسلم لیگ۔ چیونٹیوں بھرا کباب سنا ہے کہ اس پکچر میں جان نکالنے والے جان ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگرچہ جان ڈالنا خدا کا کام ہے مگر انسان بھی ترقی کررہا ہے۔''

اب استرا میرے گلے پر آگیا تھا۔ باربر نے کہا۔ ''بابو جی آپ مسلم لیگ کے حامی ہیں یا عوامی لیگ کے؟''

میں نے کہا۔ ''اے پیارے باربر۔ پیشتر اس کے کہ میں اس سوال کا جواب دوں تو خدا کے لیے استرا میری گردن سے ہٹا لے۔ تیرے اس سیفٹی ایکٹ کی موجودگی میں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔''

باربر نے گلے سے استرا ہٹا لیا تو میں نے کہا۔ ''پیارے باربر تم ان دونوں میں سے کس کے ساتھ ہو؟''

''اجی ہم تو اس کے ساتھ ہیں جو ہمارا بھلا کرے۔'' باربر نے جواب دیا۔ ''ہر کوئی اپنا بھلا کرتا ہے، دوسرے کی بھلائی کی بات نہیں کرتا۔ ایمان کی بات ہے، ہم کسی کے ساتھ نہیں۔ صرف اس کے ساتھ ہیں جو ہمارا بھلا کرے۔''

''میرے پیارے باربر تو بالکل ٹھیک کہتا ہے۔ رمضانی کا بھی یہی خیال ہے۔''

وہ استرا پھر پھیرنے لگا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے پھر گلے پر استرا رکھ کر مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اب میں ڈر گیا ہوں۔ اب میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ چاہے ادھر کی دنیا اُدھر ہوجائے میں کسی ہیئر کٹنگ سیلون سے شیو نہیں بنواؤں گا۔ اب میں شیو کا سامان خرید لایا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی میرے گلے پر استرا رکھ کر میری رائے پوچھے۔ میں جانتا ہوں کہ اختلاف رائے کی صورت میں استرے سے گلا کٹ سکتا ہے۔ یہ میری کمزوری ہے اور اس کا مجھے اعتراف ہے۔ میں اب بھی غسل خانے میں گنگناتا ہوں۔

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
لیکن صاحب۔ میں استرے کے سائے سے پناہ مانگتا ہوں

دوسرا کالم

یہ کالم 25 نومبر 1956ء کے جنگ میں شائع ہوا۔ اس کا عنوان تھا۔ دور کی کوڑی۔

میں سوچ رہا تھا کہ سات آٹھ روز سے رمضانی بالکل چپ ہے۔ اس سے پہلے جب وہ آتا تھا پہروں باتیں کرتا تھا۔ آخر آج میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔ ''کیا بات ہے رمضانی ہفتہ بھر سے تم خاموش ہو۔ کیا تم نے گونگے کا گڑ کھالیا ہے یا چپ شاہ کا روزہ رکھ لیا ہے۔''

رمضانی نے کہا۔ ''نہیں، بابو جی، یہ بات نہیں۔ بات

اصل میں یہ ہے کہ اب میں سوچ رہا ہوں۔ اس سے پہلے جب سوچتا نہیں تھا تو بغیر سوچے سمجھے جو کچھ ذہن میں آتا تھا کہہ دیتا تھا۔ مجھے سوچنے کے بعد معلوم ہوا ہے کہ جو لوگ سوچتے ہیں وہ کم بولتے ہیں اور جو نہیں سوچتے وہ بولتے ہیں اور بے تکان بولتے ہیں۔

میں نے کہا۔ "رمضانی یہ تجھے سوچنے کی کیا سوجھی؟ سوچنے والے سوچتے رہیں گے تو کیوں مفت میں ہلکان ہوتا ہے؟ سوچنے سے پریشانی ہوتی ہے۔ وسوسے بڑھتے ہیں سر چکرانے لگتا ہے۔ دل ڈوبنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی دن میں تارے بھی نظر آتے ہیں۔ یہ بہت بری بات ہے۔ جب بے سوچے سمجھے بھی کام چلتا ہے تو ناحق پریشان ہونے کی ضرورت ہے۔"

رمضانی نے کہا۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں بابو جی۔ واقعی سوچنے سے پریشانی ہوتی ہے۔ جب سے سوچنے کی مشق کر رہا ہوں۔ کئی بار کھوپڑی چٹخ چٹخ گئی ہے۔ کئی بار محسوس ہوا ہے دماغ کی چولیں ڈھیلی ہو رہی ہوں۔ کبھی کبھی مجھے سائے رقص کرتے نظر آتے ہیں۔ کانوں میں یوں آوازیں گونجتی ہیں جیسے سیدھا بندر روڈ پر کار، ٹرک، اونٹ گاڑی، موٹر گاڑی، موٹر سائیکل رکشا، گدھا گاڑی اور سائیکل کی ایک ساتھ ٹکر ہوگئی ہے۔ ان سب کے ٹکرانے سے جو آوازیں پیدا ہوتی ہیں بس ویسی ہی آوازیں میرے کانوں میں گونجتی ہیں۔ جتنا سوچتا ہوں، اتنا ہی پریشان ہوتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں جب کام دھندا چالو تھا۔ میں خود کو مصروف رکھتا تھا۔ اتنا مصروف کہ سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی۔ اس لیے کبھی سوچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔ لیکن جب سے کام دھندا چوپٹ ہوگیا ہے، وقت گزارنے کا بھی یہی مشغلہ ہے کہ سوچا جائے اور مسلسل سوچا جائے۔ پہلے وقت آپ سے آپ کٹ جاتا تھا۔ اب سوچتا ہوں اور وقت کاٹتا ہوں۔ حتی کہ نیند میں بھی سوچنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں جاگ رہا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "رمضانی تم جانتے ہو کہ بیکار دماغ شیطان کا کارخانہ ہوتا ہے۔ مجھے یہ سن کر تشویش ہوئی کہ تم بھی سوچنے لگے ہو خدا جانے تم کیا سوچتے ہو۔ اور دیکھو بھائی یہ سوچنے ووچنے کا کام ہمارا نہیں۔ یہ ان لوگوں کا کام ہے جو ہمارے لیے سوچتے ہیں اور وہ بنی بنائی کے وزن پر سوچی سوچائی چیزیں ہمیں دیتے ہیں۔ ہمارا تمہارا سوچنا فضول ہے۔ اور پھر اگر ہم سوچیں بھی تو کیا کرسکتے ہیں؟ جب کر نہیں سکتے سوچنا بھی بے معنی ہے۔ اس لیے خدا کو مانو اور سوچنا چھوڑ دو۔ ورنہ اس جرم میں دھر لیے جاؤ گے اور اخباروں میں خبر چھپے گی کہ حسن علی آفندی روڈ پر فٹ پاتھ نمبر دو پر ایک آدمی کو گرفتار کرلیا گیا۔ معلوم ہوا ہے کہ وہ سرعام گھٹنوں میں سر دے کر سوچ رہا تھا۔"

گفتگو بہت طویل ہوچکی تھی۔ میں نے سوچا کہ اب اس سلسلے کو کچھ مختصر کردیا جائے۔ اور رمضانی سے پوچھا جائے کہ اس نے کیا سوچا؟ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔ "دیکھو بھائی، اب مجھے لکھنا ہے۔ وقت بہت ہوچکا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ آٹھ دن میں آخر تم نے کیا سوچا؟"

رمضانی نے کہا۔ "بابو جی آٹھ دنوں میں یقین کیجیے، مسلسل سوچا۔ ٹرام میں بیٹھ کر، بس میں بیٹھ کر، ہوٹل میں بیٹھ کر، فٹ پاتھ پر بیٹھ کر، کیٹی جیٹی کے پل پر بیٹھ کر، حتی کہ بیت الخلا میں بیٹھ کر میں نے سوچا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ دنیا فانی ہے۔"

میں نے کہا۔ "ارے بھائی! اتنی سی بات سوچنے کے لیے تم نے اپنی زندگی کے آٹھ دن ضائع کردیے۔ یہ بات لوگ برسوں سے کہہ رہے ہیں۔"

رمضانی نے کہا۔ "بابو جی بہت ہی افسوس ہے کہ آپ نے میری محنت کی داد نہیں دی۔ اور سب کیا دھرا خاک میں ملا دیا۔ کم از کم یہ تو سوچیے، جو بات لوگوں نے برسوں میں سوچی وہ میں نے آٹھ دن میں سوچ لی۔ اور یہ بات آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ یہ الہامی طور پر میرے ذہن میں آئی۔ میں نے یوں محسوس کیا جیسے کوئی سفید پوش بزرگ سبز کپڑے پہن کر اور ہاتھ میں عصا تھامے میرے سامنے آیا ہے اور کہہ رہا ہے۔ "ارے رمضانی! یہ دنیا فانی ہے۔" اسی وقت میں نے کہہ دیا۔ "یہ دنیا فانی ہے۔" یعنی

یہ دولت آنی جانی ہے
یہ دنیا رام کہانی ہے

میں نے اس وقت کہا کہ جمعہ بلوچ پان والے کی دکان پر لکھا ہے۔

"یہ دنیا فانی ہے اور رہے نام اللہ کا۔"

میں واقعی رمضانی کا قائل ہوگیا کہ وہ آٹھ دن تک سوچنے کے بعد کتنی دور کی کوڑی لایا۔ میرا خیال ہے کہ اس نے وقت ضائع نہیں کیا۔

☆☆☆

جنگ کے لیے روزانہ کالم لکھنے اور نمکدان کے لیے

پندرہ روز بعد کالم لکھنے کے علاوہ جنگ کے سنڈے ایڈیشن کے لیے کوئی نظم بھی لکھتے تھے۔ اس کے بعد وقت ہی نہیں بچتا تھا۔ نمکدان کے لیے اداریہ بھی لکھنا پڑتا تھا اور ایک مضمون بھی۔ جب پرچا چل پڑا تو انہوں نے مضمون سے جان چھڑالی اور جنگ کی پرانی نظم چھاپنا شروع کردی۔ اسی زمانے کا ایک مضمون پڑھیے۔ اس کا عنوان تھا۔ "یہ گدھے۔" یہ مضمون انہوں نے 1949ء میں لکھا تھا۔

گدھا حضرت عیسیٰ کا ہو یا غریب کمہار کا۔ گدھا بہرحال گدھا ہے۔ مار کھاتا اور آگے بڑھنا اس کا کام ہے۔ گدھا اگر "ترقی پسند" ہوتا تو علم بغاوت بلند کرتا اور اس کی ذمے داریوں کا بوجھ بھی انسان کے کاندھوں پر پڑتا اور انسان یہ بوجھ چپکے سے "سائنس" کے کاندھوں پر ڈال دیتا۔ لیکن سائنس ترقی پسند ہے۔ یہ ٹرک منوں بوجھ اٹھاتے ہیں مگر پیٹرول نہ ہو تو ایک قدم آگے نہیں بڑھتے۔ گدھا بھوکا پیاسا رہتا ہے، اس کے باوجود چلتا رہتا ہے۔ کبھی یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ میری گھاس میں اضافہ کرو۔ اگر کسی کے بہکانے سے وہ کسی وقت احتجاج بلند کرے۔ یعنی ڈھینچوں ڈھینچوں کے قومی ترانے سے اسٹرائیک کا آغاز کرے تو چند لاٹھیاں اسے کام کرنے پر مجبور کردیتی ہیں۔ یہ مار کھاتا اور کام کرتا ہے۔ کس قدر "وفادار" ہے۔

گدھا بیمار ہو یا زخمی، تھکا ہارا ہو یا بوجھ تلے دبا ہوا۔ جب تک اس میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی سکت اور آپ کے ہاتھ میں لاٹھی ہے، آپ اسے ہنکائے لیے چلے جائیے۔ وہ ایک لفظ بھی آپ کے خلاف نہیں کہے گا۔ بڑھتا چلا جائے گا۔

گدھوں میں رنگ یا نسل کا فرق نہیں۔ ان میں گورے کالے کی بھی تمیز نہیں۔ سب گدھے بھائی بھائی ہوتے ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں بڑے بڑے انقلاب آئے، مگر گدھے کی فطرت میں کوئی انقلاب نہیں آیا۔ وہ اس وقت بھی گدھا تھا جب حضرت آدم کو جنت سے نکالا گیا تھا اور آج بھی گدھا ہے۔

یوں تو ہر جگہ گدھوں نے بڑے بڑے کام کیے ہیں لیکن کراچی کی تعمیر ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ یہ بڑی بڑی عمارتیں، یہ لمبی لمبی سڑکیں، پہلے کہاں تھیں؟ ماہی گیروں کی چھوٹی سی بستی بڑھتے بڑھتے، پھیلتے پھیلتے بہت بڑا شہر بن گئی۔ گدھے باہر سے ریت لاتے رہے۔ سیمنٹ، بجری، چونا اور اینٹ گارا پہنچاتے رہے۔ اور دیکھتے دیکھتے یہ دنیا کا سب سے بڑا شہر بن گیا۔ پہاڑوں کے تنگ و پُر پیچ راستے جہاں کوئی ٹرک نہیں جاسکتا، وہاں گدھا ہی پہنچ سکتا ہے۔ گدھے کے ساتھ گاڑی نے تو سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ اس طرح ایک گدھا چار گدھوں کا بوجھ اٹھانے لگا۔ وہ کام جو گاڑی کے بغیر پورے ڈیڑھ سو برس میں ختم ہوتا پچاس برس میں ختم ہوگیا۔ قوموں کی زندگی میں پچاس برس ایک لمحے کے برابر ہیں۔ یوں سمجھیے کہ پلک جھپکتے میں یہ سب کچھ ہوگیا جو وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا۔

سائنس بھی اتنا کمال نہیں کرسکتی جو اس گدھا گاڑی نے انجام دیا ہے۔ جسے آپ کراچی کے ہر موڑ پر دیکھ سکتے ہیں۔

یہ گدھا گاڑی آپ کو کسی اور شہر میں نہیں مل سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان شہروں نے بڑی دیر میں ترقی کی، کیونکہ وہاں گدھے بغیر گاڑی کے بوجھ اٹھاتے ہیں۔ پنجاب میں تو بیل گاڑیوں سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں ترقی کی رفتار بہت سست رہی۔ لاہور کی تعمیر انگریزوں کے زمانے میں شروع ہوئی۔ اور آج تک ختم ہونے میں نہیں آئی۔ اگر وہ گدھا گاڑی بنالیتے تو لاہور کو نیویارک بناسکتے تھے۔

دنیا کے کسی ترقی یافتہ ملک میں آپ کو گدھا گاڑیاں نظر نہیں آئیں گی۔ گدھے نے اگر تاریخ میں کوئی ترقی کی ہے تو وہ یہی ہے کہ کراچی والوں نے اسے گاڑیوں میں استعمال کیا اور ایک گدھے نے چار گدھوں کا بوجھ اٹھایا۔ ایک آدمی جس کام کو پچاس دن میں کرتا ہے۔ چار آدمی یقیناً کم دنوں میں کریں گے۔

گھوڑے اس سے پہلے بہت مغرور تھے۔ انہیں گھمنڈ تھا کہ وہ شرکت غیر ایک گاڑی کے مالک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بڑی راہ روی سے سڑکوں پر چلتے تھے۔ وہ گدھے کو دیکھ کر فخر سے سر اونچا کرلیتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ کوئی نہ کوئی راہگیر (آج کی اصطلاح میں پناہ گیر) گاڑی کے نیچے آجاتا تھا۔

لیکن گدھے میں نام کو غرور نہیں۔ وہ اس وقت بھی گدھا تھا جب گاڑی کا دم چھلا اس کے ساتھ نہیں لگا تھا اور آج بھی ویسا ہی گدھا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ وہ بڑا آدمی ہو کر بد دماغ نہیں ہوا اور نہ وہ بھی گھوڑے کی طرح بدنام ہوجاتا اور آئے دن تصادم ہوتے رہتے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آج تک کوئی شخص گدھا گاڑی کے نیچے آکر نہیں مرا۔ اس کی وجہ گدھے کی "سلامت روی" ہے۔

کار جب سڑک پر سے گزرتی ہے تو چلنے والوں پر بڑی بدتمیزی سے خاک دھول اڑاتی ہے۔ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ اور کہتی ہے کہ یہ سب میرے سامنے گرد ہیں۔ لیکن گدھا

گاڑی نے کبھی ایسی بدتمیزی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ انسان کو ہمیشہ انسان سمجھتی رہی۔ آپ ایک بھی ایسی مثال پیش نہیں کر سکتے جب گدھا گاڑی نے سڑک پر دھول اڑائی ہو۔ ٹرام کا انجن فیل ہوجائے تو وہ کراچی کی زبان میں ”کھٹارا“ ہے۔ کار کا پیٹرول ختم ہوجائے تو وہ ”بے کار“ ہے۔ ریل کے انجن کا کوئلا ختم ہوجائے تو گدھا گاڑی سے بھی زیادہ ذلیل سواری ہے۔ یہ گدھا گاڑی ہے جو ہر حالت میں چلتی ہے۔ سچ کہتے ہیں۔ چلتی کا نام گاڑی ہے۔

گدھا گاڑی میں عموماً دو گدھے ہوتے ہیں۔ ایک تو اصلی گدھا ہوتا ہے، جو گاڑی کو کھینچتا ہے۔ دوسرا شخص ”گدھا“ ہوتا ہے۔ یہ اصلی گدھے کے ساتھ دوڑتا ہے۔ پہلے تو ہم سمجھے کہ گاڑی میں ایک گدھا کافی ہے۔ دوسرے کو یار لوگ یوں ہی ”دیخ“ لگاتے ہیں۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ دوسرا گدھا، تربیت اور تعلیم کے لیے گاڑی سے بندھا رہتا ہے۔ تین سال تک یہ تعلیم حاصل کرتا ہے اور پھر اعلا تعلیمی ڈگری لے کر اپنی گاڑی آپ چلاتا ہے۔ اور ایک نئے شاگرد پیشہ کی تعلیم وتربیت میں منہمک ہوجاتا ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ اگر پڑھا لکھا شخص ایک ایک جاہل کو اسی طرح پڑھاتا تو ہمارے ملک میں آج تعلیم عام ہوجاتی اور لوگ بجائے انگوٹھا لگانے کے راشن کارڈ کی درخواست پر دستخط کرتے۔

بہرحال گدھا نمبر دو محض گدھا رہتا ہے۔ دوسرے سال وہ پچاس فیصد گدھا بن جاتا ہے۔ یعنی اگر کسی موڑ پر دائیں یا بائیں مڑنا ہو تو ہینڈل کا کام دیتا ہے۔ اور کبھی کبھی وہ بریک کی جگہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ دو سال میں وہ بی اے یعنی BIG-ASS بن جاتا ہے۔ پھر وہ ایم اے پاس کرتا ہے۔ اور کبھی کبھی اصل گدھے کی جگہ لیتا ہے۔ اس کے بعد وہ گدھا نمبر ون یعنی مکمل گدھا بن جاتا ہے۔ اور زندگی کی دوڑ میں حصہ لیتا ہے۔ کام کرتا ہے۔ مار کھاتا ہے۔ مگر بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جب تک موت کی منزل نہیں آتی۔

ہندوستان اور پاکستان آزاد ہوگئے۔ لیکن گدھے اب تک غلام ہیں۔ وہ ہمیشہ غلام رہے۔ وہ ہمیشہ غلام رہیں گے۔ ”جشن آزادی“ کے بعد بھی یہ گدھے اسی طرح بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں، جس طرح کل اٹھائے پھرتے تھے۔

یہ گدھے جو کل بھی گدھے تھے اور آج بھی گدھے ہیں کہتے ہیں کہ ہم اس وقت بیدار ہوں گے جب دجال گدھے پر سوار ہوکر آئے گا۔ یہ گدھے کسی کے منتظر ہیں، لیکن بیدار ہوکر یہ گدھے نہیں رہیں گے، بلکہ انسان بن جائیں گے۔

☆☆☆

مجید لاہوری ہر پندرہ روز بعد ریڈیو پاکستان کراچی سے ”وغیرہ وغیرہ“ کے عنوان سے تقریر نشر کیا کرتے تھے۔ چونکہ یہ تقریریں ریڈیو کے لیے ہوتی تھیں اس لیے ان میں مجید کی مرضی کم اور ریڈیو کی پالیسی کو زیادہ دخل ہوتا تھا۔ بہرحال مجید اس میں بھی نوکدار اور چبھتی ہوئی باتیں کہہ جاتے تھے۔ ان تقریروں میں ان کا موضوع عوام اور ان کے مسائل ہوا کرتے تھے۔ وہ اپنے اخباری کرداروں کی آڑ لے کر لوگوں سے باتیں کیا کرتے تھے۔ یعنی رمضانی، گل شیر خان اور سائیں سلیمان بادشاہ وغیرہ۔ یہ انداز ایسا تھا کہ اس میں وہ براہ راست باتیں کرنے کے بجائے ان کی زبان سے کہتے تھے۔

وہ طنزو مزاح نگار بھی تھے۔ اپنی نظموں میں انہوں نے خوب جولانیاں دکھائی ہیں۔ اردو نظموں میں طنزو مزاح کافی قدیم ہے۔ البتہ اس کا کوئی مقصد نہیں ہوتا تھا۔ دوستوں کی محفل میں کلام سنا دیا اور داد وصول کر لی۔ طنزو مزاح پھر ہجو میں تبدیل ہوگئی۔ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالی جانے لگی۔ اس میں مصحفی، انشا اور سودا جیسے شعرا کے نام آتے ہیں۔

اردو شاعری میں اکبر الٰہ آبادی وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے شعوری طور پر مزاحیہ شاعری کی ہے اور اس سے تعمیری کام لینے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اس کے صحت مندانہ پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ بعد میں اقبال اور ظفر علی خان نے بھی اس میدان میں قدم رکھا لیکن جلد ہی پیچھے ہٹ گئے، اس لیے کہ ان کا مطمع نظر کچھ اور تھا۔

اس کے بعد کے دور میں مجید لاہوری کے علاوہ حاجی لق لق، ظریف جبلپوری، ضمیر جعفری اور مرزا محمد سرحدی شامل ہیں۔

ان سب میں مجید لاہوری کا نام سب سے اوپر لکھنا چاہیے۔ انہوں نے طنزو مزاح کو جس طرح اپنے شعروں میں برتا ہے کسی اور نے نہیں برتا۔ وہ اکبر الٰہ آبادی کے بعد مزاحیہ شاعری میں بے حد مقبول ہوئے۔ ان کے پاس نت نئے موضوعات ہیں، اچھی زبان ہے، خیالات کی کمی نہیں ہے۔ وہ مزاح لکھنا جانتے ہیں اور انہیں شائستہ طنز کرنا بھی آتا ہے۔ وہ اپنے معاشرے پر بھرپور انداز میں طنز کرتے ہیں جو موثر بھی ہوتا ہے۔

طنزیہ اور مزاحیہ شاعری میں مجید نے بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ جن میں درج ذیل بہت مشہور ہوئیں۔ مثلاً گدھے، دستور بن رہا ہے، غنڈہ ایکٹ، آزادیوں کا دور ہے، نئے بھکاری، منکہ ایک منسٹر ہوں۔

اس نظم میں موجودہ دور کے منسٹروں پر طنز کیا گیا ہے جو سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے اخباروں میں لغو بیانات بگھارتے ہیں اور کیمروں کے سامنے چہروں پر مسکراہٹ سجا کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اس نظم میں ان پر بھرپور طنز کیا گیا ہے۔

ان کی ایک نظم ”الیکشن کا زمانہ“ بہت کامیاب ہے۔ اپنی اس نظم میں انہوں نے لوٹ کھسوٹ اور بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے والے لیڈروں کا پول کھول کر رکھ دیا ہے۔ جو الیکشن کے موقع پر کاسۂ گدائی لے کر ووٹوں کی بھیک مانگتے ہیں، لیکن کامیاب ہونے کے بعد اپنا مکھڑا تک دکھانا گوارا نہیں کرتے۔ اس نظم میں مجید کا موضوع یہی ہے۔

مجید لاہوری میں یہ خوبی بھی تھی کہ انہوں نے علاقائی [illegible] کو اپنے کلام میں نہایت چابک دستی سے [illegible] دیا ہے۔ مثلاً ”رانجھے خان کی غزل“ میں انہوں نے پنجابی الفاظ کی آمیزش کی ہے۔ جیک کی نظم ”سنڈے کے سنڈے“ میں انگریزی کے الفاظ استعمال کیے ہیں، جو عموماً اردو سے نابلد [illegible] انگریز بولتے ہیں۔ ”بمبئی والا انجل“ میں انہوں نے بمبئی کے سیٹھوں کی زبان استعمال کی ہے۔ جب کہ ”دلی کے [illegible]“ میں انہوں نے دہلی کی کرخندار زبان کو خوش اسلوبی سے برتا ہے۔ ”اِجت کھدا نے دیا۔“ اسی قسم کی ایک نظم ہے۔

اردو میں پیروڈی ایک باقاعدہ صنف ہے، مگر اسے بہت شعرا نے اختیار کیا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے کوئی درجہ نہیں دیا گیا بلکہ ابھی تک علیحدہ سے اس کی فنی حیثیت کو تسلیم ہی نہیں کیا گیا۔ اسی لیے شعرا نے اسے شعوری طور پر اپنانے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ چند شعرا نے اس میدان میں قدم رکھا ہے ان میں مجید لاہوری، ضمیر جعفری اور سید محمد جعفری شامل ہیں۔ مجید نے اس کمال خوبی سے برتا ہے، اس لیے انہوں نے شعوری طور پر اس فن کو اپنایا ہے۔

وہ طنزو مزاح میں پیروڈی کو مقدم سمجھتے تھے۔ انہوں نے اقبال، حفیظ جالندھری اور نظیر اکبر آبادی کی نظموں کی کامیاب پیروڈی کی ہے۔ نظیر کی جن نظموں کی انہوں نے پیروڈی لکھی ہے ان میں برسات کی بہاریں، بنجارا، عاشقوں کی [illegible] اور مسدس کریما شامل ہیں۔ آدمی کی فلاسفی کی انہوں نے نہایت دلچسپ انداز میں پیروڈی کی ہے۔ اس کے اشعار دیکھیے۔

مونچھیں بڑھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
داڑھی منڈا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
مرغے جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
دلیا پکا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور لنچ اڑا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
وہ بھی ہے آدمی جسے کوٹھی الاٹ ہوگئی
وہ بھی آدمی ملا جس کو گھر نہ گھاٹ
وہ بھی ہے آدمی کہ جو بیٹھا ہے بن کے لاٹ
وہ بھی ہے آدمی جو اٹھائے ہے سر پہ کھاٹ
موٹر میں جا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
رکشا چلا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
بیٹھے ہیں آدمی ہی دکانیں سجا سجا
اور آدمی ہی پھرتے ہیں ٹھیلا لگا لگا
ہر مال چار آنے کی دیتے ہیں صدا
پولیس ان کا چالان کرتی ہے جا بجا
کیبن بنا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اس کو گرا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
رشوت کے نوٹ جس نے لیے وہ بھی آدمی

مجید لاہوری جن نظموں کی پیروڈی کرتے تھے۔ وہ صرف تفریح طبع کے لیے نہیں کرتے تھے۔ وہ جدید تقاضوں کے مطابق اسے زندگی سے ہم آہنگ کر دیتے تھے۔

☆☆☆

رسول مقبولؐ کا احترام مجید کی سرشت میں تھا اور بعض اوقات اپنے احباب سے دوران گفتگو جب حضور اکرمؐ کا ذکر آ جاتا رونے لگتے تھے۔ عقیدت میں انہوں نے کئی نعتیں کہی ہیں، جن میں کوئی خاص یا انوکھی بات نہیں ہے، بہرحال ان سے ان کا جذبہ محبت جھلکتا ہے۔

تقسیم سے پیشتر مجید لاہوری نے بہت سی نظمیں اور گیت پنجابی میں لکھے۔ انہوں نے ”سانگ پبلسٹی“ میں ملازمت کر لی تھی اور گاؤں گاؤں گھومتے تاکہ لوگوں کو جنگ میں شریک ہونے پر آمادہ کرسکیں۔ پنجاب کے دیہاتوں میں لوگ اردو نہیں سمجھ سکتے تھے، لہٰذا انہیں پنجابی کا سہارا لینا پڑا۔ وہ کہتے تھے کہ انگریز کی فتح ہماری فتح ہے۔ اس لیے کہ انگریزوں کی جنگ ہماری جنگ ہے۔ لوگوں کو نغمے اور گیت سنا کر آمادۂ جنگ کیا جاتا تھا۔ اس کے حق میں اخبارات میں مضامین شائع کیے جاتے تھے اور تقریریں ہوتی تھیں۔

پھر جب جنگ ختم ہوگئی تو یہی لوگ عام افراد کی ہمت بندھاتے تھے کہ اب امن قائم ہوگیا ہے، لہٰذا ان پر سونے اور چاندی کی بارش ہوگی۔ اس کے بعد ملک میں ”گندم زیادہ

اگاؤ“ اور ”قومی بچت اسکیم“ جیسی چیزیں شروع ہوگئیں۔ مجید چونکہ ”سانگ پبلسٹی“ میں ملازم تھے اس لیے گاؤں دیہاتوں میں گھوم پھر کر پبلسٹی کرتے پھرتے تھے۔ ان کے اس زمانے کی گیتوں اور نغموں میں فکر کی گہرائی نہیں تھی اور خیالات بلند تھے۔ سیدھے سادے دیہاتیوں کے لیے سیدھی سی زبان تھی اور ان نظموں کا ایک خاص مقصد تھا۔ چنانچہ انہیں فنی ترازو میں نہیں تولنا چاہیے۔

جنگ ختم ہوجانے کے بعد لوگوں میں یہ اشتیاق پیدا ہوگیا کہ انگریزوں نے جو وعدے وعید کیے تھے، اب انہیں پورا کرے۔ مگر اس کے بجائے ”رولٹ ایکٹ“ آگیا اور سارے ہندوستان میں شور مچ گیا۔ اس کے خلاف گاندھی جی نے ”عدم تعاون تحریک“ چلائی اور سکھوں نے ”اکالی لہر“ اور مسلمانوں کی ”خلافت تحریک“ شروع ہوگئی۔

بہرحال مجید چونکہ سانگ پبلسٹی میں تھے چنانچہ وہ انگریزوں کے گیت گاتے رہے اور لوگوں میں قومی جذبہ بیدار کرتے رہے۔

مجید نے پنجابی شاعری کرنے کے ساتھ پنجابی مضامین بھی لکھے ہیں، بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ان سے یہ مضامین لکھوائے گئے تھے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نے مولانا عبد المجید سالک کے اشتراک سے ایک ماہنامہ ”پنجابی“ کے نام سے شائع کرنا شروع کیا۔ وہ اس سلسلے میں کراچی بھی آئے۔ ان دنوں ”نمکدان“ کا آفس نیو چالی میں ہوا کرتا تھا۔ ڈاکٹر فقیر وہیں آکر قیام پذیر ہوگئے۔ کراچی میں انہوں نے صرف مجید سے لکھنے کا مطالبہ کیا یا پھر شفیع عقیل سے۔

پہلے تو مجید انہیں ٹالتے رہے جب اس سے بات نہیں بنی تو انہوں نے دو مضامین لکھ دیے۔ جب کہ شفیع نے چھ سات افسانے۔ مجید کا ایک مضمون تو فضول سا تھا اور رسالے کا پیٹ بھرنے کے لیے لکھا گیا تھا، البتہ دوسرا مضمون اردو مضامین جیسا تھا۔ وہی سلاست، روانی اور بات سے بات نکالنے کا انداز۔ جملوں میں شگفتگی اور رعنائی، مزاح کی چاشنی اور ہلکا سا طنز۔ اردو تحریر میں جیسا کہ وہ نچلے طبقے کے مسائل کو پیش نظر رکھتے تھے اور اپنے کرداروں کی زبانی کہانی کو آگے بڑھاتے تھے۔

اس مضمون ”ہم کی تم کی“ میں ایک دیہاتی کا کردار پینٹ کیا گیا ہے جو پرانی وضع قطع کو اختیار کیے ہوئے ہے اور نئی تہذیب سے ناآشنا ہے اور خود بھی اس کے قریب نہیں جانا چاہتا۔ کردار کا لہجہ یعنی ڈکشن دلچسپ ہے۔ اس لیے کہ وہ ہر چیز کو اپنے آئینے سے دیکھنے کا عادی ہے۔

☆☆☆

پچاس کی دہائی میں بچوں کے لیے کم لکھا جاتا تھا اور رسائل بھی کم ہی شائع ہوتے تھے۔ 1951 میں روزنامہ جنگ نے بچوں کے لیے ایک ماہنامے ”بھائی جان“ کا اجرا کیا۔ اس کے مدیر شفیع عقیل مقرر ہوئے۔ بچوں کے لیے لکھنے والے کم تھے اور جو تھے وہ جان چھڑاتے تھے۔ شفیع نے تہیہ کرلیا کہ بڑوں کے لیے لکھنے والوں سے اصرار کرتے رہیں گے۔ چنانچہ انہوں نے مجید سے نظمیں اور کہانیاں لکھوائیں۔ ہر چند کہ ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ اس لیے کہ وہ کاہل تھے اور ان کا موڈ ہی نہیں بنتا تھا۔ اس زمانے میں صوفی تبسم، ابن انشا، حفیظ جالندھری اور اسماعیل میرٹھی وغیرہ لکھا کرتے تھے۔

1955ء میں جب بھائی جان کا خاص نمبر شائع ہورہا تھا تو مجید نے شفیع کے بے حد اصرار پر ایک نظم لکھ کر انہیں دی، جس میں بچوں کے لیے دلچسپی کا سارا سامان موجود ہے۔ عنوان ہے، ”چورن“۔

مولوی شیر گل یہ کہتا ہے:

کھانا کھا کر میں گھر سے آیا ہوں
بھوک بالکل نہیں مگر پھر بھی
حلوا مل جائے تو کھا لوں گا
اور اگر مرغ ہو تو کیا کہنا
تھوڑی سی فیرنی بھی ہو تو کھا لوں گا

☆☆☆

شرط یہ ہے کہ ہاضمے کے لیے
تھوڑا چورن بھی ساتھ لاؤ

وہ جب بچوں کے لیے لکھتے تو خود بھی بچہ بن جاتے تھے۔ بچوں کے لیے لکھنا دشوار ہے۔ بچوں کے سے انداز میں سوچنا اور بولنا پڑتا ہے۔ خاص طور پر مکالمے ایسے ہونا ضروری ہیں کہ بچے انہیں ہضم کرسکیں۔ بچے مجید کی کہانیاں ہضم کرلیتے تھے۔

وہ اپنی موت 26 جون 1957ء تک جنگ سے وابستہ رہے۔ انہوں نے صرف 44 برس تک اس دنیائے رنگ و بو میں سانس لی۔ 1971ء میں شفیع عقیل نے ان کے کالموں کا مجموعہ ”حرف و حکایت“ مرتب کیا جو مجید کی وفات کے چودہ برس بعد شائع ہوا۔ ان کی غزلوں اور فکاہیہ نظموں کا انتخاب اوکسفرڈ پریس نے شائع کیا۔

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمیں پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر و کوہسار سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔ لیکن ان فضاؤں سے جو نکل کر کسی اور شاخ پر آشیانہ سجانے کی خواہش کرتا ہے۔ اسے کیسی کیسی پریشانیاں گھیرتی ہیں اس کا ذکر جو یورپ و امریکا میں بسنا چاہتے ہیں وہ اس تحریر کو ضرور پڑھیں۔

ایک جداگانہ انداز کی دلچسپ سفر کہانی کا چوبیسواں حصہ

میں اس وقت نسرین کے پہلو میں بیٹھا سوچ میں گم [illegible] نے مجھ سے وعدہ لینے کا کہہ کر ایک نادیدہ حصار میں [illegible] تھا۔ میں خود کو ”چور بالی“ میں مقید محسوس کررہا تھا۔ [illegible] ریگستان کے اس حصے کو کہتے ہیں جو گرداب جیسا ہوتا ہے۔ دریا میں بننے والے گرداب میں کوئی چلا جائے تو وہ نکل نہیں پاتا۔ یہی حال چور بالی کا ہے، اگر غلطی سے کوئی چور بالی میں قدم رکھ دے تو پھر آسانی سے نکل نہیں پاتا، جتنا نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے گا وہ اتنا ہی دھنستا چلا جائے گا، میں

بھی خود کو بے دست و پا محسوس کر رہا تھا۔ میں اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اور نظریں جھیل پر ٹکی ہوئی تھیں۔ یہ جھیل خوب صورتی کا مرقع تو تھی ہی اس کے علاوہ بھی اس میں ایک خاص کشش ہے جس کی وجہ سے نہ صرف سیاح بلکہ ان سے زیادہ مقامی افراد یہاں آتے رہتے ہیں کیونکہ یہ جھیل مقامی باشندوں میں متبرک مانی جاتی تھی۔ یہاں کے قدیم باشندے ریڈ انڈینز اسے مقدس جھیل کہتے اور اپنے خداؤں کا مسکن قرار دیتے تھے۔ اس کی تنہائی ایگانگی، پُراسراریت اور بلندی پر ہونے کی وجہ سے وہ اس کے پاس آتے ہی جھک جاتے، وہ کہتے کہ اس کے پانیوں میں ان کے خداؤں کی روح رہتی ہے۔

ابھی تک اس کی گہرائی کا اندازہ ٹھیک ٹھیک لگایا نہیں جاسکا تھا۔ یورپین باشندوں کا کہنا تھا کہ یہ اندازاً اٹھی سوفٹ سے زیادہ گہری ہے۔ ویسے تو ہر جھیل کو بھرنے کے لیے کوئی دریا ہوتا ہے، یا ندی ہوتی ہے یا پھر اردگرد برفانی پہاڑ ہوتے ہیں۔ اس کی نکاسی لیک اونٹاریو کی جانب ایک مقام پر ہے مگر پانی کہاں سے آتا ہے، یہ بات معما ہے۔ یہ معما ہی اسے تقدس عطا کرتا ہے جھیل دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پہاڑ میں قدرتی طور پر کھودے گئے گہرے گڑھے میں یہ سمائی ہے لیکن اس کا پانی کہاں سے آتا ہے؟ اس بارے میں ان کا جواب ہے کہ یہ خداؤں کا مسکن ہے اور خدا ہی جانے کہ پانی کہاں سے آتا ہے۔

برسوں قبل ریڈ انڈینز یہاں چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ ہر سال یہاں انسان کی قربانی دی جاتی تھی۔ اس کے نیلے پانیوں میں وہ سرخی یعنی خون ملا کر اپنی نجات مانگا کرتے تھے۔ جب بھی زیادہ برف پڑتی تو قافلوں کی صورت میں پہاڑ پر چڑھتے اور پھر کسی کو ذبح کر کے رو رو کر دعائیں مانگتے۔

جب یورپین آئے تو انہوں نے پہلے ریڈ انڈینز کو ذبح کیا اور بعد میں اس کی گہرائی میں اترے تو معلوم ہوا کہ سیکڑوں فٹ نیچے پانی کے لاتعداد چشمے رواں ہیں۔ زمین سے پانی نکل رہا ہے لہٰذا اس کی گہرائی کو ناپنا مشکل ہے۔

ریڈ انڈینز کی لڑائی جب یورپین یعنی باربیرنز سے ہوئی تو شکست کھانے کے بعد قدیم باسی اپنی متبرک جھیل کی جانب پناہ مانگنے کے لیے بھاگے۔ یہ تیروں اور نیزوں سے مسلح تھے اور دشمن بندوق بردار تھا۔ تیر والوں کے اندر غدار بھی تھے جو انہیں بہکاتے اسی وجہ سے نواب سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کی طرح یہاں بھی وطن کے وارثوں کو شکست ہوئی۔ تیر والے بھاگ کر جھیل کے آگے سجدے میں گر گئے۔ شاید جھوٹے خداؤں کے آگے سجدوں میں پڑے ہوئے ہی انہیں بھون دیا گیا اور لاشیں جھیل کے سپرد کر دی گئیں۔ کہتے ہیں کہ یہاں سینکڑوں لوگوں کو ایک ساتھ قتل کیا گیا اور لاشوں کو جھیل برد کر دیا گیا۔ اس کے بعد جھیل کی اداسی زیادہ بڑھ گئی۔

شروع میں جو لوگ انڈینز کو مار کر یہاں آباد ہوئے تو انہوں نے بھی یہی عقیدہ رکھا کہ اس جھیل کا کوئی پیندہ نہیں۔ یہ جھیل لامحدود گہرائیوں میں گرتی چلی گئی ہے۔ اس سوچ اور یقین نے جھیل کو انتہائی پُراسرار بنادیا۔ گزرے وقت کی باتوں پر دھول پڑتی رہی مگر اب بھی لوگ اس کی خوب صورتی سے زیادہ اسے پوشیدہ قوتوں کے مسکن سمجھ کر اسے دیکھنے آتے ہیں۔ کوئی بھی یہاں رات بسر نہیں کرتا اور شام سے پہلے لوگ یہاں سے روانہ ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے یہاں کوئی کیمپنگ نہیں۔ ایک کاٹیج ہے جو کرائے پر تمام سہولتوں سمیت اٹھایا جاتا ہے مگر یہ اکثر خالی رہتا ہے۔

یہاں رات گزارنے والے ایک شخص نے اپنے تجربات اور مشاہدات کچھ اس طرح بیان کیے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے جب مقامی لوگوں اور سیاحوں سے اس جھیل کی پُراسراریت کی کہانیاں سنیں تو ایک رات اسی کاٹیج میں اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ آٹھہرا۔ مجھے مافوق الفطرت قوتوں کے بھید جاننے کا بہت شوق تھا اور اب بھی ہے۔ کاٹیج میں ہر طرح کی سہولت موجود تھی۔ آرام دہ بیڈ، صاف و شفاف، باتھ روم، کچن، کشادہ لیونگ روم وغیرہ۔ ہم شام سے پہلے یہاں آگئے تھے۔ لیونگ روم اور بیڈ روم کی کھڑکیاں جھیل کی جانب کھلتی تھیں۔ پورا چاند جھیل میں اپنا عکس دیکھ کر زیادہ شوق ہو رہا تھا۔ ہوائیں تیز چلتیں تو پورا جنگل کہرام مچا دیتا۔ جھیل کے اردگرد درختوں کی ٹہنیوں اور پتوں کی سرسراہٹوں کا شور گونجتا تھا مگر اس وقت جھیل گہری نیند میں ڈوبی محسوس ہو رہی تھی۔ ہم نے لیونگ روم میں ٹی وی لگا رکھا تھا اور گرم بھاپ اڑاتی کافی نے ہمیں گردونواح سے بے خبر کر دیا تھا۔ ہمیں احساس بھی نہ تھا کہ اردگرد میلوں دور تک کوئی ذی روح نہیں ہے اور ہم اس ویرانے میں، اندھیری رات کے کنویں کے اندر بالکل اکیلے ہیں۔ ہوا شوکتی آتی اور لکڑی کے کاٹیج سے لپٹ جاتی تب ایسا لگتا کہ کھڑکیوں پر کوئی دستک دے رہا ہے۔

ہم لوگ ابھی جاگ رہے تھے۔ رات کا شاید وہ دوسرا پہر تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ ہوا کی تندی میں آہ و بکا در آئی ہے۔ جیسے بہت سے لوگ مل کر رو رہے ہیں۔ اگر یہ وہم ہوتا تو صرف مجھے ہوتا مگر سوزن (گرل فرینڈ) کو بھی یہ آوازیں سنائی

دیں۔ ہم دونوں نے فوراً ٹی وی بند کیا اور گھر کی سب لائٹیں بجھا دیں۔ اس طرح کھڑکی کے باہر سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ چاندنی نے جھیل اور جنگل کو روشن کر دیا تھا۔

ہم نے دیکھا کہ بہت سارے سائے جھیل کے پانیوں سے باہر آرہے ہیں۔ وہ سائے تھے کہ پرچھائیں تھیں مگر کوئی شکل نہ دکھتی تھی۔ وہ لڑکھڑا رہے تھے۔ ان سے ایسی آوازیں آرہی تھیں جیسے بہت سے بھنورے ایک ساتھ بھنبھنا رہے ہوں۔ ہم بری طرح سہم گئے۔ میں نے جلدی جلدی دروازے کا لاک چیک کیا۔ کھڑکیاں دیکھیں تو وہ بھی اندر سے بند تھیں۔ سوزن بائبل اٹھا لائی۔ میں نے اپنا وڈیو کیمرا جو پہلے اسٹینڈ پر لگا تھا، اس سے ریکارڈنگ شروع کر دی۔

سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کتنے لوگ ہیں کیونکہ وہ سائے آپس میں گڈمڈ تھے۔ مجھے واکنگ ڈیڈ (زندہ لاشیں) فلم یاد آرہی تھی جس میں قبروں سے مردے نکل آتے ہیں اور وہ لوگوں کو چیر پھاڑ کر ان کا گوشت کھاتے ہیں۔ میرے لیے وہ وقت بہت مشکل تھا۔ مجھے خود سے زیادہ سوزن کی فکر تھی۔ وہ چونکہ میری ہر بات سے نفی کرتی چلی آرہی تھی کہ غیبی مخلوق کا کوئی وجود نہیں ہے۔ تم اپنی شہرت کے لیے ایسی کہانیاں تلاش کرتے ہو مگر جب اس نے سائے دیکھے تو وہ دہل زدہ ہوگئی۔ اگر وہ پرچھائیں متحرک نہ ہوتیں تو ہم نظر انداز کر دیتے۔ وہ سب ہمارے کاٹیج کی جانب بڑھ رہے تھے۔ مجھے گمان بھی نہ تھا کہ یہ صورتِ حال مجھے درپیش ہوگی۔ ان کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے آواز ریکارڈ کرنے کے لیے جدید وائس ریکارڈ آن کر دیا تھا۔ وڈیو کیمرے میں کچھ نہیں تھا۔ سوائے سیاہ اسکرین کے۔ میں نے اور سوزن نے حواس برقرار رکھنے کے لیے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ جب وہ سائے قریب پہنچے تو آوازیں تیز ہو گئیں۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ سائے کاٹیج کے چاروں جانب پھیل گئے ہوں۔ وہ دس گز دور ہوں گے تو مجھے واضح انسانی ہیولے نظر آرہے تھے۔ وہ قریب آرہے تھے۔ میں اب خوف زدہ ہو گیا تھا۔ میرے سامنے کوئی اور راستہ نہ تھا۔ پھر اچانک کاٹیج کی اور سرچ لائٹس جل پڑیں ہمیں معلوم نہ تھا کہ باہر موشن سینسر لگے ہیں اور کسی قسم کی بھی حرکت سے رات کو وہ لائٹس جل اٹھتی ہیں۔ جیسے ہی لائٹس آن ہوئیں تو چاروں جانب روشنی پھیل گئی۔ روشنی کے پڑتے ہی وہ سائے پیچھے سرکنے لگے پیچھے سرکتے سرکتے جھیل کے پانیوں میں تحلیل ہوگئے۔ ان کے پیچھے سرکتے ہی سرخ روشنیاں دوبارہ بجھ گئیں۔ ہم پوری رات جاگتے رہے مگر وہ سائے پھر جھیل سے برآمد نہ ہوئے۔

میں لکڑی کے ڈیک پر کھڑا اس جھیل کے متعلق مشہور واقعات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے ڈرائیور نے کہا تھا۔ ”اپنی بیوی کو کچھ نہ بتانا۔ وہ ڈر جائے گی۔ وہ تاکید نہ بھی کرتا تو میں اسے کچھ نہ بتاتا۔ وہ اکیلی رہتی تھی اور اگر ڈر اس کے دل میں بیٹھ جاتا تو اس کی زندگی اجیرن ہو جاتی۔

میں ڈیک پر کھڑا جھیل کی سطح کو دیکھ رہا تھا۔ وہاں اگر کسی مافوق الفطرت قوتوں کا قبضہ نہ بھی ہو تب بھی وہ جھیل میرے اندر سنسنی پھیلا رہی تھی۔ ایک انجانا سا خوف مجھے گھیرے تھا۔ ایسا ہی خوف جو ایک بار جھیل سیف الملوک کے کنارے کیمپ لگانے پر رات کو محسوس ہوا تھا۔

نسرین میرے پاس آئی اور بولی۔ ”یہاں سے چلتے ہیں۔ مجھے پتا نہیں کیوں ڈر لگ رہا ہے۔ ہمارے علاوہ یہاں پر کوئی ہے بھی نہیں۔“

میرے جواب سے پہلے وہ ڈیک سے اتر گئی۔ میں جھیل کے کناروں کو دیکھنے لگا جہاں کے پانی انتہائی سبز تھے اور ایسا لگ رہا تھا کہ ان پانیوں کے نیچے گھاس بچھی ہے۔

ہم واپس آئے تو ڈرائیور سمیت سب خاموش تھے۔ سعد کا چہرہ بھی اترا ہوا تھا جسے نسرین نے گلے لگا رکھا تھا۔ ڈرائیور بھی اسٹیرنگ پر خاموش بیٹھا سوچوں میں گم تھا۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے کیب آگے بڑھا دی۔

ہم ایک ایسی سڑک سے گزر رہے تھے جس کے دونوں جانب چھوٹے چھوٹے درخت تھے جو سفید، گلابی اور زرد پھولوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ان درختوں کے پیچھے دور دور تک پھیلے آلوؤں اور ٹماٹر کے کھیت تھے۔ ہمیں کبھی کھیت نظر آنے لگتے اور کبھی انگوروں اور سیبوں کے باغات پھلوں کے درختوں تلے دور دور تک ہریالی تھی۔ سبزہ بچھا تھا جس نے میرے ذہن سے وقتی طور پر جھیل کی بابت سب کہانیوں کو نکال دیا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ ذرا دیر کے لیے سڑک کنارے گاڑی روک دیں۔

گاڑی رکی تو میں دروازہ کھول کر باہر آیا۔ میں نکلنے لگا تھا تو نسرین نے میرا کندھا پکڑا اور فکرمندی سے بولی۔ ”کہاں جا رہے ہو؟“

میں نے سمجھانے کے انداز میں جواب دیا۔ ”تم لوگ اندر بیٹھو۔ میں پانچ دس منٹ سے زیادہ نہیں لوں گا۔“ مگر اس نے سعد کو سیٹ پر رہنے دیا اور بولی۔ ”میں بھی تمہارے ساتھ

چلوں گی تاکہ کچھ اور وقت ساتھ گزار لوں کیونکہ کل سے تم نے تو دوبارہ سے اپنی جاب میں مصروف ہو جانا ہے۔"

ڈرائیور بولا۔ "ابھی پانچ بجے ہیں بہت وقت رہتا ہے۔ تم لوگ آرام سے انجوائے کرو۔"

میں نے نسرین کے کان میں سوالیہ انداز میں بولا۔ "ڈرائیور کہہ رہا ہے کہ آرام سے انجوائے کرو۔ اس کا کیا مطلب ہے؟"

وہ مسکرا کر بولی۔ "اور لوگ موجود ہوں تو فلرٹ کرنے لگتے ہو، مگر جب تنہا ہوں تو بہت سیریس ہو کر بیٹھ جاتے ہو۔" پھر ذرا سوچ کر بولی۔ "معلوم نہیں تم شرماتے ہو یا جھجک محسوس کرتے ہو؟"

میں نے ہنس کر اس کا ہاتھ پکڑا اور سفید پھولوں سے لدے ایک درخت کے نیچے سے گزر کر باغ کے کنارے جا کھڑا ہوا اور بولا۔ "ڈرائیور کا مقصد باتوں کو انجوائے کرنے کا نہیں بلکہ خاموشی کو انجوائے کرنے کا تھا۔"

ہوا ٹھہر ٹھہر کر چل رہی تھی اور میں نے دیکھا کہ درختوں تلے ہزاروں پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی ہیں۔ سڑک پر کوئی پیچ وخم نہ تھا بلکہ سیدھی چلی جا رہی تھی۔ اس کے دونوں جانب پھولوں سے لدے درخت ایک ہی سائز کے تھے۔ پہاڑی سڑک تھی۔ اس لیے دور تک صاف نظر آ رہا تھا۔ اوپر صاف و شفاف چمکتا آسمان تھا اور کہیں کہیں بادل تھے۔ ہمارے سامنے دور دور تک سیبوں اور انگور کے باغات پھیلے تھے۔ زمین کو سرسبز گھاس نے ڈھانپ رکھا تھا۔ میلوں تک کوئی ذی روح نظر نہ آتی تھی۔

ہم پھولوں کے درختوں تلے چلتے ہوئے کچھ آگے نکل گئے۔ نسرین کہہ رہی تھی کہ خیال کرنا، کہیں پھولوں کی پتیاں پیروں تلے آ کر کچلی نہ جائیں۔ ہم لوگ پھولوں کو پھولوں کی طرح رکھتے ہیں۔ سنبھال کر اور خیال سے رکھتے ہیں۔ انہیں دیکھتے بھی مسکرا کر ہیں کہ کہیں وہ روٹھ نہ جائیں۔

میں پوچھ بیٹھا کہ واقعی پھولوں کی بات کر رہی ہو یا مجھے اپنے بارے میں نصیحتیں کر رہی ہو۔

وہ بولی۔ "اگر تم مجھے پھولوں کی جگہ رکھ رہے ہو تو کیا مجھے پھولوں کی طرح رکھو گے؟"

"نرم و نازک برتاؤ کا میں عادی نہیں ہوں۔ نہ کسی شے کو قرینے سے رکھا اور نہ کسی کو سلیقے سے برتا مگر کوشش کروں گا کہ تمہارا خیال رکھ سکوں۔"

میں اس سے کوئی ایسا وعدہ کرنا نہیں چاہتا تھا جسے بعد میں نبھا نہ سکوں۔ میں نے ایک وعدہ اس سے کیا تھا کہ اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ ایسے دعوے تو لوگ اپنی اور سامنے والے کی تسلی کے لیے کرتے ہیں۔ جبکہ زمانہ کسی کو کہیں سے کہیں پہنچ دیتا ہے۔ پھر بھی ہم وعدے وعید کرتے نہیں تھکتے ہمیشہ ساتھ رہنے کا یقین اس لیے بھی دلاتے ہیں کہ ایک دوسرے کا خیال کرتے ہیں۔ ہمیشہ نہ بھولنے کی قسمیں کھانے والوں کے انجام بھی میں نے دیکھے ہیں۔ ایک قبر میں جاسوئی اور دوسرے نے کوئی اور پریزاد ڈھونڈ لی اور تین بچوں کا باپ ہے اور مرحومہ کی قبر پر پھول اس کی ماں چڑھاتی ہے۔

ایسا بھی نہیں کہ نسرین سے وعدہ میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے کیا تھا۔ میں نے تہیہ کیا تھا کہ اسے کسی بھی حالت میں تنہا نہیں کروں گا۔ نسرین مجھے اچھی لگنے لگی تھی اور سعد مجھے کچھ زیادہ ہی پیارا لگنے لگا تھا۔ وہ اپنی معصومیت، بھولپن اور خوش شکلی کے باعث دل میں گھر کر گیا تھا۔ پھر دونوں ماں بیٹا میری ذات کے ساتھ جڑ گئے تھے۔ اب ان کو میں اپنے آپ سے جدا کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

کچھ دور چل کر ہم دونوں واپس آ گئے۔ وہ مجھ سے کہہ رہی تھی۔ "میری خواہش ہے کہ جب بھی تمہارے ساتھ کہیں بھی ہوں تو شلوار قمیص پہنا کروں۔ ایسے ٹرپ پر تو مشکل ہے مگر گھر میں ہمیشہ تمہاری پسند کے لباس میں سامنے آؤں۔"

وہ پینٹ شرٹ میں بھی بھلی لگتی تھی مگر شلوار قمیص میں جب وہ میرے سامنے آئی تھی تو میں حیرت اور خوشی سے اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ وہ میری نظروں میں چھپی دلچسپی کو بھانپ گئی تھی۔

ہم کیب میں روانہ ہوئے تو میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ مسرتوں کا موسم اس کے اندر در آیا ہے۔

کچھ دوری طے کرنے کے بعد ایک میدان آ گیا تھا جس میں لاتعداد لکڑی کے کھمبے ایستادہ تھے۔ جن پر برڈ ہاؤس (پرندوں کے گھر) بنے تھے۔ ساتھ ایک خوب صورت گرجا گھر تھا۔ بہت سی گاڑیاں وہاں رکی ہوئی تھیں۔ میرے پوچھنے پر ڈرائیور نے کہا کہ اس علاقے میں جھیلوں کی وجہ سے پرندے زیادہ آتے ہیں۔ علاقے والوں نے سیاحوں کی دلچسپی کے لیے برڈ ہاؤس سٹی بنا دیا ہے۔

اتنے سارے کھمبے ایک دوسرے سے ذرا ذرا فاصلے پر کھڑے بہت دلچسپ منظر پیش کرتے تھے۔ پرندے ان چھوٹے چھوٹے گھروں میں انڈے دیتے ہیں۔ کئی رنگوں کے چھوٹے چھوٹے پرندے بنے بنائے گھر ملنے پر خوشی سے

چہچہا رہے تھے۔ سعد کے چہرے پر حیرت اور خوشی سے سرخی ابھر آئی تھی۔ وہ ان گھروں کو بلندی پر لٹکے دیکھ کر بولا۔ "یہ گھر پرندوں کے اپنے ہیں یا کرائے پر لے رکھے ہیں؟"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ لوگوں نے گھر بنا کر پرندوں کو کرائے پر دے رکھا ہے اور وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے مسکراتی ہوئی اپنی ماں کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔

میرے لیے یہ خیال بھی خوب صورت تھا کہ میں پرندوں کے شہر گیا تھا جہاں ہر طرح کے پرندے تھے۔ کئی رنگوں والے اور مختلف چونچوں والے۔ پر اگر سبز ہیں تو دم نیلی، چونچ کاسنی اور سر سرخ ہے۔ اڑتے غوطہ زن مختلف رنگوں والے ان پرندوں پر نظر ٹکانا بھی دشوار تھا۔ ہم سب خاموش تھے کہ پرندے کہیں ڈر نہ جائیں اور پرندے چہچہا رہے تھے کہ کہیں ہم اکتا نہ جائیں۔

نہ دیکھنے والے اکتا رہے تھے اور نہ گنگنانے والے تھک رہے تھے۔ وہاں سے جانے کو جی نہ کرتا تھا مگر ہمیں پکٹن جانا تھا اور پھر وہاں سے واپس کورنٹو کی شٹل لینی تھی۔ بمشکل میں سعد کو کھینچ کر اس ماحول سے باہر لایا اور کچھ دیر بعد ہم پکٹن کے چھوٹے سے بازار میں کیب سے اتر رہے تھے۔

اللہ نے نہایت خوب صورتی سے اس کاؤنٹی کو بنایا تھا تو یہاں کے لوگ بھی پیچھے نہ رہے تھے۔ انہوں نے اپنی پوری استعداد کے ساتھ اس بازار کو کاؤنٹی کے مزاج کے ہم آہنگ بنا لیا تھا۔ بازار کے نام پر میں نے اپنے ذہن میں جو تخیل بنایا تھا وہ مری کے مال روڈ جیسا تھا۔ جی پی او سے دوسرے کنارے تک بستا ایک ہجوم، دکانوں میں رش، ریسٹورنٹس کے اندر لوگوں کی لائنیں شالیں اور جرسیاں خریدتی خواتین اور ادائیگی کرتے مرد حضرات مگر یہاں دو رویہ سڑک کے کناروں پر فٹ پاتھ اور اس پر جھکے وہی درخت جنہوں نے رنگ برنگ پھولوں کو اپنی ٹہنیوں پر سجا رکھا تھا۔ فٹ پاتھ کی دونوں جانب پرانی طرز کی دو اور تین منزلہ عمارتیں جس کے نچلے حصے میں شیشوں کی کھڑکیوں کے پیچھے صاف و شفاف دکانیں نظر آتی تھیں۔ اتنا سامان ان میں رکھنے کی گنجائش نہ ہو اور نہ اتنی خالی کہ کچھ اور رکھنے کی گنجائش نکلتی ہو۔ درختوں کے ساتھ کھمبوں پر رنگ برنگے جھنڈے ہوا سے لہرا رہے تھے۔ فٹ پاتھ پر درختوں سے گری پھولوں کی پتیاں بکھری تھیں، کچھ سیاح ان سے بچ بچا کر چل رہے تھے۔ سب کے چہرے خوشی اور شادمانی سے چمک رہے تھے۔ کبھی دکانوں میں جھانکتے اور کبھی آسمان کو تکتے جو بادلوں کو لیے پکٹن کی مین مارکیٹ کے اوپر نظر آتا تھا۔

ڈرائیور نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ لوگوں نے کھانا کھانا ہے تو اس والے ریسٹورنٹ میں کھائیں۔ وہاں کی ٹراؤٹ مچھلی انتہائی لذیذ ہوتی ہے۔" اسے وہ اپنے ٹائم واپس آنے کا بول کر کیب کی جانب بڑھ گیا تھا۔ ہم ایک سڑک کے کونے پر کھڑے تھے، وہیں پرانا سا سینما گھر تھا۔ اس پر ریجنٹ تھیٹر لکھا تھا۔ ایسا تھیٹر جیسے میں اسی اور نوے کی دہائی میں لاہور کے میکلوڈ روڈ پر دیکھا کرتا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب دو سے تین منزلہ عمارتیں جن میں سے بہت سی لمبے ستونوں پر کھڑی تھیں۔ دکانوں کے شیشوں پر رنگا رنگ چھپر لگے تھے۔ اکثر دکانوں کے باہر گملوں میں خوشنما پھول مہک رہے تھے۔ بہت سوں نے تو پھولوں کے گملے دکانوں کے باہر لٹکائے ہوئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بٹن سائز کے سفید اور نیلے پھول ہماری توجہ اپنی جانب مبذول کرا رہے تھے۔ چوڑے فٹ پاتھ جن پر گھنے پھولوں بھرے درخت ترتیب سے لگے تھے۔ فٹ پاتھ کے کناروں پر درخت تھے پھولوں کی جھاڑیاں تھیں۔ تنی ہوئی بازار میں فٹ پاتھ پر سفید، نیلی اور سبز چھتریاں تھیں۔ جن کے پیچھے ٹھیلے لگے تھے۔ ان ٹھیلوں پر آئس کریم، ہاٹ ڈاگ، آلو کے قتلے اور کیا کچھ بک رہا تھا۔ فٹ پاتھ پر چلتے سیاح دکانوں کے شیشوں میں جھانکتے نظر آ رہے تھے۔ آسمان صاف، زمین صاف، لوگ صاف اور ان کے لباس بھی صاف۔ چہرے کھلے کھلے اور مسکراتے ہوئے جس طرح میاں بیوی آپس میں بچوں کے ساتھ کھلکھلا کر باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ میں نے ایسا اپنے ملک میں کم دیکھا ہے۔ یہاں کوئی بھی جوڑا چاہے عمر رسیدہ ہی کیوں نہ ہو، وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے خوش گپیاں کرتے نظر آئیں گے۔ اگر جوان ہیں اور بچے چھوٹے ہیں تو وہ اسٹرولر میں ہوتے ہیں اور شوہر اس اسٹرولر کو سنبھالتے ہوئے اپنی بیوی کو پیار بھری نظروں سے دیکھتا مسکراتا خوشگوار انداز میں باتیں کرتا نظر آتا ہے۔ ہمارے ہاں میاں بیوی پہلے تو ایک ساتھ گھر سے نکلتے نہیں اور اگر بڑے شہروں میں نکلتے بھی ہیں تو اکثر آپس میں ایک مخصوص فاصلہ رکھ کر چلتے ہیں۔ خریداری کرنی ہو تو شوہر دکان کے باہر ٹھہر جاتا ہے اور کہتا ہے کہ شاپنگ کر کے باہر آ جانا، میں ادھر ہی کھڑا ہوں۔ یہ نہیں کہ وہ خوش رہنا نہیں چاہتے بلکہ انہیں خوش رہنے ہی نہیں دیا جاتا۔ جہاں متوسط آمدنی والے گھر کا تیس فیصد پانی بجلی اور گیس کے بلوں میں چلا جاتا ہو۔ اتنا ہی بچوں کی اسکول اور ٹیوٹر کی ٹیوشن میں نکل

جاتا ہو۔ اس کے علاوہ کچن، میڈیسن اور ٹرانسپورٹ کا خرچا ہے تو یہ سب ملا کر ایک آدمی تو اسے پورا نہیں کر سکتا ہے۔ لہٰذا لامحالہ طور پر گھر کے ہر افراد کے ماتھے پر تفکرات کی شکنیں پھیل جاتی ہیں۔ یہاں یوٹیلٹی کے بل پانچ سے سات فیصد ہوتے ہیں۔ اسکول بچوں کے لیے گریڈ بارہ تک مفت ہے کچن کا خرچ آمدنی کا دس پندرہ فیصد سے زیادہ نہیں۔ پیٹرول پر بھی پانچ فیصد خرچ ہوتا ہے۔ اگر ایسا حساب کتاب ہو تو مسکرائیں گے نہیں تو اور کیا کریں گے؟ ہمارے ہاں تو ہر گھر معاشی چنگل میں پھنس کر رہ گیا ہے۔ اس پر بھی اگر وہ کہیں ہنستے مسکراتے مل جائیں تو میں یہ کہنے سے ہرگز نہیں رکوں گا کہ وہ واقعی زندہ دل لوگ ہیں۔ اللہ میرے ملک اور اس کے باسیوں کو اپنی امان میں رکھے، آمین۔

ہمارا جس جانب منہ تھا ہم ادھر کو ہی چل پڑے۔ ایک کارڈ شاپ نظر آئی تو نسرین نے مجھے روکا اور بولی کہ تم یہاں سے کوئی کارڈ خرید کر بیوی کو پوسٹ کردو۔

”اسے میں ہر دوسرے دن فون کرتا رہتا ہوں۔ اس کی کیا ضرورت ہے؟“ میں نے جواب دیا۔

”تم عورت کے دل کو نہیں سمجھتے۔ ایسی چھوٹی چھوٹی خوشیاں انہیں بہت کچھ دے جاتی ہیں جو وہ لاکھوں کے تحائف لے کر بھی حاصل نہیں کر پاتی۔“ اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے وہ بولی۔ ”وہ جب ادھر آئے گی تو تمہارا کارڈ اور اس میں چھپی محبت اس کے دل میں ہوگی۔“

”کارڈ تو میں ابھی پوسٹ کردیتا ہوں مگر میں یہ بتانا بھول گیا کہ وہ پہلے ٹورنٹو نہیں بلکہ نیویارک جائے گی بلکہ پہنچ چکی ہوگی اور چند ماہ بعد ٹورنٹو آئے گی۔“

وہ حیرت سے منہ کھولے مجھے دیکھ رہی تھی: پھر وہ بولی۔ ”مذاق کررہے ہو؟“

میں نے پھر سے وہی جواب دیا تو اس کا ردِعمل میرے لیے عجیب تھا بگڑ کر بولی۔ ”ہر کوئی تم سے مشورہ مانگتا ہے۔ میں، شہباز، سرجی یا شہباز لیکن اپنے لیے تم خود فیصلے کرتے ہو۔ ایک تو مجھے بتایا نہیں اور اچھا کیا کہ نہیں بتایا ; ورنہ یہ دو دن میرے بہت برے گزرتے۔ جو پاکستان سے صرف تمہارے پاس آنا چاہتی ہے۔ اسے تم نیویارک بھیج رہے ہو۔“

میں اس کے اس ردِعمل کے لیے ہرگز تیار نہ تھا۔ مجھے اچھا بھی لگ رہا تھا کہ اسے میری فیملی کی فکر ہے۔ میں خود چاہتا تھا کہ اس بات پر وہ مجھ پر اور زیادہ برسے۔ اس کا چہرہ اور تیور بتارہے تھے کہ وہ جو کہہ رہی ہے، سچ کہہ رہی ہے۔ اس میں رتی بھر بھی بناوٹ نہ تھی۔ سمیعہ آجاتی تو اس سے میرا ملنا کس قدر ممکن ہوتا یہ میں نہیں جانتا تھا اور نہ ہی وہ جانتی تھی مگر ان کے چند ماہ دیر سے آنے پر وہ مجھ پر خفا ہو رہی تھی۔ وہ بولتی رہی اور میں سنتا رہا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”تم میرا اتنا خیال کرتے ہو۔ تمہیں کیا معلوم کہ مجھے تمہاری کتنی فکر رہتی ہے۔ کھانا تم ڈھنگ سے کھاتے نہیں اور اسی لیے تمہارا وزن گر گیا ہے۔ ہر وقت ان کو یاد کرتے ہو۔ تمہیں ان کی اور ان کو تمہاری ضرورت ہے۔ جتنا جلدی تم لوگ آپس میں ملوگے تو یہ تم دونوں کے لیے فائدہ مند ہوگا۔ تم گھر آتے ہو تو حیلے بہانوں سے تمہیں روکتی ہوں۔ چاہتی ہوں کہ وہ سب بنا کر تم کو کھلاؤں جو تم کو پسند ہو۔ تمہارا خیال رکھوں کہ تمہیں آرام ملے اور تم عجیب وغریب فیصلے کرتے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتے نہ تم اور نہ تمہارے فیصلے۔“

”اگر میرا اتنا خیال ہے تو تمہارے گھر شفٹ ہو جاتا ہوں۔“

”ہرگز نہیں، میں تمہیں اپنا عادی بھی نہیں کرنا چاہتی۔ میں بھی کتنی بدنصیب ہوں کہ اپنے پیار کو اپنا پیار بھی نہیں دے سکتی۔“ وہ یہ کہہ کر فٹ پاتھ کنارے رکھے بینچ پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے تھے۔

سعد نے ماں سے معصومیت سے پوچھا۔ ”مما! آپ آج روئیں گی تو نہیں؟“

میں سٹپٹا گیا تھا۔ گویا سب سن کر اس کی قدر و منزلت میرے دل میں بڑھ گئی تھی مگر اسے اس طرح آنسو بہاتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ اسے فیملی کے نیویارک جانے کا پس منظر سمجھاتا رہا۔ اسے بتاتا رہا کہ میرے بچے اور بیوی میرے لیے کتنی زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنے اور اس کے بندھن کے بارے میں غور کرتا رہا۔ وہیں میرا ٹورنٹو کا بے یقینی کا سفر اس یقین پر آٹھہرا کہ میرا اور اس کا رشتہ ایسا سادہ اور کمزور نہیں کہ ایک موڑ مڑنے کے بعد ختم ہو جائے۔ وہ میرے زیادہ قریب آگئی تھی۔ اس کی باتوں، لہجے اور آنکھوں میں مکمل سچائی تھی۔ میں بول نہیں رہا تھا، بس اسے دیکھ رہا تھا۔ مسکرا رہا تھا۔ آج اس نے مجھے اتنا زیادہ اپنے قریب کرلیا تھا کہ گمان ہوتا تھا کہ ہم سالوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ اسے منایا اسے پیار سے سمجھایا، اسے دلاسے دیے، اس کے بدلے سعد کو گلے لگا کر پیار کیا تو اس نے اپنے آنسو صاف کیے۔ دوبارہ سعد کے چہرے پر بوسہ دیا تو میرا دھیان اور خیال اس کے چہرے

...نے لگا۔
میں نے کارڈ خریدا، کچھ پیغام لکھے اور وہیں سے ٹکٹ
...ر دکان دار کے حوالے کارڈ کردیا کہ اسے پوسٹ
...ے۔ جب ہم دکان سے باہر نکلے تو دن اس کے چہرے
...رح روشن تھا۔
... ہم فٹ پاتھ پر شیشوں کے پار دکانوں کی ونڈو شاپنگ
...ے جارہے تھے۔ گفٹ شاپ، پیزا شاپ، آرٹ گیلری،
...ات کی دکانیں، جنرل آئٹم اسٹور، کینڈل اسٹور جہاں
...لف قسم کی موم بتیاں ملتی ہیں۔ ریسٹورنٹ وغیرہ ہمارے
...ی جانب اور سڑک کے پار تھے۔ لوگ ہم سے بچ بچا کر
...اور اگر ان سے ٹکر ہوگئی تو ایکسکیوزمی ایکسکیوزمی کی گردان
...ع کردیتے۔ ایک شاپ پر جس پر چیز بک رہا تھا۔ نسرین
...ئی تو میں بھی اس کے ہمراہ تھا۔ صاف ستھرے کاؤنٹر،
...، چمکتا فرش اور روشن بلب تھے۔ دکاندار ایک نوجوان
...وہ بتا رہا تھا کہ یہ لوگ خود ہی بھیڑ، بکریوں اور گائے کے
...ے پنیر بناتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان جانوروں کا
...ھی پلاسٹک کے کین میں دستیاب تھا۔ سب شیلفوں میں
...ے پیکٹ رکھے تھے۔ نسرین مختلف قسم کے پنیر دیکھ رہی
...اس نے چیڈر پنیر خریدا۔ مجھے تو معلوم بھی نہ تھا کہ یہ کس
...ا پنیر ہے اور نہ میں نے نسرین سے پوچھنا مناسب سمجھا۔
...دکاندار کے پاس ہی رکھوایا کہ واپسی پر اٹھالیں گے۔
میں اسے ستانے کے لیے بولا۔ ”سنا ہے پنیر کھانے
...لوگ موٹے ہوجاتے ہیں۔ اپنا خیال رکھنا، مجھے تم ایسی
...ٹ ہی اچھی لگتی ہو۔“
وہ بولی۔ ”اپنے لیے کہاں خریدا ہے میں نے، یہ تو تم کو
...ی تاکہ کچھ تو تمہارا وزن بڑھے۔“ ”میرا وزن جتنا بھی کم ہو
...م کو با آسانی اٹھا سکتا ہوں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا تو
... جواب آیا۔ ”تم چاہے کتنا کہو پر تم خاصے کمزور ہو،
...ے سے خوراک نہ ملے تو ایسا ہوجاتا ہے۔“
... میں نے بات یہیں ختم کردی۔ ”جلدی سے کھانے کا
...ردو۔ مجھے اور سعد کو بہت بھوک لگی ہے۔“
...اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور کاؤنٹر کے ساتھ ٹیک
...لڑکی کو اشارہ کیا۔ وہ ایک اشارے پر کھنچی آئی۔ دراصل
... ہوئے ایک قدیم ساخت کی ریسٹورنٹ میں آبیٹھے
...یں کے علاوہ ہال خالی تھا۔ ویٹرز ویسے بھی فارغ کھڑی
... ہمارے ساتھ آکر کھڑی ہوگئی۔ براؤن بالوں والی
...ی لڑکی تھی۔ سنہرے بال اور سبز آنکھیں۔ کالی پینٹ پر

نماز

اسلام کا دوسرا اہم رکن نماز ہے۔ نماز کے لغوی معنی کسی کی طرف رخ کرنا، بڑھنا، دعا کرنا اور قریب ہونا ہے۔ نماز عبادات الٰہی کا مقررہ اسلامی طریقہ ہے۔

شرائط نماز

طہارت: جس سے مراد جلد اور جسم کا پاک ہونا ہے۔

ستر: جسم کے ان حصوں کو چھپانا جن کا چھپانا مرد اور عورت پر فرض ہے۔

نماز کا وقت: جس نماز کے لیے جو وقت ہے اس کے اندر نماز ادا کی جائے۔

استقلال قبلہ: یعنی قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا۔

نیت کرنا: یعنی دل میں خاص اس فرض نماز کا ارادہ کرنا جو پڑھنی ہو۔

ارکان نماز: تکبیر تحریمہ، قیام، قرأت، رکوع، دونوں سجدے، قعدہ اخرہ۔

شاہد محمود ڈوگر کی تصنیف کون کیا ہے سے اقتباس

انتخاب: نادیہ شکیل، فوجیوں والا

سفید شرٹ میں وہ بھلی لگ رہی تھی۔ نسرین کی وجہ سے میں نے اس کے خدوخال ایک نظر میں دیکھے اور پھر سر جھکا دیا۔ میں ہر منظر کو لوگوں کو اور ان کی گفتگو کو ہمیشہ غور سے دیکھتا اور سنتا ہوں۔ یہ کسی بھی لکھنے والے کی سرشت میں ہوتا ہے کہ ہر چیز پر بغور توجہ دے۔ نسرین کو معلوم نہ تھا کہ میں لکھاری بھی ہوں اور وہ بھی ڈائری کی حد تک اسی لیے میں جب بھی کسی منظر میں کھو جاتا یا پھر گفتگو کو دھیان سے سنتا یا لوگوں کا جائزہ لیتا تو وہ تب تک کچھ نہ کہتی جب تک سامنے کوئی لڑکی ہو۔ کسی لڑکی سے مسکرا کر بات کروں یا اس کے چہرے کی جانب دیکھوں تو وہ اپنی توجہ میری جانب مبذول کر لیتی اور بعد میں سوالات بھی کرنے لگتی تھی۔ میں نے ویٹرس سے پانی کا بولا تو اس نے روایتی مسکراہٹ نوازتے ہوئے جواب دیا۔ ”آپ سوڈا لیں یا پانی، دونوں کا نرخ ایک ہے۔“ پھر ایک توقف کے بعد بولی۔ ”تو پانی لاؤں یا کچھ اور......؟“

میں نے پانی کا کہا تو نسرین نے بھی پانی منگوایا۔ سعد کو

اورنج جوس چاہیے تھا۔

وہ پانی وغیرہ لینے چلی گئی اور میں ریسٹورنٹ کا جائزہ لینے لگا۔ وہ ایک چوکور ہال تھا جس میں پندرہ بیس میزیں لگی تھیں۔ میزوں کے گرد لکڑی کی کرسیاں تھیں۔ صاف ستھرے سفید کور سے سارا فرنیچر ڈھکا تھا۔ دروازے کے قریب دائیں جانب کاؤنٹر تھا اور ساتھ ہی زنانہ مردانہ واش روم تھے۔ چھت پر پرانے طرز کے فانوس لٹکے ہوئے تھے۔ چھت سے نیچے چاروں جانب ٹیرس تھا جس کی سیڑھیاں سامنے دیوار کے ساتھ اوپر چڑھ رہی تھیں۔ ٹیرس پر بھی میز کرسیاں سجی تھیں۔ لکڑی کی دیواریں اور ان پر علاقے کی جھیلوں، بچز اور جزیروں کی دلکش پینٹنگز آویزاں تھیں۔ یہ سو سال سے بھی زیادہ پرانا ریسٹورنٹ تھا اور اسی لیے اس کی سجاوٹ میں پرانی روایات اور اسٹائل کا خیال رکھا گیا تھا۔ سب فرنیچر قدیم وقتوں کا لگتا تھا۔

واش روم میں بھی دیواروں پر فریم لگے تھے اور کاؤنٹی کے مناظر سجے تھے۔ صاف ستھرے، واش بیسن، قیمتی پیپر، ٹاول اور صابن کی جگہ لیکوڈ سوپ تھا۔ میں نے گرم پانی سے چہرہ دھویا اور تازہ دم ہو گیا۔

میں واش روم سے باہر نکلا تو ویٹرس ہماری ٹیبل کے ساتھ کھڑی شاید میرا انتظار کر رہی تھی، اس نے آرڈر لینا تھا۔ میں نے ٹراؤٹ مچھلی کا نسرین سے کہا۔ سعد کو نوڈلز پسند تھے اور نسرین نے اپنے لیے بھی ٹراؤٹ منگوائی۔

میرے شہر ڈیرہ اسماعیل خان کے پہلو میں دریائے سندھ صدیوں سے بہتا چلا آ رہا ہے۔ مچھلی مجھے کئی اقسام کی کھانے کو تھوڑی بہت ملتی رہی ہے۔ اس کے ذائقوں سے میں آشنا ہوں مگر پہلی بار میں نے دریائے کنہار کی تازہ ٹراؤٹ کا ذائقہ چکھا تو پھر اسے آج تک نہیں بھول سکا۔ میں دوستوں کے ہمراہ ناران میں تھا۔ صبح سیف الملوک جھیل کو جاتے اور شام ڈھلے وہاں سے پیدل چل کر ناران کے بازار میں گھومتے۔ جھیل کا سحر اور دریائے کنہار سے لپٹ کر آتی تازہ خنک ہوائیں مجھے اپنا مجنوں بنائے رکھتی تھیں۔ ایک صبح ہم ڈوریں ڈال کر دریا کے کنارے بیٹھ گئے۔ ماحول کا نشہ سب سے زیادہ منہ زور ہوتا ہے اور ہم اسی نشے میں بدمست پڑے رہے۔ اٹھے تو صرف دو مچھلیاں ڈور سے بندھی تڑپ رہی تھیں۔ ہوٹل کے باورچی نے بنا کر ہمیں دیں تو وہ ذائقہ امر ہو گیا۔ پھر کالام جاتے ہوئے ٹراؤٹ فش فارم سے ہم نے ٹراؤٹ خریدی۔ مگر بناتے ہوئے وہ تو ہاتھوں میں ہی قیمہ ہو گئی اور وہ ذائقہ نہ مل سکا۔ پھر جب ناران جاتا تو ہوٹل کے کسی ملازم کو مچھلی کے شکار پر بھیج دیتے۔ کبھی کم اور کبھی زیادہ مگر مصالحے لگی اور تیل میں تلی ٹراؤٹ مجھے ملتی رہی۔ کینیڈا آنے سے پہلے سب نے یہی کہا کہ وہاں مچھلی بہت زیادہ اور بہت ارزاں ہوتی ہے اور آج پہلی بار میں اس ریسٹورنٹ میں ٹراؤٹ مچھلی کا آرڈر دے کر اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ اپنی بے چینی کو کم کرنے کے لیے میں نے سعد سے باتیں شروع کر دیں۔ نسرین ہم دونوں کو باتیں کرتے دلچسپی سے سن رہی تھی۔ انتظار کی گھڑیاں تمام ہوئیں اور کسی جل پری کی مانند دکھتی ویٹرس نے ٹراؤٹ پلیٹ میں سجا کر میرے سامنے آ رکھی.

ہاتھ کی انگلیوں سے ذرا بڑی ٹراؤٹ پلیٹ میں سجی تھی. اس کے آس پاس کہیں کسی ٹماٹر کا ٹکڑا، سلاد کے چند پتے، کھیرے کی ایک قاش ایسے سمائی تھی کہ جیسے ہم پینڈو ہیں اور وہ ہمیں متاثر کر رہے ہیں۔ میں تو فرائی مچھلی کھاتا چلا آیا تھا اور یہ کسی اوون میں جلدی سے نکال کر اور مناسب کارروائی کرنے کے بعد ہمیں پیش کی گئی تھی۔ یہ لوگ تو کچی مچھلیاں بھی کھا جاتے ہیں مگر ہمارے ساتھ یہ رعایت کی کہ اسے ہلکا سا دھواں وغیرہ لگوا دیا تھا۔ یہ پورے دن کے کسی بھوکے بندے کا لنچ تھا اور جی چاہتا تھا کہ یہ پلیٹ اس فریم پر دے ماروں جس میں کوئی صاحب ایک بڑی مچھلی شکار کیے، دانت نکالے مسکرائے چلے جا رہے تھے۔ میں تو تندور کی روٹی، بریانی، پلاؤ یا کڑھائی گوشت ہوٹلوں میں کھاتا چلا آ رہا تھا اور یہاں ٹراؤٹ مچھلی کا ٹکڑا میری بے بسی کا مذاق اڑا رہا تھا۔

یہ ٹراؤٹ میرے لیے تھی جو نہ تھوکنے والی تھی اور نہ نگلنے والی۔

نسرین نے پوچھا۔ ”کس چیز کا انتظار کر رہے ہو؟ کھانا شروع کرو۔“

”میری تو بھوک ہی مر گئی۔ یہ کچا پکا میں نہیں کھا سکتا۔“ میں نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

ویٹرس ہماری جانب ہی متوجہ تھی کیونکہ اسے کوئی اور کام نہ تھا۔ نسرین کے اشارے پر وہ مینو چارٹ لیتی آئی. نسرین نے اس سے کہا کہ یہ اسے پسند نہیں ہے اور ہم کچھ اور آرڈر کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے چہرے پر کوئی ردعمل لائے بغیر میری پلیٹ اٹھالی۔ میرے لیے نسرین نے فرائیڈ رائس اور مشروم آرڈر کیے۔ میں نے ریسٹورنٹ میں دستیاب سب مصالحہ جات ڈال کر اسے کھانے کے قابل بنایا اور خاموشی سے انہیں اپنے معدے میں اتار دیا۔

ادائیگی کے لیے نسرین کاؤنٹر پر گئی۔ وہی ویٹریس گھوم کر کاؤنٹر کے پار چلی آئی۔ میں نے نسرین کو ادائیگی سے روکا تو ویٹرس مسکرا کر بولی۔ ”ضروری نہیں شوہر ہر وقت ادائیگی کرے۔ بیوی کو بھی یہ موقع ملنا چاہیے۔“

پھر بھی ادائیگی میں نے ہی کی اور بل دیکھا تو اس نے ٹراؤٹ فش چارج نہیں کی تھی۔ اس کا شکریہ ادا کر کے میں نے نسرین کے کان میں کہا۔ ”لگتا ہے پرنس ایڈورڈ کاؤنٹی والے ہماری شادی کروانے پر تلے ہوئے ہیں۔“

مسکرا کر وہ دانشمندی سے سر ہلاتی ہوئی بولی۔ ”دن میں خواب دیکھنا بند کرو۔ میں نے یہ شادی نہیں کرنی۔“

ریسٹورنٹ کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور مصنوعی حیرت سے پوچھا۔ ”کیا! شادی نہیں کرنی مجھ سے؟“

بولی۔ ”بالکل نہیں کرنی۔“ پھر میرے تھامے ہوئے ہاتھ کا میرے ہی ہاتھ سے موازنہ کرتے ہوئے بولی۔ ”اس رنگ والے کے ساتھ اس رنگ والی کیسے شادی کر سکتی ہے؟“

[illegible] جو وہ بولی اس کا مطلب یہ تھا کہ منہ دھو کر رکھو۔ میں خفت سے اپنا سر کھجانے لگا۔ اپنا ہاتھ چھڑوا کر میرا ہاتھ دباتے ہوئے بولی۔ ”اب یہ اداکاری بند کرو اور یہاں سے چلو ورنہ جس ویٹرس کو تم غور سے دیکھ رہے تھے وہ دوبارہ سے ٹراؤٹ لے آئے گی۔“

ہم جس طرف سے آئے تھے اسی جانب چل پڑے۔ [illegible] خراماں خراماں چلتا نظر آ رہا تھا۔ سب کے چہروں پر بے [illegible] تھی۔ موسم بہار کا ہو اور وہ بھی اونٹاریو کی بہار، جو ایک بار [illegible] بار بار آپ کو جتاتی ہے کہ مجھے پھولوں میں دیکھو، مجھے [illegible] ؤں میں ڈھونڈو، مجھے لہلہاتے کھیتوں میں تلاش کرو، مجھے [illegible] درختوں اور مہکتی فضاؤں میں محسوس کرو۔ مجھے پالو تو میرے خالق تک جا پہنچو گے۔ مجھے تلاش کرتے رہو تو اپنے بھید تم پر کھولتی جاؤں گی۔ مجھے سرِ راہ نہ دیکھو۔ مجھ [illegible] نہ کتراؤ۔ میں اپنے خالق کی ادنیٰ سی مخلوق ہوں جو تم پر [illegible] کر اترتی ہے۔ مسجدوں میں اس کا شکر ادا کرو جس نے [illegible] تم پر اتاری ہیں۔ وہ خالق جو ہواؤں، تاروں، چاند [illegible] ، رات اور دن، درختوں اور پودوں، پھولوں اور [illegible] میں سب جگہ موجود ہے۔ یہ سب نعمتیں سب کے لیے ہیں مگر حساب ان کا زیادہ ہو گا جو اسباب پر گرفت [illegible]۔

جس ماحول میں ہم چلتے تھے وہاں بہت فیض تھا۔ ہوائیں آسودگی اور شادمانی کے سندیسے ہمارے کانوں میں ڈال کر کسی اور کی جانب نکل پڑتی تھیں۔ وہ سب کے لیے یکساں تھیں۔ ان کے لیے بھی جو بڑے گھروں میں رہتے تھے اور اس کے لیے بھی جو ایک چھوٹے کمرے میں چار دوستوں کے ہمراہ کونے میں پڑے میٹرس پر پڑا اس کا شکر گزار بنتا تھا۔

لوگ ہم پر نظر ڈالے نکل جاتے اور ہم ان پر۔ کبھی ہم دکانوں میں جھانکتے اور کبھی دوسرے چہروں میں۔ دکانیں سامان سے بھری تھیں اور چہرے مسکراہٹوں سے۔ ہر ایک کے ہمراہ بچے تھے۔ وہ کسی کے کاندھے پر سوار تھے یا پھر کسی اسٹرولر میں خاموش پڑے تھے۔ جو بڑے تھے وہ اپنے پیروں پر اچھلتے ہوئے چل رہے تھے۔ ایک بات حیرت انگیز تھی کہ کوئی بچہ بھی روتا یا منہ بسورتا مجھے نظر نہ آیا۔ سب کھلکھلا رہے تھے۔ میں بہت غور کرتا رہا کہ ہمارے ملک میں بچے گھر پر ہوں یا باہر، ہر وقت روتے کیوں رہتے ہیں۔ ایک ہی جواب مجھے ملا کہ روتے وہ ہیں جو نظر انداز ہوتے ہیں۔ سسکیاں وہ لیتے ہیں جن کا پیٹ پورے دن میں ایک بار بھی نہیں بھرتا۔ منہ جب بسورتے ہیں جب کوئی کھلونا دوسرے کے پاس دیکھتے ہیں اور اپنے ہاتھ خالی ہوتے ہیں۔ مدد طلب نظروں سے اس وقت دیکھتے ہیں جب گھر میں ماں بیمار پڑی ہوتی ہے۔

میں ایک بار کراچی میں دوستوں کے ہمراہ برنس روڈ پر کھانا کھا رہا تھا۔ ہم فٹ پاتھ پر رکھی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ کھانے میں بہت سی اشیاء تھیں، کڑاہی گوشت، بریانی، نہاری، بہاری کباب وغیرہ، کھانوں سے میز بھری ہوئی تھی۔ اتنا کھانا جو ہم دو دن میں بھی نہیں کھا سکتے تھے۔ میں نے گوشت کھایا اور ہڈی ڈسٹ بن نہ ہونے کی وجہ سے دوسروں کی طرح سڑک کنارے پھینک دی۔ میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس بچے رحم طلب نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ میری پھینکی ہڈی پر وہ ایک ساتھ جھپٹے۔ ایک کے ہاتھ میں وہ من و سلویٰ آیا اور پھر اسے چبانے لگا۔ مجھ پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ میں گناہ گار بن گیا۔ کھانا تو بہرحال چھوٹ گیا مگر آنسوؤں کی جھڑی برس پڑی۔ میں اتنا بے پروا تھا کہ ان بچوں کی آنکھوں میں نہ دیکھ سکا تھا۔ میں سالوں گزرنے کے بعد اس واقعے کو نہیں بھول سکا ہوں۔ میں ظالم تھا اور میرے سامنے مظلوم سڑک پر بیٹھے دوسری ہڈی کا انتظار کر رہے تھے۔ ہم نے کھانا اس وقت سب میں بانٹا اور واپس چلے آئے۔ اس دن میری زبان سے صرف یہ الفاظ نکل سکے تھے۔ ”جہاں انصاف نہیں

وہاں امن ناممکن ہے۔"

ہم ایک سوینیر کی دکان پر کھڑے تھے۔ کاؤنٹی کے ماحول، جھیلوں، مرغزاروں اور ساحلوں کو اجاگر کرتے سوینیر بھرے پڑے تھے۔ پہلے بھی میں جہاں گیا وہاں کے یادگاری سوینیر لے آیا۔ اب نسرین کچھ پسند کرتی تھی۔ دکان بھری پڑی تھی۔ دکانوں پر بھی لڑکیاں کام کرتی ہیں اور نسرین اس کا وقت لے رہی تھی۔ مجھے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی اور لہٰذا میں ایک کونے میں کھڑا سعد سے باتیں کررہا تھا۔ سعد کی محفل مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ اپنی باتوں میں اتنا محو کردیتا ہے کہ اس کے ساتھ بوریت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ چھتری اٹھائے مجھے اسکول کی، دوستوں کی اور اساتذہ کی دلچسپ باتیں بتا رہا تھا۔ باتیں کرتے کرتے ڈیکوریشن کے لیے ایک فریم اس کی نظروں میں جچا تو وہ مجھ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اب میری توجہ نسرین اور کاؤنٹر کے پیچھے لڑکی کی باتوں پر تھی۔ لڑکی اس سے کہنے لگی کہ گھر کی آرائش کے کون کون سے سوینیر اچھے رہیں گے۔

نسرین ہر چیز کو جانچ رہی تھی۔ لڑکی میری جانب دیکھ کر بولی۔ "لگتا ہے آپ کے شوہر گھر کی سجاوٹ میں بالکل دلچسپی نہیں لیتے۔"

نسرین نے مسکرا کر میری جانب دیکھا اور بولی۔ "بالکل دلچسپی نہیں لیتے، میں گھر سنوارتی ہوں یہ بگاڑ دیتے ہیں۔"

لڑکی حیرت سے میری جانب دیکھ کر نسرین سے بولی۔ "واقعی؟" اپنی بات جاری رکھی اور کہنے لگی۔ "بہت مصروف رہتے ہوں گے۔"

"ہاں بہت مصروف۔ دو دو جاب کرتے ہیں مگر اپنی بیوی اور فیملی سے بہت محبت کرتے ہیں۔" نسرین بولی۔

"پھر تو تم بہت خوش قسمت ہو۔" لڑکی بولی۔

"ہاں وہ تو ہوں میرا گھر تو ان کی وجہ سے بچ جاتا ہے۔" نسرین نے شرارت سے مجھے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"تو کیا آپ بھی جاب کرتی ہیں؟" لڑکی بھی بہت باتونی لگ رہی تھی۔

"شاید اب چھوڑ دوں۔ یہ کہتے ہیں کہ تم ہیومن ریسورس مینجمنٹ میں ڈگری لو۔"

"واؤ پھر کب داخلہ لے رہی ہو؟" لڑکی حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

"یہ کہتے ہیں کہ داخلہ وغیرہ سب میں کروادوں گا۔ تم بس گھر میں بیٹھ کر اسٹڈی کرو اور ڈگری لے کر اچھی جاب ... آجاؤ تو میں بھی سرخرو ہوجاؤں گا۔"

"بہت محبت کرتے ہیں تم سے۔ شوہر ہو تو ایسا ... بیوی کا پورا خیال رکھے۔"

"ہاں بہت خیال رکھتے ہیں یہی بات تو مجھے ان ... اچھی لگتی ہے۔"

ان کی باتیں جاری رہتیں اگر میں مداخلت نہ کرتا۔ ... نے نسرین سے کہا کہ جلدی کرو۔ ہمیں واپس بھی جانا ہے۔

اس لڑکی نے نسرین کو ایک خوب صورت فریم دیا ... کہا۔ "اپنے بیڈ روم میں آپ دونوں کی فوٹو اس میں ... اچھی لگے گی یہ بھی لے لو۔"

نسرین بولی۔ "یہ تو میں ضرور لوں گی۔ جب بھی فر... دیکھوں گی تو پکٹن یاد رہے گا۔"

لڑکی نے سب سوینیر پیک کیے۔ میں نے ادائیگی کر... چاہی تو نسرین میرا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "اپنے گھر کو سجانے ... لیے یہ سب چیزیں میں انہیں گفٹ کررہی ہوں۔ تو ادائیگی بھی میں ہی کروں گی۔"

اس نے ادائیگی کی اور ہم باہر نکل آئے۔

میں نے نسرین سے کہا کہ یہ تم اس سے کیا کہہ رہی تھی بولی۔ "میں تو اس کے سوالات کے جواب دے رہی تھی اور تم لڑکیوں کی باتوں میں کیوں پڑتے ہو؟"

سڑک پر گاڑیاں آجارہی تھیں۔ ہم چلتے چلتے وہاں ... پہنچے جہاں چھتریوں تلے شیشے کے شوکیسوں میں ٹھیلے لگے تھے۔ ایسا ہی ماحول تھا جیسا ہمارے میلوں ٹھیلوں میں ہوتا ہے۔ کہیں آئس کریم بک رہی تھی، کہیں ہاٹ ڈاگز اور کہیں پاپ کارن تھے۔ کچھ پر آلو کے قتلے تھے اور کہیں تازہ لیمن ... جوس تھا۔ لوگوں کا رش تھا اور بچوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ ساتھ ایک فوارہ تھا جس کے گرد سیمنٹ اور لوہے کی بینچ رکھی تھیں۔ ہم نے پانی خریدا اور آئس کریم لے کر سیمنٹ کے بنچ پر آبیٹھے۔ ونیلا، چاکلیٹ اور اسٹرابیری کی آئس کریم بہت لذیذ تھی مگر آئس کریم میں نے کبھی بھی شوق سے نہیں کھائی ... اس دن بھی میری یہی حالت تھی۔

سوا چار بج رہے تھے اور ہمیں یہیں کیب نے ملنا تھا۔ یہ جگہ بیٹھنے کے لیے موزوں تھی کیونکہ فوارہ چلتا تھا اور اردگرد درخت تھے اور واہی ہوا چل رہی تھی جو نہ جانے کب سے شروع ہوئی تھی۔

مجھے چائے کی طلب ہورہی تھی مگر کینیڈا یا امریکا میں آپ کو کہیں بھی چائے نہیں ملے گی۔ یہ لوگ صرف کافی پیتے ہیں۔

سعد اپنی چھتری کو اور نسرین سوینیر کے بیگ کو گود میں لیے آئس کریم کھا رہی تھی۔

میں نے نسرین سے کہا۔ "یہ تم شاپ میں لڑکی سے کیا کہہ رہی تھیں کہ میں تمہارا شوہر ہوں؟"

"ایک بار بھی میں نے نہیں کہا کہ تم میرے شوہر ہو اور اپنی خوش فہمی کو ختم کردو۔" وہ آرام سے آئس کریم کھاتی ہوئی بولی۔

میں بھی سوچ میں پڑ گیا کہ ایسا تو اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ اس نے کاؤنٹر کے پیچھے لڑکی کو میرے شوہر ہونے کا تاثر دیا تھا مگر منہ سے کچھ نہیں بولی تھی۔

وہ اپنے دماغ کو ہر وقت حاضر رکھتی تھی۔ وہ اس کا استعمال بھی جانتی تھی اور ہر جزئیات پر غور کرتی تھی۔ میں اس کے برعکس تھا۔ اکثر اوقات میں اپنے دماغ کو آزاد چھوڑ دیتا تھا۔ سب خیالات کو نکال کر ذہن کے دروازے بند کرلیتا تھا۔ صرف آنکھوں اور دل کی نگاہ سے دیکھتا اور سوچتا تھا۔ مجھے میری یہ عادت پسند تھی اور اسی لیے مجھے اپنے ہمراہ کوئی نہ کوئی ایسا چاہیے تھا جو مجھ پر کڑی نظر رکھتا۔ میں ہمیشہ کچھ رکھ کر اکثر بھول جاتا ہوں اور پھر سب اسے تلاش کررہے ہوتے ہیں۔ نسرین یہ فرض کماحقہ نبھا رہی تھی۔ میری بیوی آج تک میرا سامان سنبھالتی پھرتی ہے اور چیزیں سمیٹتے ہوئے ہمیشہ اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل رہے ہوتے ہیں۔ "اللہ! انہیں ہدایت کرے، اللہ انہیں ہدایت کرے۔"

میں خیالات کے گرداب میں ڈوبا ہوا تھا کہ چین کھینچنے کی ہلکی سی آواز گونجی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ نسرین نے اپنا بیگ کھولا تھا پھر اس میں سے اس نے اپنی چیک بک نکالی اور پہلے سے لکھا ہوا ایک چیک پھاڑ کر میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔

میں نے حیرت سے پہلے اسے دیکھا اور پھر چیک کو دیکھا تو میرے نام پر اس نے چھ ہزار سات سو ڈالر لکھے تھے۔

میں ابھی تک حیرت میں تھا، اس سے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"میرے سب معاملات اب تمہارے سپرد ہیں تو اپنی یہ جمع پونجی بھی اپنے پاس رکھ لو۔ اتنا خرچ بھی کررہے ہو آگے میرے اخراجات بھی ہوں گے تو اب تمہیں ہی سب دیکھنا ہے۔"

"ابھی تو گورنمنٹ سے وظیفہ بھی مل رہا ہے اور اسٹور پر مجھے کیش ملتا ہے۔ وہی کیش میرے لیے بہت ہے۔ وظیفہ جمع ہوتے ہوتے چار ماہ میں اتنا ہوگیا ہے۔" وہ مجھے بہت سنجیدہ لگ رہی تھی۔ اسی نے اپنی بات جاری رکھی اور کہا۔ "آئندہ بھی جو رقم اکٹھی ہوگی وہ تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کروادوں گی۔"

مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ آخر یہ چیک دینے کی ضرورت اسے کیوں پیش آگئی ہے۔ بڑی وجہ یہ ہوسکتی تھی کہ وہ اپنے پاس کی چیزیں مجھے سونپ کر ہمارے تعلق کو مضبوط کرنا چاہتی تھی۔ دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی تھی کہ وہ کسی طرح سے مجھے یہ ڈالر دے کر میرے کام آنا چاہتی تھی۔ اس ٹرپ پر میں نے اسے کچھ خرچ نہ کرنے دیا تھا اور اسے یہ بھی احساس ہوگا کہ میری فیملی آرہی ہے تو مجھے فنانس کی ضرورت ہوگی۔

میں چیک کو دیکھتے ہوئے بغور یہ سوچ رہا تھا۔ میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر وہ پریشان ہوگئی اور پوچھا۔ "تم کو برا تو نہیں لگا؟ میں نے اس لیے یہ چیک دیا ہے کہ اپنی ذمہ داریاں تمہارے حوالے کردوں۔ اس سے زیادہ کوئی بات نہیں۔"

اس کی یہ بات سن کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میری اپنے خیال میں بھی یہی وجہ تھی ورنہ دوسری وجہ مجھے قطعاً قابل قبول نہ تھی۔

میں اسے بہت عقل مند سمجھتا تھا حقیقتاً وہ عقلمند تھی وہ ذہین ہونے کے علاوہ جذباتی بھی تھی۔ اپنے آپ کو میرے ساتھ جوڑنے کا کوئی اور راستہ نہ پایا تو اس نے یہ طریقہ سوچا تھا۔ اگر بالفرض میں یہ چیک اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروا بھی دیتا تو سال بعد کے آڈٹ میں جب یہ دیکھا جاتا کہ نسرین بی بی نے اپنا سارا گورنمنٹ کا وظیفہ میرے سپرد کردیا ہے تو وہ سیدھا اس نقطے پر پہنچتے کہ اسے اس وظیفے کی ضرورت نہیں ہے اور پھر یا وہ ختم ہوجاتا اور یا پھر کم کردیا جاتا۔ یہاں کی حکومتیں جب وظیفے دیتی ہیں تو آپ کے اکاؤنٹ کا سالانہ آڈٹ بھی چیک کرتی ہیں۔

میں نے چیک ابھی تک دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے درمیان پکڑا ہوا تھا۔ مجھے اس پر ہنسی آگئی اور وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس سے پین مانگا اور چیک پر بڑا بڑا VOID لکھ کر نیچے لکھ دیا۔ "ہم پہلے بھی ایک مضبوط تعلق سے بندھے ہیں۔ یہ ڈالر ہمیں آپس میں جوڑے رکھنے میں کوئی مدد نہیں کرسکتے۔"

یہ لکھ کر میں نے چیک اپنے بٹوے میں رکھ لیا اور پھر

اس کو تمام صورتِ حال سمجھائی۔ اسے یہ بھی بتایا کہ اگر تم نے اپنے اکاؤنٹ سے کچھ خرچ نہ کیا تو اگلے سال گورنمنٹ اسے ختم کردے گی یا پھر کم کردے گی۔

وہ مرعوب ہوکر مجھے دیکھ رہی تھی اس نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔ ''تو اب میں کیا کروں؟''

میں نے کہا کہ فوری سے پہلے اسٹور کی کیش جاب چھوڑ دو۔ کیش تو ہم اس لیے لیتے ہیں کہ ہم حکومت کو ٹیکس نہ دیں۔ اگر تم ٹیکس دیتی ہو تو وظیفہ ختم ہوجائے گا۔ اگر ٹیکس ادا نہیں کرتی تو یہ غلط بات ہے۔ ٹھیک راستہ چنو اور دیکھو آگے سب اچھا ہوتا جائے گا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔ میرا ہاتھ تھام کر بولی۔ ''اسی لیے تو کہتی ہوں کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے جو مجھے صحیح راستہ بتائے۔ میں تو پہلے بھی یہ سوچتی رہی ہوں کہ یہ غلط ہے مگر سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ فیصلہ کیا کروں۔ مجھے اتنا اندازہ بھی نہ تھا کہ کچھ غلط بھی ہوسکتا ہے جو آگے جا کر میرے لیے مشکل کھڑی کرسکتا ہے۔ واقعی تم صحیح کہتے ہو کہ یہ ٹھیک ہی نہیں ہے سب لوگ ایسا ہی کرتے ہیں تو میں نے بھی سوچا کہ ایسا کرنا ٹھیک ہی ہوگا۔''

''اصل میں تم نے مستقبل کے بارے میں غور نہیں کیا۔''

''گویا مجھے کیش کی جاب چھوڑ دینی چاہیے۔''

''بالکل۔'' میں نے کہا تو اس نے میرے کندھے پر اپنا سر رکھ لیا اور کان میں بڑے پیار سے بولی۔ ''شکریہ چند منٹوں میں میرا رخ تم نے بدل دیا۔ مجھے آگاہی دے دی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

اس کا یوں پیار بھرے انداز میں میرے شانے پر سر رکھنا مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ میں کچھ بولتا کہ کیب ہمارے سامنے آرکی۔ میں نے جلدی سے اس سے مذاق میں کہا۔ ''بی بی اب سر ہٹاؤ۔ کیب آگئی ہے۔'' وہ اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے ہنس پڑی۔

شٹل آنے میں کچھ منٹ رہتے تھے۔ وہ اسی ہوٹل سے روانہ ہوئی تھی جہاں ہمیں کل ڈراپ کیا گیا تھا۔ جو زیادہ دور بھی نہ تھا۔ میں نے ڈرائیور کا شکریہ ادا کیا۔ دس ڈالر کا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھا اور وہ گڈ بائے کہہ کر واپس چلا گیا۔

میں نے بس کی ٹکٹس لیں اور سیٹ پر جا بیٹھے۔ اس بار سعد میرے ہمراہ بیٹھا تھا اور نسرین اکیلی بیٹھی سوچ میں ڈوبی نہ جانے کن خیالوں میں کھوئی تھی۔ میں نے وہ چیک سنبھال کر رکھ دیا تھا اور وہ ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔

میں اور سعد تمام راستے سوتے رہے۔ جب آنکھ کھلتی تو نسرین کو جاگتے پاتا اور پھر نیند میں ڈوب جاتا۔ ہم ٹھیک وقت پر ٹورنٹو ڈاؤن ٹاؤن پہنچ گئے۔ نسرین کو میں نے اس کے اپارٹمنٹ تک پہنچایا۔ اس کی چائے پلانے کی ضد کے باوجود میں باہر ہی سے چلا آیا۔ اس نے کہا کہ وہ ایک ہفتے میں ہی اسٹور کی جاب چھوڑ دے گی۔ بڑے اہتمام سے مجھے رخصت کیا اور جب میں اپنے اپارٹمنٹ پہنچا تو رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔

لیونگ روم میں خاموشی تھی۔ دیکھا کہ مطیع اللہ اپنے مخصوص انداز میں بیٹھا چھت کو گھور رہا ہے اور شہباز کارپٹ پر لیٹا ہے اور اس کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی ہیں۔ کمرے میں حبس ہے اور شہباز پسینے سے نہا رہا ہے۔ میں نے سب سے پہلے بڑھ کر لیونگ روم کی کھڑکی کھولی جو میں پہلی بار کھول رہا تھا۔ کھڑکی کھلتے ہی تازہ ہواؤں نے لیونگ روم کو اپنی یلغار پر رکھ لیا۔

مطیع اللہ بولا۔ ''اچھا! یہ کھڑکی کھلتا بھی ہے۔ میری تو سانس بھی بند ہو رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ بھینسوں کے باڑے میں بند ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''تو پھر مفلر کیوں لپیٹا ہوا ہے۔''

قدرے سوچ کر وہ مدبرانہ انداز میں بولا۔ ''جانوروں کی بُو ہو تو ناک تو ڈھانپنی پڑتی ہے۔''

شہباز اس فقرے پر چونکا، غور کیا، ہلکا سا زرد ہوا مگر خاموش رہا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر بھینسوں کے باڑے کو اپنے پر طنز لیا تو پھر ہمیشہ کے لیے اس کے ہاتھوں رگیدا جائے گا۔ میں نے مطیع اللہ سے پوچھا۔ ''سرجی اور مفتی نظر نہیں آرہے؟''

پھر غور کرنے کے بعد وہ چھت کو گھورتا ہوا بولا۔ ''وہ دونوں پھوٹو (فوٹو) کھنچوانے گئے ہیں۔''

میں حیران ہوا کہ رات کے ساڑھے دس بج چکے ہیں۔ کل ہفتہ ہے اور کسی ایجنسی میں اس ٹائم فوٹو بنوانے گئے ہیں۔ یہ بات مجھے قطعاً ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ مگر میں خاموش ہو رہا۔ مطیع اللہ کی بات سن کر لیٹے شہباز کا پیٹ تھرتھرایا اور جس کا مطلب صاف تھا کہ وہ اپنی ہنسی دبا رہا ہے۔ وہ ہنسنا چاہتا تھا مگر مطیع اللہ کی بات پر ہنس کر اسے خوش نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں اپنا بیگ لے کر کمرے میں آیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں کئی دنوں بعد اپنے کمرے میں داخل ہوا ہوں۔ ایسا لگا کہ کسی لمبے سفر سے پہنچا ہوں۔ یہ احساس اپنے مقام سے

ری کی نسبت سے نہیں بلکہ اپنے معمول سے دوری کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔

میں نے شاور لیا اور تازہ دم ہو لیا۔ شاور لے کر لیونگ روم میں آیا تو ماحول وہی تھا جو کچھ دیر پہلے میں چھوڑ آیا تھا۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھا تو مجھ سے سوال جواب شروع ہوئے۔

مطیع اللہ پوچھنے لگا۔ ''کہاں گئی تھی؟ پھسٹ کلاس (فرسٹ کلاس) جگہ تھی؟ اکیلے میں تو تمہیں مزہ آتا ہے۔ طبیعت تو نہیں ہوئی۔''

کم وبیش یہی سوالات شہباز نے دہرائے۔ وہ اپنے جواب علیحدہ چاہتا تھا۔ لگتا تھا کہ اس کی مطیع اللہ سے کوئی ان بن ہوئی ہے۔ اسی لیے تو وہ ایک دوسرے کی جانب دیکھ ہی نہیں رہے تھے اور ایک دوسرے کی باتوں کو نظر انداز بھی کر رہے تھے۔

میں نے مختصر جوابات دینے کے بعد بات کا رخ بدلا اور پوچھا۔ ''وہ دونوں بتا گئے ہیں کہ کب آئیں گے؟''

جواب دونوں جانب سے نہ آیا۔ دراصل وہ دونوں یہ سمجھ نہ پائے تھے کہ میں نے کس سے پوچھا ہے۔ مجھے اب یقین ہوگیا کہ دونوں کے بیچ کوئی چپقلش چل رہی ہے۔ مطیع اللہ کو باآواز بلند کہا کہ تم سے پوچھ رہا ہوں تو وہ بلی کی طرح غرایا اور بولا۔

''مجھے کیا معلوم وہ کب آئیں گی۔ ادھر سب مرضی کے مالک ہیں۔ دو دو دن غائب رہیں۔ آئیں یا نہ آئیں آزاد ملک ہے۔ سب کو آزادی ہے۔ خنجیر (خنزیر) گوروں کے ملک میں سب کبوتروں کی طرح آزاد ہیں۔'' وہ اپنی بات کرتے کرتے مجھے بھی رگید گیا تھا۔

شہباز میرے لیے چائے بنانے چلا گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ سرجی اور مفتی رات کے اس پہر کہاں جاسکتے ہیں۔ آج ویک اینڈ نائٹ بھی تھی اور لامحالہ طور پر مفتی سرجی کو پکڑ کر کلب لے گیا ہوگا۔ مطیع اللہ سے مایوس ہونے کے بعد اس نے یقینی طور پر سرجی کو کسی نہ کسی طرح سے تیار کرلیا ہوگا۔ اپنے شبے کا اظہار ان کے سامنے نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ انہیں بھنک بھی پڑ گئی تو خاص طور پر مطیع اللہ تو سرجی کو کانوں پر اٹھائے رکھے گا۔

شہباز چائے کے دو مگ لے آیا۔ ایک میرے لیے اور اپنے لیے۔

میں نے مطیع اللہ سے پوچھا۔ ''تم چائے نہیں پیو گے؟''

وہ چھت کی جانب گھورتا ہوا آہستگی سے بولا۔ ''میں تو گوروں کی چائے بھی نہیں پیتی۔ وہی پڑا ہے۔ میں اسے گھونٹ کر پیوں گی۔''

میں نے کہا کہ دودھ بھی تو گوروں کا ہے۔ سوچ کر سنجیدگی سے بولا۔ ''دودھ گورے نہیں بھینس دیتی ہیں۔''

شہباز ذرا تلملایا اور غصے میں چائے کا پورا گرم کپ ایک سانس میں پی گیا۔

میں بالآخر ان سے پوچھ بیٹھا۔ ''تم دونوں آپس میں بول کیوں نہیں رہے ہو؟ کس بات پر تم لوگ ناراض ہو؟''

پہلے تو وہ ناں ناں کرتے رہے مگر میں نے جب اصرار کیا اور سنجیدہ ہوا تو شہباز بتانے لگا۔ ''آج سالن خوچہ (مطیع اللہ) نے بنانا تھا۔ ہفتے میں ایک دن اس کی باری آتی ہے۔ مجھے بھی شدید بھوک لگی تھی۔ کھانا کھانے بیٹھے اور جب میں نے روٹی سے سالن لیا اور کھایا تو بجائے نمکین کے میٹھا تھا۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگا۔ یہ زنانیوں والے کام مجھ سے نہیں ہوتے۔ اس نے نمک کی بجائے چینی ڈال دی تھی اور چائے میں نمک ڈالا ہوا تھا۔''

میں نے شہباز سے پوچھا۔ ''پھر آگے کیا ہوا؟''

وہ پیٹ سہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں تو پھینکنے والا تھا مگر یہ پورا سالن چمچ سے پی گیا۔''

مجھے شہباز کی بات سن کر ہنسی تو آئی مگر میں اسے دبا گیا۔ اس دوران مطیع اللہ متواتر چھت کو میٹرلیس سے ٹیک لگائے گھورے جا رہا تھا۔

میں نے مطیع اللہ سے پوچھا۔ ''اب تم بتاؤ کیا ماجرا ہے؟''

اس کی نگاہیں چھت سے فرش پر آئیں۔ مفتی کے تکیے کو پیٹ تلے ٹھیک کیا۔ ذرا سی پوزیشن بدلی اور پھر دوبارہ پہلے والی پوزیشن پر آیا اور بڑی متانت سے بولا۔ ''جاب پر بہت کام تھا اور بہت تھک چکی تھی۔ یہاں باورچی خانے کا کام بھی کرنا تھا۔ طبیعت بہت خراب ہو رہی تھی پھر بھی میں نے سالن چڑھایا۔ سرجی اور مفتی تو پھوٹو (فوٹو) کھنچوانے کے لیے دھیگر (سہ پہر) سے تیار ہو رہے تھے۔ تصویر بنواتے وقت عطر لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ مفتی نے خود پر بھی چھڑکا اور سرجی پر بھی۔ سرجی نے دوبارہ پھر سے اپنے پر عطر چھڑکوایا اور مفتی بھی آج اس کی بات مان رہا تھا۔ میں اکیلی ہانڈی بناتی رہی۔ یہاں کی چینی بھی تو نمک کی طرح باریک ہے۔ سرجی سے

پوچھا کہ نمک کدھر ہے تو انہوں نے چینی کا ڈبہ مجھے پکڑا دیا اور خود گنگناتے ہوئے تصویر بنوانے چلے گئے۔ میں نے چینی ڈال کر نمک چکھا تو وہ میٹھا تھا۔ میں نے حساب برابر کرنے کے لیے تین چمچ نمک کے ڈالے تو وہ زیادہ ہو گیا پھر چینی ڈال کر حساب برابر کیا مگر ذائقہ اچھا تھا یہ (شہباز) تو خوامخواہ میں پیلی پڑ رہی تھی۔"

میں نے شہباز سے پوچھا۔ "تم نے پھر کیا کھایا؟"

جواب مطیع اللہ نے یہ دیا۔ "اس نے پھر سر جی کی ساری جلیبیاں چٹ کیں۔ آدھا دودھ پیا اور پھر ادھر لیٹ کر لڑنے لگا۔"

شہباز اس سے پہلے کچھ بولتا کہ مطیع اللہ دوبارہ بول پڑا۔ "میٹھی جلیبی کھا گئی مگر میٹھا سالن کھاتے موت پڑتا ہے اس کو۔"

میں نے شہباز سے پوچھا۔ "سر جی گانا کون سا گنگنا رہے تھے۔"

وہ ترخ کر بولا۔ "یہ ملاقات ایک بہانہ ہے، پیار کا سلسلہ پرانا ہے۔"

میں ہنس کر سوچنے لگا کہ یہ گانا گا کر وہ تصویر بنوانے تو ہرگز نہیں جا سکتے۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ مجھے کل بارہ بجے دوپہر ہولڈنگ سینٹر جاب پر جانا تھا۔ مطیع اللہ اور شہباز دونوں ابھی تک اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے تھے۔ میں سونے کے لیے اٹھا تو شہباز نے بھی اپنا مورچہ چھوڑا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ شہباز کو پسپا ہوتے دیکھ کر مطیع اللہ بھی اپنی گھات سے نکلا۔ ہم کمرے میں آئے۔ سب اپنی اپنی جگہوں پر لیٹ گئے۔ میں نے ڈور وال کو ذرا سا سرکایا تو تازہ ہوا کمرے میں چلی آئی۔ مطیع اللہ بولا۔ "سوات میں ہو بہو یہی ہوا چلتی ہے۔" یہ کہنے کے فوراً بعد اس کے خراٹے گونجنے لگے۔

صبح اٹھ کر سب سے پہلے میں نے کمرے کی ڈور وال بند کی کیونکہ سب کی طرح میں بھی ٹھنڈ کے باعث کمفرٹر میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ تینوں سوتے ہوئے باری باری خراٹے لے رہے تھے جیسے ان کے بیچ کوئی میچ چل رہا ہو۔ سر جی سوتے وقت اپنی پھندنے والی ٹوپی پہن کر سویا کرتے تھے۔ سر جی لیٹ آئے تھے اسی لیے سب کے پاؤں میں بے حس و حرکت پڑے تھے اور ٹوپی کا پھندنا ان کے کمفرٹر سے باہر تھا۔ میں تیار ہو کر لیونگ روم میں آیا تو مفتی چہرے پر جو تاثرات لیے سویا تھا اس سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ جاگ رہا ہے۔ ہم سب کو آرام کے لیے نیند کی ضرورت ہوتی ہے اور مفتی کو صرف غنودگی کی۔ وہ کرسی پر بھی سو کر تازہ دم ہو جاتا ہے۔ ایک ٹی وی اس کی آنکھوں کے سامنے چلتا رہتا ہے تو دوسرا ذہن میں۔ سوتے وقت سامنے والا ٹی وی بند پڑا ہوتا ہے تو وہ ذہن کی اسکرین کھول دیتا ہے۔ جتنا شو وہ ٹی وی پر دیکھتا ہے تو باقی ماندہ ذہن کی اسکرین پر دیکھ کر اپنی قسط مکمل کرتا ہے۔

میں اپنے لیے چائے بنانے لگا تو وہ ہلکا پھلکا کھانسنا شروع ہو گیا۔ اس کا مطلب ہمیشہ کی طرح یہی تھا کہ اسے بھی چائے پینی ہے۔ میں نے دو کپ بنائے۔ ایک اس کے میٹرس کے ساتھ رکھا اور اس سے کہا۔ "اب اٹھ کر چائے پی لو ورنہ ٹھنڈی ہو جائے گی۔" میں کارپٹ پر ڈور وال سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

وہ اٹھا تو نہ جانے کیوں نظریں کترا رہا تھا۔ واش روم سے واپس آیا تو خاموشی کے ساتھ منہ پھیر کر چائے پینے لگا۔ وہ خود تاثر دے رہا تھا کہ رات ہم دونوں کلب گئے تھے۔ میں نے اسے چھیڑنے کا ارادہ کیا۔ اس سے پوچھا۔ "بے چین ہو، خیریت تو ہے ناں؟"

اس کے چہرے پر کچھ رنگ تیزی سے آئے مگر وہ اپنی جانب سے خود اعتمادی سے بولا۔ "نہیں سب ٹھیک ہے۔" اپنی بات کو آگے بڑھائی۔ "تمہارا ٹرپ کیسا رہا؟"

میں نے مناسب جواب دینے کے بعد کہا۔ "کل رات تم سر جی کے ساتھ فوٹو کھنچوانے گئے تھے؟"

جواب دیا۔ "ہاں، پھر میں ایک دوست کے پاس چلا گیا تھا اور سر جی نے کہا کہ میں ڈاؤن ٹاؤن کا چکر لگاتا ہوں۔"

ہمیں معلوم تھا کہ نہ کوئی مفتی کا دوست ہے اور نہ سر جی اکیلے کہیں جانے والے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ "واپس کب آئے تھے؟"

جواب دیا۔ "میں بارہ بجے آ گیا تھا۔ تم لوگ سو رہے تھے۔"

ہم حقیقت میں ساڑھے بارہ بجے سوئے تھے مگر میں نے اس سے کہا کہ ہم تو ایک بجے سوئے تھے اور اس وقت تم دونوں واپس نہیں آئے تھے۔ وہ اب رحم طلب نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔

میں اٹھا اور ناشتا بنانے کے لیے کچن میں چلا گیا۔ میں کچن کی کھڑکی سے دیکھ رہا تھا کہ وہ کسی کشمکش و پیچ میں مبتلا ہے۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر اٹھ کر کچن میں آ گیا۔ مجھ سے آہستگی سے بولا۔ "ہم دراصل کلب گئے تھے۔ پر مزا نہیں آیا۔" پھر بولا۔ "شہباز اور مطیع اللہ کو معلوم نہیں ہونا چاہیے ورنہ وہ دونوں ہر وقت مذاق اڑائیں گے۔"

میں نے کسی کو نہ بتانے کی ہامی بھرتے ہوئے کہا۔ "سر جی کو مزہ آیا؟"

وہ کھلکھلا کر بولا۔ "اسے تو بہت مزہ آیا۔ وہ تو صبح تک وہاں رکنا چاہتے تھے۔" مفتی نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "وہ پہلے تو حیران و پریشان ہوئے کہ یہ کون سی دنیا ہے۔ پھر قسمیں اٹھاتے رہے کہ وہ اس سے پہلے ان سے مستفید نہیں ہوئے۔ وہ یوں کلب میں ہراساں پھر رہے تھے جیسے کوئی بچہ بیری کے باغ میں چوری چھپے داخل ہوا اور چوکیدار موجود نہ ہو۔ وہ مجھ سے بار بار کہہ رہے تھے کہ ندیم بھائی کو نہیں بتانا۔"

مفتی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ ندیم کو نہیں بتاؤں گا اور پلیز تم اس سے ذکر نہ کرنا۔

میں گیارہ بجے ہولڈنگ سینٹر کی جاب کو نکلا تو کمرے میں تینوں ویک اینڈ کی وجہ سے ابھی تک سوئے ہوئے تھے۔

میں جاب پر پہنچا تو لنچ کا ٹائم تھا۔ ڈائننگ ہال میں سب قیدی جمع تھے۔ آج باجوہ سنگھ ہیڈ گارڈ تھا۔ جب سے میری لائی ہوئی لاٹری کے ٹکٹ بنے تھے وہ تب سے کھنچا رہنے لگا تھا۔

میں نے احوال پوچھا تو بولا۔ "کاکا اقبال! رات ایک پاکستانی لڑکے کو ایئرپورٹ سے پکڑ کر یہاں لائے ہیں۔ اس کی شٹوری (اسٹوری) جاننی ہے تو انٹرویو اس کا شروع کر دو۔ آدھے گھنٹے بعد لنچ بریک ختم ہو جائے گی۔ اس سے پہلے اپنا گورکھ دھندا لپیٹ لو۔"

وہ یہ ٹھیٹھ پنجابی میں بولا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں ہر نئے آنے والے کی داستان سنتا ہوں۔ اس کے سامنے میز کے گرد پاکستانی قیدی بیٹھے تھے ان قیدیوں میں سے ایک خوش شکل لڑکے کی طرف اس نے اشارہ کیا جو ڈرا سہما بیٹھا تھا۔ چہرہ پریشانی کے باعث فق ہو رہا تھا۔

میں تا دیر اس کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ گوری رنگت اور بال سیاہ تھے۔ جسامت میں مناسب تھا۔ دوسرے پاکستانیوں میں گھرا وہ خاموش بیٹھا تھا۔ بلکہ سب چپ تھے۔ کبھی کبھار آپس میں کوئی بات کر کے پھر ویران نظروں سے میز کو تکنے لگتے تھے۔ ان پاکستانیوں کو اس حالت میں دیکھ کر میرا دل کڑھتا تھا۔ انہیں سمجھانے کا کیا فائدہ تھا کیونکہ وہ پہلے ہی اپنا نقصان کر بیٹھے تھے۔

وہ فکر میں غلطاں بیٹھے تھے کہ میں ان کی میز پر جا پہنچا۔ سب نے مجھے پہچانا ماسوائے نئے شکار کے۔ وردی میں ایک پاکستانی یا دیسی چہرہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں امید کی ایک لو جاگی۔ تعارف پر وہ کھل اٹھا کہ جیسے میں نجات دہندہ ہوں۔ اپنی بارہ گھنٹے کی شفٹ میں مختلف وقفوں کے اندر میں نے اس کی کہانی سنی۔ نہایت اختصار سے اسے بیان کر رہا ہوں۔ ایسے واقعات میں اس لیے بیان کرتا ہوں کہ شاید کوئی سبق حاصل کر سکے۔ میرے سامنے ایک زندہ سلامت شکار بیٹھا تھا۔ ایسے بھی بہت ہوتے ہیں جو راستے میں مارے جاتے ہیں یا پھر ایران، ترکی، یونان یا افریقا کے کسی ملک میں پولیس کے ہاتھوں یا قزاقوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔

اس کا نام جاوید اختر تھا۔ تعلق کراچی سے تھا۔ والد اسٹاک مارکیٹ میں اوسط درجے کے بروکر تھے۔ دو بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ بھائی کی نوکری بینک میں ہوگئی تھی مگر یہ ایم بی اے کرنے کے باوجود پچھلے آٹھ سال سے بے روزگار تھا۔ طویل بے روزگاری سے وہ جھنجلا اٹھا تھا۔ ماں باپ بھی اب اس کے لیے پریشان رہنے لگے تھے۔ وہ دوستوں میں بیٹھتا تو ان کا موضوع ایک ہی ہوتا تھا کہ کس طرح سے یہ ملک چھوڑا جائے۔ پھر ایک دوست کی وساطت سے اس کی ملاقات ایک ایجنٹ سے ہوگئی۔ اٹلی اور لندن کے حالات سازگار نہ رہے تھے اور سب کی نظریں کینیڈا اور امریکا کی جانب لگی تھیں۔ ایجنٹ نے کہا کہ میں کینیڈا کے لینڈنگ پیپرز پندرہ لاکھ روپے کے عوض مہیا کر دوں گا۔ ایسے شخص کے اصل لینڈنگ پیپرز ہوں گے جو تمہاری عمر کا ہوگا۔ جاوید کو اس کے نام کا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنوانا ہوگا۔ اس نے گھر میں تذکرہ کیا۔ مایوس لوگوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ ماں نے بیٹیوں کے لیے کچھ جمع کیا زیور بیچا۔ بھائی نے پانچ لاکھ بینک سے قرضہ لیا۔ باپ نے بھاگ دوڑ کر کے اپنے جاننے والوں سے سات لاکھ کا قرضہ اپنے سر پر چڑھایا۔ پندرہ لاکھ ایجنٹ کو دیئے۔ ایک لاکھ کے قریب دو نمبر شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنوانے میں لگے۔ پچاس ہزار کی ٹکٹ ملی۔ ایک ہزار ڈالر جیب میں ڈالے اور محمد فیصل اب جاوید اختر بن کر ٹورنٹو کے پیرسن ایئرپورٹ پر اترا۔ وہ سہما ہوا خوف زدہ چہرہ لیے امیگریشن کے سامنے آیا۔ اس نے پیپرز پیش کیے اور آگے گھاک لوگوں نے اسے تاڑ لیا تھا۔ ان کے چند سوالوں کے بعد ہی اس کی زبان لڑکھڑا چکی تھی۔ پھر ایک گھنٹے کے اندر ہی وہ حکام کے سامنے اپنا جرم قبول کر کے بیٹھا رو رہا تھا۔ امیگریشن نے اسے ہولڈنگ سینٹر بھیج دیا۔ یہاں اس کے آگے پھر وہی دو راستے تھے۔ عدالت میں جا کر کوئی سیاسی یا مذہبی پناہ مانگے اور یا پھر اپنے ہزار ڈالر سے واپسی کا ٹکٹ کٹائے۔ اب وہ دوسرے پاکستانیوں سے مشوروں کا محتاج تھا۔ ان سب کی طرح وہ بھی اتنا زیادہ خرچ کرنے کے بعد خالی ہاتھ واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ سب مل کر اسے یہ مشورہ دے رہے تھے کہ سیاسی پناہ اب بمشکل ملتی ہے اور تم مذہبی پناہ مانگو اور وہ بھی اسی نقطے پر قائل بیٹھا تھا کہ مذہبی پناہ کے لیے عدالت میں درخواست دے اور یہ ہزار ڈالر کسی وکیل کو فیس میں ادا کر دے۔

بعد کے دنوں کا احوال یہ ہے کہ اسے کسی طرح سے غلط حلف نامے جمع کروانے پر مذہبی پناہ مل گئی تھی۔ اس کو حکومت معمولی سا وظیفہ دے رہی تھی۔ اسے کام کرنے کی اجازت نہ تھی۔

ایک بار میں دیسی بازار جیرالڈ اسٹریٹ گیا۔ وہاں ایک ریسٹورنٹ کے ساتھ گنے کی مشین لگی تھی۔ گنے کا رس پینے والوں کا ہجوم کھڑا تھا۔ میں بھی دوستوں کے ہمراہ گنے کا رس پینے ہجوم میں گھس گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جاوید گنے کی مشین سے گلاسوں میں رس بھر بھر کر تین تین ڈالر میں گلاس بیچ رہا ہے۔ مجھ پر نظر پڑی تو اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ خوف سے وہ لرزنے لگا۔ وہ وہاں سے دوڑ لگانا چاہتا تھا کہ میں نے اس کو بازو سے پکڑ لیا۔ وہ سمجھا تھا کہ میں اسے گرفتار کرنے آیا ہوں۔ وہ ہمیں سیکیورٹی گارڈ کے بجائے پولیس سمجھتے تھے۔ اس کو کام کرنے سے منع کیا گیا تھا اور اگر وہ پکڑا جاتا تو سیدھا ڈی پورٹ ہوتا تھا۔ اب وہ کھڑا لرز رہا تھا اور میں نے اس کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ میں اس سے کہتا تھا کہ گھبرائے نہیں، میں اُسے گرفتار کرنے نہیں آیا مگر وہ میری بات کا یقین نہ کرتا تھا۔ اس کی زبان گنگ تھی اور بے معنی الفاظ اس کے منہ سے نکلتے تھے۔ آس پاس کے لوگ بھی حیران و پریشان تھے۔ اب تو اس کی حالت دیکھ کر میں بھی ہراساں ہوگیا۔ بہت دیر تک سمجھانے کے بعد وہ مطمئن نہ ہوا اور بے یقینی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کا بازو چھوڑ کر اس سے کہا کہ ایک گلاس مجھے بھی دو۔ مجھ سے گنے کا رس پیا بھی نہیں جا رہا تھا کیونکہ وہ پھٹی نظروں اور زرد چہرے کے ساتھ بت بنا مجھے ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے ادائیگی کرنا چاہی تو اس نے انکار کر دیا۔ میں نے ڈانٹ کر کہا تو اس نے فوراً تین ڈالر پکڑ لیے۔ میں سر جھٹکتا واپس چلا آیا اور وہ اسی طرح بت بنا کھڑا تھا۔

وہ وہاں چار ڈالر فی گھنٹا کے حساب سے نوکری کر رہا تھا۔ میں نے پھر اسے کہیں نہیں دیکھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ایسی نوکری کے علاوہ کچھ نہیں کر سکے گا۔

مجھے بھی اسی طرح گرین کارڈ کی آفر ہوئی تھی جسے خوش قسمتی سے میں نے ٹھکرا دیا تھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب امریکا جانے کی میری خواہش تازہ تازہ پروان چڑھ رہی تھی۔ مجھے کوٹری میں ایک فارما انڈسٹری میں جاب پر سے نکال دیا گیا تھا۔ مجھے جو قصور بتایا گیا اس کا مجھے علم بھی نہ تھا۔ میں اس کے بعد کراچی چلا آیا۔ یہاں کافی تگ و دو کے بعد مجھے کورنگی میں کسی چھوٹی سی فارما فیکٹری میں جاب ملی۔ انٹرویو میں جس تنخواہ کا کہا گیا تھا وہ اس سے دو گنی تھی جو مجھے مہینے کے آخر میں ملی۔ میں مایوس تھا اور یہ مایوسیاں مجھے ڈپریشن میں پھینک دیتیں اگر حسن اس فیکٹری میں میرے ساتھ نہ ہوتا۔ ہم بہت اچھے دوست بن گئے تھے۔ اس کے بھائیوں نے اس کے لیے گرین کارڈ کی درخواست دی ہوئی تھی اور اس سے کہا تھا کہ اسی دوران تم کسی فارما انڈسٹری میں کوالٹی کنٹرول کا تجربہ حاصل کر لو اسی لیے اس نے اس چھوٹی سی تیسرے درجے کی فیکٹری میں جاب شروع کی تھی۔

ہم لنچ اور ٹی بریک میں فیکٹری کے گیٹ کے قریب چھپر تلے اینٹوں پر بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے۔ وہ مجھے اپنے امریکا جانے کی منصوبہ بندی بتاتا رہتا تھا۔ میرے سامنے ان دنوں ایسا کوئی راستہ نہ تھا جو مجھے امریکا لے جاتا مگر وہ میرا شوق بڑھاتا رہتا تھا۔ ہم چند ماہ وہاں اکٹھے رہے اور پھر وہ وہاں سے نکال دیا گیا اور میں ملتان میں آ بسا۔

ایک دن مجھے اس کا خط ملا کہ وہ امریکا جا رہا ہے اور اس نے مجھے کراچی بلایا تھا کہ ملاقات کے علاوہ کوئی ضروری بات بھی کرنی ہے۔ میں کراچی پہنچا۔ تین ہٹی کے قریب چاولہ اپارٹمنٹ میں بیٹھے تھے۔ وہ میرے ایک دوست کا اپارٹمنٹ تھا جس میں، میں ٹھہرا ہوا تھا۔

اس نے میرے سامنے میز پر دو لفافے رکھے، بولا کہ دونوں میں اس کے گرین کارڈ کے کاغذات ہیں۔ دراصل امریکا میں دو مختلف سینٹرز نے اسے دو گرین کارڈ جاری کر دیئے تھے۔ اب وہ مجھ سے کہتا کہ اگر میں چاہوں تو ایک کو لاکھوں میں بیچ دوں مگر تم میرے دوست ہو اور میں چاہتا ہوں کہ ہم اکٹھے امریکا جائیں۔ مجھ سے بولا کہ ایک تم اٹھا لو اور دوسرا میں رکھ لیتا ہوں۔ مجھ سے کہا کہ تم کو میرے نام کا پاسپورٹ بنوانا ہوگا جو مشکل نہیں ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ امریکا پہنچ کر تین سال بعد شہریت ملنے پر تم اپنا نام دوبارہ تبدیل کر کے اصل نام پر رکھ لینا۔ میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اس نے مجھے سوچ میں دیکھا تو کہنے لگا کہ یہ موقع ضائع مت کرو۔ ابھی نکل جاؤ گے تو قسمت پھر جائے گی۔ قدرت ایسے مواقع بہت کم کم کسی کو دیتی ہے۔ تم سے تو میں پیسے بھی نہیں لے رہا اور یہ ذمہ داری بھی لیتا ہوں کہ وہاں جا کر تمہاری رہائش اور جاب کا بھی انتظام اپنے ساتھ کروں گا۔

میں نے انکار کر دیا۔ وہ پہلے تو حیران ہو کر بولا کہ مجھے تو اندازہ تھا کہ تم پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو جائے گی مگر تم انکار کر رہے ہو؟

میں نے اس سے کہا کہ اتنے جھنجٹ اٹھا کر مجھے اس طرح نہیں جانا۔ بات مختصر، وہ چلا گیا اور میں دس سال بعد کینیڈا پہنچا۔ اس نے وہاں شادی کر لی تھی اور بیوی، بچی سمیت مجھ سے ملنے ٹورنٹو آیا تھا۔ میں ان دنوں ہیمو سال میں جاب کر رہا تھا۔ ایک چھوٹے اپارٹمنٹ میں بیوی بچوں سمیت رہتا تھا۔ پرانی گاڑی میرے پاس تھی۔ مجھے وہ وقت یاد دلاتا تھا کہ دس سال پہلے تم آ جاتے تو آج کہاں سے کہاں ہوتے۔ تم نے وقت ضائع کر دیا۔

میں نے اس سے کہا کہ میں تمہاری دوستی کی قدر کرتا ہوں اور اگر میں اس وقت آ جاتا تو نا معلوم کہاں شادی کرتا اور اس وقت میرے پاس یہ میری بیوی اور بچے شاید نہ ہوتے۔ میں اسی حالت میں خوش ہوں۔

وہ چلا گیا۔ جو اللہ پر بھروسا کرے تو اللہ اسے ضرور دیتا ہے۔ حسن میرا اب بھی بہترین دوست ہے لیکن وہ اب یہ کہتا ہے کہ ندیم تمہارا وقت ضائع نہیں ہوا۔ تمہیں اللہ نے کم عرصے میں اتنا کچھ دے دیا جو مجھے اس سے دوگنے سالوں میں بھی نہیں مل سکا۔

میرا یہ سب بتانے کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو صحیح راستہ چننا چاہیے۔ دیر ہو جاتی ہے مگر اللہ کی رحمت کسی وقت کی پابند نہیں ہوتیں۔ جو بھی غیر قانونی طور پر یہاں آئے ان میں سے بیشتر پچھتا رہے ہیں۔

رات ایک بجے میں اپارٹمنٹ جاب کر کے پہنچا تو سب بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ سنڈے نائٹ تھی اور کل میرے علاوہ کسی کی بھی جاب نہ تھی۔ سرجی تعظیم سے ملے اور نظریں کترا کر بیٹھ گئے۔ انہیں شاید خدشہ یہ تھا کہ ان کے کل رات کلب جانے کا بھید کہیں میں پا نہ لوں۔ میں انجان بنا رہا۔ نہ

ہی مجھے پوچھنا تھا اور نہ ہی یہ ضروری تھا۔
میں شاور لے کر لیونگ روم میں آیا تو سرجی نے کھانا لا کر میرے سامنے رکھا اور بے حد ادب سے پوچھا۔ ”آپ کا جھیلوں والا ٹرپ کیسا رہا؟“ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ نسرین بھی میرے ہمراہ تھی۔ پھر بھی پوچھنے لگے۔ ”اکیلے بور تو نہیں ہوئے؟“
مطیع اللہ چھت کو تکنے کے مراقبے سے باہر آیا اور میرا جواب وہ دینے لگا۔ بولا۔ ”ندیم بھائی اکیلی کہاں بور ہوتی ہے۔ میرے پاس سوات آئی تو پورا دن دریا کنارے اکیلی بیٹھی رہتی اور کبھی کبھی میرے دادا کو بھی لے جاتی۔ دونوں گھنٹوں باتیں کرتے رہتے۔“
میں مطیع اللہ کے پاس سوات اس کے گاؤں جاتا رہتا تھا۔ دریائے سوات جہاں چوڑا ہو کر بہتا ہے وہیں آبادیوں سے بہت دور اس کا گھر تھا۔ آس پاس باغ اور کھیت تھے۔ جہاں ہر روز بہت سے کھانوں میں دریائے سوات کی تازہ مچھلی ہوتی تھی۔ میں دریا کے ساتھ چادر بچھا کر لیٹا رہتا۔ کتابیں پڑھتا اور اس کے دادا کے ساتھ ماضی کی ڈھیروں باتیں کرتا۔ ان کی یادداشت کا میں قائل ہو گیا جب انہوں نے اپنے بچپن کے واقعات تک مجھے پورے کے پورے سنائے تھے۔ کیا نفیس انسان تھے۔ مجھے دریا کی بہتی لہروں اور ان کی گفتگو میں کوئی فرق محسوس نہ ہوتا تھا۔ ان کی سنائی گئی دلچسپ اور حیرت انگیز کہانیاں میری ڈائری میں موجود ہیں۔
مفتی بولا کہ شہباز اور سرجی میں شدید جھگڑا ہوا ہے۔ وجۂ فساد وہ جلیبیاں تھیں جو کل شہباز دودھ کے ساتھ ساری اپنے معدے میں اتار گیا تھا۔
میں نے سرجی سے کہا۔ ”اب اتنا عرصہ ہو گیا ہے جلیبیاں کھاتے ہوئے۔ اب ان کی جان تو چھوڑ دیں۔ اسی وجہ سے تو......“
یہیں سرجی نے سراسیمہ ہو کر میری بات کاٹی اور بولے۔ ”جلیبیاں کھانے کی وجہ سے کیا ہوا ہے؟“
ان کے ذہن میں ابھی تک کلب جانے کے راز کا افشاں ہونے کا خوف تھا۔
میں نے بات گھما دی اور بولا۔ ”اسی وجہ سے تو آپ کھانا بھی ٹھیک سے تناول نہیں کرتے۔“
یہ سن کر ان کی سانس میں سانس آئی۔ بولے۔ ”مگر جلیبیوں سے تو مجھے بھوک زیادہ لگتی ہے۔“
شہباز بولا۔ ”انہیں جلیبیوں کا حرص ہے۔ جلیبیاں نہ ہوئیں لکشمی چوک کا کڑاہی گوشت ہو گیا۔“
سرجی نے لفظ حرص کو پکڑ لیا اور پھر لگے لڑنے۔ کہنے لگے۔ ”ہم تو حریص ہو گئے۔ ہم کو تو سب ندیدہ سمجھتے ہیں۔ اپنے گریبان میں کوئی نہیں دیکھتا۔ اس دن میں دو درجن انڈے لایا تھا۔ لوگ (یعنی شہباز) ایک دن چار انڈے اکٹھے ابال کر میرے سامنے کھا گئے۔ میں نے تو کسی کو حرصی نہیں کہا۔“
شہباز لیٹے لیٹے جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور آہ وزاری کرنے لگا۔ ”میں نے تو عام سی بات کہی تھی اور پھر انہوں نے فساد شروع کر دیا ہے۔ ہم بھی تو ان کے کام آتے ہیں۔ ان کو کین سینٹر لے گئے۔ سیکیورٹی کی جاب دلوائی۔ ہتھیلی کا زخم بنا کر رکھا مگر یہ کسی چیز کو مانتے ہی نہیں۔“
سرجی بگڑ کر بولے۔ ”یہ ہتھیلی کا زخم کیا ہوتا ہے۔ ہتھیلی کا چھالا بولتے ہیں۔ ایک تو آپ لوگ غلط محاورے بولتے ہیں، اردو زبان کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ قومی زبان کی قدر نہیں ہے اور شہباز مجھ پر اپنے احسان جتلا رہا ہے۔ یہ تو ایسا ہوا کہ تولہ بھر کی آرسی اور نانی بولے فارسی۔“
مفتی نے پوچھا یہ محاورہ فارسی میں ہے تو سرجی ایکدم مؤدب ہو گئے اور بولے۔ ”نہیں اردو میں ہے۔ مطلب ہے کہ احسان کم کیا ہے اور جتلایا زیادہ ہے۔“
مطیع اللہ شہباز سے بولا۔ ”تم لاہوری ہو تو پنجابی کے محاورے بولا کرو۔ تمہاری غلط اردو سے سرجی خفا ہو گئی ہیں۔“
شہباز سر کھجا کر بولا۔ ”یار اصل میں پنجابی کے محاورے میں محاورے کم ہوتے ہیں اور بے عزتی زیادہ ہوتی ہے۔“
اس بات پر سب ہنس پڑے ماسوائے سرجی کے۔ وہ ابھی روٹھے ہوئے تھے اور بولے۔ ”اردو کی تو قدر نہیں ہے مگر پنجابی زبان کی بھی انہیں قدر نہیں ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ان کی مادری زبان سنسکرت ہے۔“
شہباز مسکرا کر سرجی سے بولا۔ ”چھوڑیں اس جھگڑے کو۔ لوگ ہمیں لڑا کر خوش ہوتے ہیں اور ہم کیا بے وقوف ہیں کہ ہر وقت لڑتے رہیں۔“ پھر وہ سرجی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ یہ تو مانیں کہ ہم آپ کے کام آئے ہیں۔“
سرجی دھیمے پڑ گئے اور بولے۔ ”وہ تو میں دل سے مانتا ہوں مگر آپ بھی تو تنکا اتار کر چھپر رکھ دیتے ہیں۔“
شہباز نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا اور بولا۔ ”ایک سیاپا ختم کرتا ہوں اور یہ محاوروں کا سیاپا شروع کر دیتے ہیں۔“

مطیع اللہ تجسس سے بولا۔ ”سرجی! اس چھپر والے شعر کا مطلب کیا ہے؟“
مطلب جو بتایا وہ یہی تھا کہ کام آ کر اس کا معاوضہ مانگتے ہیں۔
مجھے کل گیارہ بجے جاب پر نکلنا تھا۔ میں کمرے میں سونے چلا گیا اور لیونگ روم میں ابھی بحث جاری تھی اور سرجی مطیع اللہ کو کہہ رہے تھے۔ ”یہ بھی تمہیں معلوم نہیں کہ محاوروں اور شاعری میں کیا فرق ہوتا ہے۔ ڈوب مرنے کا مقام ہے، پاکستانیوں کے لیے۔“
مفتی اور میری ہیموسال کی شفٹ مختلف تھی۔ وہ صبح جاتا تو میں دوپہر ایک بجے جاتا تھا۔ بیچ کے دو گھنٹے ہم فیکٹری میں اکٹھے ہوتے تھے۔ ایک دن میں ہیموسال گیا تو سب دیسی لنچ روم میں بیٹھے تھے۔ مفتی بہت غصے اور دکھ میں ڈوبا لگ رہا تھا۔ سب اس کے گرد بیٹھے مفتی کو تسلیاں دیتے نظر آ رہے تھے مگر سب کے چہروں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی چھائی تھی۔
میں ساتھ جا کر بیٹھا تو اختر نے اپنا منہ میرے کان کے قریب کر کے کوئی راز کی بات بتانا چاہی مگر وہ اپنی ہنسی ضبط کرنے کے چکر میں اپنا سانولا چہرہ سرخ کر بیٹھا تھا۔ فزیکا میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اس سے پوچھا۔ ”کیا ماجرا ہے؟“
وہ مجھے دیکھتا رہا مگر جواب نہ دیا۔ مجھے بہت غصہ آیا۔ اس سے پہلے میں اس بدتمیزی پر اس کی خبر لیتا کہ منظر نے اردو میں کہا۔ ”یہ میری جانب دیکھ رہا ہے۔ اس کی انگلی نہیں دیکھتے مجھ پر اٹھی ہوئی ہے۔“ میں نے فزیکا کی انگلی پکڑ کر اپنی جانب کی اور پھر اس سے پوچھا۔ ”مفتی کیوں ناراض ہے؟“
میں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ فزیکا کی دونوں آنکھیں آپس میں نہیں ملتی تھیں۔ سامنے بیٹھنے والوں کو مغالطہ ہو جاتا تھا کہ وہ کس جانب دیکھ رہا ہے۔ میں نے اس کی انگلی پکڑی، اپنی جانب اسے متوجہ کیا کیونکہ وہ جس سے بات کر رہا ہوتا ہے تو اسی جانب اپنی انگلی کیے رکھتا ہے۔
فزیکا مجھے مفتی کی خفگی کی وجہ بتاتے ہوئے بولا۔ ”جین نے اس سے بہت بدتمیزی کی ہے۔“
میں پریشان ہو گیا۔ پوچھا۔ ”اس نے کیا کر دیا ہے؟“
فزیکا نے مفتی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ مفتی خود بتلائے گا۔
اب مفتی روہانسی آواز میں اپنی ظلم کہانی بتا رہا تھا۔ ”تم اور جین ایک ہی ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتے ہو۔ اسے سمجھا دو کہ میں اپنی عزت پر دھبا نہیں لگنے دوں گا۔“
میں نے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا۔ ”میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ اس سے اکیلے میں مت ملا کرو۔ اس نے ابھی شادی نہیں کی اور وہ کسی وقت بھی کسی کی بھی عزت داغ دار کر سکتی ہے۔“
اختر جو پچھلے پانچ منٹ سے متواتر لرز رہا تھا کیونکہ اس نے اپنی ہنسی دبائی ہوئی تھی۔ میری بات سن کر وہ زیادہ ضبط نہ کر سکا اور اس کے منہ سے تیز سیٹی کی طرح کا لمبا قہقہہ بلند ہوا بلکہ گرا۔ مفتی نے اس کی جانب غصے سے دیکھا اور پھر مجھ سے بولا۔ ”یہ وہ بات نہیں بلکہ یہ دوسری بات ہے۔“ سانس لے کر پھر بولا۔ ”اس نے آج مجھے اپنے کتے سے بھی کم تر کر دیا ہے۔“
میں بولا۔ ”اوہ اس کی یہ جرأت۔ اشرف المخلوقات کی اتنی تضحیک؟“
اس نے پھر جو ماجرا سنایا تو میں بھی اپنی ہنسی دبانے میں ناکام ہونے لگا تھا۔
جین اپنے ڈیپارٹمنٹ میں گہری سوچوں، اداسیوں اور محرومیوں کو لیے کھڑی تھی۔ اکیلی تھی اور مفتی کسی خوشگوار حالت میں اس سے گپ شپ کرنے لگا۔ مفتی نے پوچھا۔ ”اتنی خاموش کیوں ہو؟“
”میرا کتا بیمار ہے۔“ جین نے جواب دیا۔
”کتوں کی بجائے انسانوں پر توجہ دو۔ تو زیادہ بہتر نہ ہوگا؟“
جین تنک کر بولی۔ ”کیا تم پر توجہ دوں؟“
قہقہہ لگا کر بولا۔ ”آزما کر تو دیکھو۔“
وہ بھڑک کر بولی۔ ”تم کیا کتے سے بہتر ہو؟“
وہ فق ہو کر بولا۔ ”جین یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“
وہ طیش میں آ کر بولی۔ ”میرا کتا تم سے زیادہ حسین اور سمجھدار ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔“
مفتی گھگیا کر بولا۔ ”میری بات تمہیں بری لگی؟“
وہ بے نیازی سے بولی۔ ”بات کے علاوہ تم بھی برے لگے اور تم نے میرے کتے کی بے عزتی کی ہے۔“
مفتی شرمندہ ہو کر بولا۔ ”اچھا میں چلتا ہوں۔“
یہ چلا آیا اور وہ ابھی تک غصے میں ہے اور اسے پیٹھ پیچھے بھی گھور رہی ہے۔
میں نے مفتی سے کہا۔ ”تمہیں کیا ضرورت تھی کہ اسے کہتے کہ کتے کی جگہ تمہیں آزما کر دیکھے؟“

"میں نے یہ کب کہا؟"
"مفہوم تو یہی تھا بالفرض وہ تمہیں آزمانا چاہتی تو کیا تم اس آزمائش پر پورا اتر سکتے تھے؟"
یہ سن کر ہنسی دبائے اختر کے ضبط کا ایک اور بند ٹوٹ گیا اور لمبا قہقہہ سیٹی بجاتا باہر نکلا۔
گورے اپنے کتوں سے اتنا پیار کرتے ہیں جتنا اپنی اولاد سے بھی نہیں کرتے۔ اگر مفتی جین کے کتے کی جگہ اپنے آپ کو پیش نہ کرتا تو وہ اسے آزما بھی لیتی مگر مفتی سے ٹیکنیکل غلطی ہوگئی تھی۔ وہ اس کی نظروں سے گرچکا تھا۔ اتنے میں جین اپنا کافی کا مگ پکڑے ڈولتی ہوئی لنچ روم میں داخل ہوئی۔ مفتی سمیت اختر بھی سہم گیا۔ اس نے بے پروائی سے سب کو گڈ آفٹرنون کیا۔ ہم نے اس کی تقلید کی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "تمہارے کتے کا کیا حال ہے؟"
وہ سنجیدگی سے بولی۔ "آج کل اداس رہتا ہے لگتا ہے ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔"
"مفتی بھی آج اداس ہے اور ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔"
وہ حیرت سے بولی۔ "وہ کیوں؟"
"تم نے ہی تو کہا ہے کہ تمہارا کتا اس سے زیادہ خوب صورت ہے۔"
وہ ماتھے پر بل دے کر بولی۔ "وہ ہے تو میں نے بولا ہے اس کی براؤن آنکھیں ہیں۔ خوب صورت چہرہ ہے۔ میں نے کون سی بات غلط کہی ہے؟"
میں خاموش اس لیے ہوگیا کیونکہ اس کے لفظوں کی برچھیاں میں برداشت نہ کرسکتا تھا۔
جین ہمیشہ صبح کی شفٹ میں آتی تھی۔ وہ ہمارے ڈپارٹمنٹ کی ٹیم لیڈر بھی تھی۔ بولتی تو چپ نہ ہوتی اور جب چپ ہوتی تو کوئی لاکھ جتن کرلے وہ بولتی نہ تھی۔ عمر کے تیس سال گزار چکی تھی اور شادی نہیں کی تھی۔ شکل کی اچھی بھلی تھی۔ سگریٹ بے تحاشا پیتی۔ میں اور وہ اکثر اکٹھے سگریٹ پینے پارکنگ لاٹ میں کھڑے ہوتے تھے۔ جتنی دیر مجھے ایک سگریٹ پینے میں لگتی تو وہ دو تین پھونک جاتی تھی۔
ایک دن میں دوپہر کی شفٹ میں آکر لنچ روم میں بیٹھا تھا۔ سب دوست وہیں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ میرے پاس ساتھ لانے کو کچھ نہ ہوتا تھا۔ اس دن میں ان سب کے درمیان بیٹھ گیا۔ اتنے میں جین لنچ روم میں داخل ہوئی۔ مجھے دیکھا تو بولی۔ "ندیم! میں لنچ کرنے باہر جارہی ہوں تم ساتھ چلو گے؟"
ساتھ بیٹھا اختر سرخ ہوا تو مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی بے وقتی ہنسی دبائے بیٹھا ہے۔ انڈین سریش منظر کو آنکھ مارنے لگا۔ منظر نے مفتی کو میز کے نیچے پاؤں کا ٹھوکا لگایا۔ پرتیک آنکھیں مٹکانے لگا اور مجھے ان کی حرکات پر طیش آنے لگا۔ میں نے ان سب کا جائزہ غصے بھری نظروں سے لیا اور جین سے بولا۔ "چلو میں تیار ہوں۔ ہم باہر نکل رہے تھے کہ پیچھے سے منظر کی آواز آئی۔ "واپس ادھر ہی آنا ہے۔"
میں نے سنی ان سنی کی اور میں دروازے کی طرف جین کے ساتھ بڑھ گیا۔ جین کے ساتھ لنچ پر جانا اتنا مہنگا پڑے گا مجھے پتا نہ تھا میں تو اپنے ساتھیوں کے رویے سے تنگ آکر اس کے ساتھ جارہا تھا۔
دروازے سے باہر نکلے تو ریسپشن پر نتاشا بیٹھی تھی۔ اسے پچھلے دنوں استقبالیہ پر رکھا گیا تھا۔ درمیانہ قد، گوری رنگت تو بہرحال ہونی تھی اور ساتھ بوائے کٹ سیاہ بال تھے۔ دیکھنے والوں کے لیے جاذب نظر تھی۔ وہ کچھ کام نہ ہونے کی وجہ سے بے کار بیٹھی تھی۔ اس نے جین سے پوچھا کہ اگر تم لوگ لنچ پر جارہے ہو تو میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔ جین اس سے بولی۔ "چلو شاباش فٹافٹ تیار ہوجاؤ۔"
اس نے تیار کیا ہونا تھا، بس اپنے آپ کو سمیٹا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔
میں اور جین کار میں آگے بیٹھے اور نتاشا پچھلی سیٹ پر نیم دراز ہوگئی۔ ہم ایئرپورٹ روڈ پر آئے اور پھر ہائی وے 27 پر چڑھ گئے۔ آگے جاکر جین نے ذیلی سڑک پکڑی اور ایک پب کے سامنے گاڑی روک لی۔ میں نے پوچھا۔ "لنچ نہیں کرنا ہے؟"
وہ بولی۔ "پی کر لنچ کرنے جائیں گے۔"
ہم پب میں آبیٹھے۔
اندر قدرے اندھیرا تھا اور مدھم روشنی چھائی تھی۔ ہم تینوں بارٹینڈر کے کاؤنٹر کے سامنے اسٹولوں پر بیٹھ گئے۔ میں اس سے پہلے کسی پب میں نہیں گیا تھا۔ مختلف سفرناموں میں پب کا تذکرہ تو سنا تھا مگر رونمائی آج ہورہی تھی۔ دھیمی موسیقی بج رہی تھی اور نتاشا نے ہولے ہولے کاؤنٹر پر طبلہ بجانا شروع کردیا۔ میرے ساتھ جین اور جین کے ساتھ نتاشا بیٹھی تھی۔ سامنے دیوار کے ساتھ بنے ایک شیلف میں کئی اقسام کی شرابیں سجی تھیں۔ میں اپنے تاثرات سے یہ ظاہر نہ ہونے دیتا تھا کہ کسی مے خانے میں پہلی بار آیا ہوں۔ تبھی......!

(جاری ہے)

کیوبا سے فرار

ولید چیمہ

اس نے پورے ملک کو ایک جیل خانے میں تبدیل ہوتے دیکھ کر فرار کی راہ کا انتخاب کیا لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں تھا، زمینی راستوں پر خاردار باڑ لگی تھی اور سمندر میں آبدوزیں تاک میں تھیں لیکن اس نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ تن تنہا فرار ہوگیا تاکہ کوئی سہارا تلاش کرسکے اور جیسے ہی اسے سہارا ملا بیوی بچوں کو اس ملک سے نکالنے کے لیے ہوائی جہاز لے کر پہنچ گیا۔

فرار کی کوشش کا ایک انوکھا طریقہ کار

چھتیس سالہ اور لیسٹس لورنیز و اپنے ہوائی جہاز کے کاک پٹ میں بیٹھا آلات کی پڑتال کررہا تھا۔ دور افق پر سورج چمک رہا تھا۔ جب وہ اپنا کام مکمل کرچکا تو ریڈیو آن کر کے پُراعتماد لہجے میں بولا۔ "یہ سیسنا 5819 ایکس ہے۔ ابھی رن وے چھوڑنا چاہتا ہوں رخ جنوب کی طرف ہے۔"
لورنیزو کا سیسنا میراتھن کے چھوٹے سے ہوائی اڈے پر کھڑا تھا۔ یہ شہر امریکی ساحلی ریاست فلوریڈا میں واقع ہے۔ ہوائی اڈے کی انتظامیہ کو خبر دینا ضروری نہیں تھا لیکن وہ

دوسرے پائلٹوں کو اپنی جگہ بتانا چاہتا تھا۔ آج ہفتے کا دن تھا اور تاریخ 19 دسمبر 1992ء آج ایک معمولی غلطی بھی بڑی مہنگی پڑ سکتی تھی۔ لہٰذا وہ بہت محتاط تھا۔ جلد ہی دو انجنوں والا چھ نشستی سیسنا رن وے پر دوڑا اور پھر ہوا میں بلند ہو گیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک ہزار فیٹ کی بلندی پر جا پہنچا۔ اب لورنیزو نے کیوبا کے شمالی ساحل کا تفصیلی نقشہ اپنی گود میں پھیلا لیا۔ لورنیزو پر خوشی اور گھبراہٹ کے ملے جلے جذبات طاری تھے۔ وہ اکیس ماہ سے اپنی بیوی وکی اور دو بیٹوں گیارہ سالہ رینئیل اور چھ سالہ ایلجنڈرو سے بچھڑا ہوا تھا۔ اس کا منصوبہ کامیاب ہو جاتا تو اس کی اذیت ناک تنہائی ختم ہو جاتی۔ وہ بے تابی سے اسی دن کے انتظار میں تھا لیکن یہ منصوبہ خطرات سے خالی نہ تھا۔ پچھلی ہی رات اسے ایک دوست نے خبردار کیا تھا۔ ”یہ منصوبہ خودکشی کے مترادف ہے۔“

دراصل کیوبن ریڈار سیسنا کو شناخت کر لیتے تو آن واحد میں مگ طیاروں کے میزائل اسے تباہ کر ڈالتے پھر یہ خطرہ بھی تھا کہ کوئی کیوبن خاموشی سے اپنی حکومت کو اس کی آمد پر چوکنا کر دیتا۔ گویا یہ مہم پھندا بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ اسے بخوبی اس بات کا علم تھا کہ اگر وہ پکڑا گیا تو کیوبن حکومت فوراً اسے شوٹ کر دے گی لیکن اس نے خطرہ مول لینے کا بیڑا اٹھا لیا تھا۔

لورنیزو کے لیے سب سے بڑا خوف یہ تھا کہ اگر دونوں بیٹے مقررہ جگہ نہ پہنچے تو پھر کیا ہوگا؟ یہ سوچ کر لورنیزو نے بے اختیار سینے پر لٹکی صلیب چھوئی اور اپنے رب سے دعا مانگی۔ ”اے خدا! وہ وہاں موجود ہوں۔“

ہوائی جہاز جب کیوبن فضائی حدود میں داخل ہوا تو لورنیزو نے پروں پر نقب بتیاں بجھائیں اور سیسنا کا رخ سمندر کی طرف موڑ دیا۔ اب وہ سطح سمندر سے محض دس فٹ بلند پرواز کرنے لگا تاکہ کیوبن ریڈار سے بچ سکے۔ تیس منٹ کی پرواز کے بعد اسے دور ہوانا کے مضافاتی علاقے ماتنزہ کی عمارتیں نظر آنے لگیں۔ کچھ ہی دیر میں سیسنا اس سڑک پر پہنچ گیا جو شہر سے باہر مشرق کی سمت جاتی تھی۔ جہاں سڑک کا اتصال دریائے کانیمار سے ہوتا، وہاں پل بنا ہوا تھا۔ لورنیزو وہ جگہ دیکھ کر بڑبڑایا۔ ”آخر میری منزل آ پہنچی۔“

کیوبا کی حکومت وہاں سے اندرون ملک جانے کے لیے ایک دو رویہ سڑک تعمیر کر رہی تھی۔ اس کا کچھ حصہ مکمل ہو چکا تھا۔ لورنیزو اسی شاہراہ پر سیسنا اتارنا چاہتا تھا۔ اب وہ سو فٹ بلند ہو گیا تاکہ اترنے کی تیاری کر سکے۔ منصوبے کے مطابق وکی اور دونوں بچوں نے پل سے ایک میل دور کھڑے ہونا تھا۔ انہوں نے چمک دار نارنجی رنگ کی قمیصیں اور ٹوپیاں پہنی تھیں تاکہ لورنیزو انہیں پہچان سکے۔ لورنیزو اترنے اور پھر پرواز کرنے میں زیادہ سے زیادہ ایک منٹ صرف کرنا چاہتا تھا۔ گویا وقت بہت کم تھا اور مقابلہ بڑا سخت لیکن آدھا میل کا فاصلہ طے ہوا تو سڑک یک دم ایک پہاڑی پر چڑھ گئی۔ یوں اس سے آگے کا منظر دیکھنا ناممکن ہو گیا۔

اب لورنیزو کو احساس ہوا کہ سیسنا کو مزید بلند کرنا پڑے گا تبھی وہ دیکھ سکتا ہے کہ وکی اور بچے سڑک پر کھڑے ہیں یا نہیں۔ وہ جہاز زیادہ بلند نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اب مجبوری تھی۔

لورنیزو نے پھر خدا سے اپنی کامیابی کی دعا مانگی اور جہاز کا تھروٹل اٹھا دیا۔ اسے احساس تھا کہ وہ موت اور زندگی کی جنگ لڑ رہا ہے۔ ایک طرف دکھ اور تکلیف کا سماں تھا تو دوسری طرف خوشیوں بھری زندگی۔ ڈیڑھ سو فٹ کی بلندی پر جا کر آخرکار جب اسے آگے کا منظر نظر آیا تو لورنیزو کا دل دھڑکنے لگا۔ سردی کے باوجود ماتھے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔

☆......☆

لورنیزو نے اکیس ماہ قبل مارچ 1991ء میں آخری بار اپنی پیاری بیوی کا ہاتھ تھاما تھا۔ تب وہ اپنے اپارٹمنٹ کی عمارت کے باہر کھڑے تھے۔ یہ عمارت کیوبن فضائیہ کے سانتا کلارا نامی مستقر میں واقع ہے۔ تب لورنیزو نے سرگوشی کے انداز میں وکی سے کہا۔ ”میرے پیغام کا انتظار کرنا اگر تم بچوں کے ساتھ نہ آ سکی تو میں تمہیں لینے آ جاؤں گا۔“

اس نے بھیگی آنکھوں سے بیوی کو الوداع کیا اور اپنے فضائی مستقر روانہ ہو گیا۔ اسے معمول کے مطابق اپنے مگ 23 لڑاکا طیارے میں پرواز کرنی تھی لیکن اس بار ہوا میں بلند ہوتے ہی لورنیزو نے طیارے کا رخ شمال کی طرف کر دیا۔ اٹھارہ منٹ بعد وہ ریاست فلوریڈا میں واقع امریکی بحریہ کے فضائی مستقر ویسٹ نیول ایئر اسٹیشن پہنچ گیا۔ اس نے S.O.S کا اشارہ دیا تاکہ فضائی مستقر والے مدد کریں اور وہ بہ آسانی دشمن ملک میں اتر سکے۔ اس نے فضائی مستقر کے تین چکر لگائے اور ہوائی اڈے پر اتر گیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے فوجیوں کی گاڑیوں نے مگ 23 کا محاصرہ کر لیا۔ لورنیزو نے کاک پٹ کھولا اور متجسس فوجیوں کی طرف دیکھ کر ہسپانوی میں بولا۔ ”میں سیاسی پناہ اور تحفظ کی درخواست کرتا ہوں۔“

ایک ہسپانوی فوجی نے جملہ ترجمہ کر کے اپنے افسر کو

بتایا۔ لورنیزو کو خوف تھا کہ اسے گرفتار کر کے جیل بھیجا جا سکتا ہے لیکن فوجی افسر کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے بلند آواز میں کہا۔ ”امریکا میں خوش آمدید۔“

کیوبن حکومت کو جب اطلاع ملی کہ لورنیزو امریکا فرار ہو گیا ہے تو فوجیوں نے اس کے اپارٹمنٹ پر دھاوا بول دیا۔ انہوں نے وکی کو بتایا کہ اس کا شوہر غدار نکلا۔ وکی نے پُرسکون لہجے میں بتایا کہ وہ اپنے شوہر کے عزائم سے ناواقف تھی۔ اگلے دن ایک سرکاری ماہر نفسیات اس کے گھر آ دھمکی۔ اس نے وکی کو کہا۔ ”تمہارے شوہر نے انقلاب کی عزت مٹی میں ملا دی۔ اس نے تمہیں بھی دھوکا دیا۔ اب وہ امریکا جا کر رنگ رلیاں منائے گا اور کسی حسین لڑکی سے شادی کر لے گا۔“

وکی نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے ابھی تمہیں کسی سے محبت نہیں ہوئی اس لیے تم اس کا مطلب نہیں سمجھ سکتی۔“

لورنیزو اور وکی کالج میں زیر تعلیم تھے کہ ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا ہو گئے۔ 1976ء میں انہوں نے شادی کر لی۔ بعد ازاں لورنیزو بحیثیت پائلٹ طویل عرصے کے لیے انگولا چلا گیا۔ یوں انہیں کبھی جدائی کا چرکا سہنا پڑا۔ 1986ء میں اسے چار سالہ فضائی تربیت کے لیے سوویت یونین جانا پڑا۔

بچپن ہی سے لورنیزو آزاد طبیعت کا مالک تھا لیکن اس پر شروع سے یہ نظریہ ٹھونس دیا گیا کہ اسے کمیونسٹ انقلاب کو جان سے زیادہ عزیز رکھنا ہے۔ ایک بار سات سالہ لورنیزو سے باپ نے بطور امتحان سوال کیا۔ ”اگر میں اور تمہاری ماں امریکا جانے کا منصوبہ بنالیں، تو تم کیا کرو گے؟“

لورنیزو نے بڑی ذمہ داری سے کہا۔ مادر وطن سے غداری کرنے پر میں یہ پسند کروں گا کہ آپ دونوں مار دیئے جائیں۔ لورنیزو اب یہ سوچ کر متوحش تھا کہ ایسے ہی تشدد پسند خیالات اس کے دونوں بچوں پر بھی ٹھونسے جائیں گے۔

ماسکو میں دوران قیام ہی صدر گورباچوف نے وسیع اصلاحات کا منصوبہ شروع کر دیا۔ یہ گویا کمیونزم کے زوال کا اعلان تھا۔ جولائی 1990ء میں جب خاندان واپس کیوبا پہنچا لورنیزو کو امید تھی کہ اب صدر کاسترو بھی اپنی پالیسیوں میں تبدیلی لائے گا لیکن الٹا کیوبن حکومت کی پالیسی پہلے سے زیادہ سخت ہو گئی۔

ایک دن اس نے تلخ لہجے میں بیگم سے کہا۔ ”میں ان کی پالیسیوں کے مطابق چل چل کر تنگ آ گیا ہوں۔ اب میرے بچوں کو بھی لکیر کا فقیر بننا پڑے گا۔ میں ایسی پابند زندگی پر لعنت بھیجتا ہوں۔“

وکی نے شوہر کو پریشان دیکھا تو بولی۔ ”اگر آپ چاہتے ہیں تو یہاں سے چلے جائیں۔“

یوں لورنیزو نے امریکا فرار ہونے کا منصوبہ بنا لیا۔ اسے یقین تھا اگر وہ کامیاب ہو گیا تو صدر کاسترو اس کے خاندان کو نہیں روکے گا۔ آخر کیوبن حکومت اعلان کر چکی تھی کہ جن شہریوں کو کسی ملک سے ویزا مل جائے وہ کیوبا چھوڑ سکتے ہیں لیکن لورنیزو کو قطعاً احساس نہ تھا کہ یہ اعلان محض صدر کاسترو کا ایک جھوٹ ہے۔ امریکا پہنچنے کے تین ماہ بعد لورنیزو نے بذریعہ ڈاک وکی اور اپنے دونوں بچوں کا امریکی ویزا کیوبا بھجوا دیا۔ وکی امریکی کاغذات لے کر کیوبن پاسپورٹ دفتر پہنچ گئی۔ وہاں ایک افسر نے اسے بتایا کہ وہ جزیرے سے نہیں جا سکتی۔ افسر کا کہنا تھا۔ ”تمہارا شوہر اتنا ماہر ہواباز ہے کہ مگ اڑا کر امریکا لے گیا۔ اب ذرا وہ پھر اپنی مہارت دکھائے اور آ کر تمہیں لے جائے۔“

خفیہ پولیس مسلسل وکی اور اس کے بچوں کی نگرانی کر رہی تھی۔ وکی گھبراہٹ اور خوف کا شکار ہو کر اپنے والدین کے گھر ہوانا منتقل ہو گئی۔ لورنیزو جب بھی فون کرتا تو وہ ریکارڈ کر لیے جاتے۔ اکثر کال کو درمیان سے کاٹ دیا جاتا۔

اکتوبر 1991ء سے شارٹ ویو ریڈیو کے ذریعے لورنیزو صدر کاسترو کے خلاف تقریریں کرنے لگا۔ اس نے آمر پر الزام لگایا کہ اس نے زبردستی اس کی بیوی وکی اور دونوں بچوں کو روک رکھا ہے۔ اس دوران امریکا میں کیوبن شہریوں کی ایک غیر سرکاری تنظیم ولا درلیس فاؤنڈیشن لورنیزو کی مدد کو آ پہنچی۔ انسانی حقوق کی علمبردار یہ تنظیم کیوبا کے ایک سیاسی قیدی آرمینڈو ولادرلیس نے قائم کی تھی۔ اس نے 43 سال تک جیلوں میں قید رہ کر حکومت کے مظالم سہے تھے۔ جولائی 1992ء میں صدر کاسترو نے اسپین کا دورہ کیا۔ لورنیزو بھی وہاں جا پہنچا اس نے میڈرڈ کے ایک مرکزی چوک میں خود کو زنجیروں سے باندھا اور سات دن کی بھوک ہڑتال شروع کر دی مگر یہ ڈرامائی اپیل بھی پتھر دل کاسترو پر اثر نہ کر سکی۔ لورنیزو نے گورباچوف کو خط لکھا مگر یہ عمل بھی رائیگاں گیا۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر لورنیزو نے فیصلہ کیا کہ اسے ہی ہوانا جا کر بذریعہ ہوائی جہاز اپنے خاندان کو لانا ہوگا۔ وہ مگ اور دوسرے بڑے جہاز اڑا سکتا تھا جس کے اترنے کے لیے رن وے کی ضرورت تھی جب کہ چھوٹے جہاز کسی سڑک پر بھی اتر سکتے تھے اس لیے وہ سیسنا اڑانے کی تربیت حاصل کرنے

لگا۔

ادھر کیوبا میں حکومت وکی کے گرد پہرا تنگ کرنے لگی۔ ایک دن ایک آدمی وکی کے پاس آیا اور کہا۔ ”میں آپ کا ہمدرد ہوں۔ میری سمندر میں کشتیاں چلتی ہیں اگر آپ کا ارادہ ہو تو میں ایک کشتی کے ذریعے آپ کو امریکا پہنچا سکتا ہوں۔ وکی جانتی تھی کہ اگر کوئی جزیرے سے فرار ہونے کی کوشش کرے تو اسے تین سال جیل کی ہوا کھانا پڑتی ہے پھر وہ پکڑی جاتی تو حکومت اس کے بچوں پر قبضہ کرلیتی۔ کاسترو درحقیقت یہی چاہتا تھا۔ یوں وہ لورنیزو سے بہترین انداز میں انتقام لے لیتا۔ وکی نے اس آدمی کو بتایا۔ ”میں غیر قانونی طریقے سے کبھی نہیں جاؤں گی۔“

وہ آدمی غصے سے پیر پٹختا چلا گیا۔ تب جذبات کی ماری وکی کا پورا جسم لرز رہا تھا۔ اس وقت وکی کو احساس ہوا کہ وہ ایک پھندے میں پھنستے ہوئے بال بال بچی ہے۔ چند ہفتے بعد ایک اور مہمان نے وکی کو ایسا پیغام سنایا کہ اس کا دل خوشی سے زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یہ ورجینیا گونزیلے تھی، میکسیکو میں ایک غیر سرکاری تنظیم کی عہدے دار۔ لورنیزو اس تنظیم سے بھی مدد کا طلب گار ہوا تھا۔ لہٰذا وہ اسے خوب جانتی تھی اس بار وہ اپنی فلاحی سرگرمیوں کے سلسلے میں کیوبا آنے لگی تو لورنیزو نے ورجینیا کے ہاتھ اپنے خاندان کے لیے کچھ تحفے بھجوائے۔ ان تحفوں میں سب سے اہم اس علاقے کا نقشہ تھا جہاں لورنیزو اترنا چاہتا تھا۔ اگلے دن وکی، ورجینیا اور بچے اس علاقے میں پہنچ گئے۔ وہاں وکی نے شاہراہ کا جائزہ لیا تو اسے احساس ہوا کہ کم ٹریفک کی بنا پر ہی شوہر نے اترنے کے لیے یہ جگہ چنی ہے۔ ورجینیا نے اسے بتایا۔ ”میرا خیال ہے لورنیزو دو تین ماہ بعد ہی یہاں آئے گا۔ اگر میں کبھی فون پر تم سے میکسیکو پارٹی کا ذکر کروں تو سمجھ جانا کہ منصوبے پر کامیابی سے کام جاری ہے اگر میں تذکرہ نہ کروں، تو سمجھ جانا منصوبہ رک چکا ہے۔“

ورجینیا کی ہدایت پر وکی اسے قریبی بازار لے گئی۔ وہاں اس نے تینوں میزبانوں کے لیے چمک دار نارنجی رنگ کی ٹی شرٹیں اور ٹوپیاں خریدیں۔ رخصت ہوتے ہوئے اس نے وکی کو ایک ننھی منی صلیب بھی دی اور کہا۔ ”اسے اپنے پاس رکھنا یہ تمہاری حفاظت کرے گی۔“ اس دوران ولادو ریس فاؤنڈیشن نے لورنیزو کو اپنا سیسنا طیارہ اڑانے کی اجازت دے دی۔ لورنیزو نے اسے اڑا کر دیکھا تو اس کو بہترین حالت میں پایا۔ ہوائی اڈے پر اترتے ہی اس نے ساتھیوں کو بتایا۔ ”میں نے لائسنس لے لیا اور اب مجھے ایک سیسنا بھی مل گیا ہے۔ اب میں جانے کے لیے تیار ہوں۔“

18 دسمبر 1992ء کی شام چھ بجے اس نے ورجینیا کو میکسیکو فون کیا اور بتایا۔ ”کل پارٹی کے لیے ساری تیاری مکمل کرلی گئی ہے۔“

لورنیزو کو احساس ہوا کہ یہ سن کر ورجینیا نے اطمینان کا گہرا سانس لیا ہے پھر لورنیزو نے اپنے خاندان کا حال پوچھا۔ ورجینیا نے اسے بتایا۔ ”وہ ٹھیک ہیں وہ دیکھنے میں نارنگی نظر آئیں گے۔“

اس رمزی جملے سے لورنیزو جان گیا کہ انہوں نے چمک دار نارنجی رنگ کی ٹی شرٹیں پہن رکھی ہوں گی۔ اب لورنیزو نے وکی کو ہوانا فون کیا اور پہلے سے طے شدہ رمزی جملوں میں گفتگو ہونے لگی۔ وکی نے اسے بتایا۔ ”تمہارا باپ پہلے سے کمزور ہوچکا ہے مگر اس کی طبیعت ٹھیک ہے۔“

اس جملے کا مطلب یہ تھا کہ اسے لورنیزو کے منصوبے سے اتفاق تھا۔ لورنیزو نے اگلا رمزی جملہ بولا۔ ”میں تمہیں رقم بھجوا رہا ہوں تاکہ تم ٹی وی اور وی سی آر خرید سکو۔“ مطلب یہ تھا کہ وہ انہیں لینے کل آرہا ہے۔

یہ سن کر وکی بولی۔ ”اتنی جلدی! خیر بچوں کے لیے ساڑھے پانچ اور ساڑھے چھ سائز کے جوتے بھی بھجوا دینا۔“

یہ کہہ کر وکی نے فون بند کردیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ آخری جملے میں اس نے شوہر کو پیغام دے دیا تھا کہ وہ مقررہ جگہ ساڑھے پانچ تا ساڑھے چھ کے درمیان پہنچ جائے جب سورج ڈوب رہا ہوتا ہے۔

18 دسمبر کی رات وکی پریشانی کے مارے بالکل نہ سو سکی۔ صبح 8 بجے اس نے بچوں کو لیا۔ والدین سے ملی اور باہر نکل گئی۔ انہوں نے قمیص پتلون پہن رکھی تھی۔ ان کا واحد سامان ایک چھوٹے بیگ میں بند وکی کے کاندھوں پر جھول رہا تھا۔ اس میں تیراکی کا لباس، نارنجی ٹی شرٹیں اور ٹوپیاں موجود تھیں۔ ان کا رخ اس ساحل سمندر کی طرف تھا جس کے قریب ہی شاہراہ واقع تھی۔ لڑکے خوش تھے کہ وہ جی بھر کے تیراکی کریں گے۔ دراصل احتیاط کے پیش نظر وکی نے انہیں منصوبے کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ میمی نامی وہ ساحل مقررہ جگہ سے ایک میل دور تھا۔ وکی کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ تقریباً خالی ہے۔ وہ دس بجے وہاں پہنچے۔ آج دھوپ نکلی ہوئی تھی مگر فضا میں خنکی تھی۔ لہٰذا اس نے بچوں کو نہانے سے روک دیا اور کہا کہ وہ دو تین بجے سمندر کا رخ کریں۔

ایک بجے دونوں بچے بے چین ہوگئے۔ ماں ان کا دل بہلانے انہیں ساحل پر بنے چھوٹے سے ریستوران میں لے گئی۔ اندر داخل ہوتے ہی وکی کی ٹانگیں گھبراہٹ کے عالم میں کانپنے لگیں۔ ایک میز پر بیٹھے دو سپاہی اسے گھور رہے تھے۔ وکی نے بیٹھتے ہی بیرے سے کہا کہ پانی لے آؤ یوں وہ اپنے تنے اعصاب کو سکون دینا چاہتی تھی۔ وکی کو محسوس ہوا کہ سپاہی اب تک اس پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ اسے یہ خوف محسوس ہوا کہ شاید وہ منصوبے کے متعلق جان چکے ہیں پھر اپنے خدشات سے پیچھا چھڑانے کی خاطر اس نے بچوں سے کہا کہ وہ سمندر میں نہانے چلے جائیں۔ یوں وہ سپاہیوں کو تاثر دینا چاہتی تھی کہ وہ سیر و تفریح کرنے ساحل پر آئے ہیں۔ الجنڈرو نے تیراکی کا لباس پہنا اور پانی کی طرف چلا گیا لیکن رینغل اب نہانا نہیں چاہتا تھا۔ ماں نے اسے سرزنش کی۔ ”بیٹا! یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے چلو شاباش نہانے چلے جاؤ۔“

وہ بھی نہانے چلا گیا۔ اب وکی نے بیگ سے ناول نکالا اور پڑھنے لگی اور دل ہی دل میں دعا مانگنے لگی۔ ”اے خدا! ہماری حفاظت کرنا۔“ کچھ دیر بعد سپاہی چلے گئے تو وکی نے سکون کا سانس لیا۔ پانچ بجے تینوں نے نارنجی ٹی شرٹیں پہنیں، ٹوپیاں سر پر جمائیں اور خراماں خراماں اس مقام کی سمت بڑھنے لگے جہاں لورنیزو کے جہاز نے اترنا تھا۔ وہ وہاں پہنچے تو انہیں سڑک کے درمیان ہولے ہولے چلتا ایک ٹرک نظر آیا اور وہ بس بھی جو اس کے پیچھے آرہی تھی۔

ہوائی جہاز میں بیٹھے لورنیزو نے ایک لمحے میں سارا منظر دیکھ لیا اس نے جہاں اترنا تھا وہاں ایک بھاری بھرکم ٹرک ہولے ہولے عین سڑک کے درمیان چل رہا تھا۔ ایسے ٹرک سڑکوں کی تعمیر کے دوران استعمال ہوتے ہیں۔ اس سے پیچھے آنے والی بس جلد ہی ٹرک کو پار کرنے والی تھی اور آخر میں اسے نارنجی قمیصوں میں ملبوس تین انسانی ہیولے بھی دکھائی دیے۔ انہیں دیکھتے ہی لورنیزو کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ تب اسے پہلا خیال یہی آیا ”فوراً جہاز اتار دو۔“ مگر نیچے ابھی اترنے کی جگہ خالی نہ تھی۔ اب اس کا ذہن پوری طاقت سے یہ سوچنے لگا کہ ہوائی جہاز کیسے شاہراہ پر اتارا جائے؟ وقت بہت کم تھا اور مقابلہ انتہائی سخت۔ آخر لورنیزو نے فوراً اترنے کا فیصلہ کرلیا تب تک بس ٹرک کو پار کر چکی تھی۔ لورنیزو نے تھروٹل گھمایا اور جہاز کا رخ نیچے ہوگیا۔ اترتے ہوئے جہاز کے پہیے گزرتی بس سے صرف چند فٹ اوپر تھے۔ اب اسے سست رفتار ٹرک سے بچ کر آگے جانا تھا۔

ٹرک نزدیک آیا تو لورنیزو نے تھروٹل پوری قوت سے دائیں سمت گھما دیا مگر جہاز کا ایک پر ٹرک سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ وہ اس سے محض ایک گز دور تھا۔ لورنیزو نے دیکھ لیا کہ ہکا بکا ٹرک ڈرائیور خوف کے عالم میں بت بنا بیٹھا ہے۔ بہر حال لورنیزو نے بالآخر کامیابی سے جہاز سڑک پر اتار لیا۔ وکی اور بچوں کو جہاز اسی وقت نظر آیا جب وہ ان کے نزدیک آکر رک گیا۔ وہ تینوں حیران پریشان اپنی جگہ کھڑے رہ گئے پھر وکی اپنے حواس میں آئی اور چیخ اٹھی۔ ”بھاگو بھاگو یہ تمہارے ابو ہیں۔“

یہ سنتے ہی رینغل جہاز کی طرف دوڑ پڑا۔ تب تک لورنیزو دروازہ کھول کر سیڑھی نیچے لٹکا چکا تھا۔ رینغل جہاز پر چڑھتے ہی باپ سے چمٹ گیا مگر یہ میل ملاپ کا موقع نہ تھا۔ باپ نے اسے پچھلی نشستوں کی طرف دھکیل دیا۔ جلد ہی الجنڈرو اور آخر میں وکی بھی جہاز میں سوار ہوگئے۔ یہ ساری کارروائی منصوبے کے مطابق ایک منٹ میں انجام پا گئی۔ اب لورنیزو نے شاہراہ پر جہاز دوڑایا اور پلک جھپکتے میں ہوا میں بلند ہوگیا اس کا رخ شمال کی طرف تھا۔ اسی وقت لورنیزو نے مسرت کے عالم میں نعرہ مارا اور چلایا۔ ”میں نے کر دکھایا! کاسترو تمہیں اپنے سوالوں کا جواب مل گیا۔ میں واقعی ایک ماہر ہواباز ہوں۔“

وکی اور دونوں بچے زار و قطار رو رہے تھے مگر لورنیزو جوش جذبات میں نہ آیا اور پورے دھیان سے جہاز چلاتا رہا۔ ابھی آخری کڑا مرحلہ باقی تھا۔ اس نے انہیں تنبیہ کی۔ ”نیچے نہ دیکھنا۔“ وہ سمندر سے صرف چند فٹ اوپر تھے۔ اندھیرا چھا چکا تھا۔ سمندر کی بلند لہروں کا پانی جہاز کی کھڑکیوں سے ٹکرا رہا تھا۔ جہاز جیسے ہی کیوبن راکٹوں کی حد سے باہر ہوا لورنیزو نے اسے بلند کرلیا۔ اب اس نے ایک ہاتھ تھروٹل پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے بیوی بچوں کو آغوش میں لے کر انہیں پے در پے بوسے دینے لگا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ رہے تھے۔ رات سات بجے میراتھن ہوائی اڈے کا کنٹرول ٹاور لورنیزو کی آواز سے گونج اٹھا۔ وہ مائیک میں بول رہا تھا۔ ”یہ سیسنا 5819 ایکس ہے۔ محبت سے لدا پھندا جہاز جلد ہی رن وے پر اترنے والا ہے ہمارا استقبال کرنے کو تیار رہیے۔“

انور فرهاد

انگریز راج میں برصغیر کی فلمی صنعت تین حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ پہلا مرکز بمبئی، دوسرا کلکتہ، تیسرا لاہور لیکن جیسے ہی قیام پاکستان کا وقت قریب آیا ہندو سرمایہ دار جن کی لاہور فلمی صنعت پر اجارہ داری تھی آہستہ آہستہ ہجرت کرنے لگے۔ مال و اسباب بھی بمبئی منتقل ہونے لگا۔ اسی درمیان فسادات کی لہر چل پڑی جس نے رہی سہی کسر پوری کردی۔ عاقبت نااندیش بلوائیوں نے اسٹوڈیوز کو آگ لگانا شروع کردیا۔ وطن کی محبت میں سرشار مسلمان ہنرمند جب بمبئی کلکتہ سے لاہور پہنچے تو یہاں راکھ کے ڈھیر منتظر تھے۔ ہجرت کرنے والوں نے اس راکھ کے ڈھیر پر فلمی صنعت کی تعمیر شروع کردی۔ ناممکن کو ممکن کر دکھایا اور یہاں بھی عالمی معیار کی فلمیں بننے لگیں۔ اس صنعت کی تعمیر میں بہتوں نے حصہ ڈالا، انہی میں سے ایک موسیقار کا ذکرِ خاص جس کی دھنیں بھارت میں بھی مقبول تھیں۔

پاکستانی فلمی نگر کے ایک چمکتے ہیرے کی داستان

اللہ رب العزت جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے، جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے مگر وہ جو کچھ دیتا ہے یہ دیکھ کر دیتا ہے کون کس کا مستحق ہے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ شکر خورے کو شکر اور موذی کو ٹکر تو یہ جانکاری ضروری ہے کہ اچھے کا ہمیشہ اچھا انجام ہوتا ہے اور برے کا برا۔ ہم بندے بشر کے ساتھ ہی نہیں ملک، معاشرہ، قصبہ اور شہر کے ساتھ بھی اسی فارمولے پر قدرت کارروائی کرتی ہے۔ مثال کے طور پر میں لاہور کا نام لوں گا۔ آپ نے بارہا سنا ہوگا۔ لاہور، لاہور ہے۔ یعنی

لاہور کی کیا بات ہے۔ کبھی آپ نے سوچا کہ لاہور کو ایسے تعریفی انداز میں کیوں یاد کیا جاتا ہے؟ اگر سوچا ہے تو یقیناً اس نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ لاہور وہ شہر ہے جو ادب، آرٹ، تہذیب اور کلچر کے لحاظ سے ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔ اس شہر کے ادیب، شاعر، صحافی، فنکار، گلوکار اور موسیقار پورے خطے میں اپنی تحریر، اپنے تخیل، اپنی سوجھ بوجھ اور اپنی فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ملک، معاشرہ اور انسانی قدروں کی خدمت کرتے رہے ہیں۔

اس ضمن میں، میں خاص طور پر نئی نسل کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ایک دور تھا کہ لاہور کی بنی فلمیں پورے متحدہ ہندوستان میں دکھائی جاتی تھیں۔ ان میں کام کرنے والے فنکار اور ہنرمند پورے برصغیر میں اپنی کارکردگی کی بنیاد پر پسند کیے جاتے تھے۔ اس دور میں کلکتہ جسے اب کولکتہ کہا جاتا ہے اور بمبئی جو اب ممبئی کہلاتا ہے، ان دونوں جگہوں میں بڑے اور مستند فلمی مراکز تھے۔ بڑی بڑی فلمیں بنائی جاتی تھیں اور انہیں بنانے والے اور ان میں کام کرنے والے ملک گیر شہرت کے حامل تھے جب کہ لاہور کا فلمی مرکز اور یہاں کی فلمیں اور فنکار کسی بھی طرح کلکتہ اور بمبئی کی فلموں اور فنکاروں سے کمتر نہیں سمجھے جاتے تھے اور ان میں سے اکثر اپنی فنی کارکردگی اور شہرت کی وجہ سے کلکتے اور بمبئی کی فلموں میں کاسٹ کیے جاتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ لاہور سے بمبئی جانے والا فنکار یا کلاکار وہیں کا ہو رہتا تھا کیونکہ بمبئی میں کلکتہ اور لاہور کے مقابلے میں بہت زیادہ فلمیں بنتی تھیں۔ ایسے بہت سے اداکار، اداکارائیں، گلوکار، گلوکارائیں اور موسیقار ہیں جنہوں نے لاہور کی فلموں سے شہرت اور مقبولیت حاصل کی مگر بمبئی والوں نے انہیں اپنا بنا لیا۔ آج کی اس نشست میں ہم ان میں سے ایک باصلاحیت موسیقار، فیروز نظامی کا ذکر خیر کریں گے۔

اس سے پہلے کہ اس نابغۂ روزگار موسیقار کے بارے میں تفصیل سے بتاؤں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ برصغیر میں ناطق فلموں کے دور سے موسیقاروں کا ایک مختصر ذکر کروں کہ کن لوگوں نے موسیقی کی دھنوں سے برصغیر کی فلموں کو سجایا اور نغمہ بار کیا۔

بمبئی اور کلکتہ میں ناطق فلموں کے ابتدائی دور میں یا اسے مذکورہ فلموں کی اوّلین دہائی کہہ لیجیے۔ اس میں کئی موسیقاروں نے اپنے فن کا لوہا منوا لیا تھا۔ ان میں آر سی بورال، بدری پرشاد، سندر داس، پران سکھ نائک، ٹلو بھائی نائک، کے سی ڈے، ملک اٹل بسواس، حکیم چند پرکاش، گیان دت اور ذرا بعد میں سی رام چندر اور نوشاد علی نے اپنی اپنی عظمتوں کے جھنڈے گاڑے۔

اِدھر لاہور میں رفیق غزنوی، ایچ سی بالی، ماسٹر جھنڈے خان، بنے خان، بشیر خان دہلوی، ماسٹر غلام حیدر، ماسٹر گوبند رام، جی اے چشتی، دیال گوسوامی، انوپم کھٹک، شیام سندر، پنڈت امرناتھ، دھنی رام اور پچھی رام نے اپنی اپنی طرزوں سے شائقین موسیقی کو بہت متاثر کیا۔ ان مذکورہ معتبر ناموں میں بالخصوص ماسٹر غلام حیدر، جھنڈے خان صاحب، رفیق غزنوی اور جے اے چشتی نے پنجاب کو بمبئی اور کلکتہ کے مقابل لا کھڑا کیا کہ جس پر بعض اوقات کلکتہ اور بمبئی کے نامی گرامی میوزک ڈائریکٹروں نے بار بار رشک کا اظہار کیا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ پنجاب کی فلموں نے بمبئی اور کلکتہ کے فلم سازوں کے لیے ایک دشواری پیدا کر دی۔ بہرحال تینوں ہی مراکز اس لحاظ سے خوش نصیب تھے کہ تینوں ہی جگہوں کو مہان سریلے کلاکاروں کی کھیپ میسر آتی رہی۔

مذکورہ دہائی (1930ء سے 1940ء) ابھی اپنے اختتام کو پہنچ ہی رہی تھی کہ اس کے آخری چند برسوں 1939ء سے 1943ء اور پانچویں دہائی کے ابتدائی کئی سالوں میں نہایت ذہین، فطین، محنتی اور باصلاحیت موسیقاروں کی ایک جواں سال تازہ دم نئی کھیپ سامنے آئی جنہوں نے اپنے اپنے باکمال تخلیقی اسلوب و آہنگ سے مزین فلمی نغموں کی دھنیں ترتیب دے کر اس سریلے سرمائے میں سریلا اضافہ کیا اور رفتہ رفتہ آنے والے سالوں میں یہ سب اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے علم و فن کے سبب سیسہ پلائی دیوار بن گئے۔ یہ اسمائے گرامی برصغیر پاک و ہند کی (بمبئی، کلکتہ، لاہور) فلمی صنعت میں آج بھی سال ہا سال گزرنے کے بعد ایک اکیڈمی، ایک سند، ایک سکہ بند حوالے کے طور پر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ جہاں عظیم فنکاروں کا فن کل بھی زندہ تھا، آج بھی تر و تازہ ہے اور آئندہ بھی کئی نسلیں ان سے محظوظ اور مستفید ہوتی رہیں گی۔ برصغیر پاک و ہند بالخصوص پنجاب کی فلمی صنعت سے وابستہ موسیقاروں کی نامی گرامی کثیر تعداد میں گنتی کے چند ایک نام ہمیں ایسے ملیں گے جنہوں نے کلاسیکی موسیقی کی عملی نظری تعلیم نہایت جان ماری سے حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ملک کی اعلیٰ درسگاہوں سے اعلیٰ سطح کی تعلیم بھی حاصل کی اور یوں موسیقی

کے فن کے ساتھ ساتھ نصابی تعلیم اور جملہ علوم پر بھی ان کی مطالعاتی نظر گہری ہوتی چلی گئی۔ اس ضمن میں رفیق غزنوی، خورشید انور اور فیروز نظامی کے نام بطور حوالہ پیش کیے جا سکتے ہیں۔

ان تینوں مہان موسیقاروں نے اپنے عہد میں موسیقی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درسگاہوں سے اپنے علم کی پیاس بجھائی۔ خواجہ خورشید انور نے گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفہ میں ایم اے کیا۔ رفیق غزنوی نے گریجویشن تک تعلیم حاصل کی۔ فیروز نظامی خاندانی اور حسبی نسبی موسیقار ہونے کے ساتھ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کے فارغ التحصیل تھے۔ یعنی پنجاب یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے۔ یوں رفیق غزنوی اور خواجہ خورشید انور کے ساتھ فلمی دنیا کو ایک اور باقاعدہ تعلیم یافتہ موسیقار میسر آیا۔

فیروز نظامی کو انفرادیت اور اعزاز یہ حاصل ہے کہ باوجود اس کے کہ ان کا گھریلو ماحول صرف اور صرف موسیقی اور گائیکی کو محیط کیے ہوئے تھا اور ایسے ماحول اور فضا میں پرورش پانے والے بچوں اور نوجوانوں کا تعلیمی درسگاہوں کے توسط سے نصابی اور تدریسی آگہی کے حصول کا رجحان نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے مگر قدرت کو شاید یہی منظور تھا کہ فیروز نظامی اس ماحول اور فضا میں پرورش پاتے ہوئے بھی مستقبل میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان بن کر ابھریں گے۔

آج کی نوجوان نسل کو یہ بتانا ضروری ہے کہ ہمارے ملک اور معاشرے میں ایک طویل عرصہ سے اب تک فنکاروں اور کلاکاروں کو میراثی کہہ کر اور سمجھ کر سوسائٹی میں وہ عزت اور تکریم نہیں دی جاتی جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں۔ اب اگرچہ بہت سے پڑھے لکھے گھرانوں کے افراد بھی شوبز سے وابستہ ہو گئے ہیں مگر ہمارے اشرافیہ کا ایک طبقہ انہیں اب بھی میراثی کہتا اور سمجھتا ہے۔

اعلیٰ تعلیم صرف اشرافیہ کی میراث نہیں۔ ملک و معاشرہ کے ہر طبقے کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی علمی پیاس بجھائے۔ بس شوق اور لگن کی بات ہے۔

موسیقی تو نسل در نسل سے فیروز نظامی کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ اس لیے سُر ان کی رگوں اور جسم و جاں میں سرائیت کیے ہوئے تھے مگر اپنے دور طالب علمی میں فیروز نظامی کا شمار ایک ذہین اور فطین طالب علم رہنا اور سُر تال لے اور الانکار کے فن سے معمور مدھر مضامین اپنے عمدہ تعلیمی ریکارڈ کو برقرار رکھنا اور پھر عمدہ سلیقے سے گریجویشن کر لینا

زندگی نامہ

نام: فیروز نظامی

پیدائش: 1910ء (لاہور)

تعلیمی ادارے: اسلامیہ ہائی اسکول بھاٹی گیٹ لاہور: اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور

تعلیمی قابلیت: گریجویشن (پنجاب یونیورسٹی لاہور)

اساتذہ: خان صاحب عبدالوحید کرانہ والے۔ خان صاحب سردار خان دہلی والے۔ استاد محمود خان رامپور والے۔

نامور شاگرد: اسسٹنٹ موسیقار سلیم اقبال، موسیقار طفیل فاروق، موسیقار محمد علی شبیر

فلموں کی کل تعداد: 26

پہلی فلم: وشواس 1943ء متحدہ ہندوستان

آخری فلم: زن زر تے زمین (پنجابی) 1974ء

نامور بھائی: سراج نظامی (صحافی و محقق) نذر محمد (شہرت یافتہ کرکٹر) مدثر نذر کے والد

تصانیف: اسرارِ موسیقی۔ سرچشمۂ حیات (تصوف)

ABC OF MUSIC-HISTORY OF DEVELOPMENT OF MUSIC

وفات: 15 نومبر 1975ء لاہور

ایک تحیر انگیز پہلو ہے۔

موسیقار فیروز نظامی کی شخصیت اس قدر ہمہ جہت ہے اور پہلو دار ہے کہ ان کی ہمہ دانی، عملی اور نظری موسیقی کی خدمات پر بجائے خود ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

ان کا ذکر آگے بڑھانے اور ان کی سوانح حیات بیان کرنے سے پہلے اگر میں ان کے جیسے نصابی تعلیم حاصل کرنے والے رفیق غزنوی اور خواجہ خورشید انور کے بارے میں بھی اختصار کے ساتھ معلومات فراہم کر دوں تو فیروز نظامی کو سمجھنے اور پرکھنے کا بہتر موقع ملے گا۔

رفیق غزنوی، فیروز نظامی سے بہت پہلے فلمی دنیا میں

آچکے تھے اور نامور موسیقار، گلوکار نغمہ نگار اور ہدایت کار کے طور پر مشہور ہو چکے تھے۔ وہ 1907ء میں مارچ کے مہینے میں راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگوں کا تعلق افغانستان کے شہر غزنی سے تھا جو وہاں سے ہجرت کر کے پشاور آکر آباد ہو گئے تھے۔ ان کے والد تلاشِ معاش کے سلسلے میں پشاور سے پنڈی آگئے تھے۔ رفیق غزنوی نے راولپنڈی کے اسلامیہ ہائی اسکول سے میٹرک کیا۔ اسلامیہ کالج لاہور سے انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ وہ بمبئی کے فلمی حلقوں میں پشاوری موسیقار کہلائے۔ رفیق غزنوی کو شاعری اور موسیقی سے والہانہ لگاؤ تھا۔ اداکاری سے جنون کی حد تک دلچسپی تھی۔ وہ طالب علمی کے زمانے میں اپنے کالج میں ہونے والے ڈراموں میں حصہ لیتے تھے۔ انہوں نے کلاسیکل موسیقی کی باقاعدہ تعلیم استاد عبدالعزیز خان اور استاد میاں قادر بخش لاہوری سے حاصل کی۔ بعد ازاں نامور موسیقار استاد عاشق علی خان پٹیالہ والے کی شاگردی اختیار کی۔

1930ء میں ایک فلمی ادارے یونائیٹڈ پلیئر فلم کارپوریشن میں ملازم ہوئے۔ اس ادارے کی ایک خاموش فلم ''بریو ہارٹس عرف سرفروش'' میں بطور سیکنڈ ہیرو کام کیا۔ اس فلم کے ہدایت کار اے آر کاردار تھے۔ اداکاروں میں مس گلزار، گل حمید، رفیق غزنوی، غلام قادر، احمد دین اور فضل شاہ نمایاں تھے۔ یہ فلم 30 جولائی 1930ء کو ریلیز ہوئی اور ایک کامیاب فلم ثابت ہوئی۔ اس وقت اس فلم کی کل آمدنی ایک ہزار ایک سوسترہ روپے دو آنے چھ پائی ہوئی تھی۔

آج کے قارئین اور فلم بین کے لیے یہ بات بے حد حیران کن ہوگی کہ ایک کامیاب فلم کی کل آمدن ایک ہزار ایک سوسترہ روپے دو آنے اور چھ پائی ہوئی کیونکہ اب تو فلموں کی آمدنی ایک سو دوسو اور تین سو کروڑ تک ہوتی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہ آج سے کوئی 88 سال پہلے کی بات ہے۔ جب فلمیں بھی کروڑوں کی لاگت سے نہیں، چند سو میں بن جاتی تھیں۔ پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ چیزیں مہنگی ہوتی چلی گئیں۔ فلموں کی لاگت میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور آمدنی کا تناسب بھی بڑھتا گیا۔

جب بولتی فلموں کا دور شروع ہوا تو رفیق غزنوی نے 1932ء میں ''پلے آرٹ فوٹوٹون'' کی ایک بولتی فلم ''ہیر رانجھا'' عرف حورِ پنجاب میں ہیر و رانجھا کا کردار ادا کیا۔

اس فلم کی ہیروئن انوری تھی، کاسٹ کے دیگر فنکاروں میں حمید گل، ایم اسماعیل اور لالہ یعقوب نمایاں تھے۔ اس فلم کے ہدایت کار بھی اے آر کاردار تھے۔ موسیقی رفیق غزنوی نے ترتیب دی تھی۔ اس فلم میں اس کا گایا ہوا یہ گیت بہت مقبول ہوا تھا

اٹھا اے وفا شعار مرا حال زار دیکھ

رفیق غزنوی خود بھی بڑے خوبرو نوجوان تھے اور طبیعت بھی بڑی حسن پرست تھی۔ ہیروئن انوری کو گانوں کی ریہرسل کراتے کراتے اسے اپنے من کی ہیر بنا بیٹھے اور ان سے خفیہ طور پر شادی کرلی۔ جب انوری کی ماں کو اس صورتِ حال کا علم ہوا تو اس نے تھانے میں رفیق غزنوی کے خلاف پرچا کٹوایا۔ پولیس نے چھاپہ مار کر انوری کو برآمد کرلیا اور رفیق غزنوی کو گرفتار کر کے عدالت میں پیش کردیا مگر انوری کے اس بیان پر کہ وہ عاقل اور بالغ ہے اور اس نے اپنی مرضی سے رفیق غزنوی سے شادی کی ہے۔ عدالت نے مقدمہ خارج کردیا اور رفیق غزنوی کو باعزت بری کردیا۔

اسی سال رفیق غزنوی نے اورینٹل پکچرز کی ایک فلم ''پوتر گنگا'' کی موسیقی ترتیب دی۔ اس فلم کے ہدایت کار جے کے نندا تھے۔ رفیق غزنوی نے اس فلم کے جو گیت لکھے وہ بھی مقبول ہوئے۔ اس فلم کی تکمیل کے بعد رفیق غزنوی اپنی اہلیہ انوری کے ساتھ لاہور سے بمبئی چلے گئے۔ جہاں انہوں نے مہاراشٹر سینے ٹون کی فلم ''پرتھوی راج سنجوگتا'' اور امر مووی ٹون کی فلم ''انتقام'' کی موسیقی ترتیب دی۔ دونوں فلمیں 1933ء میں ریلیز ہوئیں۔ دونوں فلموں میں رفیق غزنوی کے گائے ہوئے گیت پسند کیے گئے اور یہ فلمیں بھی کامیاب ہوئیں۔

انہی دنوں کی بات ہے کہ رفیق غزنوی نے انوری کو طلاق دے دی۔ ان دونوں کی پیار کی نشانی ایک خوب صورت بچی زرینہ تھی جو بعد میں لیاقت آغا سے شادی کرنے کے بعد زرینہ آغا کہلائی۔ ان کی بیٹیاں سلمٰی آغا اور سبیتا آغا لندن میں پیدا ہوئیں۔ وہیں پلی بڑھیں۔

1934ء میں رفیق غزنوی نے جیت پکچرز کی ایک فلم ''جوانی دیوانی'' میں زہرا کے ساتھ بطور ہیرو کام کیا اور اس فلم کی موسیقی بھی ترتیب دی۔ اس فلم کی فلم بندی کے دوران رفیق کی جوانی فلم کی ہیروئن زہرا کی دیوانی ہوگئی اور انجام کار اس سے شادی کرلی۔

1935ء میں رفیق غزنوی نے زہرا کے ساتھ فلم ''پریم پجاری'' اور فلم ''بہن کا پریم'' میں بطور ہیرو کام کیا۔ دونوں فلموں کے موسیقار بھی وہی تھے۔ ان کے کچھ گیت بھی انہوں نے گائے تھے۔ پریم پجاری کی ہدایات بھی ان ہی کی تھیں۔ اس شعبے میں بھی وہ کامیاب رہے مگر اس پر مزید توجہ نہیں دی۔

ان فلموں کی تکمیل کے بعد رفیق غزنوی نے زہرا کو طلاق دے دی اور اس کی بہن اداکارہ انوراہا سے شادی کرلی۔ زہرا اور رفیق غزنوی کی ایک بیٹی شاہینہ پیدا ہوئی۔ نیلی آنکھوں والی اس بچی نے عالمِ شباب میں چند پاکستانی فلموں میں کام کیا تھا۔

اسی سال رفیق غزنوی نے فلم ''دھرم کی دیوی'' میں سردار اختر اور کمار کے ساتھ بطور سیکنڈ ہیرو کام کیا۔ 1937ء میں رفیق غزنوی نے پریم یاترا میں لیلاوتی کے ساتھ بطور ہیرو کام کیا جب کہ اس فلم کی موسیقی بھی ترتیب دی۔ 1939ء میں انہوں نے فلم ''کون کسی کا'' اور فلم ''ستارہ'' کی موسیقی مرتب کی۔

1940ء میں رفیق غزنوی نے فلم ''اپنی نگریا'' اور ''بہو رانی'' کی موسیقی مرتب کی اور ان کے کچھ گیت بھی گائے۔ 1941ء میں غزنوی نے منروا مووی ٹون کی تاریخی فلم ''سکندر'' اور ایک اور فلم ''سوامی'' کی موسیقی ترتیب دی۔ سکندر کے ہدایت کار سہراب مودی جب کہ سوامی کے ڈائریکٹر اے آر کاردار تھے۔ 1942ء میں رفیق غزنوی نے ہند پکچرز کی فلموں کل یگ، سوسائٹی اور بھارت ٹاکیز کی فلم ''کس کی بیوی'' کی موسیقی مرتب کی۔ کل یگ اور سوسائٹی کے ہدایت کار نذیر صاحب تھے جب کہ ''کس کی بیوی'' کے ہدایت کار ایم اے مرزا تھے۔

رفیق غزنوی نے اپنا پورا کیریئر بہت کامیابی کے ساتھ گزارا۔ ان کو اس بات کا اعزاز بھی حاصل تھا کہ وہ کشمیر کے پہلے موسیقار تھے جنہوں نے ہالی ووڈ کی فلم میں موسیقی دی۔

خواجہ خورشید انور 1912ء میں میانوالی کے محلے بلوچاں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد خواجہ فیروز الدین میانوالی میں وکیل تھے جو بیرسٹر ہونے کے بعد لاہور منتقل ہو گئے۔ ان کے نانا شیخ عطا محمد میانوالی میں سرجن تعینات تھے۔ خان بہادر شیخ عطا محمد، علامہ اقبال کے سسر بھی تھے۔ خورشید انور نے 1928ء میں سینٹرل ماڈل اسکول

قیامِ پاکستان سے پہلے کی فلمیں

وشواس: 1943ء
بڑی بات: 1944ء
امنگ: 1944ء
اس پار: 1944ء
پیا ملن: 1945ء......شربتی آنکھیں: 1945ء
امرراج: 1946ء
نیک پروین: 1946ء
جگنو: 1947ء
رنگین کہانی: 1947ء

قیامِ پاکستان کے بعد کی فلمیں

ہماری بستی: 1950ء
چن وے (پنجابی): 1951ء
دوپٹا: 1952ء
شرارے: 1955ء
سوہنی: 1955ء
انتخاب: 1955ء
قسمت: 1956ء
16 آنے: 1959ء
گلشن: 1959ء
(شریک موسیقار رشید عطرے)
راز: 1959ء
زنجیر: 1960ء
منزل: 1960ء
منگول: 1961ء
سوکن (پنجابی): 1965ء
زن زر تے زمین (پنجابی) 1974ء

لاہور سے میٹرک کیا اور 1929ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ سائنس میں داخلہ لیا۔ تھرڈ ایئر میں پہنچے تو ان کی ملاقات فیض احمد فیض سے ہوگئی جو ان دنوں مرے کالج میں داخل ہوئے تھے۔

خواجہ صاحب سائنس اور فیض صاحب آرٹس کے شعبے میں تھے۔ ان دنوں ہندوستان میں سیاسی ہیجان کا دور تھا۔ ملکی سیاست میں تشدد داخل ہو چکا تھا۔ جلیانوالہ باغ کے قتلِ عام اور خلافت تحریک کے بعد بھگت سنگھ تحریک زور

پکڑ رہی تھی اور نوجوان طبقہ اس تحریک سے بے حد متاثر تھا اور تحریک میں صف اوّل کا کردار ادا کر رہا تھا۔ خواجہ خورشید انور بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے اور ان کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ خواجہ صاحب اس قدر آگے بڑھ گئے کہ کالج کی لیبارٹری میں دیسی ساختہ بم بناتے ہوئے دیکھ لیے گئے اور انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ چونکہ ان کے والدین کے تعلقات وسیع تھے۔ خاندانی اثر و رسوخ کی بناء پر جلد ہی رہا کر دیئے گئے۔

اس واقعے کے بعد وہ سیاست سے اس قدر اکتا گئے کہ پھر آنکھ اٹھا کر بھی اس طرف نہیں دیکھا۔ والد خواجہ فیروز الدین موسیقی سے رغبت رکھتے تھے۔ ان کی بیٹھک میں انڈین کلاسیکل اور نیم کلاسیکل موسیقی کے ریکارڈز موجود رہتے تھے جن سے خواجہ خورشید انور اپنے ذوق کی تسکین حاصل کرتے۔ اس بیٹھک کو موسیقی کدہ بھی کہا جا سکتا ہے جہاں موسیقی کے بڑے بڑے اساتذہ تشریف لاتے اور موسیقی کی محفلوں کی جان بنا کرتے۔ جن میں استاد توکل حسین خان، استاد عبدالوحید خان، استاد عاشق علی خان اور چھوٹے غلام علی خان آتے۔ فیض احمد فیض اور خواجہ خورشید انور اس بیٹھک کے مستقل سامع اور میزبان ہوا کرتے۔ اسی دوران والد سے موسیقی سیکھنے کی درخواست کی تو انہوں نے بیٹے کو استاد توکل حسین خان کی شاگردی میں دے دیا۔ موسیقی سیکھنے کے ساتھ ساتھ خواجہ خورشید انور نے تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور 1935ء میں ایم اے فلسفہ کے امتحان میں ٹاپ کیا اور گولڈ میڈل کے مستحق قرار پائے۔ بعد ازاں فیض احمد فیض کے ساتھ انڈین سول سروس کا امتحان بھی دیا جس میں بھگت سنگھ تحریک میں بم بنانے کی وجہ سے فیل کر دیئے گئے۔

اس کا ان پر اتنا اثر ہوا کہ پنجاب یونیورسٹی میں جب ان کو فلسفہ کے امتحان کی پہلی پوزیشن کے گولڈ میڈل کے لیے بلایا گیا تو وہ تقریب میں شریک ہی نہ ہوئے۔ بعد ازاں وہ دہلی چلے گئے جہاں انہوں نے ریڈیو سے بطور میوزک پروڈیوسر وابستگی اختیار کر لی لیکن جلد ہی یہاں سے بھی دل بھر گیا اور ریڈیو کی سرکاری نوکری چھوڑ دی۔

ان دنوں بمبئی کی فلمی صنعت میں فلم ساز اور ہدایت کار اے آر کاردار کا طوطی بول رہا تھا۔ کاردار صاحب نے خواجہ صاحب کو فلم کے لیے کام کرنے کی دعوت دی جو خواجہ صاحب نے قبول کرتے ہوئے پنجابی فلم اکڑ مائی (1941ء) کی موسیقی دی جس کے نغمے نامور گلوکارہ رام کماری نے گائے۔ اس فلم کے گانے ”ماہی وے راماں“ نے برصغیر میں دھوم مچا دی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے فلم اشارہ (1942ء)، پرکھ (1943ء)، یتیم (1944ء)، آج اور کل (1945ء)، پگڈنڈی (1946ء)، پروانہ (1946ء)، سنگھار (1949ء)، نشانہ (1950ء) اور نیلم پری (1952ء) کی موسیقی دی۔ ان فلموں کے گیتوں نے شائقین کے دلوں پر راج کیا۔ بھارت میں خواجہ خورشید انور نے سہگل، گوہر سلطانہ، گیتا رائے، زینت بیگم، سرچندر کور، جی ایم درانی، منور سلطانہ اور راج کماری جیسے نامور سنگرز سے اپنی موسیقی میں گیت گوائے۔

1946ء میں بننے والی فلم پروانہ اور 1949ء میں ریلیز ہونے والی فلم سنگھار کی عمدہ موسیقی پر خواجہ صاحب کو دو بار ٹائمز آف انڈیا ایوارڈ دیئے گئے۔

1953ء میں خواجہ خورشید انور پاکستان لوٹ آئے۔ یہاں آئے تو اس وقت بابا جی اے چشتی اردو اور پنجابی فلموں کی موسیقی کی ضرورت بنے ہوئے تھے۔ ماسٹر غلام حیدر کی فلم گلنار کے گانوں کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ ماسٹر عنایت حسین کی فلم گمنام اور قاتل باکس آفس پر چھائی ہوئی تھیں۔ رشید عطرے، فیروز نظامی اور صفدر حسین کے کام کا بھی طوطی بول رہا تھا لیکن ان سب میں خواجہ خورشید انور نے اپنی محنت کے سبب اپنا منفرد مقام بنا لیا۔

خواجہ صاحب نے پاکستان آ کر فلم ”انتظار“ کی موسیقی ترتیب دی۔ جس کے نغموں نے ہر سو دھوم مچا دی۔

او جانے والے رے

نے شہرت کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ خواجہ صاحب اس فلم کے موسیقار، کہانی کار اور فلم ساز بھی تھے۔ اس وقت کے صدر پاکستان سکندر مرزا جب ایران کے دورے پر گئے تو فلم ”انتظار“ کو بھی ساتھ لے گئے۔ شہنشاہ ایران نے فلم دیکھی تو اس کی موسیقی کی تعریف کرتے ہوئے خواجہ خورشید انور کو کنگ آف دی میلوڈی کا خطاب دیا۔

انڈیا کے دورے میں بھی جب یہ فلم ایوان صدر میں دیکھی گئی تو بھارتی صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اسے بے حد پسند کیا اور وہاں کے موسیقاروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کو اس فلم کی موسیقی سے سبق سیکھنا چاہیے۔“

اس فلم کو نغمہ بار بھی کہا جا سکتا ہے۔ قتیل شفائی کے لکھے [illegible] نے خواجہ خورشید انور کی موسیقی میں ہر طرف دھوم مچا رکھی جس سے فلم کو انٹرنیشنل سطح پر پذیرائی ملی۔ اس فلم کے تمام فلم کی ہیروئن نور جہاں نے گائے۔ اسی فلم کی نغمہ سرائی کی سے انہیں ملکہ ترنم کا خطاب ملا جوان کی زندگی اور نام کا حصہ بنا۔ اس فلم کو تین صدارتی ایوارڈز ملے۔

قارئین کرام اپنے دل تھام لیجیے کیونکہ میں وہ بات [illegible] نے جا رہا ہوں کہ آپ ششدر رہ جائیں گے کہ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ایسا نابغہ روزگار موسیقار، ایسی آفاقی دھنیں ترتیب دینے والا میوزک ڈائریکٹر خواجہ خورشید انور کوئی بھی ساز نہیں بجا سکتے تھے۔

آپ نے تو یہی سنا یا دیکھا ہوگا کہ موسیقار ہارمونیم یا [illegible] اور ساز پر دھنیں بناتے ہیں مگر ہمارے پہلے موسیقار خواجہ خورشید انور ماچس کی ڈبی پر انگلی سے چوٹ لگا کر [illegible] مرتب کرتے تھے۔ ہے ناں حیرت کی بات؟

انتظار کی ریلیز کے ایک ہفتے بعد خواجہ صاحب کی [illegible] موسیقار دوسری فلم ”مرزا صاحباں“ نمائش پذیر ہوئی جو باکس آفس پر فلاپ ثابت ہوئی مگر انہوں نے اس کا کوئی اثر [illegible] لیا کہ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔

فلم کسی ایک شعبے کی وجہ سے نہ کامیاب ہوتی ہے نہ ناکام۔

ان کی تیسری فلم ”زہر عشق“ 1958ء میں ریلیز ہوئی۔ یہ بھی ایک مکمل میوزیکل فلم تھی جو خواجہ صاحب کی موسیقی اور ناہید نیازی کی آواز کے جادو کی وجہ سے ایک معرکۃ الآرا فلم ثابت ہوئی۔

یہ کریڈٹ بھی خواجہ صاحب کو جاتا ہے کہ انہوں نے ناہید نیازی جیسی سنہری آواز کو میانوالی سے ڈھونڈ نکالا۔ ناہید نیازی میانوالی کے نامور میوزک ڈائریکٹر اور ریڈیو کے اسٹیشن ڈائریکٹر سرور نیازی کی بیٹی تھیں۔ اس ابھرتی ہوئی گلوکارہ کو اپنی فلم میں چانس دے کر انہوں نے پاکستانی فلم انڈسٹری کو ایک بے حد خوب صورت آواز کا تحفہ دیا۔

فلم ”زہر عشق“ پر بھی خواجہ صاحب کو نگار اور دیگر ایوارڈز سے نوازا گیا۔ 1950ء کا سال خواجہ صاحب کے لیے کامیابیوں کا سال تھا۔ اس سال ان کی دو فلمیں ”جھومر“ اور ”کوئل“ ریلیز ہوئیں۔ جھومر نے ایک بار پھر خواجہ صاحب کی موسیقی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ اس فلم میں ناہید نیازی کی آواز میں گائے گئے گیتوں

☆ چلی رے چلی رے میں تو دیس پیا کے چلی رے

☆اک البیلا پردیسی دل میں سما گیا
☆پیا پیا نہ کوک کوئلیا
☆نہ کوئی یہاں میرا
☆جب یاد کسی کی تڑپائے
☆ونجلی بجائے دور سے کوئی

نے فلم کی کامیابی میں نمایاں کردار ادا کیا اور شائقین فلم کے دل موہ لیے۔

''کوئل'' بھی اپنی مدھر موسیقی اور اچھی کہانی کی وجہ سے اس سال کی باکس آفس پر کامیاب فلم ثابت ہوئی۔

1960ء میں فلم ایاز ریلیز ہوئی۔ اس فلم کے گیت

رقص میں ہے سارا جہاں

ناہید نیازی، زبیدہ خانم اور کوثر پروین کی آوازوں میں ریکارڈ کی گئی نعت نے بے مثال شہرت حاصل کی۔

1962ء میں خواجہ صاحب کی ذاتی فلم ''گھونگھٹ'' ریلیز ہوئی جس کے نغمے

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا

نے بے پناہ شہرت حاصل کی۔ اسی فلم میں خواجہ صاحب نے نامور گلوکار مہدی حسن کو متعارف کروایا اور ان کی آواز میں فلمی نغمے ریکارڈ کیے۔

1964ء میں خواجہ صاحب کی فلمیں ''حویلی'' اور ''چنگاری'' ریلیز ہوئیں۔ جن کے گیتوں کو بہت پسند کیا گیا۔

☆شکوہ نہیں کسی سے گلہ نہیں
☆اے روشنیوں کے شہر بتا
☆اک دل نے کہی اک دل نے سنی

مقبول ہو کر خواجہ صاحب کی شہرت میں چار چاند لگ گئے۔

1968ء میں ''سرحد'' اور 1969ء میں ''ہمراز'' ریلیز ہوئیں جب کہ 1970ء میں ان کی دو پنجابی فلمیں ''گڈو'' اور ''ہیر رانجھا'' نمائش پذیر ہوئیں۔ گڈو فلاپ ہو گئی لیکن ہیر رانجھا نے شہرت کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔ اس فلم میں احمد راہی کے لکھے نغموں

☆سن ونجلی دی مٹھڑی تان وے

اور ''ونجلی والڑیا'' اور دیگر نغمے آج بھی روز اول کی طرح لوگوں کی پسند ہیں۔ یہ فلم اپنے گیتوں اور کہانی کی وجہ سے سحر انگیز کہلائی۔

1971ء میں ریلیز ہونے والی فلمیں ''سلام محبت''
اور ''پرائی آگ'' کے نغموں

☆ کیوں ہم سے خفا ہو گئے اے جان تمنا
بھیگے ہوئے موسم کا مزہ کیوں نہیں لیتے
☆سن پگلی پون سنگ اڑتی گھٹا

نے خواجہ خورشید انور کی مقبولیت میں اور اضافہ کیا۔

1975ء میں خواجہ صاحب کی بطور موسیقار شیریں فرہاد 1978ء میں حیدر علی اور 1982ء میں فلم مرزا جٹ ریلیز ہوئیں۔

انہوں نے انڈیا میں 14 سال اور پاکستان میں 26 برس موسیقی کو دیے۔ اس 40 سالہ دور میں انہوں نے انڈیا کی 11 اور پاکستان کی 20 فلموں کی موسیقی دی۔ انہوں نے 250 گیتوں کی لازوال دھنیں تخلیق کیں۔ جن میں سے زیادہ تر گیتوں کو میڈم نور جہاں نے گایا۔

انہوں نے ذاتی فلمیں گھونگھٹ، چنگاری اور ہمراز بنائیں جن کی کہانی خود لکھی۔ ان کی ہدایات اور موسیقی بھی خود دی۔ انہوں نے موسیقی میں تجربات کیے۔ ان کے سازوں کی ترتیب منفرد ہوتی تھی۔ مختلف سازوں کا غالب حیثیت میں استعمال ان کا خاص ہنر تھا۔ مثال کے طور پر ہیر رانجھا فلم میں انہوں نے صرف بانسری اور ڈھولک کے ساتھ گیت ریکارڈ کیے۔ فلم گھونگھٹ میں گیت

کوئی نہ جانے کب آئے

میں پہلی بار مندر کی گھنٹیوں کو ساز کے طور پر استعمال کیا گیا۔ انہوں نے فلموں میں کورَس کو رواج دیا۔ انہوں نے فلم کوئل کے گیت

ساگر روئے لہریں شور مچائیں

میں وائلن سے سمندر کا شور نکالا۔ فلم ''زہر عشق'' میں بین کی آواز کا تجربہ کیا فلم انتظار میں گیت

آ گئے آ گئے سجن پردیسی بلم پردیسی

میں پہاڑ کی گونج لڑکیوں کی آواز میں پیدا کی۔

خواجہ خورشید انور کے نمایاں کاموں میں ریڈیو پاکستان کی سگنیچر ٹیون کی تخلیق اور راگ مالا اور آہنگ خسروی ہے جس کے ذریعے موسیقی کے نامور گھرانوں کے 110 راگ محفوظ کیے گئے۔

1980ء میں خواجہ صاحب کو حکومتِ پاکستان کی طرف سے ستارۂ امتیاز دیا گیا۔ 1982ء میں انڈین فلم انڈسٹری کی طرف سے انہیں فانی انسان لافانی گیت ایوارڈ سے نوازا گیا۔

...تنہائی پسند کم گو باوقار شخصیت کے مالک خواجہ خورشید ...یل علالت کے بعد 30 اکتوبر 1984ء کو اس جہانِ ...ے کوچ کر گئے مگر وہ آج بھی میوزک لورز کے دلوں ...ندہ ہیں۔

...ہو سکتا ہے آپ کی طرح اور لوگ بھی یہ سوچ رہے ...کہ فیروز نظامی کے بارے میں بتاتے بتاتے میں نے ...زنوی اور خواجہ خورشید انور کی کہانیاں کیوں سنا دیں؟ ...دراصل یہ ہے کہ ان تینوں میں کئی باتیں مشترک ہیں ...لیے تینوں کی کتابِ زندگی اور ان کی کارکردگی اگر ایک ...سامنے ہوں گی تو ان کو سوچنے سمجھنے اور ان کے بارے ...ور وفکر کرنے میں آسانی ہوگی۔

پہلی بات یہ کہ تینوں کا تعلق لاہور سے تھا تینوں نے ...ے بے مثال کی فضا میں موسیقی سے اپنا رشتہ جوڑا اور پھر ...ی اعلیٰ کارکردگی نے پورے متحدہ ہندوستان میں ان کی ...کے ڈنکے بجائے اور وہ وقت بھی آیا جب کلکتہ اور ...ی فلموں کے لیے بھی ان کی موسیقی کی خدمات حاصل ...یں اور سب سے اہم ان تینوں کی مشترکہ خوبی ان کی ...تعلیم تھی۔ تینوں نے گانے بجانے سے رشتہ جوڑنے ...وجود اعلیٰ درسگاہوں سے تعلیم حاصل کی اور یہ ثابت ...ے کی کوشش کی کہ انسان چاہے جس شعبے سے وابستہ ہو ...لیے تعلیم ازبس ضروری ہے۔ تعلیم کی وجہ سے دل و ...روشن ہوتے ہیں اور بندہ جس فیلڈ میں بھی ہو زیادہ ...ی حاصل کرتا ہے۔

رفیق غزنوی، فیروز نظامی اور خواجہ خورشید انور مختلف ...ے موسیقار تھے۔ رفیق غزنوی خاموش فلموں کے دور ...رہے پھر بولتی فلموں میں بھی موسیقی دی۔ وہ موسیقار ...وہ اداکار، نغمہ نگار، گلوکار بھی تھے اور ہر شعبے میں ...نے اپنی تعلیمی سوجھ بوجھ کی وجہ سے خاطر خواہ کامیابی ...ی جب کہ خواجہ خورشید انور رفیق غزنوی، فیروز نظامی ...سلے میں آخری دور سے تعلق رکھتے تھے مگر اپنی اعلیٰ ...لاحیتوں کی وجہ سے موسیقی کی دنیا میں اپنا منفرد اور ...نام بنایا۔

...یے! اب فیروز نظامی کی کتاب زندگی کا مطالعہ ...رتے ہیں۔ فیروز نظامی لاہور کے ایک نہایت ...موسیقار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ فیروز نظامی ...ن پانچ بھائی تھے۔ یعنی ببر نظامی، فیروز نظامی، ...امی، شریف نظامی اور نذر محمد۔ نذر محمد بجائے خود بہت سریلے تھے اور بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ کرکٹ کے حوالے سے ان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اس میدان میں وہ بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود وہ گانے والے تھے۔ باقاعدہ کسی سے موسیقی کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی پھر بھی اپنے نامی گرامی موسیقار بھائی فیروز نظامی کی طرز سازی میں بعض اوقات ان کی خاطر خواہ معاونت بھی کرتے رہے تھے۔ فیروز نظامی کی ہمشیرہ خورشید آف اجرو کا شمار اپنے عہد کی نامور ترین گانے والیوں میں ہوتا تھا۔

موسیقی کی انتہائی ابتدائی تعلیم فیروز نظامی کو کم سنی ہی میں گھر میں میسر آنے لگی تھی۔ پانچ چھ برس کی عمر میں انہیں اسلامیہ ہائی اسکول بھاٹی گیٹ میں داخل کروا دیا گیا۔ وہ لائق، ذہین اور زیرک تھے اس لیے اسکول کے ہونہار ترین طلبہ میں سے تھے۔ مذکورہ اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد تاریخی علمی اور انتہائی عظیم درسگاہ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں داخلہ لیا۔ انگریزی زبان و ادب سے خاصا شغف تھا اس لیے دوران طالب علمی میں ہی انگریزی لکھنے کی بڑی ہی بھرپور مشق بہم پہنچاتے رہے۔ مذکورہ عظیم درسگاہ سے بی اے کا امتحان پاس کر کے پنجاب یونیورسٹی کے گریجویٹ کہلائے۔

1932ء سے 1939ء تک یعنی سات سالہ دور میں جوان کے عنفوان شباب کا دور تھا انہوں نے موسیقی کی عملی اور نظری ہر دو سطح پر بے مثال خدمت کی، سر و دیا میں تحصیل فن کے حوالے سے وہ کیرانہ گھرانے کے گائیک تھے۔ ان کی گائیکی حتیٰ کہ طرزوں پر بھی کیرانہ گھرانے کے لگاؤ کی چھاپ محسوس کی جا سکتی ہے مگر کیرانہ کے علاوہ انہوں نے دہلی گھرانے اور رامپور گھرانے سے بھی اکتساب فیض کیا۔ دہلی گھرانے کے استاد سردار خان دہلی والے سے فیض حاصل کیا جب کہ رامپور گھرانے کے معروف کلاسک گائیک خان صاحب استاد محمود خان رامپور والے سے بھی اپنے علم وفن کی پیاس بجھائی مگر ان کی باقاعدہ توجہ ایک تسلسل اور تندہی کے ساتھ سراپا ہمہ تن گوش ہو کر کیرانہ والوں کی سمت رہی اور کیرانہ کے انتہائی نامور استاد کلاسک گائیک استاد عبدالوحید خان کیرانہ والے کے سامنے انہوں نے باقاعدہ زانوئے تلمذ تہیہ کیا اور اس سمندر سے جی بھر کر سیراب ہوئے۔

جب عبدالوحید خان صاحب کیرانہ والے لاہور

تشریف لائے تو بقول فیروز نظامی ''خان صاحب کی گائیکی نے مجھے مسحور کردیا تھا۔'' خان صاحب نے بھی اپنے اس ہونہار اور نہایت ذہین شاگرد پر خصوصی توجہ دی اور خاص شفقت فرمائی۔

خان صاحب عبدالوحید خان کیرانہ والے کا کہنا تھا۔ ''فیروز نظامی میرا بلاٹنگ پیپر ہے جو بتاتا ہوں فوراً جذب کرلیتا ہے۔''

اپنی ذہانت اور خداداد لگن کے باعث فیروز نظامی نے بڑی ہی سرعت کے ساتھ کلاسیکی موسیقی میں مہارت حاصل کرلی اور اس سے پہلے اپنے فن کا باقاعدہ مظاہرہ ایس پی ایس ہال لاہور میں کیا اور سامعین و ماہرین سے بے پناہ داد حاصل کی۔

انہی دنوں کی بات ہے، پنڈت وشنو دگمبر نے ٹیکسالی دروازے کی نواحی آبادی میں منشی لدھا کے باغ میں کلاسیکی موسیقی سکھانے کا ادارہ گندو مہادیالہ کے نام سے قائم کیا۔ فیروز نظامی اس ادارے میں بھی اپنے فن کا باقاعدہ مظاہرہ کرتے رہے اور اپنا علم و فن مختلف تلامزہ تک پہنچاتے رہے۔

برصغیر پاک و ہند کے مایہ ناز فلمی گائیک محمد رفیع مرحوم کو بھی فیروز نظامی جیسے نابغۂ روزگار کی شاگردی کا اعزاز حاصل رہا اور رفیع صاحب اپنے ان استاد محترم کا ذکر خیر نہایت ادب واحترام سے کیا کرتے تھے کہ ادب، قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

پھر اسی قرینے نے برسوں بعد فلم جگنو کے شہرۂ آفاق دوگانے کی شکل میں یوں جنم لیا

یہاں بدلہ وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے
محبت کرکے بھی دیکھا محبت میں بھی دھوکا ہے

یہ شعر تو فلمی سچویشن کے حوالے کے مطابق لکھا گیا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ محمد رفیع نے اپنے استاد کے ساتھ ہمیشہ خلوص و محبت کا انمول رشتہ نبھایا۔ البتہ ایک ناگوار اتفاق یہ ہوا کہ رفیق صاحب کو فیروز نظامی کے ساتھ کام کرنے کا موقع نہ مل سکا مگر مذکورہ دوگانے نے انہیں مکمل طور پر متعارف کروا کر محمد رفیع بنادیا اور پھر پلٹ کر انہوں نے پیچھے نہ دیکھا۔

بہرحال ذکر ہو رہا تھا پنڈت وشنو دگمبر کا آنجہانی کے مذکورہ ادارے کے بعد فیروز نظامی نے خود اپنی انفرادی اور ذاتی کاوشوں سے ادارہ شرکت ادبیہ کے نام سے کلاسیکی موسیقی کی تعلیم و تربیت اور تدریس و ترویج کے لیے ایک ادارہ قائم کیا۔ یہ ادارہ موہنی روڈ کے اختتام پر ویام شالہ کے قریب میاں سلطان جوگی رئیس بازار حکیماں کے امرود کے باغ کنارے واقع ایک بلڈنگ میں قائم کیا۔ اس ادارے میں فیروز نظامی بذاتِ خود ایک عرصے تک موسیقی کی باقاعدہ تعلیم دیتے رہے۔

ان کی یہ تمام عملی و نظری خدمات ان کے گریجویشن کرنے سے آٹھ سال بعد تک محیط ہیں۔ انہی برسوں کے دوران میں یعنی 1935ء میں انہوں نے موسیقی کی نہایت وقیع کتاب ''اسرار موسیقی'' لکھی جو موسیقی سے شغف رکھنے والوں کے لیے ایک بہترین رہنما کا کام دیتی رہی۔

1939ء میں فیروز نظامی نے آل انڈیا ریڈیو لاہور میں میوزک کے پروڈیوسر کے طور پر ملازمت کا آغاز کیا۔ یہ سال ریڈیو کے لیے خوش نصیبی کا مژدہ لایا تھا کیونکہ فیروز نظامی کے ساتھ تو خواجہ خورشید انور اور کرشن چندر نے بھی ریڈیو کی ملازمت کو ترجیح دی۔ ریڈیو لاہور میں فیروز نظامی کی ہمہ جہت شخصیت کے کئی پہلو سامنے آئے۔

میوزک کے پروڈیوسر کے طور پر انہوں نے نہایت وقیع پروگرام پیش کیے۔ بذات خود کلاسیکی موسیقی نشر کرتے رہے۔ موسیقی کے مختلف موضوعات پر باقاعدگی کے ساتھ بڑی ہی وقیع اور جاندار تقاریر نشر کرتے رہے اور کبھی کبھار ہلکے پھلکے گیتوں اور غزلوں کی دھنیں بھی ترتیب دیتے رہے مگر صد افسوس کہ ان کا یہ قیمتی سرمایہ ہوا کی لہروں کی نذر ہوگیا اور تقاریر و اسکرپٹ تقسیم برصغیر کے ہنگاموں نے تلف کردیے۔

ریڈیو لاہور کے بعد ان کی خدمات پہلے آل انڈیا ریڈیو دہلی اور پھر آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کو منتقل کردی گئیں۔ تینوں مراکز پر انہوں نے اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ ان کی ریڈیو کی ملازمت کا عرصہ تقریباً تین سالوں پر محیط ہے۔

1943ء میں انہوں نے بوجوہ ریڈیو کی ملازمت کو خیرباد کہہ دیا اور یہ سال فلم انڈسٹری کے لیے مسعود و مبارک ثابت ہوا کہ فیروز نظامی نے لکھنؤ سے بمبئی کا سفر اختیار کیا۔ جن دنوں وہ بمبئی گئے ہیں۔ ان دنوں وہاں ہدایت کار سوہی واڈیا کا بڑا چرچا تھا۔ واڈیا مووی ٹون کی فلم وشواس (1943ء) سے فیروز نظامی بطور میوزک ڈائریکٹر متعارف ہوئے اور یوں فلم دنیا کو ایک سحر طراز موسیقار

...ب ہوا۔ فلم وشواس میں فیروز نظامی نے بھائی چھیلا ...لے والے کے ساتھ بطور شریک موسیقار کام کیا۔

یہ وہ دور تھا جب فن اور فنکاروں کی قدر کی جاتی ...فلم انڈسٹری میں کھرے اور کھوٹے کو سمجھنے والے لوگ ...فلم کے کسی بھی شعبہ میں جب کوئی نیا بندہ پرفارم کرتا ...سمجھا جاتا کہ یہ باصلاحیت ہے تو زیادہ سے زیادہ لوگ ...کی خدمات حاصل کرتے۔ اس دور میں بھی اسٹار سسٹم کا ...ج تھا مگر اس کے ساتھ ابھرتی ہوئی صلاحیتوں کو بھی ...خواہ موقع دیا جاتا تھا جس کا فلم انڈسٹری کو بھی دوررس ...دہ ہوتا تھا۔ فیروز نظامی کو بھی اپنی پہلی فلم وشواس کے بعد ...یں ملنا شروع ہوگئیں اور انہوں نے اپنے اندر پوشیدہ ...حیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرنا شروع کردیا۔ اس طرح 194... سے 1947ء کے پانچ سالہ دور میں انہوں نے ...ی کی دس فلموں کی موسیقی ترتیب دی۔ ان میں سے دو ...ں یعنی رنگین کہانی اور نیک پروین میں دو گانے ...یٹ) بھی گائے۔ فلم رنگین کہانی میں انہوں نے حمیدہ ...کے ساتھ اپنی آواز کا جادو جگایا جب کہ نیک پروین میں ...م اختر کے ساتھ اپنی آواز ریکارڈ کروائی۔

اگرچہ 1946ء میں بننے والی فلم نیک پروین کے ...ں اور بالخصوص حمیدہ بانو کی نعت نے لوگوں کی توجہ ...ل کرلی تھی مگر ابھی تک فیروز نظامی بطور میوزک ...یکٹر لوگوں کو چونکانے میں خاطر خواہ کامرانی حاصل نہ کر ...تے کہ فلم جگنو کا آغاز ہوگیا۔ یہ فلم اور اس کی شاہکار ...ں نے فیروز نظامی کو شہرت عام و بقائے دوام کی صف ...ڑا کردیا۔ اس فلم سے فیروز نظامی کی ایسی دھوم مچی جو ...انہی کا حصہ تھی۔

جگنو کے فلم ساز و ہدایت کار سید شوکت حسین رضوی ...ہیں۔ ''جگنو کے ریکارڈ اس کثرت سے بجے اور بے ...بکے کہ ان کی رائلٹی کی آمدن سے میں نے اگلی فلم ...کا ارادہ کرلیا۔''

جگنو نے سید شوکت حسین رضوی کو ہی کامیابی و ...ل سے مالا مال نہیں کیا بلکہ فلم کے کچھ اور شرکاء کی بھی ...ل دی۔ فلم کے ہیرو دلیپ کمار اپنی ابتدائی فلموں جوار ...ہتا، ملن اور گھر کی عزت کی پٹنے کے بعد دیگرے ...ں سے اس قدر دل برداشتہ ہوگئے تھے کہ انہوں نے ...لیا تھا کہ اگر یہ فلم (جگنو) بھی ناکام ہوگئی تو یہ ان کی ...لم ہوگی مگر جگنو کی سپرڈپر کامیابی نے انہیں نہ صرف اس ارادے سے باز رکھا بلکہ برصغیر کی فلم انڈسٹری کا عظیم اداکار بنادیا۔

اس فلم کی عظیم الشان کامیابی و کامرانی کی اصل وجہ اس کی آفاقی موسیقی تھی۔ فیروز نظامی کی موسیقی اس کی دھنوں اور اس کے گیتوں نے شائقین فلم کو اپنے سحر میں ایسا جکڑ لیا تھا کہ یہ فلم اور اس کی ہر شے امیر ہوگئی۔

محمد رفیع کا بھی یہ ابتدائی دور تھا۔ ابھی تک انہیں کوئی خاطر خواہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی مگر فیروز نظامی نے ان سے جگنو کا یہ گیت گوا کر انہیں محمد رفیع بنادیا۔

یہاں بدلہ وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے
ابھی کیا تھا ابھی کیا ہے اسی کا نام دنیا ہے

فیروز نظامی نے فلم کی سچویشن کو پیشِ نظر رکھ کر جس گیت کی دھن کمپوز کی تھی اس پر ایک غیر معروف شاعر اصغر سرحدی سے گیت لکھوایا تھا۔ یہ گیت دلیپ کمار اور نور جہاں پر فلمایا گیا تھا جو اس فلم کے ہیرو ہیروئن تھے۔ اس گانے کے علاوہ بھی جگنو کے دیگر گانے کانوں کے راستے دل میں اتر جانے والے تھے۔

جن دنوں فلم جگنو ریلیز ہوئی وہ 1947ء کا پُرآشوب دور تھا۔ بمبئی کے علاوہ دیگر بڑے شہروں میں بھی ہندو مسلم فسادات ہو رہے تھے۔ اس کے باوجود اسے دیکھنے والوں کی تعداد سینما گھروں میں کم نہیں ہو رہی تھی۔ ایسے وقت میں جب لوگوں کا اصل مسئلہ جان بچانا ہوتا ہے ایسے میں تفریح کسے سوجھتی ہے؟ مگر یہ جگنو اور اس کے نغمہ بار گیتوں کا اثر تھا کہ لوگ اسے دیکھنا بھی ضروری سمجھتے تھے۔

ایک طرف ایسی فقید المثال کامیابی اور دوسری طرف متحدہ ہندوستان کا بٹوارہ۔ اگست 1947ء میں ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ بھارت اور پاکستان۔ بمبئی بھارتی حصے میں تھا۔ اس لیے وہاں کی فلم انڈسٹری سے وابستہ بہت سے فلم والے جن کا تعلق پاکستانی حصے سے تھا۔ ایک ایک دو دو اور تین تین کی ٹولیوں کی شکل میں بمبئی سے لاہور منتقل ہونے لگے۔ نذیر صاحب سورن لتا، لقمان، خود سید شوکت حسین رضوی اور نور جہاں نے پاکستان جانا ہی بہتر سمجھا۔ یہ سلسلہ تا دیر جاری رہا۔ اس طرح بمبئی فلم انڈسٹری چھوڑ کر پاکستان آنے والوں میں نجم نقوی، عطا اللہ شاہ ہاشمی، ایس ایم یوسف، غلام محمد، ڈبلیو زیڈ احمد اور نینا کے علاوہ بھی بہت سے نام ہیں۔

وہ بھی نہ جانے کیا سوچ کر بمبئی کا بھرا میلہ چھوڑ کر

لاہور آگئے تھے؟ قیاس اغلب ہے کہ انہوں نے یہی سوچا ہو گا کہ لاہور جا کر بھی اسی طرح موقع ملے گا جس طرح یہاں بمبئی میں ملتا ہے کیونکہ وہ جب لاہور میں تھے تو وہاں کی فلم انڈسٹری اپنے جوبن پر تھی۔

مگر اب جب وہ اور دیگر فلم والے لاہور آئے تو ان پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ یہاں تو پھولتی پھلتی اور پُرشباب فلم انڈسٹری کی بجائے اس کے کچھ آثار باقی رہ گئے تھے۔ کھنڈر سے پتا چلتا تھا کہ یہاں نگار خانے نام کی کوئی چیز تھی۔

آنے والوں کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''ہائے! یہ کیا ہوگیا؟ کیسے ہوگیا؟''

یہاں والوں نے انہیں بتایا۔ ''تقسیم ہند سے پہلے جب بہار، بنگال اور مشرقی پنجاب میں فسادات پھوٹ پڑے اور مسلمانوں کا خون بہایا جانے لگا اور ان کے املاک کو نقصان پہنچایا جانے لگا تو اس کے ری ایکشن کے طور پر یہاں بھی جواب پاکستان کا حصہ ہے۔ یہاں کے سکھوں ہندوؤں کے جان و مال کو بھی نقصان پہنچانے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ مذموم سلسلہ شروع ہوا تو یہاں کی فلم انڈسٹری کیسے محفوظ رہتی؟ آپ لوگ جانتے ہیں کہ لاہور کی فلم انڈسٹری میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ وہ نگار خانوں کے مالک ہی نہیں، فلم سازوں، ہدایت کاروں، ہنرمندوں اور فنکاروں میں بھی غالب اکثریت رکھتے تھے، فسادیوں نے انہیں بھرپور نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ لوٹ مار، توڑ پھوڑ، گھیراؤ جلاؤ کے نتیجے میں جو کچھ بچا ہے وہ یہی در و دیوار ہیں جن پر حسرت برستی آپ لوگ دیکھ رہے ہیں۔''

پاکستان کی محبت میں آنے والوں میں سے کئی ایک کو افسوس ہوا کہ انہوں نے بمبئی سے لاہور آنے میں بہت جلدی کی۔

بمبئی میں فسادات کے دنوں میں فلم انڈسٹری پر کوئی آنچ نہیں آئی تھی۔ اگر ان دنوں وہ ذرا تحمل سے کام لیتے تو آج انہیں اس صورتِ حال کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

لاہور میں فلم سازی کی بنیاد بھی ہندوؤں نے رکھی تھی۔ انہی کے سرمائے، انہی کی سرپرستی، انہی کی تکنیکی معاونت اور انہی کی جدوجہد نے پنجاب میں فلم سازی کی عمارت کھڑی کی تھی۔ آغاز تو خاموش فلموں کے دور سے ہو چکا تھا پھر بولتی فلموں کا دور شروع ہوا تو اس دور میں بھی لاہور میں بننے والی فلموں کو ہندو سیٹھوں اور سرمایہ داروں کی سپورٹ حاصل رہی۔ کچھ دنوں تک تو یہاں کی فلمی صنعت کو قدم جمانے کا موقع نہیں ملا مگر جب سیٹھ دل سکھ پنچولی اور ان کے بعد آر ایل شوری نے یہاں فلم سازی کی باگ ڈور سنبھالی تو لاہور کی فلموں اور فلم انڈسٹری کو کلکتہ اور بمبئی کے مدِ مقابل کھڑا کر دیا۔

یہ کہانی بہت طویل ہے اور بہت دلچسپ بھی ہے اگر کبھی موقع ملا تو اسے تفصیل کے ساتھ سناؤں گا۔ اس موقع پر بس یہ عرض کروں گا کہ فسادات کے نتیجے میں سیٹھ پنچولی کو جان بچا کر بھارت جانا پڑا تو اس وقت لاہور میں ان کے دو اسٹوڈیوز، تین سینما گھر، ایک کوٹھی اور ایک بڑا قطعہ اراضی تھے۔ جس کے لیے وہ منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ اگر یہ سانحہ نہ ہوتا تو شاید کوئی جدید نگار خانہ قائم کرتے۔ علاوہ ازیں ان کی ملکیت میں سیکڑوں ملکی اور غیر ملکی فلمیں بھی تھیں جن کے حقوق انہوں نے خرید رکھے تھے جو کام وہ یہاں مکمل نہیں کر سکے تھے انہوں نے بمبئی جا کر نئے سرے سے کیا۔

اس سے پہلے کہ آر ایل شوری اور ان کے صاحبزادے روپ کے شوری کی کارکردگی کا مختصر ذکر کروں۔ دل سکھ پنچولی کے بارے میں اختصار کے ساتھ یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے فلم سازی کے ضمن میں کیا کارہائے نمایاں انجام دیے۔

پنچولی پکچرز کی پہلی فلم گل بکاؤلی تھی جو پنجابی زبان میں بنائی گئی تھی۔ اس میں نور جہاں نے بھی کام کیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے یملا جٹ بنائی، یہ بھی پنجابی فلم تھی جس نے متحدہ ہندوستان میں زبردست بزنس کیا۔ اس کے منافع سے پنچولی نے لاہور میں پربھات سینما بنایا۔ جس کا بعد میں نام صنوبر سینما رکھا گیا۔ ان دو پنجابی فلموں کے بعد انہوں نے اردو فلم خزانچی بنائی جس نے کامیابی کے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ اس کی موسیقی ماسٹر غلام حیدر نے دی تھی۔ اس فلم کی موسیقی سے برصغیر کی فلمی دنیا میں ایک انقلاب آگیا۔ ماسٹر غلام حیدر نے لوک گیتوں کی آمیزش سے ایسی دھنیں مرتب کیں کہ کلکتہ اور بمبئی کے فلم ساز بھی اس روش کو اپنانے پر مجبور ہو گئے۔ فلم خاندان اس کی عمدہ مثال ہے جس کے گیتوں نے پورے برصغیر میں تہلکہ مچا دیا تھا۔

خاندان کے یہ دو گیت تو زبردست ہٹ ہوئے تھے۔

☆ تو کون سی بدلی میں میرے چاند ہے آجا

☆ میرے لیے جہاں میں چین ہے نہ قرار ہے

ان گیتوں کے بول اتنا عرصہ گزرنے کے بعد آج ...ول ہیں۔ یہ گیت نور جہاں کی آواز میں تھے جو فلم کی ...تھیں۔ ان کے ہیرو پران تھے۔

اب پنچولی والوں نے زمیندار بنائی جس کی ہیروئن ...آپٹے اور ہیرو ڈاکٹر ایس ڈی نارنگ تھے۔ یہ سلسلہ ...نکلا انہوں نے چودھری، پونجی، دھمکی، پگڈنڈی اور ...فرہاد بنائی۔

یہاں تک پہنچتے پہنچتے فسادات پھوٹ پڑے اور ...وں نے حالات کا رخ دیکھتے ہوئے یہی سوچا کہ کچھ ...ے کے لیے بمبئی منتقل ہو جائیں۔

لاہور میں آر ایل شوری نے بھی پنچولی والوں کے ...بلے میں وسیع پیمانے پر فلم سازی شروع کی۔ ان کے ...زادے روپ کشور شوری جنہیں آر کے شوری بھی کہا ...ے ان دونوں باپ بیٹوں نے لاہور کی فلم انڈسٹری کو ترقی دی۔ لاہور میں پنچولی کے بعد ان کا دوسرا بڑا ادارہ ...جس کے بینر تلے کئی کامیاب فلمیں پیش کی گئیں۔ شوری ...والوں نے اپنی پہلی فلم ''دلا بھٹی'' پنجابی زبان میں ...اس کی کاسٹ میں راگنی، ایس ڈی کنور اور کامیڈین ...شامل تھے۔ یہ فلم پنجاب سرکٹ میں بہت پسند کی گئی۔ ...کے بعد آر کے شوری نے کملا مووی ٹون کے بینر تلے فلم ...اور مجنوں 1935ء بنائیں۔ جس میں کامیڈین ...اور امیر جان نے کام کیا، اس کے بعد یہ کمپنی شوری ...میں تبدیل ہوگئی پھر انہوں نے نشانی بنائی۔ اس کے ...تی۔ یہ بھی پنجابی فلم تھی۔ اس فلم نے بڑا کامیاب بزنس ...اس کی کاسٹ میں ممتاز شانتی اور ایک نیا ہیرو پرویز تھا ...د میں مسعود پرویز بنا اور اس نے پاکستان میں خواجہ ...انور کے اشتراک سے کئی کامیاب فلمیں بنائیں۔

...نے لاہور میں کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کیے اور ...پکچرز والوں کی مثالی حیثیت بڑی مستحکم ہوگئی۔ لاہور ...انہوں نے دو فلمیں اور بنائیں ان میں ایک شالیمار تھی ...میں چندر موہن اور شانتا آپٹے تھی جب کہ دوسری فلم ...بت تھی۔

اس سے پہلے کہ فیروز نظامی کی کہانی آگے بڑھائی ...بہت ضروری ہے کہ پاکستان کی پہلی فیچر فلم تیری یاد کا ...ذکر کر دیا جائے۔ پاکستان 14 اگست 1947ء کو عالم ...میں آیا اور ''تیری یاد'' 2 ستمبر 1948ء کو لاہور میں ...طر کے موقع پر پربھات سینما میں ریلیز کر دی گئی۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس کا بنانے والا بھی ایک ہندو تھا جس کا نام دیوان سرداری لال تھا۔ یہ صاحب لاہور میں رہتے تھے۔ پیشے کے اعتبار سے انکم ٹیکس وکیل تھے۔ شروع ہی سے انہیں فلموں سے دلچسپی تھی اس لیے لاہور کی فلمی دنیا سے ان کا گہرا رشتہ تھا۔ اداکارہ آشا پوسلے ان کی منظور نظر تھی اس لیے انہوں نے اسے خوش کرنے کے لیے فلم ''تیری یاد'' شروع کر دی۔ یہ بات پاکستان بننے سے کچھ دن پہلے کی ہے۔ انہوں نے دلیپ کمار کے چھوٹے بھائی ناصر خان جو ان دنوں لاہور میں تھے انہیں ہیرو لے کر فلم تیری یاد شروع کر دی۔ بطور موسیقار انہوں نے آشا پوسلے کے والد کا انتخاب کیا۔ ان کا اصل نام عنایت تھا مگر انہیں ناتھ کے نام سے متعارف کرایا۔ ہدایت کاری کے لیے داؤد چاند کا انتخاب کیا۔ معاون اداکاروں میں ڈانسر شعلہ اور کیریکٹر ایکٹر غلام محمد شامل تھے۔ یہ فلم مختصر سے سرمائے سے مختصر لوگوں کے تعاون سے تیار ہوگئی۔

پاکستان بننے سے پہلے فسادات کے نتیجے میں لاہور کی فلم انڈسٹری کا جو حال ہوا اس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔

پاکستان بننے کے بعد دیوان سرداری لال نے 2 ستمبر 1948ء کو تیری یاد پہلی پاکستانی فلم کے نام سے ریلیز کر دی۔ یہ الگ بات ہے کہ باکس آفس پر یہ فلم بری طرح ناکام ثابت ہوئی مگر دیوان سرداری لال نے فاؤنڈر آف پاکستان فلم انڈسٹری اور پہلی پاکستانی فلم کے تخلیق کار کے طور پر اپنا نام پاکستانی فلمی تاریخ میں ہمیشہ کے لیے رقم کروا لیا۔

سید شوکت حسین رضوی المعروف بہ شاہ جی، نور جہاں اور فیروز نظامی بمبئی سے لاہور پہنچے تو بدلا ہوا زمانہ تھا۔ نہ پھول تھے، نہ چمن تھا، نہ آشیانہ تھا اگر کچھ تھا تو تباہی و بربادی کے آثار تھے۔

بمبئی سے آنے والوں نے اور یہاں کے مسلمان فلم والوں نے سوچا جو کچھ ہو چکا، اس کا ماتم کرنے کی بجائے حالات کو معمول پر لانے اور لٹی پٹی فلم انڈسٹری کے آشیانے کو نئے تنکے چن کر نئے سرے سے آباد کرنے کی تدبیریں کرنی چاہیے۔

شاہ جی (سید شوکت حسین رضوی) نے حکومت سے درخواست کی کہ پنچولی کا تباہ حال اسٹوڈیو ان کے نام الاٹ کیا جائے تاکہ وہ اسے فلم سازی کے قابل بنا کر لاہور کی فلم انڈسٹری کو نئے سرے سے زندہ کریں۔ حکومت پاکستان نے ان کی درخواست قبول کر لی اور پنچولی اسٹوڈیو شاہ جی

پاکستان کے منتخب فلمی نغمے

(1950ء سے 1974ء تک)

''ہماری بستی'' 1950ء اک شہری بابو آیا، پکھراج پپو۔ چھپ گیا دن کالی رات آئی، پکھراج پپو۔ محبت کرنے والوں پہ، پکھراج، پپو، علی بخش ظہور۔

''چن وے'' 1951ء وے منڈیا سیالکوٹیا، نور جہاں، وے تو بھل نہ جاویں، پکھراج پپو، صادق۔ جادو کوئی پا گیا، نور جہاں۔ بچ جا منڈیا موڑ توں، نور جہاں کورس۔

''دوپٹا'' 1952ء میں بن پتنگ اڑ جاؤں، نور جہاں۔ تم زندگی کو غم کا فسانہ بنا گئے، نور جہاں۔ سانوریا رے تو۔۔، کوئی پکارے، نور جہاں۔ جگر کی آگ سے، نور جہاں۔

''شرارے'' 1955ء لب پر میرے ہنسی بھی ہے، منور سلطانہ۔ جھوم جھوم کے لکھی، سلمیٰ بیگم۔ بجھا دو شمعیں، منور سلطانہ۔

''سوہنی'' 1955ء اک چوٹ لگی ہے، اقبال بانو، تری یاد ستائے ساجنا، کوثر پروین۔

''انتخاب'' 1955ء، رت ہے شباب کی، سلیم رضا۔ دل جھوم جھوم جائے، عنایت بھٹی۔ تمہیں دل یاد کرتا ہے۔

''قسمت'' 1956ء پیار بھرا دل توڑنے والے، کوثر پروین، فضل حسین۔ میں واری جاؤں جی، زبیدہ خانم۔ البیلا نیناں، روشن آراء بیگم۔ کیوں تری دنیا میں آئے، کوثر پروین۔

کے نام الاٹ کردیا اور شاہ جی نے پنچولی اسٹوڈیو کو شاہ نور اسٹوڈیو بنا دیا۔ یہ نام ان کے اور ان کی چہیتی بیگم نور جہاں کے ناموں کے پہلے حصوں سے ترتیب دیا گیا تھا۔

قدرت کے کھیل بڑے نیارے ہوتے ہیں۔ وقت نے جن سید شوکت حسین رضوی اور نور جہاں کو پنچولی اسٹوڈیو کا مالک بنا دیا تھا۔ یہ وہی سید شوکت حسین رضوی تھے جنہیں 1943ء میں سیٹھ دلسکھ پنچولی نے کلکتے سے بلا کر کہا تھا۔ ''آپ ہماری فلم خاندان ڈائریکٹ کریں۔''

''مگر سر میں تو......''

''ہم جانتے ہیں آپ ایڈیٹر ہیں۔ کلکتہ فلم انڈسٹری کے نامور تدوین کار ہیں۔''

''پھر......پھر میں کسی فلم کی ہدایت کاری کیسے کرسکوں گا؟''

''میاں کب تک نرے تدوین کار بنے رہو گے؟ آگے بڑھنے کی امنگ ہے لگن ہے کہ نہیں؟''

سید شوکت حسین رضوی کو سیٹھ دلسکھ پنچولی کی بات دل کو لگی۔ انہوں نے اللہ کا نام لے کر خاندان کی ہدایت کاری کی۔ بندہ دل جمعی کے ساتھ اپنے کام سے انصاف کرے تو کامیابی مقدر ہوتی ہے۔ پنچولی صاحب نے پہلی بار نور جہاں کو ہیروئن کاسٹ کیا اور ان کے مقابل پر ان کو ہیرو کا کردار دیا جو بعد میں انڈین فلموں کے نامور ولن بنے۔ ماسٹر غلام حیدر کو خاندان کا موسیقار بنایا۔ انہوں نے اس فلم کے لیے موسیقی کی ایسی دھنیں کمپوز کیں کہ فلم کے ساتھ اس کے گانے بھی ہٹ ہوگئے۔ اس کامیاب فلم میں کام کرنے والے آرٹسٹوں اور ہنر مندوں کو بمبئی سے بلاوے آنے لگے۔ لاہور کے مقابلے میں بمبئی کی فلم انڈسٹری بہرحال بڑی اور مستحکم تھی۔ جانے والوں میں سید شوکت حسین رضوی اور نور جہاں پیش پیش تھیں۔ بمبئی والوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کی قسمت کے دروازے کھل گئے۔ شاہ جی نے نور جہاں کو جو اداکارہ کے ساتھ ساتھ گلوکارہ بھی تھیں ان سے شادی کرلی۔ بمبئی پہنچ کر شاہ جی نے زینت اور جگنو جیسی سپرہٹ فلمیں بنائیں جب کہ نور جہاں نے محبوب خان کی انمول گھڑی میں بطور اداکارہ اور گلوکارہ کام کیا۔ جس کی موسیقی نوشاد نے دی تھی۔ انمول گھڑی کے تمام ہی گیت بے حد مقبول ہوئے۔

وہ شخص جو 1943ء میں کلکتے سے بلا کر پنچولی والوں کی فلم خاندان کا ہدایت کار بنایا گیا تھا آج اللہ نے اس کو پنچولی اسٹوڈیو کا مالک بنا دیا تھا۔ شاہ جی ہنر مند آدمی تھے اسٹوڈیو کی مشینری سے پوری طرح واقف تھے چنانچہ انہوں نے اسٹوڈیو کے ٹوٹے پھوٹے اور تباہ حال فلم سازی کے

''سولہ آنے'' 1959ء، مجبوروں کی اس دنیا میں، زبیدہ خانم۔ میں نے جو گیت ترے پیار کی، عنایت بھٹی۔ چوری [illegible]لیا دل متوالا، زبیدہ خانم۔

''گلشن'' 1959ء اس دنیا میں کوئی پیار کا نام (شریک موسیقار رشید عطرے)، ناہید نیازی۔ کیوں چھین لیا میرا [illegible]، نسیم بیگم۔ مجھے ہو گیا تم سے پیار، ناہید نیازی، منیر حسین۔

''راز'' 1959ء میٹھی میٹھی بتیوں سے جیا نہ جلا، زبیدہ خانم۔ مست نظر میری پتلی کمر، مبارک بیگم۔ جھلک رہی ہیں [illegible]لیاں، احمد رشدی، زبیدہ خانم۔

''زنجیر'' 1960ء اے دل کی لگی اب تو ہی بتا، کوثر پروین، جس نے چرائی نیند ہماری، سلیم رضا، مجھ کو ہے تم سے پیار، کوثر پروین کورس۔

''منزل'' 1960ء تو ہی بتا دے چندا، نور جہاں، دن ڈھلتے ڈھلتے نور جہاں، آ آ تو میرا ہے میں تیری، نور جہاں۔

''منگول'' 1961ء آج ہے سگائی کل بارات، نسیم بیگم۔ حسن کا نظارہ کیجیے، ناہید نیازی۔ آئے وہ میرے دل میں، [نو]ر جہاں۔ مہکا ہوا ہے سماں، نور جہاں۔ ہاتھوں میں ہاتھ لے کر، نور جہاں کورس۔

''سوکن'' 1965ء اج بھراں میں ہوا وچ نچدی، مالا۔ اکھاں کچھ ہور، مالا منیر حسین۔ سن میرے مالکا، نسیم بیگم۔ [illegible]وں کچھ نہ لگا ٹیارے، مسعود رانا، مینوں عشقے دا سبق پڑھا دے، آئرن پروین فضل حسین۔

''زن زر تے زمین'' 1974ء زن زر تے زمین دا جھگڑا، مسعود رانا۔ میں نوں کے دا مجھیں ڈر، نسیم بیگم۔ پیار [illegible]روے مینوں پیار، مالا، چار چو میرے دھم ماہی دے، رونا لیلیٰ۔ کجلے دیاں کچ کے دھاراں، تصور خانم۔

[illegible]ز و سامان کو دن رات ایک کر کے مرمت کا کام شروع کیا [illegible]کار خانے کو اس قابل بنا دیا کہ اس میں شوٹنگز ہوسکیں۔

اب انہوں نے فلم چنو وے شروع کردی۔ اس [illegible]ی فلم کی موسیقی کے لیے انہوں نے جگنو کے ہٹ موسیقار [فیر]وز نظامی کا ہی انتخاب کیا۔ چن وے ریلیز ہوئی تو اس [illegible]کانوں نے تہلکہ مچا دیا۔ چنو وے کے گیت نور جہاں نے [illegible]ئے تھے۔ اس فلم کی کامیابی کی بنیادی وجہ فیروز نظامی کی [illegible]ں دھنیں اور نور جہاں کی جادو بھری آواز تھی۔ ویسے چن [و]ے کے کریڈٹ میں نور جہاں کا نام بطور ہدایت کارہ بھی [illegible]ج ہے۔ شاہ جی نے انہیں پہلی خاتون پاکستانی ہدایت [کا]رہ بنانے کے لیے یہ حرکت کی ہوگی جب کہ سارا کام خود [illegible]کیا ہوگا۔ ویسے ہدایت کاری کے تناظر میں اس فلم کا کوئی [illegible]نہیں ہے۔

فیروز نظامی کی بطور موسیقار یہ دوسری پاکستانی فلم [تھی] جو 1951ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس سے پہلے ان [کی] پہلی فلم ہماری بستی 1950ء میں نمائش پذیر ہوچکی تھی [جب] کہ ان کی آخری پاکستانی فلم زن زر تے زمین تھی جو 19[74]ء میں ریلیز ہوئی۔ ان 15 فلموں میں تین (چن [وے]، سوکن، زن زر تے زمین) پنجابی فلمیں تھیں۔ باقی [ارد]و زبان کی تھیں۔ ان فلموں میں دوپٹا نے موسیقی کے تناظر میں بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کی تھی۔ دوپٹا کے اس گیت

سانوریا تو ہے کوئی پکارے

کی طرز پر گنگناتا مگھکر مسرت، حسرت اور عقیدت سے بے چین ہوگئی تھیں اور انہوں نے فون پر فرمائش کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ڈیڈی! فلم دوپٹا کا یہ گیت براہ کرم فوراً بھجوایئے۔''

فلموں کے حوالے سے فیروز نظامی کی پاکستانی فلمیں زیادہ معیاری نہیں تھیں۔ خاص طور پر ابتدائی دور کی فلمیں جب کہ بعد کی فلموں میں کچھ قسمت، راز، زنجیر اور سنگدل معیار کے اعتبار سے بہتر تھیں۔

ان جیسے جینئس موسیقار کے لیے، بڑے سرمائے اور بڑے ہدایت کاروں کی فلموں کی ضرورت تھی جو لٹے پٹے پاکستانی فلم انڈسٹری میں انہیں حاصل نہ ہوسکیں۔ بہرحال جس کی قسمت میں جو لکھا ہوتا ہے وہی اس کے سامنے آتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ راگ داری میں جو عملی اور نظری عبور انہیں عطا ہوا تھا کم ہی موسیقاروں اور میوزک ڈائریکٹرز کے حصے میں آیا ہے۔

فلم کے میوزک ڈائریکٹر کے طور پر ان کے دور کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ پہلا پانچ سالہ دور

1943ء سے 1947ء دوسرا پندرہ سالہ دور (1950ء سے 1965ء)۔

ایک تسلسل اور ترتیب کے ساتھ اگر ہم اس عظیم میوزک ڈائریکٹر کی بنائی ہوئی طرزوں کو بغور سنیں تو ہمیں ان میں ایک تنوع آمیز پھیلاؤ ملے گا۔ اس تنوع کی بڑی ہی واضح مثال آپ کو دوپٹا کے شاہکار نغموں کے بعد بھی ملتی چلی جائے گی۔ قسمت، سولہ آنے، راز، منزل، ان فلموں کے گیتوں کی دھنیں، ان کے طرز کی تخلیق ووسعت کا منہ بولتا ثبوت فراہم کریں گی۔ نت نئی طرز نت نیا انداز فیروز نظامی کا خاصا تھا۔

انہوں نے اپنی فلمی زندگی کے کیریئر میں کلاسیکی پابندیوں کا دامن کبھی بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ یہی ان کی فنی پختگی کی بین دلیل ہے۔ انہوں نے فلمی . یتی و طفیل فاروقی اور سلیم اقبال جیسے مایہ ناز میوزک ڈائریکٹرز دیئے۔ محمد علی شبیر کے سر پر دست شفقت رکھا۔ دھیر علی منصور، فضل گوش کی خاطر خواہ رہنمائی کر کے انہیں باضابطہ میوزک ڈائریکٹر بنایا۔ مذکورہ میوزک ڈائریکٹرز فیروز نظامی کے تلامذہ تھے۔ انہی کے تربیت یافتہ تھے بلکہ سلیم اقبال (سلیم حسین اقبال) تو نظامی کے رشتے میں بھانجے بھی تھے جب کہ اقبال حسین مرحوم فیروز نظامی کے برادر کلاں سراج نظامی کے پسر نسبتی (داماد) بھی تھے۔

فیروز نظامی نے دو شادیاں کیں اور ان کی دو بیویوں سے ماشاءاللہ بارہ اولادیں ہیں۔ یعنی سات بیٹے اور پانچ بیٹیاں۔ باپ کی حیثیت سے وہ اپنی ہر اولاد سے یکساں محبت اور شفقت کا اظہار کرتے تھے اور یہ انہی کی تعلیم و تربیت تھی کہ سارے بھائی بہن ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہیں۔ موسیقی پر فیروز نظامی کی دوسری کتاب رموز موسیقی ہے جب کہ ستر کی دہائی میں وہ پاکستان ٹائمز میں بڑی باقاعدگی کے ساتھ موسیقی کے مختلف موضوعات پر ایک تسلسل کے ساتھ مضامین لکھتے رہے۔ ان کے مذکورہ مضامین کتابی شکل میں History of developmnt of music کے نام سے شائع ہوئی۔ انگریزی ہی میں ان کی ایک اور تصنیف ABC of Music ہے۔ مذکورہ کتاب میں مغربی موسیقی کو مشرقی کلاسیکی موسیقی کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے اسلوب واہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

پاکستانی موسیقاروں کے وفد کے قائد کی حیثیت سے فیروز نظامی نے افغانستان کا دورہ بھی کیا اور وہاں پر ایک پرمغز مقالہ بھی پیش کیا۔ ریڈیو پاکستان لاہور کے سینٹرل پروڈکشن یونٹ کے لیے بھی آپ نے وقیع فیچر سپرد قلم کیے۔

امیر خسرو پر فیروز نظامی کو ایک اتھارٹی کی حیثیت حاصل تھی۔ جب امیر خسرو کا سات سو سالہ جشن منایا گیا اس موقع پر فیروز نظامی کے لکھے ہوئے فیچروں کو ریڈیو پاکستان نے بڑے اہتمام اور کروفر سے نشر کیا جس کی بڑی پذیرائی ہوئی۔

فیروز نظامی کا شمار ریڈیو پاکستان لاہور کے ریسرچ سیل کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ ان کی نایاب لائبریری بھی اس ریسرچ سیل میں محفوظ ہے۔

کئی سالوں تک جب وہ پاکستان آرٹس کونسل میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز رہے تو بڑی ہی باقاعدگی کے ساتھ شائقین اور تلامذہ موسیقی کے لیے عمدہ اور قابل سماعت لیکچر دیتے رہے۔

ہومیو پیتھک اور بایو کیمکس سے بھی شغف تھا۔ موسیقی کے علاوہ مختلف اور متنوع موضوعات پر نایاب کتب کا ذخیرہ ان کے گھر کی زینت تھے۔

زندگی کے آخری برسوں میں ان کی طبیعت کا رجحان تصوف کی طرف زیادہ ہوگیا تھا۔ درویش منش تو وہ تھے ہی مگر اب اس درویش نے تصوف کی نظر میں حدود پھلانگ کر عملی حدود میں سرگردانی شروع کردی تھی۔ فلسفۂ تصوف پر ان کی نظر عمیق تر ہوتی جارہی تھی۔ اس موضوع پر سرچشمہ حیات ان کی عمدہ یادگار ہے۔

ان کی خواہش تھی کہ انہیں راگ راگنیوں کی جو ان گنت بندش ازبر ہیں انہیں تین تین منٹ کے دورانیے کی شکل میں بصورت ریکارڈنگ محفوظ کرایا جائے۔ اس منصوبے پر وہ روز سوچا کرتے تھے اور ذہنی طور پر وہ اس کی تیاری میں مصروف تھے۔

15 نومبر 1975ء کی ایک ٹھنڈی صبح انہیں بلغم آمیز کھانسی کی تکلیف ہوئی۔ سانس کی نالی میں رکاوٹ کے باعث بے ہوش ہوگئے۔ اسی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا جہاں وہ جاں بر نہ ہوسکے۔

دل اپنی طلب میں صادق تھا گھبرا کے سوئے مطلوب گیا
دریا سے یہ موتی نکلا تھا دریا پر جا کے ڈوب گیا

مونا عمیدی

سلمیٰ اعوان

اس کی شاعری میں ایک انوکھا پن تھا۔ شام میں ہورہی خانہ جنگی کا بین، تباہ ہو رہے ملک کا ماتم اور بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہو رہے انسانوں کا دکھ سمویا ہوا ہے۔ امریکن ماں اور شامی باپ کی اس لاڈلی بیٹی کی شاعری پورے عالم عرب میں گونج رہی ہے۔

شام کی اس شاعرہ کا تذکرہ جو انقلاب کی آواز ہے

دمشق میں چم cham پیلس ہوٹل کے بالمقابل نوبل بک شاپ پر دھری مونا عمیدی کی نظموں کے مجموعے کی پھولا پھرولی میں اس نظم نے پل بھر میں ہی گرفت میں لے لیا تھا۔

آہ بغداد کے اسٹور بند ہیں
تریپولی کی گلیاں ویران ہیں
غزہ پر بمباری ہے
فلوجہ شعلوں میں نہا رہا ہے
دنیا سو رہی ہے
اور عرب دنیا
بحث میں الجھی ہوئی ہے کہ

ورلڈ کپ میچوں میں کون جیتا ہے؟
رہے نام اللہ کا

یہ چونکا دینے والی نظم تھی۔ وہیں کھڑے کھڑے پانچ چھ مزید نظموں کے مطالعہ نے بتایا کہ شاعرہ نے بشارالاسد کے آغاز اقتدار سے جس سیاسی تبدیلی کی خوشبو محسوس کرتے ہوئے بہت سی اُمیدیں وابستہ کیں۔ فکری انقلاب مشرق وسطیٰ کے درودیوار پر دستک دیتا محسوس کیا۔ 2000 سے 2001 کے مختصر وقت کو "دمشق بہار" کے نام سے موسوم کیا تھا۔ آنے والے وقتوں میں اس نے مایوس کیا۔

نثر اور کورس کی کتابیں لکھتے لکھتے دلی جذبات شعروں میں ڈھلنے لگے تھے۔

کھلتی رنگت والے سیلز مین نے صاحب کتاب سے مزید تعارف کی غرض سے ایک اور خوبصورت کتاب سیرین فوک ٹیلز Syrian Folk tales پکڑادی اور ساتھ ہی بڑے میٹھے سے لہجے میں کتاب کو تفصیلی دیکھنے کی دعوت بھی دے دی۔

دیدہ زیب طباعت و کتابت اور ٹائیٹل نے توجہ فوراً کھینچی۔ صفحات الٹنے پلٹنے اور کہیں کہیں پڑھنے سے احساس ہوا کہ بلادالشام کے مختلف علاقوں کی یہ کہانیاں ایک انتہائی شاندار پیش کش تھی۔ گرفت میں لینے والی عام فہم زبان جو حقیقت اور طلسم، معلوم اور نامعلوم کے درمیان سفر کرتی تھیں۔ مصنفہ شاعرہ بھی کمال درجے کی تھی۔ دونوں کتابیں خرید لیں۔ میری درخواست پر بک شاپ کے مالک نے مصنفہ کا فون نمبر اور پتا بھی کاغذ پر لکھ دیا تھا۔ یہ 2008 تھا۔ شام پُرامن تھا اور عام آدمی کب جانتا تھا کہ فضاؤں میں کہیں اس کی بربادیوں کے چرچے گردش میں ہیں۔

کہانیوں نے مجھے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ یہ تعارف تھا اِس خوبصورت ملک کے ماضی کے تہذیبی اور ثقافتی ورثے سے۔ یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں عمیدی کی دادی سے بیٹھی کہانیاں سن رہی ہوں۔ شام کے شہروں کے گھروں کے پُرسکون ماحول میں، شام کے مختلف دیہی علاقوں میں روایتی زندگی کے سارے رنگ اِن کہانیوں میں اڑتے پھرتے تھے۔

رات گئے نظمیں پڑھتی رہی۔ اگلے دن ال فردوس اسٹریٹ پرواقع گھر پر ملاقات کے لیے پہنچ گئی۔ گھر ڈھونڈنے میں پتا پانی ہوگیا۔ ٹیکسی ڈرائیور اناڑی تھا۔ خوب خوب گھمایا۔ اس پتھر کی طرح رولا جو فٹ پاتھ پر پڑے کسی شرارتی سے چلنے والے راہگیر کی ٹھوکروں پر آجائے جو پاؤں کے ٹھڈوں سے اسے لڑھکا لڑھکا کر اس کا حشر نشر کردے۔

مونا عمیدی قدرے فربہی بدن کی سرخ وسفید خاتون نے مجھے اپنے گھر کے دروازے پر خوش آمدید کہا تھا۔ دروازہ ایک معمر عورت نے کھولا۔ ایک اجنبی صورت سامنے تھی۔ زبان یارمن ترکی والا معاملہ تھا۔ تاہم مونا آگئی۔ پاکستان کا جان کر اتنا خوش ہوئی کہ جتنی سفر سے کوفت ہوئی تھی سب اڑنچھو ہوگئی۔ چھوٹے سے سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہی کولڈ ڈرنک آئی پھر قہوہ، کھجوریں اور مٹھائی آگئی۔ باتیں شروع ہوئیں اور پھیلتی چلی گئیں۔ اپنی دونوں کتابیں میرے پاس دیکھ کر خوش ہوئی۔ میں نے کہا کہ وہ ان پر کچھ لکھ دے۔

"سکون سے بیٹھو۔ لکھ دوں گی۔" محبت بھرا اظہار تھا لہجے میں۔

یہ شاعری اس نے کتاب کی طرف اشارہ کیا شاید اس معیار کی نہ ہو جو شاعری کا ہوتا ہے۔ اصل میں تو فوک ٹیلرز کی یہ کتاب ہے جسے میں نے اہتمام اور محبت سے لکھا ہے۔ یہ تو بس ایسے ہی جذبات کا اظہار ہے۔

باتیں شروع ہوئیں وہ بھی دو عورتوں کی جو دو مختلف ملکوں، دو مختلف ثقافتوں اور تہذیبوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ عورتوں کے حوالے سے جو تصویر مونا نے مجھے دکھائی وہ ہماری تصویر سے کچھ ہی مختلف تھی۔ شہری اور دیہی عورت کا جائزہ بھی تھا۔ تاہم سیریا میں زیادہ آبادی شہری ہے۔ ملکی قانون میں بھی مرد عورت کی کوئی تخصیص نہیں۔

تاہم سیاسی طور پر جو کچھ سننے کو ملا وہ صحت مند نہ تھا۔ مونا بہت سلجھی ہوئی اور ملکی حالات پر گہری نظر رکھنے والی خاتون تھی۔ اس نے مختصراً شام کی سیاسی تاریخ میرے سامنے کھول دی تھی۔ میری درخواست تھی کہ وہ کچھ حالات پر روشنی ڈالے کہ جانوں تو سہی۔

خادمہ ٹرالی گھسیٹتی ہوئی لائی جس پر ڈش میں سرخ کٹا تربوز سجا تھا۔ مونا نے پلیٹ میرے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے اسے بھرنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی کانٹا بھی ہاتھوں میں تھمادیا۔

شہد جیسا میٹھا ٹھنڈا تربوز حلق سے نیچے کیا اترا کہ روح تک سرشار کرگیا۔

عرب دنیا میں دراصل بعث پارٹی نے بہت سرعت اور جانفشانی سے نوجوان طبقے کو متاثر کیا تھا۔ اِس کی واحد مثال اسلامی بھائی چارے سے ہی دی جاسکتی ہے۔ حافظ الاسد ایسا

ہی ایک مضطرب نوجوان تھا جو قومی کردار میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے بے قرار تھا۔ وہ فائٹر پائلٹ تھا۔ اپنی فوجی وابستگی کو اس نے پارٹی میں اپنے کردار کے لیے بہت سمجھداری سے استعمال کیا۔ سیاسی سوجھ بوجھ، مہارت، ذہانت، فراست اسے 1971 تک ملک کی صدارت کے عہدے تک لے گئے۔

اس کی فتح یابی یقیناً کسی معجزے سے کم نہیں تھی۔ وہ اگر چاہتا تو اپنے اِس اقتدار میں سیریا کو آسمان پر لے جاتا مگر اس نے بنیادی مسائل جن میں سرفہرست نسلی امتیازات اور "معاشرے میں اسلام کا کردار" کی طرف توجہ نہیں دی۔

یہ سلسلہ جو آج سیریا میں اپنی تلخیوں اور المیوں کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ شاید نہ آتا اگر اس کا تدارک کرلیا جاتا۔

1973 کے نئے آئین میں درج تھا۔ فرانسیسی غلبے کے دوران بھی جو آئین وضع تھا اس میں بھی یہ درج تھا کہ صدارت پر متمکن صرف مسلمان ہوگا۔ سیکولر سیاست کے ساتھ مخلص ہونے کے باوجود حافظ الاسد نے اس مسلم آرا کو دو طریقوں سے سبوتاژ کیا۔ پہلے کے مروجہ آئین ایک شق داخل کرتے ہوئے اسلام کو نئے معنی پہناتے ہوئے اسے نئی تعریف دی۔

اسلام امن، عدل، سلامتی، محبت اور مساوات کا مذہب ہے۔ اس میں علویوں (Alawis) کو شیعہ مسلک سے جوڑا گیا اور کافر یا بدعتوں کی فہرست سے نکال باہر کیا۔ یہی وہ بنیادی وجہ تھی کہ جو 1982 حما (Hama) کے شہر میں پہلی بار فسادات کا باعث بنی۔ ان کی شدت اِس درجہ تھی کہ شہر کھنڈر بن گیا۔

یہ اور بات تھی کہ اس کی بھرپور توجہ، دلچسپی اور فراخدلانہ وسائل کے استعمال نے کیا گھروں، کیا سڑکوں، اسپتالوں، پارکوں کی تعمیر کرواکے دنیا کو دکھا دیا کہ وہ جلا بھنا کھنڈر شہر کیسے ایک زندہ شہر بن سکتا ہے اور حکمران اگر چاہیں تو چیزیں کیسے ممکن ہوتی ہیں؟

یہاں تک تو ٹھیک تھا مگر بنیادی جھگڑا تو جوں کا توں تھا۔ نسلی مسائل کو حل کیسے کرنا ہے اور اسلام کا معاشرے میں کیا کردار ہو جیسے اہم مسائل پر اس کی عدم دلچسپی آنے والے خونین حادثات کا باعث بنی۔ اس کے ہاں اسلام اور بعث پارٹی سنی اور علویوں، شہروں اور دیہی علاقوں میں سماجی تضادات کی گتھیوں میں الجھتی رہیں اور اس نے انہیں سلجھانے اور حل کرنے کی طرف قطعاً توجہ نہ کی۔

2000 میں بشار کے آنے سے احساس ہوا کہ شاید تبدیلی کی کوئی خوشگوار سی لہر چلے۔ اس کی برطانوی نژاد بیوی اسما الِ کمر اس بھی بہت تیز اور ڈرامیٹک قسم کی اپروچ کی حامل نظر آئی تھی۔

دراصل اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد اس نے دمشق بہار کا نعرہ لگاتے ہوئے درجنوں اسٹڈی سرکلز اور بحث مباحثوں کے مراکز قائم کیے۔ سچی بات ہے 2001 میں دانشوروں اور وکلاء کے گروپوں نے آئین میں اصلاحات کے لیے زوردار قسم کی مہمیں چلائیں۔ جن میں سرفہرست ایمرجنسی قوانین کا ہٹانا اور مکمل شخصی آزادیوں کا حصول تھا مگر جابرانہ ہتھکنڈے اتنے زبردست تھے اور اندرخانے ایسی ایسی گھناؤنی سازشیں تھیں کہ بظاہر ہر سطح بہت پُرسکون نظر آنے کے باوجود تہہ میں بہت طوفان مچلتے تھے۔

جب ہم شام کی چائے پیتے تھے۔ ملحقہ کمرے سے مدھم سروں میں کسی گیت کی آواز نے جیسے مجھے مضطرب سا کردیا۔ آواز اتنی خوبصورت تھی کہ سمجھ نہ آنے کے باوجود بھی گیت دل میں اترا جاتا تھا۔

مونا نے پوچھا تھا۔ "عربی کی شد بد ہے؟"
"بس پڑھنے کی حد تک سمجھنے کی نہیں۔"

یہ نزار قبانی کی شاعری تھی۔ ترجمہ بھی اس نے کردیا تھا۔ اور گانے والے کا نام بھی۔ نزار قبانی پر بات ہوئی تو کہنے لگی۔ وہ زمانوں کا شاعر ہے۔ مخصوص وقت کا نہیں۔

عورت مرد کی امارت سے
نہ ہی اس کی خوبصورتی سے
اور نہ ہی اس کی شاعری سے
کچھ نہیں چاہتی
اس کی تمنا ایک ایسا مرد ہے
جو اس کی آنکھوں کی زبان سمجھ سکے
جب وہ اداس ہو
وہ اپنی چھاتی کی طرف اشارہ کرے
اور کہے
یہ ہے تمہاری جائے پناہ

پھر مونا کی ذاتی زندگی کے بارے میں جانا۔ امریکن ماں اور شامی باپ کی یہ بچی 1962 میں دمشق میں پیدا ہوئی۔ انگریزی ادب میں گریجویشن اس نے دمشق یونیورسٹی سے کیا۔ اس کے ساتھ اس نے انگلش عربی ٹرانسلیشن کا ڈپلوما بھی حاصل کیا۔ آغاز میں اس نے بچوں کے لیے انگریزی کورسز مرتب کیے اور انگریزی زبان کیسے پڑھائی

جائے پر نصابی کتب لکھیں۔ بعدازاں عربی کہانیوں کا ترجمہ شروع کردیا۔
دو بچے بیٹا اور بیٹی باپ کے ساتھ ”دیمس“ کسی عزیز کے ہاں گئے تھے۔
”دراصل ان کی بیٹی میری بیٹی کی ہم عمر ہے۔ بہت پیار ہے دونوں میں۔ آج اس کی سالگرہ تھی۔“
”آپ نہیں گئیں؟“ پوچھا۔
”کچھ طبیعت ٹھیک نہ تھی۔“ پھر ہنستے ہوئے بولیں۔ ”ہاں چلی جاتی تو تم سے کیسے ملتی؟“
اور واقعی میں نے سوچا یہ جو دانے دانے پر مہر ہے ایسے تو نہیں کہا گیا۔
ہمارے درمیان اب اس کی فوک کہانیوں کے حوالے سے باتیں ہونے لگیں۔
فوک کہانیوں کی ان سلسلہ وار کتابوں نے ایک دھوم مچادی۔ عام شامی کیا پڑھے لکھے لوگ بھی اپنے ملک کی ثقافت کے اِن خوبصورت رنگوں سے ناواقف تھے۔ بہت پذیرائی ہوئی۔ انگریزی میں شاعری بھی چونکا دینے والی تھیں۔ یہ جذبات و احساسات کا ایک جہاں کھولتی تھیں۔ عراق سے متعلق نظمیں، لیبیا، مصر، عرب دنیا کس بے حسی کا شکار ہے۔ بڑی طاقتوں کی سیاسی ریشہ دوانیاں، غلبے کی خواہشیں اور طاقت کے اندھے اظہار کیسے چھوٹے چھوٹے ملکوں کے عام لوگوں کے خوابوں، خواہشوں، امیدوں اور ان کے ہنستے بستے خوش وخرم گھروں کو کھنڈر بنا دیتے ہیں۔ وہ جو کہانیاں اور محبت کے گیت لکھتے اور گاتے لوگ کیسے میٹھے جذبات سے ناطہ توڑ کر خنجر ہاتھ میں پکڑ لیتے ہیں۔ بے حد عام فہم لفظوں میں حقیقت کا چہرہ اور اپنے جذبات و احساسات کس خوبی سے اپنے اندر سے نکال کر وہ باہر صفحے پر بچھا دیتی ہے۔
جب عراق خاک وخون میں نہا رہا تھا، کہیں کسی وژن رکھنے والے نے کہا تھا۔ عراق سے فراغت کے بعد شام کی باری ہے۔ آپ اِس بارے میں کیا کہتی ہیں۔
اِس بات پر اس نے دکھ سے بھری ہوئی لمبی گہری سانس کھینچی تھی اور مجھے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔
”حافظ الاسد غیر معمولی ذہانت والی شخصیت تھی۔ سوال ہے کہ 1982 کی تباہ کن بغاوت سے اسے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کس طرح بیرونی طاقتیں اس کے لوگوں میں گھسی کام کر رہی ہیں؟ جب 1500 سے زائد مشین گنیں پکڑی گئیں۔ لوگ گرفتار ہوئے اور معلوم ہوا کہ ان کی سی آئی اے نے تربیت کی ہے تو پھر عزائم کو پڑھ لینا کوئی مشکل کام نہ تھا مگر بات تو اتنی سی ہے کہ آمرانہ اقتدار کا مزہ اس نشہ آور مشروب کی طرح ہے جسے حالات کی تیز ترین ترشی جھنجوڑتی ضرور ہے مگر ہوشیار نہیں کرتی۔“
رات کے کھانے کے بعد مونا کا ڈرائیور مجھے چھوڑنے آیا تھا۔ ہم نے فون، ای میل کے تبادلے کیے تھے۔
پاکستان آکر کبھی کبھی میرا اس سے رابطہ ضرور ہوتا۔ تاہم 2011 میں اخبارات نے بتانا شروع کیا کہ خانہ جنگی شام کے خوبصورت شہروں پر اپنی نحوست کے سائے پھیلانے شروع ہوگئی ہے۔
آنسوؤں نے آنکھیں دھندلا دی تھیں کہ اندھی عرب دنیا اور دیگر اسلامی ملکوں کی قیادتیں سب آلۂ کار بنی ذاتی اعتراض کے لیے ضمیر کے سودے کرتی کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے اپنی اپنی دنیاؤں میں گم تھیں۔ کوئی منصوبہ بھی ہے۔ کہیں پر عظیم تر اسرائیل کے لیے کام ہو رہا ہے۔ امریکی تھنک ٹینک اب عرب اور تیسری دنیا کے مفلوک الحال ملکوں کو کس اندھے کنوئیں میں دھکیلنے کے لیے سرگرم ہیں۔ انہیں کوئی غرض نہیں۔
اور یہ جنگ پھیلتی جارہی تھی۔ اپنی ایک میل میں اس نے لکھا تھا۔
”اِس عقل کے اوندھے بشار کو کون سمجھائے کہ سیاسی مخالفت کا مطلب ہتھیاروں کو اٹھانا نہیں ہوتا۔ سیریا کا جھگڑا پُر امن احتجاج کے طور پر شروع ہوا تھا۔ اِسے لڑائی میں کیوں بدلنے دیا گیا؟ احمق مغرب کی چالوں کو نہیں سمجھتا۔ جانتی ہو کتنے لوگ مارے گئے۔“ وہ مجھ سے مخاطب تھی۔ ”ایک لاکھ سے زیادہ لوگ مارے گئے اور دربدری کا المیہ تم دیکھتی ہی ہوگی۔“
اور یہ اِس کی نیٹ پر باتیں تھیں۔ جنہوں نے مجھے بتایا تھا کہ عمیدی کہیں نہیں بھاگی۔ دمشق میں رہی کیونکہ دمشق سے اسے عشق ہے۔ لینن گراڈ کے اس بوڑھے موسیقار کی طرح جو سمجھتا تھا کہ وہ اگر شہر سے چلا گیا تو فصیلِ شہر گر جائے گی۔ اپنے خوبصورت ملک کے خوبصورت شہروں کو عراق کے شہروں کی طرح کھنڈر بنتے دیکھتی اور اپنے دکھوں کو لفظوں کے ہاروں میں پرو پرو کر اس کا اظہار کرتی رہی۔

دمشق خوبصورتیوں، پرانی اور نئی تہذیبوں کا شہر
آہ روشنیوں کا شہر مگر اب بجلی نہیں
چنبیلی جیسی کلیوں کا شہر مگر اب پانی نہیں
محبتوں کا شہر، مگر دوستوں سے خالی

تاریخ سے بھرا شہر مگر مستقبل سے خالی

وہ ہمسائیوں کو آواز دیتی ہے اور سنتی ہے سارے شہر میں پانی نہیں، بجلی نہیں، گیس نہیں۔ تب دکھ نس نس اور رگ رگ سے پھوٹتا ہے۔ پھر وہ معصومیت سے خود سے سوال کرتی ہے۔ ایسا تو کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔ دمشق میں فیجا چشمہ سلامت رہے۔ اس نے تو شہریوں کا ہمیشہ خیال رکھا تھا۔
پھر جیسے وہ ماضی کی یادوں سے حال میں آتی ہے۔ میں اسلامی کیلنڈر کے صفحات الٹتی ہوں۔ جو میری کچن کی دیوار پر آویزاں ہے۔ دو ماہ بعد رمضان ہے۔ میرے بچپن کے رمضان کی خوبصورت یادیں اپنی پوری توانائی سے میری آنکھوں سے باہر جھانکتی ہیں۔ کیسے دل موہ لیتے منظر تھے۔ افطاری کے کھانوں کی خوشبوئیں، اذان کی پُرسوز آواز، تراویح کی رونقیں۔ ٹپ ٹپ آنسو آنکھوں سے گرتے ہیں۔ یہ رمضان کیسا ہوگا؟

”صبح کے منظر رلا دینے والے ہیں
دمشق کے لوگوں کو کس جرم کی پاداش میں
سزا دی گئی ہے
میں کیسے بتاؤں کہ
دمشق کے رمضان کی مقدس راتیں
مگر رنگین لالٹینوں اور قمقموں کے بغیر

اب
خاموشیوں کو توڑتی ذکر کی آوازیں نہیں
دمشق میرے خوبصورت شہر
زندگی تو یہاں غروب ہوتے سورج جیسی ہوگئی ہے
جو لوگوں کے دلوں میں ڈوبتی ہے
بڑی ہی آتشی دھمکیوں کے سگنل دیتی
اداسی اور مایوسی کی لہروں کو پھیلاتی
گھپ اندھیروں میں گم ہوتی“

یہ جولائی 2014 ہے اور وہ لکھتی ہے۔ میں شہر کا چکر لگانے کا ارادہ کرتی ہوں۔ اپنی گلی کے ہمسائیوں کے دروازوں کے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے ہوا کی چال میں لڑکھڑاہٹ اور بین کی سی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ بند دروازوں پر دستک میں درد کی ایسی چیخ ہے کہ جیسے وہ اچانک کسی میٹھے مسحور کن خواب سے جاگی ہے اور اسے یہ کربناک احساس ہوا ہے کہ اس کے مکین ہمیشہ کے لیے کہیں چلے گئے ہیں۔ میرا یہ شہر جو کبھی لوگوں سے بھرا پرا ہوتا تھا۔ زندگی کی کہما کہمی سے ہنستا مسکراتا جانے کہاں گم ہوگیا ہے؟ امیدوں سے بھرا میرا یہ بلاد الشام مایوسیوں اور ناامیدیوں کے پاتال میں گر پڑا ہے۔
دیکھئے تو یہ درد مونا کے شعروں میں کیسے در آیا ہے۔

”ہش ہش
قدموں کی چاپ دروازے کی طرف بڑھتی ہے
تالے کے سوراخ میں چابی گھومنے کی آواز
کہیں خوشی ومسرت کا در کھلنے کی امید
ہمیشہ رہنے والی تاریکی کو روشن کرنے کی آرزو
نہیں نہیں
ارد گرد صرف تاریک سائے منڈلاتے ہیں
دروازے کے سوراخوں سے ہوا سیٹیاں بجاتی ہیں
خاموش دروازہ بند رہتا ہے
اپنی افسردگی کو گلے سے لگائے
کھلنے کا خواب دیکھتے ہوئے“

دمشق کے گلی کوچوں میں پھرتے ہوئے میرا دل دکھ اور یاس سے بھر جاتا ہے۔ ہر کوئی ملک سے بھاگ رہا ہے۔ آپ باہر نکلتے ہیں، خوبصورت گھروں کے دروازے بند ہیں، کھڑکیاں بند ہیں۔
میں رک جاتی ہوں۔ دروازے جیسے مجھے کہتے ہیں ہم اپنے مکینوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ کب واپس آئیں گے؟

یہ 1947ء یا 1948ء کی بات ہے۔ میں بذریعہ ٹرین اعظم گڑھ سے لکھنو جانے کے لیے نکلا۔ اس سفر کے لیے پہلے شاہ گنج جانا ہوتا تھا۔ شاہ گنج ریلوے جنکشن تھا، اعظم گڑھ سے تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر۔ ان دونوں شہروں کے درمیان چھوٹی لائن (Narrow Guage) ٹرین چلتی تھی۔ شاہ گنج سے بڑی لائن (Meter guage) ملتی تھی۔ میں شاہ گنج پہنچ کر حسب معمول ویٹنگ روم میں بیٹھ گیا۔ قلی سے میں نے کہا کہ دہرہ دون ایکسپریس پر آکر سامان کو چڑھا دینا۔ اس نے سوال کیا ”مسلم ڈبے میں؟“ میں چونک پڑا۔ یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ اب ٹرینوں میں مسلمان مسافروں کے لیے الگ سے ڈبہ لگتا تھا۔ سوال ایسا تھا کہ جس کا جواب ”ہاں“ ہی میں ہوتا تھا۔ میں مسلمان تھا، ڈبہ مسلمانوں کے لیے تھا۔
اقتباس: ڈوبتے جہاز کے عرشے سے۔ از: فضا اعظمی

ضروریات زندگی کی چیزیں بمشکل خرید کر ایک پارک میں تھوڑا سا ستانے کے لیے آبیٹھی ہوں۔ یہاں کچھ بچے کھیل رہے ہیں۔ بحث ومباحثے میں الجھے ہوئے ہیں کہ اب کس کی شیل بننے کی باری ہے۔

ان کا یہ کھیل مجھے میرے ان دنوں میں لے گیا ہے جب ہم بھی یہی کھیل کھیلتے اور ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ اب کی کس کی باری ہے۔ چڑیل، جادوگر یا سپاہی بننے کی۔ لیکن یہ shell۔ میں بیک وقت اداس اور پریشان ہوگئی ہوں پھر جیسے شیل میرے تصور میں ابھرا ہے اور وہ اپنے موت کے سفر کا احوال بیان کرتا ہے۔

شیل کا سفر
جیسے شہاب ثاقب کے ٹوٹنے کا سفر
انہوں نے مجھے دور اور نزدیک مارنے کے لیے چنا
میں دہکتا گولہ سا دمشق کا چکر لگاتا ہوں
کہیں میناروں کہیں گھاٹیوں پر سے
اوپر اور نیچے
مصروف لوگوں کو ادھر اُدھر پھرتے دیکھتے
خوش وخرم بچے یہاں وہاں پھرتے
جونہی اچانک میں نیچے اترتا ہوں
ایک زبردست جھٹکے کے تعاقب میں چیخیں اور کراہیں
اس کے بعد کیا ہوا
میں نہیں جانتا"

زار زار بہتے میرے آنسوؤں نے ان ناموں کو دھندلا دیا ہے۔ جو میں گلیوں کی دیواروں پر لکھے دیکھتی ہوں۔ ان نوجوانوں کے نام جن کی ابھی شادیاں ہوئی تھیں۔ ان کی دلہنیں کہاں چلی گئی ہیں؟ کتنے بیٹے اور بیٹیاں اپنے والدین کو کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔ جب وہ لکھتی ہے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ایک برسات ہے۔

shells چھتوں اور فرشوں پر بارش کی صورت برس رہے ہیں
دیواروں پر مرنے والوں کے نام لکھے ہوئے ہیں
دلہنیں تو رات بھر میں ہی بیوہ ہوگئی ہیں
بچے محاذ جنگ سے باپ کی واپسی کے منتظر ہیں
جہاز طوفان کی مانند بمباری کر رہے ہیں
کہیں بچے اسکول بیگوں کے ساتھ
کہیں لوگ شاپنگ بیگز کے ساتھ
خون میں لتھڑے پڑے ہیں۔"

29 دسمبر 2014 کو اس نے لکھا۔
"لگتا ہے جیسے میں اپنے ہی شہر میں اجنبی ہوں۔
اجنبی
جس نے اپنے خوابوں کو
چوما اور شب بخیر کہا
پھر انہیں ڈھانپ دیا
اور خاموشی سے رخصت کردیا
اپنی زندگی سے چلتے ہوئے نکل گئی ہوں
اب اور اسی وقت سے
میں تو خود سے اجنبی بن گئی ہوں۔"

میری بیٹی ابھی ایک ٹرپ سے واپس آئی ہے۔ غم زدہ ماحول کے باوجود وہ خوش ہے اور مسکراتی ہے۔ وہ پرانے اسٹیم انجن کے ساتھ اپنی دوستوں کے ہمراہ Barada دریا کے کنارے کنارے منائے جانے والے اپنے ٹرپ کا احوال سناتی ہے۔

میں اپنی بیٹی کی آنکھوں سے چھلکتی امید کی روشنی دیکھتی ہوں۔

میرے اِس اداس شہر کے باسیوں میں سے وہ لوگ جو موت نہیں زندگی کے دوسرے راستے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ اس روشنی کو اِن آنکھوں سے چھلکتے محسوس کرتی ہوں۔

ہم ہیں
ہم بکھرے شکستہ خوابوں والی نسل
جو شیلوں پر سوتی، جاگتی اور قہقہے لگاتی ہے
اِس نسل کا غم اور دکھ بس صرف اتنا
کیا بجلی اور انٹرنیٹ جلد بحال ہوگا
ہم وہ نسل جس کی خوشیاں چوری ہوگئی ہیں
تاہم ہمارے نوجوان دل زندگی کے لیے ابھی بھی کشادہ ہیں
ہم وہ نسل جو کبھی کسی دن کہیں گے
ہم نے تاریکیوں سے جنگ کی اور اسے کہیں دور دھکیل دیا"

عمیدی کی نظمیں اور یادداشتیں حکومت شام کی سرکاری سطح پر ان بڑھکوں یا نظم ونسق کی ابتری کی یا وہ گوئیوں کی قلعی کھولتی ہیں جو حکومت نے اپنا طرز عمل بنالیا تھا۔ تاہم اس کی نظمیں اگر ایک طرف اس کے دکھوں کا اظہار ہیں تو وہیں وہ ہمارے لیے اس صبح کا بھی پیغام ہیں جو طویل اور تاریک رات کے بعد طلوع ہوگی اور جو ہم جیسے مایوس اور ناامید لوگوں کے لیے ایک نوید ہے۔

سید جاذب

چیتے کی ایک پرانی نسل جسے بنگال ٹائیگر کہتے ہیں جو اپنی ہلاکت خیزی کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ اس کا انداز شکار دوسرے شیروں سے بالکل مختلف ہے۔ وہ پیڑ پر بھی چڑھ سکتا ہے اور تیر کر دریا بھی پار کرلیتا ہے۔ انڈیا اور بنگلہ دیش کی سرحد پر واقع جنگل میں رہتا ہے۔ اس کی ہلاکت خیزی نے ہی اس پورے خطے کو موت کی وادی بنا دیا ہے۔ سال بھر میں سو افراد ٹائیگر کا شکار بن رہے ہیں۔

موت کا ہرکارہ کہلانے والے درندے کا تذکرہ

خلیج بنگال کے ساحلی علاقے میں قدرت کا ایک انمول عطیہ سندر بن کی شکل میں واقع ہے جس سے سمندری لہریں اٹکھیلیاں اور ہوائیں سرگوشیاں کرتی رہتی ہیں اور جب شدید نوعیت کا کوئی سائیکلون آتا ہے تو اس کے ساحلی مینگروو (چمرنگ) کے جنگلات سمندر کی منہ زور اور شوریدہ سر لہروں کے خلاف ڈھال بن جاتے ہیں۔ اپنی سحر انگیزی اور بوقلمونی کے سبب نگاہوں کو دعوت نظارہ دینے اور دلوں میں شوق و تجسس کی چنگاری بھڑکانے والا یہ وسیع وعریض، سرسبز و

شاداب اور پُراسرار جنگل دنیا کے سات نئے قدرتی عجائبات میں شمار ہوتا ہے، یہاں صاف و شفاف نیلگوں جھیلوں، نہروں، دریاؤں اور آبشاروں کا ایک جال سا پھیلا ہوا ہے اور یہ بھانت بھانت کے چرند پرند، آبی حیات، درندوں اور انسانوں کا مسکن ہے۔ 1997ء میں یونیسکو کا عالمی ثقافتی ورثہ قرار دیے جانے والا دنیا کا یہ خوب صورت ترین جنگل اپنے اندر دہشت ہولناکی اور ہلاکت خیزی کی نہ جانے کتنی خونچکاں داستانیں سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ دنیا کا واحد ہیبت ناک جنگل ہے جہاں صدیوں سے انسان اور رائل بنگال ٹائیگر ایک دوسرے سے برسر پیکار اپنی اپنی بقاء کی جنگ لڑتے آرہے ہیں۔ بنگلہ دیش سے لے کر انڈیا تک ہزاروں اسکوائر میل پر پھیلے ہوئے، اس وسیع و عریض جنگل میں جگہ جگہ موت گھات لگائے ہوئے ہوتی ہے۔

سندر بن دنیا کا سب سے بڑا ساحلی مینگرو و جنگل ہے۔ اس کا کل رقبہ تقریباً دس ہزار اسکوائر کلومیٹر پر محیط ہے جس میں سے تقریباً چھ ہزار اسکوائر کلومیٹر بنگلہ دیش اور تقریباً چار ہزار ایک سو دس اسکوائر کلومیٹر انڈیا میں، گویا ساٹھ فی صد بنگلہ دیش اور چالیس فیصد انڈیا میں واقع ہے جس میں سے 1700 کلومیٹر دریاؤں، نہروں اور ندیوں کی شکل میں پانی پر مشتمل ہے۔ اگرچہ بنگلہ دیش اور انڈیا کے درمیان اس کی کوئی باضابطہ حد بندی نہیں کی گئی ہے اور اس اعتبار سے دونوں ہی اس کے حصے دار ہیں تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ یونیسکو عالمی ورثہ نے ان ملحقہ حصوں کو سندر بن اور سندر بن نیشنل پارک کے نام سے الگ کردیا ہے۔ یہ علاقہ رائل بنگال ٹائیگر اور چیتل ہرن نیز ہرنوں کی دیگر نسلوں سمیت بھانت بھانت کے جانوروں مثلاً تیندوا، تیندوا بلیوں، جنگلی بلیوں، مگرمچھوں، زہریلے سانپوں، انواع واقسام کے خوب صورت پرندوں اور حشرات الارض کی وجہ سے مشہور ہے تاہم مرکزی اہمیت رائل بنگال ٹائیگر کو حاصل ہے جو دنیا بھر میں سب سے زیادہ خونخوار سمجھے جاتے ہیں اور آدم خور ہیں۔

☆......☆

سندر بن یعنی خوب صورت جنگل کے بارے میں قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ نام سندری درختوں سے اخذ کیا گیا ہے جو مینگرو و کی ایک قسم ہے۔ یہ درخت یہاں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ان کی لکڑیاں بہت مضبوط ہوتی ہیں جو کشتیاں بنانے کے کام آتی ہیں۔ سندر بن کی ایک اور وجہ تسمیہ یہ بھی ہے کہ یہ غالباً سمندری بن یعنی سمندری جنگل کا بگڑا ہوا نام ہے لیکن عام نظریہ یہی ہے کہ یہ لفظ سندری درختوں سے منسوب ہے۔

سندر بن کی تاریخ کا سراغ 200 تا 300 سن عیسوی تک لگایا جاسکتا ہے۔ یہاں ایک شہر ہوا کرتا تھا جسے چاند سوداگر نامی ایک نہایت امیر وکبیر اور طاقت ور شخص نے تعمیر کرایا تھا جس کے آثار آج بھی سندر بن کے ایک بلاک باگھ مارا میں پائے جاتے ہیں۔ چاند سوداگر ضلع آسام کے ایک مقام چھے گاؤں کا رہنے والا تھا جو دریائے برہم پترا کے جنوبی ساحل پر گوہاٹی سے سینتیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ چاند سوداگر کے مال بردار تجارتی جہاز سپتا گرام ٹریبولی سے ہوکر سرسوتی اور جمنا سے ہوتے ہوئے سمندر کی طرف بڑھتے تھے۔ عہدِ مغلیہ کے دور میں مغل بادشاہوں نے سندر بن کے جنگلات آس پاس کے باسیوں کو لیز کردیے تھے۔ شہنشاہ اکبر کے دور میں اس کی فوج کی پیش قدمی کے دوران بہت سے جرائم پیشہ افراد نے سندر بن کے جنگلوں میں پناہ لے لی تھی۔ یہ سب کے سب ڈاکو اور قاتل تھے۔ ان میں سے بہت سے جرائم پیشہ افراد رائل بنگال ٹائیگر کا لقمہ بن گئے۔ بعد میں ان کی تعمیر کی ہوئی بہت سی عمارتیں سترہویں صدی میں پرتگالی بحری قزاقوں، نمک کے اسمگلروں اور ڈاکوؤں کے ہاتھ لگ گئیں۔ اس کے آثار آج بھی سندر بن کے مختلف علاقوں میں ہر طرف بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

سندر بن سمندری لہروں، دلدلوں، مینگرو و جنگلات کے چھوٹے چھوٹے بہت سے جزیروں کے تانے بانے کا ایک مجموعہ ہے جو ایک دوسرے کو قطع کرتے ہیں۔ سندر بن کے قابلِ رسائی مقامات کو آبی گزرگاہیں ایک دوسرے سے ملاتی ہیں جہاں کشتیوں کے ذریعے پہنچا جاسکتا ہے۔ یہاں کی زرخیز زمین صدیوں سے لوگوں کے زیر استعمال ہے۔ کچھ علاقے جنگل سے گھرے ہوئے ہیں، لیکن بیشتر علاقوں کو قابلِ کاشت بنایا گیا ہے جہاں کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ سندر بن کے مینگرو و سمیت تمام جنگلات رائل بنگال ٹائیگرز کا مسکن ہیں لیکن اب ان کے معدوم ہونے کا خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ مینگرو و جنگلات اس اعتبار سے بھی اپنا نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں کہ کھلنا اور منگلا کے اطراف بسنے والے لاکھوں افراد کے لیے ڈھال کا کام کرتے ہیں اور انہیں سائیکلون کے نتیجے میں آنے والے سیلاب سے محفوظ رکھتے ہیں۔

سندر بن جنوب میں خلیج بنگال سے جاملتا ہے، یہ مشرق میں دریائے بیسور تک پھیلا ہوا ہے اور اس کے شمال میں

زرعی زمینیں ہیں جہاں کاشت کی جاتی ہے۔ سندر بن کے دریا نمکین اور میٹھے پانی کا سنگم ہیں۔ وہ اس طرح کہ دریائے گنگا سے نکلنے والے دریا اس علاقے سے گزر کر خلیج بنگال میں جاگرتے ہیں اور خلیج کا نمکین پانی یہاں داخل ہوجاتا ہے۔ سندر بن کا ماحولیاتی نظام جنگلی حیات کے پنپنے کے بہترین مواقع فراہم کرتا ہے۔ 2015ء کے اعداد و شمار کے مطابق سندر بن 180 رائل بنگال ٹائیگرز کا گھر ہے جن میں سے 106 بنگلہ دیش میں اور 74 انڈیا میں پائے جاتے ہیں۔ دنیا میں ایسے مقامات کم ہیں جہاں صرف ایک علاقے میں اتنی بڑی تعداد میں ٹائیگر پائے جاتے ہوں۔ ماضی قریب میں ہر سال پچاس سے ساٹھ افراد ٹائیگر کا لقمہ بن جاتے تھے۔ رائل بنگال ٹائیگر جسامت میں دنیا کے دیگر مقامات پر پائے جانے والے ٹائیگر سے قدرے چھوٹے لیکن بلا کے طاقتور ہوتے ہیں۔ دنیا بھر میں سائبرین ٹائیگر جسامت میں سب سے بڑے مانے جاتے ہیں۔ ان میں اور رائل ٹائیگر کی جسامت میں انیس بیس کا فرق ہوگا یہ نہ صرف انسانوں پر حملہ کرکے انہیں مار ڈالتے ہیں بلکہ ان کی چھوٹی کشتیوں کو بھی تباہ کردیتے ہیں۔

☆......☆

اگرچہ سندر بن وہ واحد علاقہ نہیں ہے جہاں انسان ٹائیگر کے قریب رہتے ہیں مثلاً اتر پردیش میں بندھاؤ گڑھ ٹائیگر ریزرو نیز دیگر مقامات پر گاؤں کے لوگ شیروں (ٹائیگر) کے چاروں طرف آباد ہیں پھر بھی کوئی ٹائیگر شاذ و نادر ہی کسی انسان پر حملہ کرتا ہے لیکن سندر بن کا معاملہ مختلف ہے۔ یہاں کے ٹائیگر اتنے بے خوف اور خونخوار ہیں کہ انسانوں پر حملہ کرنے سے بالکل نہیں چوکتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شدید نوعیت کے سمندری طوفانوں کے نتیجے میں وسیع علاقہ دلدل میں تبدیل ہوجاتا ہے اور ٹائیگروں کی روایتی غذا کی شدید قلت پیدا ہوجاتی ہے۔ لہٰذا وہ انسانوں پر حملہ آور ہوتے ہیں اور انہیں اپنا نوالہ بنا لیتے ہیں لیکن یہ محض ایک تھیوری ہے اور کسی کے لیے بھی یقین سے کچھ کہنا بہت مشکل ہے کہ وہ آدم خور کیوں بنے۔ بعض سائنس دانوں اور بیالوجسٹ نے جو اندازے لگائے ہیں، ان کے مطابق چونکہ سندر بن ساحلی علاقہ ہے لہٰذا اس کا پانی نسبتاً نمکین ہے۔ دیگر تمام مقامات پر ٹائیگر میٹھا پانی پیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس علاقے میں نمکین پانی پینے کی وجہ سے ٹائیگر مستقل ایک بے چینی کی کیفیت میں رہتے ہیں اور اس کے نتیجے میں انسانوں پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ اس کے پیشِ نظر مصنوعی طریقے سے میٹھے پانی کی جھیلیں بنائی گئیں لیکن اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

ایک اور تھیوری یہ ہے کہ موسمی تغیرات کی وجہ سے ٹائیگر انسانی گوشت کے عادی ہوگئے ہیں۔ انڈیا اور بنگلہ دیش کے اس علاقے میں سائیکلون کے نتیجے میں ہزاروں انسان لقمۂ اجل بن جاتے ہیں اور ان کی لاشیں بہتی ہوئی دلدلی علاقوں میں پہنچ جاتی ہیں جہاں ٹائیگر انہیں اپنی غذا بنا لیتے ہیں۔

ایک تھیوری یہ بھی ہے کہ مسلسل مد و جزر کی صورتِ حال کی وجہ سے زمین دلدلی اور مٹی چکنی ہوجاتی ہے جس کے باعث شیروں کو جانوروں کا شکار کرنے میں مشکلات پیش آتی ہیں۔ سندر بن کے باسی جلانے کے لیے جنگل کی لکڑیاں اور شہد اکٹھا کرنے نیز مچھلیوں کا شکار کرنے کی غرض سے کشتیوں کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ کا سفر کرتے ہیں اور اس دوران آسانی سے ٹائیگر کا نوالہ بن جاتے ہیں۔ وجہ کچھ بھی ہو لیکن یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ جب کوئی آدمی جھک کر کسی کام میں مصروف ہو تو ٹائیگر اسے کوئی جانور سمجھنے کی غلطی کر بیٹھتا ہے اور اس پر حملہ آور ہوتا ہے۔

سندر بن میں جہاں سیکڑوں ٹائیگر بستے ہیں وہاں دس ہزار انسان بھی بود و باش رکھتے ہیں جن میں لگ بھگ پانچ ہزار افراد گزر بسر کے لیے کثرت سے دلدلی علاقوں اور آبی گزرگاہوں میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ فشنگ بوٹس گزرتی رہتی ہیں اور شہد اور دیگر اشیاء اکٹھا کرنے کے لیے جگہ جگہ رکتی بھی ہیں۔ گھنے اور تاریک جنگل میں شیر ان کا پیچھا کرتے ہیں اور انہیں مار ڈالتے ہیں۔ دیگر علاقوں کے برعکس سندر بن کے ٹائیگر مشاق پیراک ہوتے ہیں اور وہ نہ صرف یہ کہ تیر کر ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے میں پہنچ جاتے ہیں بلکہ مچھیروں کی چھوٹی کشتیوں پر بھی حملہ آور ہوتے ہیں اور انہیں تباہ کردیتے ہیں۔ ٹائیگر کے حملے میں صرف کچھ ہی لوگ اپنی کہانیاں سنانے کے لیے زندہ رہ پاتے ہیں۔

☆......☆

کوئی بھی شے سندر بن کے باسیوں کے دل و دماغ میں اتنا خوف اور دہشت نہیں بٹھا سکتی جتنا لفظ ٹائیگر بٹھاتا ہے۔ صرف اس لفظ کا استعمال ہی انہیں دہشت زدہ کردیتا ہے۔ میں نے ایک گزرتے ہوئے مچھیرے سے شیر کی ایک جھلک دیکھنے کی خواہش کے تحت پوچھا کہ کیا اس نے آج صبح میں کوئی ٹائیگر دیکھا ہے؟ تب تک وہ میرے ساتھ وقت

گزارنے پر بہت خوش نظر آرہا تھا لیکن جونہی میں نے اس سے یہ پوچھا اس نے اپنے کیکڑوں کو سمیٹا اور مزید ایک لفظ کہے بغیر یہ جا وہ جا۔ میں حیران رہ گیا۔

''اگر آپ ٹائیگر کا نام بھی لیں گے تو وہ آجائے گا۔'' میرے کشتی ران نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''یہی وجہ ہے کہ وہ مچھیرا کچھ کہے بغیر چلا گیا۔''

یہ 2014ء کا ذکر ہے۔ میں بی بی سی ورلڈ سروس کے نمائندے کی حیثیت سے سندر بن میں تھا اور ان لوگوں سے مل کر معلومات اکٹھی کررہا تھا جنہوں نے ٹائیگر کا سامنا کیا تھا۔ وہاں مشکل ہی سے کوئی ایسا شخص نظر آیا جس کی زندگی کسی نہ کسی طرح ٹائیگر سے متاثر نہ ہوئی ہو۔ کچھ علاقے دوسرے علاقوں کی بہ نسبت زیادہ متاثرہ ہیں۔ 2006ء تا 2008ء کے دوران جنگل کا احاطہ کرنے والے پاشر دریا کے کنارے واقع ایک چھوٹے سے گاؤں جے منی میں کئی افراد ٹائیگر کے حملوں میں مارے گئے تھے۔ دیگر حملوں میں سے ایک حملے میں ایک ٹائیگر آدھی رات کو بانس کی دیوار توڑ کر ایک جھونپڑے میں گھس آیا اور 83 سال کی ایک بڑھیا کو اٹھا لے گیا۔ اس کے ساٹھ سالہ بیٹے کرشنا منڈل نے بتایا کہ ماں کی چیخ سنی تو میں دروازہ کھول کر بھاگتا ہوا ماں کے بستر کے پاس پہنچا لیکن ماں وہاں نہیں تھی۔ وہاں صرف اس کا خالی بستر تھا۔ میں نے برآمدے کا دروازہ کھولا تو چاندنی میں مجھے اپنی ماں نظر آگئی۔ وہ بہت بری طرح زخمی تھی اور زمین پر پڑی تھی۔ اس کے کپڑے چیتھڑوں کی صورت میں اس کے چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔'' اتنا بیان کرکے وہ رو پڑا۔ اس کے آنسو گالوں کو تر کرنے لگے۔ ایک موقع پر وہ اتنا دکھی ہوگیا کہ اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ وہ ایک دیوار پر ٹنگی ہوئی اپنی ماں کی تصویر لے آیا اور ناقابل یقین نظروں سے تصویر کو تکنے لگا۔ پھر گویا ہوا۔ ''ٹائیگر نے میری ماں کے سر کے بائیں طرف حملہ کیا تھا۔ اس کی کھوپڑی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ خون میں لت پت تھی۔ وہ اب بھی سانس لے رہی تھی لیکن اپنے حواس میں نہیں تھی اور پھر وہ مر گئی۔ آج میں بستر مرگ پر پڑا ہوں لیکن وہ بھیانک رات مجھے اچھی طرح یاد ہے جب باگھ نے میری ماں پر حملہ کیا تھا۔'' کرسنا منڈل نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جب میں اس حادثے کو یاد کرتا ہوں تو میرے آنسو نہیں تھمتے۔ میرے کانوں میں آج بھی ماں کی کمزور چیخ گونجتی رہتی ہے۔''

اس حملے کے فوراً بعد ہی کرشنا منڈل اپنی بیوی کے ساتھ جے منی سے کچھ ہی فاصلے پر ایک پختہ مکان میں منتقل ہوگیا جہاں وہ سب سے الگ تھلگ اپنے باغ میں ناریل کو خشک کرکے گزر بسر کرتا ہے۔

سندر بن میں بیشتر لوگ جنگل پر انحصار کرتے ہیں۔ وہ دریا سے غذا حاصل کرتے ہیں، شہد اور مچھلیاں اکٹھی کرکے پیسے کماتے ہیں۔ بہت سے لوگ محفوظ قرار دیے جانے والے علاقوں میں جاکر جلانے والی لکڑیاں کاٹتے ہیں اور جانوروں کا شکار کرتے ہیں جو یونیسکو عالمی ورثہ کا سائٹ ہونے کی وجہ سے غیر قانونی ہے اور یہیں ان کا براہ راست ٹائیگر سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس موسم گرما میں دو افراد دو مختلف حادثات میں مارے گئے تھے۔

1997ء میں جمال محمد شکار کرنے اور کھانے کے لیے مچھلیاں پکڑنے گیا تھا۔ جہاں اس کا سامنا ایک ٹائیگر سے ہوگیا جو اس سے بہت بڑا اور اس سے بہت زیادہ خونخوار شکاری تھا۔ وہ کہتا ہے۔ ''ٹائیگر مجھ پر جھپٹا، اس نے اپنے نوکیلے پنجے میری ٹانگوں میں پیوست کردیے اور مجھے گھسیٹتا ہوا پانی کے اندر لے گیا۔ میں پانی کے نیچے موت اور حیات کی کشمکش میں سخت جدوجہد کرتا ہوا لگ بھگ دس فٹ پانی کے نیچے چلا گیا۔ تب ٹائیگر نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں مزید گہرائی میں جتنی تیزی سے تیر سکتا تھا تیرتا ہوا تھوڑی دیر کے بعد جب پانی کی سطح پر ابھرا تو وہ باگھ مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ نہ جانے کہاں غائب ہوگیا تھا۔ میں نے اپنے بکھرے ہوئے حواس کو مجتمع کیا اور دریا میں تیرتا ہوا تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ مجھے ایک کشتی نظر آگئی اور میں مدد کے لیے چیخنے لگا۔''

جمال سندر بن کا ہیرو بن گیا ہے۔ وہ واحد شخص ہے جو ٹائیگر کے تین مختلف حملوں میں زندہ بچ گیا ہے۔ اس کے ساتھ سب سے تازہ واقعہ 2007ء میں پیش آیا تھا۔ وہ جلانے کی لکڑیاں اکٹھی کرنے جنگل میں گیا تھا اور ایسے میں دریا کے کنارے اونچی اونچی گھاس میں اسے ایک ٹائیگر نظر آیا جو دھوپ میں لیٹا ہوا تھا۔

''ٹائیگر دریا کے شمال کی طرف تھا اور میں جنوب کی طرف۔ میں بھاگ نہیں سکتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر ٹائیگر نے مجھے دیکھ لیا تو یقیناً مجھ پر حملہ کردے گا۔ لہٰذا میں دعا پڑھنے لگا۔'' جمال نے بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ٹائیگر نے مجھے دیکھ لیا اور میری طرف بڑھنے لگا۔ میں اپنی جگہ شل ہوگیا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں پلٹ کر بھاگا تو میرا کام تمام ہوجائے گا۔ چونکہ مجھ پر پہلے بھی دو حملے ہوچکے تھے۔ لہٰذا

مجھے پتا تھا کہ ایسے نازک موقع پر کیا کرنا چاہیے۔ میں تن کر کھڑا رہا اور اپنی شکل کو خوف ناک بنا کر دہاڑنے لگا۔ آپ کو پتا ہے ٹائیگر بھی انسان سے ڈرتے ہیں کیونکہ دونوں ہی ایک دوسرے پر حملہ کرسکتے ہیں اور یہ دونوں ہی کے لیے جان لیوا ہوسکتا ہے۔ ٹائیگر مجھ سے صرف چند میٹر کے فاصلے پر تھا۔ وہ بہت زور سے دہاڑا۔ جواباً میں بھی زور سے دہاڑا اور اپنی شکل کو جتنا خوفناک بنا سکتا تھا بنا کر دہاڑنے لگا۔ شیر مجھ پر دہاڑ رہا تھا اور میں شیر پر۔ کافی دیر تک یہی ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ میرے حلق سے خون بہنے لگا۔ میری بیوی نے یہ شور سنا اور گاؤں والوں کو اکٹھا کرکے لے آئی۔ ان لوگوں نے مل کر اتنا شور مچایا کہ ٹائیگر ڈر کر بھاگ گیا اور میں بے ہوش ہوکر گر پڑا۔''

بہت سے گاؤں والوں کے برعکس جمال اب بھی جنگل میں جاتا ہے لیکن اب وہ زیادہ محتاط ہوگیا ہے۔ ''میں ہمیشہ شیر کو خواب میں دیکھتا ہوں۔'' اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اور جب میں جنگل میں جاتا ہوں تو میرے اندر اس بات کا بے حد خوف ہوتا ہے کہ ٹائیگر مجھے دیکھ رہا ہے اور وہ کسی بھی وقت مجھ پر حملہ کردے گا لیکن مجھے اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے جنگل میں جانا ہی پڑتا ہے۔ صرف انہی کی خاطر مجھے بار بار ٹائیگر کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔''

☆......☆

ہمارے علم میں یہ بات آئی کہ ایک گاؤں میں ٹائیگر ہر سال تقریباً اسّی پالتو جانوروں اور مویشیوں کو ہلاک کردیا کرتے تھے جن میں کتے، بکرے، بھینسیں اور گائیں شامل ہیں۔ چنانچہ گاؤں والے انتقامی کارروائی پر اتر آئے اور ٹائیگروں پر حملے کرنے لگے۔ انہوں نے تین شیروں کو مار ڈالا۔ اس عمل کو روکنے کے لیے 2008ء میں مقامی نگراں گروپ نے انچاس گاؤں کی رضاکار ٹیمیں تشکیل دیں جن کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ ان شیروں سے نمٹیں جو بھٹک کر گاؤں میں آجاتے ہیں۔ انہیں ہلاک کرنے کی بجائے گاؤں والے پٹاخوں اور روشن مشعلوں سے ڈرا کر واپس جنگل میں جانے پر مجبور کردیں۔ اگر یہ حربہ ناکام رہتا ہے تو سرکاری ٹیم طلب کی جاتی ہے جو انہیں ڈاٹ کے ذریعے بے ہوش کرکے واپس جنگل میں چھوڑ آتے ہیں پھر بھی جوابی حملے اب بھی ہوتے رہتے ہیں۔

دسمبر 2013ء میں ایک ٹائیگر نے ایک شخص پر حملہ کرکے اسے مار ڈالا تھا جس کے جواب میں مقامی لوگوں نے گھا گھرا جنگل میں اسے ڈھونڈ کر ہلاک کردیا۔ مقامی لوگوں کو یہ سمجھانا بہت مشکل ہے کہ اگر یہی صورت حال برقرار رہی تو ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے کہ جب رائل بنگال ٹائیگر سندر بن سے معدوم ہوجائیں گے۔ میں نے یہ بات ایک مچھیرے دیوان منڈل کو سمجھانے کی کوشش کی تو وہ مجھے شک آلود نظروں سے دیکھنے لگا۔ ''ایک اتنا خوف ناک درندہ کس طرح ختم ہوسکتا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ''کیا تم نے کبھی کسی ٹائیگر کے دل کو دھڑکتے ہوئے سنا ہے؟''

''نہیں، میں نے کبھی نہیں سنا۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ اپنے سر کو پیچھے کی طرف پھینک کر زور سے ہنسا۔ ''میں نے ایک ٹائیگر کے دل کو دھڑکتے ہوئے سنا ہے۔'' وہ بولا۔ ''اس کا دل میرے دل سے بہت زیادہ مضبوط ہے۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ پھر گویا ہوا۔ ''میں مچھلیوں کے شکار کے لیے سندر بن کے ایک علاقے کلٹولی کھال جارہا تھا۔ میرے ساتھ اور بھی مچھیرے تھے۔ ہم نے سورج طلوع ہونے سے تھوڑا پہلے اپنی کشتی ساحل سے لگائی۔ لہریں پُرسکون تھیں۔ میں نے دعا پڑھی۔ اس وقت سورج طلوع ہورہا تھا اور تھمے ہوئے پانی پر سے دھند چھٹ رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اپنا جال چکنی کیچڑ پر رکھا۔ عین اس وقت جانے کہاں سے ایک ٹائیگر نے مجھ پر چھلانگ لگادی۔ اس کی دہاڑ اتنی خوفناک تھی کہ جیسے بجلی کڑکی ہو۔ میں نہتا اور بالکل بے بس تھا۔ ٹائیگر کا وزن اتنا زیادہ تھا کہ مجھے لگا کہ میں گر پڑوں گا لہٰذا میں نے گرنے سے بچنے کے لیے اسے دبوچ لیا۔ میرا سر اس کے سینے پر تھا اور میں اس کے دل کو دھڑکتے ہوئے سن سکتا تھا۔ ٹائیگر کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا اور اس کی دھمک مجھے اپنے سر میں سنائی دے رہی تھی۔ چونکہ میں اس کے سینے سے چمٹا ہوا تھا، مجھے اس کی سانس اپنے سر کے اوپر محسوس ہورہی تھی۔ وہ مجھے ہلاک کرنا چاہتا تھا۔'' دیوان منڈل نے رک کر میری طرف دیکھا۔ اس واقعے کو یاد کرکے اس کی آنکھیں پھیل کر بڑی ہوگئی تھیں اور ان میں خوف سمٹ آیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں اسے اسی طرح دبوچ رکھوں تو وہ مجھے کاٹ نہیں سکے گا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے اور وہ مجھے دائیں بائیں دھکیل رہا تھا تاکہ مجھے گرا کر میرا کام تمام کردے۔ میں بھی کب تک اس سے زور آزمائی کرسکتا تھا۔ وہ ایک انتہائی طاقت ور درندہ تھا اور میں انسان۔ بالآخر میں گر پڑا اور اس نے میری گردن میں اپنے دانت گاڑ دیے۔ مجھے یقین ہوگیا کہ یہ میرا آخری

وقت ہے۔اب میں بچ نہیں سکتا۔یہ ہولناک منظر دیکھ کر ایک مچھیرا ڈر کر ایک درخت پر چڑھ گیا لیکن دوسرے مچھیرے میری مدد کو لپکے۔ان میں سے کسی ایک مچھیرے نے بڑھ کر اپنی کلہاڑی سے ٹائیگر کے سر پر پوری قوت سے وار کیا۔ جب کلہاڑی اس کے سر پر پڑی تو وہ مجھے چھوڑ کر بھاگ گیا۔“

اس نے مجھے اپنی گردن پر زخم کے نشان دکھائے۔ وہاں مجھے واضح طور پر دو سوراخ نظر آئے جو اب بھر گئے تھے۔”اب میں جب بھی کوئی باگھ دیکھتا ہوں تو میرا دل خوف سے لرزنے لگتا ہے۔“اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔”جب ہمارا مالک کہتا ہے کہ دریا کے دوسری طرف جاؤ تو میں اس سے کہتا ہوں کہ اگر ٹائیگر نے مجھے دیکھ لیا تو وہ یقیناً مجھے پکڑے گا۔ وہ مجھ سے پوچھتا ہے کہ وہ تمہیں کیوں پکڑے گا؟ میں کہتا ہوں وہ جنگل میں سے چھپ کر مجھے دیکھتا ہے۔میں جانتا ہوں اگر میں گیا تو وہ مجھے ڈھونڈ نکالے گا اور مار ڈالے گا۔میں ایک حملے میں تو بچ گیا۔ضروری نہیں کہ دوسرے حملے میں بھی زندہ بچ سکوں۔“

☆......☆

اس خیال کے تحت کہ شیر ہمیشہ پیچھے سے حملہ کرتا ہے۔ سندربن کے باسیوں نے شیروں کو دھوکا دینے کے لیے یہ ترکیب نکالی کہ وہ سر کے الٹی طرف انسانی شکل کا ماسک پہننے لگے تاکہ شیر یہ سمجھے کہ انسان اسے دیکھ رہا ہے اور حملہ کرنے سے باز رہے۔ یہ ترکیب کچھ عرصے کے لیے کارگر رہی۔ ٹائیگر ان کے چکر میں آ گیا اور حملے تقریباً رک گئے لیکن جلد ہی وہ سمجھ گیا کہ اسے بے وقوف بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے،لہٰذا وہ ماسک کی پروا کیے بغیر پھر سے ان پر حملے کرنے لگا۔

شیر کے ایک حملے میں ایک گاؤں کے باسی شوکمار منڈل کو بہت زیادہ جسمانی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کا چہرہ ایک طرف لٹک گیا ہے۔اب وہ ٹھیک سے دیکھ یا سن نہیں سکتا اور صرف ایک ہونٹ سے بات کرتا ہے۔جب میں نے اس سے یہ پوچھا کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا تو وہ گویا ہوا۔”میں دریا کے کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک میں نے ٹائیگر کی دہاڑ سنی اور اگلے ہی لمحے وہ مجھ پر آ رہا۔وہ بار بار مجھ پر اپنے پنجوں سے حملہ کر رہا تھا۔ اس دوران میرا ایک ہاتھ مکمل طور پر اتر گیا۔“ اس نے مجھے اپنا ہاتھ دکھایا جس پر لمبی لمبی سفید لکیریں پڑی ہوئی تھیں اور ہتھیلی پر بھی زخموں کے گہرے نشانات تھے۔”شیر میرے سر پر کاٹ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں مر رہا ہوں۔میں نے سوچا کہ میں اس حملے میں کسی طرح بھی بچ نہیں سکتا۔ مجھے کوئی نہیں بچا سکتا۔وہ تقریباً نو فٹ لمبا تھا۔ایسے میں ایک عورت بھاگتی ہوئی آئی اور اس نے میری جان بچالی۔اس نے کسی موٹے ڈنڈے سے ٹائیگر کے سر پر پوری قوت سے ضرب لگائی۔وہ ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ مجھے چھوڑ کر بھاگ گیا پھر بہت سے لوگ بھاگتے ہوئے آ گئے۔ میں زخموں سے لہولہان تھا۔ انہوں نے میرے زخموں کو ایک تولیے سے لپیٹا اور کشتی کے ذریعے مجھے چھ میل دور چالنا لے گئے جہاں سے مجھے مزید اکتیس میل دور کھلنا کے اسپتال تک کا سفر کرنا پڑا۔“

شوکمار یقیناً خوش قسمت تھا کہ اس حملے میں بچ گیا۔وہ کئی ہفتے کھلنا اسپتال میں زیرِ علاج رہا۔ اب وہ کوئی کام کرنے کے قابل نہیں ہے۔

☆......☆

تمام بڑی بلیوں میں ٹائیگر جسامت میں سب سے بڑا اور سب سے طاقت ور ہوتا ہے۔ یہ ایک وقت میں چالیس کلو گوشت کھا جاتا ہے۔ تمام بڑی بلیاں ایک ہی جبلت کی مالک ہوتی ہیں۔ دیگر بڑی بلیوں کی طرح ٹائیگر بھی تنہائی پسند ہوتا ہے۔وہ اپنے علاقے میں صرف اپنی بادشاہت قائم رکھنا چاہتا ہے اور کسی کی موجودگی برداشت نہیں کرتا۔ کوئی شیرنی اس وقت سب سے زیادہ غضب ناک اور خطرناک ہوتی ہے جب اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں۔وہ ان کی حفاظت کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔

فروری 2011ء میں ایک بچے والی غضب ناک شیرنی نے بنگلہ دیش کے سندربن کے جنوب مغربی جنگل میں تقریباً آٹھ افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اگلے سال 2012ء کے اوائل میں مزید چار افراد اس کا شکار ہوئے۔ سال کے اس مہینے میں سینکڑوں ماہی گیر اپنے گھروں کی چھت کے لیے پتے اکٹھا کرنے کی غرض سے مینگرو جنگلات میں جاتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق تقریباً چار سو رائل بنگال ٹائیگر جو معدوم ہونے کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ بنگلہ دیش اور انڈیا کے درمیان پھیلے ہوئے ان جنگلوں میں رہتے ہیں۔ اگرچہ سندربن میں انسانوں پر شیر کے حملے کوئی غیر معمولی بات نہیں تاہم ان حملوں نے بہت سے لوگوں کو حیران کر دیا جن میں صرف دو سالوں میں بارہ افراد لقمۂ اجل بن گئے۔

”صرف ایک خاص شیرنی نے جس کا ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔تقریباً آٹھ افراد کو مار ڈالا۔“ مغربی سندربن کے فارسٹ آفیسر ظہیر الدین نے ہمیں آگاہ کیا۔”ناقابلِ یقین بات یہ ہے کہ وہ مادہ ٹائیگر آدم خور نہیں ہے۔وہ صرف لوگوں کو ہلاک کر دیتی ہے،ان کا گوشت نہیں کھاتی۔ بیشتر ہلاکتیں ضلع سات کھیرا میں ہوئیں جس کے کنارے جنگلات واقع ہیں۔“

ہزاروں افراد کی روزی سندربن سے وابستہ ہے۔ مچھیرے کیکڑے، مچھلیاں اور شہد اکٹھا کرنے کے لیے جنگل میں بہت اندر تک چلے جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ٹائیگر کا شکار بن جاتے ہیں۔ بعض ٹائیگر اکثر و بیشتر رات کے وقت جنگل کے کنارے بسے ہوئے گاؤں میں گھس آتے ہیں اور لوگوں کے مویشیوں کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ ایسے حملوں سے گاؤں والوں میں خوف اور وحشت پھیل جاتی ہے۔

”میں یہاں پینتیس سال سے بھی زیادہ عرصے سے رہ رہا ہوں لیکن میں نے کبھی اپنے گاؤں میں کسی ٹائیگر کو اتنی دلیری سے داخل ہوتے اور ہمارے مویشیوں کو لے جاتے اور انسانوں کو ہلاک کرتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔“ گولی کھالی گاؤں کے ضمیر حسین نے کہا۔”سورج غروب ہونے کے بعد کوئی بھی شخص اپنے گھر سے نہیں نکلتا۔ ہم لوگ بہت خوف زدہ ہیں۔“

حال ہی میں گاؤں والوں نے اپنے لوگوں اور شیروں کو تحفظ دینے کے لیے ٹائیگر رسپونس ٹیمیں تشکیل دی ہیں تاکہ گاؤں میں داخل ہونے والے شیروں کو ہلاک کرنے کی بجائے انہیں کسی طرح واپس جنگل میں بھیج دیا جائے۔ ماہرین کو انسانوں اور درندوں کے درمیان بڑھتے ہوئے تنازعات پر گہری تشویش ہے جس کی وجہ سے جنگل سے شیروں کے ٹھکانے ختم ہوتے جا رہے ہیں اور ان جانوروں کے ناپید ہونے کے بھی خدشات لاحق ہو گئے ہیں جن کا وہ شکار کرتے ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ ہمیں ایسے لوگوں کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے جو شہد یا پتے اکٹھا کرنے کے لیے جنگلوں کے اندر جاتے ہیں تاکہ ان حادثات میں کمی آ سکے۔

☆......☆

سندربن میں انسانوں اور درندوں کے درمیان جنگ جاری ہے۔ دونوں ہی اپنی اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ سندربن کے باسی جہاں شیروں کو انتقاماً اپنا نشانہ بناتے ہیں وہیں غیر قانونی شکاری بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔وہ اپنے مالی فائدے کے لیے اس نایاب نسل کو چن چن کر ہلاک کرنے میں مصروف ہیں۔لہٰذا ان کے ناپید ہونے کے شدید خطرات لاحق ہو گئے ہیں۔ غیر قانونی شکار ایک بہت ہی سنگین مسئلہ ہے جس پر بنگلہ دیش اور انڈیا کی حکومتیں بہت فکرمند ہیں اور اس کی روک تھام کے لیے مختلف اقدامات کرتی رہتی ہیں پھر بھی یہ سلسلہ رکنے کا نام نہیں لیتا۔ سندربن کے جنگلوں میں انسانوں کا داخلہ سخت ممنوع ہونے کے باوجود لوگ غیر قانونی طور پر جاتے ہیں اور اپنی زندگی کو داؤ پر لگاتے ہیں۔ جنگل کے اندر جانے کے لیے حکومت سے اجازت لینی پڑتی ہے اور وہی لوگ جا سکتے ہیں جن کے پاس انٹری کارڈ ہو۔ اس کا صرف یہ فائدہ ہے کہ اگر کوئی پاس ہولڈر کسی شیر کا شکار ہو جاتا ہے تو حکومت اس کے لواحقین کو معاوضہ ادا کرنے کی پابند ہے لیکن اس کی کاغذی کارروائیاں اتنی طویل اور صبر آزما ہیں کہ معاوضہ ملنے میں دس سال یا بیس سال بھی لگ سکتے ہیں۔

دوسری طرف اگر کوئی شخص انٹری پاس کے بغیر غیر قانونی طور پر جنگل میں جاتا ہے اور شیر کا لقمہ بن جاتا ہے تو اس کے لواحقین پولیس کو اس کی ہلاکت کی رپورٹ اس ڈر سے نہیں کرتے کہ کہیں الٹی آنتیں گلے نہ پڑ جائیں۔ لہٰذا ایسے بے شمار لوگ ہیں جن کی گمشدگی کی کوئی رپورٹ درج نہیں ہو سکی ہے۔ سندربن کے انڈین علاقے کی ممتا منڈل نے ہر روایت پر عمل کیا لیکن اپنے شوہر کو نہ بچا سکی۔ اس نے چولہا نہیں جلایا، اپنے کپڑے نہیں دھوئے، اس نے دریا پار نہیں کیا۔ وہ دو ہفتے تک اپنی مٹی اور پیالی کے گھر میں بند رہی اور جنگل کے دیوتاؤں سے اپنے شوہر کی، بخیریت واپسی کی دعائیں کرتی رہی لیکن اس کا شوہر کبھی گھر نہیں لوٹا۔ جب کشتی وقت سے پہلے مچھلیوں کے شکار سے لوٹ آئی تو گاؤں کے لوگ سمجھ گئے کہ کوئی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ ممتا بھی سمجھ گئی وہ ان پانچ فیملی میں سے کوئی ایک ہوگا جس کے لوگ شکار پر گئے تھے۔

”وہ پہلے بھی شکار پر جایا کرتا تھا۔“ ممتا نے دھیمے لہجے میں کہا۔”لیکن میں کبھی اپنے اندر بے چینی محسوس نہیں کرتی تھی۔ اس مرتبہ میں بہت بے چین تھی۔ پرندے شور مچاتے ہوئے، میرے جھونپڑے کے گرد چکر لگا رہے تھے۔ یہ بدشگونی تھی۔“

ممتا، سندربن کی ان تین ہزار بیواؤں میں سے ایک ہے۔ اس کا چھبیس سالہ شوہر بھی اپنی کشتی کو خشکی پر سے واپس

دریا میں دھکیل رہا تھا کہ ایک ٹائیگر نے درختوں کے پیچھے سے اس پر چھلانگ لگائی اور اسے دبوچ کر گھسیٹتا ہوا جنگل کے اندر لے گیا۔ اس کا سینتالیس سالہ چچا کھوکن منڈل اکتوبر کے اس دن اس کے ساتھ تھا۔ ”شکار پر جانا خود ان کا شکار ہونے کے مترادف ہے۔“ وہ بولا۔ ”ٹائیگر گاؤں کے بہت قریب منڈلانے لگے ہیں۔ گاؤں کے لوگ خوف زدہ ہیں۔ ان کے خوف کا یہ عالم ہے کہ وہ سمجھتے ہیں اس کا نام بھی لو تو وہ آجائے گا۔“

”یہ کرۂ ارض کی گنجان ترین آبادی میں سے ایک ہے نیز انڈیا اور بنگلہ دیش کا یہ ایک غریب ترین علاقہ ہے۔ یہاں ہر ہفتے ایک یا دو ہلاکت ہوتی رہتی ہے۔ 2009ء میں آنے والے سائیکلون کے بعد جان لیوا حملوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس سائیکلون کے نتیجے میں سندربن کی ایک بہت وسیع پٹی تباہ ہوگئی ہے اور شکار کے جانوروں کی شدید قلت پیدا ہوگئی ہے۔ اب آپ کو ٹائیگر کا شکار ہونے کے لیے جنگل میں جانے کی ضرورت نہیں۔“ نبی کے چچا نے مزید کہا۔ ”اب وہ دریا کے ساحل پر آپ کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ یہ منظر میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“

نبی کے چچا نے نبی کی ہلاکت کے بعد اپنا ماہی گیری کا پندرہ سالہ پیشہ ترک کر دیا ہے۔

”ہم شہد اکٹھا کرنے والے شیروں کو دھوکا دینے کے لیے انسانی شکل کا ماسک اپنے سر کے پیچھے پہن لیتے تھے۔“ پینتالیس سالہ سریندر نے ہمیں آگاہ کیا۔ ”لیکن اب شیر بہت چالاک ہوگئے ہیں۔ وہ ہماری اس چال کو سمجھ گئے اور انہوں نے ہمارے کئی ساتھیوں کو مار ڈالا۔ ہم خود کو محفوظ نہیں سمجھتے۔“

تیس سالہ تارو بالا ان خوش نصیبوں میں سے ہے جو ایک ٹائیگر کے حملے میں زندہ بچ گئی۔ وہ ایک دن صبح کے وقت تالاب کے کنارے واقع اپنے گھر کے صحن میں مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھی کہ اسی دوران جھاڑیوں کے پیچھے چھپے ہوئے ایک ٹائیگر نے اچانک اس پر چھلانگ لگائی۔ تارو بالا کا کہنا تھا۔ ”میں سمجھی کہ وہ کوئی بڑا سا کتا ہوگا۔ میں نے اسے زور سے دھکا دیا اور مجھے تالاب میں چھپاک سے اس کے گرنے کی آواز سنائی دی۔“

لیکن اس حملے میں تارو بالا کو جو نقصان پہنچنا تھا، وہ پہنچ چکا تھا۔ اس کی پیشانی پر ایک گہرا اور لمبا زخم آیا جو اس کی کھوپڑی کے پچھلے حصے تک چلا گیا تھا۔ نیز اس کے سینے اور ران پر سے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے نوچ لیے گئے تھے۔ تارو بالا درد سے بے حال چیختی ہوئی بھاگ کر اپنے جھونپڑے میں جاگھسی اور بے ہوش ہوگئی۔ ٹائیگر تالاب سے نکل کر اس کی تلاش میں آیا۔ اس دوران تارو بالا کی چیخ و پکار سن کر گاؤں کے لوگ بھاگتے ہوئے آگئے۔ ٹائیگر وہاں نہیں تھا۔ وہ لوگ اس کی تلاش میں نکل پڑے۔ ان کے پاس اپنی حفاظت کے لیے جال کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ درندہ انہیں اتفاق سے اس مندر میں ایک بت کے پیچھے چھپا ہوا مل گیا جو بن دیوی سے موسوم ہے جہاں ٹائیگر سے حفاظت کے خیال سے اس کی پوجا کی جاتی ہے۔ لوگوں نے مندر کے چاروں طرف بہت سے جال پھیلا دیے تاکہ وہ فرار نہ ہو سکے اور پھر محکمہ جنگلات کو اطلاع دے دی۔ وہ لوگ پانچ گھنٹے کے صبر آزما انتظار کے بعد آئے اور ٹائیگر کو ڈاٹ کے ذریعے بے ہوش کر کے واپس جنگل میں چھوڑ آئے۔ تارو بالا شدید زخمی ہونے کے علاوہ اپنی بائیں آنکھ سے نابینا ہوگئی ہے۔

☆......☆

سپن ہالدار کو اس بات کا کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وہاں کوئی ٹائیگر چھپا ہوا ہوگا۔ ٹائیگر نے اچانک اس پر حملہ کیا اور اسے دبوچ کر گھنے جنگل میں غائب ہوگیا۔ پھر کسی نے اسے زندہ نہیں دیکھا۔ سپن ہالدار پینتیس سال کا ایک مچھیرا تھا وہ انڈیا اور بنگلہ دیش کی سرحد پر واقع ایک گاؤں ڈیول باڑی کا رہنے والا تھا جو دریائے مالتا کے کنارے آباد ہے جہاں سندر بن کے جنگلات دونوں ملکوں کے درمیان پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ ایک دن پہلے ہی اپنی کشتی پر کیکڑوں کے شکار پر روانہ ہوا تھا۔

”مت جاؤ۔“ اس کی بیوی منانی نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن سپن نے اس کی ایک نہ سنی۔ اس کے سر پر موت منڈلا رہی تھی۔ پھر وہ بھلا کیسے رک سکتا تھا۔

”بچوں کا خیال رکھنا۔“ وہ بولا۔ ”میں پانچ چھ دنوں میں لوٹ آؤں گا۔“

”میں نے اسے بتایا کہ میں ہمیشہ خطرات سے ڈرتی رہتی ہوں۔ میں نے اس کی بہت منت کی لیکن اس نے جواب دیا کہ اسے جانا ہی پڑے گا۔ یہی اس کا پیشہ ہے۔“

وہ جنوری کا مہینا اور ہفتے کا دن تھا جب وہ روانہ ہوا تھا۔ اگلے دن رات میں اس کے ساتھی اس کی لاش لے کر واپس آئے۔ پچھلے دسمبر میں سائیکلون کے بعد پانی کی سطح بلند ہوگئی تھی اور بہت سے ٹائیگر بنگلہ دیش سے انڈیا کے سندربن

میں داخل ہوگئے تھے جہاں ڈیڑھ لاکھ لوگ بستے ہیں۔ اس سائیکلون کے نتیجے میں شیروں کے حملوں میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ جو مچھیرے کیکڑوں کے شکار کے لیے چمرنگ کے جنگلات میں جاتے، وہ آسانی سے ٹائیگر کا شکار ہو جاتے تھے۔ سرکاری اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ 2007ء میں ایک درجن ہلاکتیں ہوئی تھیں لیکن حملوں کی تعداد سے پتا چلتا ہے کہ ہلاکتیں اس سے زیادہ ہوئی تھیں۔ صرف ڈیول باڑی میں جس کی آبادی چار ہزار نفوس پر مشتمل ہے، اس سال چھ ہلاکتیں ہوئیں۔ وہ جوان بیوائیں جو پانی کے کنارے واقع کمیونٹی ہال میں جمع ہوئی تھیں، جانتی ہیں کہ انہیں شیروں کے ساتھ رہنے کی کتنی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ ان انتیس بیواؤں کے شوہروں کو ٹائیگر نے اپنا لقمہ بنا لیا تھا۔ بائیس سالہ انیتا جو اپنی اٹھارہ ماہ کی بیٹی کو گود میں لیے بیٹھی تھی، اس کا چوبیس سالہ شوہر دو ماہ پہلے دو آدمیوں کے ساتھ چمرنگ کے گھنے جنگلات میں کیکڑے اکٹھا کرنے گیا تھا۔

”اس نے کہا تھا کہ وہ اگلے ہفتے واپس آجائے گا۔“ وہ بولی۔

بعد میں پتا چلا کہ اس ٹرپ کے دوسرے ہی دن ایک ٹائیگر نے اس کے شوہر پر حملہ کیا اور اسے دبوچ کر تاریک جنگل میں غائب ہوگیا جہاں کسی کو بھی اس کے پیچھے جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ایک اور بیوہ چوبیس سالہ انجلی اب تک گویا سکتے کے عالم میں تھی۔ صرف دو ہفتے پہلے اس کا شوہر سنج گاؤں کے دوسرے لوگوں کے ہمراہ کیکڑوں کا شکار کرنے کی غرض سے روانہ ہوا تھا۔ تیس سالہ سنج تین بچوں کا باپ تھا۔ وہ اپنی کشتی پانی میں اتارنے کے لیے جھکا ہی تھا کہ اچانک ایک ٹائیگر اس پر حملہ آور ہوا اور اسے گھسیٹتا ہوا جنگل میں لے گیا پھر وہ کسی کو بھی نظر نہیں آیا۔ انجلی نہیں جانتی کہ وہ اپنے تین بچوں کو کیسے پالے گی۔ پچھلے دس برسوں میں دریائے مالتا کے کنارے واقع صرف اس ایک گاؤں کے پچاس سے زائد افراد ٹائیگر کا نوالہ بن چکے ہیں لیکن گاؤں والوں کا کہنا ہے کہ اس سال پندرہ ہلاکتوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ حملوں میں ڈرامائی اضافہ ہوا ہے۔ بیواؤں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

سب مچھیرے مل کر 400 روپے میں کوئی کشتی کرائے پر لیتے ہیں اور کبھی کبھی اسی دن لوٹ آتے ہیں۔ اکثر و بیشتر انہیں جنگل میں رکنا پڑتا ہے اور وہ اپنی کشتی میں سوتے ہیں۔ اگر آس پاس کوئی ٹائیگر نہ ہو تو ہر مچھیرا تین سے پانچ کلو تک کیکڑے پکڑ لیتا ہے۔ عام طور سے یہ کافی ہوتا ہے اور ان کی کوشش بارآور ہوتی ہے لیکن تین کی تیس سالہ بیوی کو مانگ تانگ کر اپنا اور اپنے تین بچوں کا پیٹ پالنا پڑتا ہے۔

”میرے پاس کوئی زمین نہیں ہے اور مجھے اپنے بچوں کو پالنا پڑ رہا ہے۔“ وہ بولی۔ ”یہاں کے لوگ غریب اور مجبور ہیں، لہٰذا انہیں لکڑیاں اور کیکڑے اکٹھا کرنے کے لیے جنگل میں جانا پڑتا ہے جہاں وہ شیروں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ ہمیں ہر حال میں یہیں رہنا ہے۔“

وہاں بہت سے لوگوں کے جسم پر زخموں کے نشان تھے جن کا ٹائیگر سے سامنا ہوا تھا۔ چھپن سالہ نریندر سردار نے جب کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو اس کے سارے دانت غائب تھے اور چہرے کے گرد زخم کی وجہ سے ساری کھال سمٹ آئی تھی جو ایک ٹائیگر سے دو دو ہاتھ کرنے کا نتیجہ تھا۔ وہ جھک کر اپنا جال پھیلا رہا تھا کہ اسی دوران ایک ٹائیگر نے اس پر حملہ کر دیا تھا۔ اس حملے میں نریندر کے جبڑے اپنی جگہ سے ہل گئے تھے لیکن وہ خوش قسمت تھا۔ جس ٹائیگر نے اس پر حملہ کیا تھا، وہ نر تھا۔ نریندر نے اس کی دونوں پچھلی ٹانگوں کے درمیان ایک لات رسید کر دی تھی۔ وہ لات اتنی زوردار تھی کہ ٹائیگر درد سے بے حال ہو گیا اور حملہ ادھورا چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اسے اپنی نانی یاد آ گئی ہو گی اور اس نے سوچا ہو گا کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟

ایک اور شخص کارتک ہالدار اس وقت صرف آٹھ برس کا تھا جب ایک ٹائیگر نے اس کے باپ کو مار ڈالا تھا جو جنگل میں شہد اکٹھا کر رہا تھا۔ اب کارتک پینتیس سال کا ہے۔ جسم پر صرف ایک میلی سی لنگی اور آدھے جسم سے ننگا۔ اس کے بائیں کندھے پر ٹائیگر کے دانتوں کا گہرا زخم تھا جب کہ پیٹھ کا زخم اب بھرنے لگا تھا۔

''آج سے لگ بھگ دو ماہ پہلے کا ذکر ہے۔ اس وقت صبح کے ساڑھے دس بج رہے تھے اور میرے پانچ ساتھیوں نے لنچ کے لیے کچھ جھینگے پکڑنے کی امید پر کشتی ایک کھاڑی میں روکی تھی۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ ''میں پانی میں اتر گیا تھا۔ اچانک میں نے اپنے شانوں پر ایک بہت بڑا بوجھ محسوس کیا جو مجھے پانی میں دھکیل رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں سمجھا کہ میرے دوست مذاق میں مجھ پر کود گئے ہیں لیکن اگلے ہی لمحے مجھ پر واضح ہو گیا کہ وہ ایک ٹائیگر تھا۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا ہی تھا کہ اس نے مجھے کاٹ لیا۔ میں مدد کے لیے چیخنے لگا لیکن کوئی بھی میری مدد کو نہیں آیا۔ میں نے اپنا ایک پیر اور ایک ہاتھ بہت سختی کے ساتھ کیچڑ میں گاڑ دیے تھے تاکہ وہ مجھے گھسیٹ کر نہ لے جا سکے۔ میری یہ کوشش کامیاب رہی اور وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔''

اپنے زخموں کے باوجود علاج کے لیے اسے اپنی جو تھوڑی بہت زمین تھی، مجبوراً بیچنی پڑ گئی۔ اس شیر سے کوئی گلہ نہیں تھا جس نے اس پر حملہ کیا تھا۔ ''میں جانتا ہوں، ہمارے آس پاس ٹائیگر ہیں لیکن ہمیں مچھلیاں پکڑنے کے لیے وہاں جانا ہی پڑتا ہے۔ وہ بس میری بدقسمتی تھی۔ ہم ٹائیگر سے نہیں لڑ سکتے لیکن ہم انہیں ہلاک کرنا بھی نہیں چاہتے۔'' وہ آخر میں بولا۔

بیشتر لوگ اس کے ہم خیال ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ شیروں کی موجودگی ان کے پیشے کے لیے ایک مستقل خطرہ ہے۔ اسی سال جب ایک ٹائیگر ان کے گاؤں میں گھس آیا تھا تو لوگوں نے اس پر شدید پتھراؤ کرتے ہوئے، اس کا پیچھا کیا اور جلتی ہوئی مشعلوں کے ساتھ اس درخت پر چڑھ گئے جہاں وہ جا چھپا تھا اور اسے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ کسی نے اسے ہلاک کرنے کی کوشش نہیں کی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بھارتی سندر بن میں 2001ء سے لے کر اب تک کسی بھی ٹائیگر کو ہلاک نہیں کیا گیا۔

☆......☆

چھپن سالہ رامن مستری مچھلیوں کے شکار کے دوران سندر بن کے خطرناک جنگل میں ایک درخت پر چڑھ کر پھل توڑ رہا تھا۔ اسی دوران ایک ٹائیگر نے اس کا پیچھا کیا اور درخت پر چڑھ کر اس پر پنجے مارنے لگا۔ اس نے اپنے پنجے رامن مستری کے کولہے میں گاڑ دیے۔ رامن مستری لہولہان ہو گیا اور درد کی شدت سے بے حال ہو کر مدد کے لیے چیخنے لگا۔ چیخ سن کر اس کے دوست بھاگتے ہوئے آئے اور ٹائیگر کو ڈرا دھمکا کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ رامن مستری کے زخموں سے وافر خون بہہ گیا تھا۔ اسے فوری اسپتال پہنچایا گیا جہاں وہ تین مہینے تک زیر علاج رہا۔ ٹائیگر نے اس کے کولہے کو ادھیڑ دیا تھا۔ یہ واقعہ کئی سال پہلے پیش آیا تھا۔ رامن مستری اب بھی مچھلیاں اور کیکڑے پکڑنے کے لیے چمرنگ کے درختوں کے اس گھنے اور خطرناک جنگل میں جاتا ہے جہاں شیر ہی شیر ہیں۔

''جب ہم مچھلیاں پکڑنے جاتے ہیں تو اکثر شیروں کو گزرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔'' وہ بولا۔ ''اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بہت ہی خطرناک کام ہے لیکن ہمارے پاس زندہ رہنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔ ہمیں جان کی بازی لگانی پڑتی ہے۔''

کہا جاتا ہے کہ ہر دس میں سے ایک رائل بنگال ٹائیگر آدم خور ہے۔ حکام کا کہنا ہے کہ اب پہلے کے مقابلے میں کم ہلاکتیں ہوتی ہیں لیکن اب بھی... گاؤں میں جوان اور ادھیڑ عمر کی بیواؤں کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے جن کے شوہروں کو شیروں نے مار ڈالا تھا۔

ایک فارسٹ آفیسر رنجن ملک کا کہنا تھا۔ ''ہم ہر طرح سے مقامی لوگوں میں آگہی کی مہم جاری رکھے ہوئے ہیں کہ وہ خطرناک علاقوں سے دور رہیں۔ ہم نے چھیانوے کلومیٹر طویل نائلون کی بلند جالی لگا دی ہے تاکہ درندوں کو انسانی بستیوں میں جانے سے روکا جا سکے۔ سندر بن انڈیا کا واحد جنگل ہے جہاں انسانوں کو بسنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ ممنوعہ علاقہ ہے، سندر بن نیشنل پارک اور دیگر خطرناک مقامات پر فارسٹ گارڈ مستقل گشت لگاتے رہتے ہیں تاکہ کسی شخص کو بالخصوص غیر قانونی شکاریوں کو ممنوعہ علاقوں میں داخل ہونے سے روکا جا سکے جو ٹائیگر کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔''

بہت سی انسانی ہلاکتوں کی خبر میڈیا تک نہیں پہنچ پاتی۔ سالانہ 50 یا 60 ہلاکتوں کی شرح ہو تب بھی صرف تین فی صد انسانی گوشت شیروں کی غذا ہے۔ انسانی گوشت ان کی بنیادی غذا نہیں ہے بلکہ صرف اضافی غذا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس علاقے سے منسلک بدنامی بلا سبب ہے۔ تین فی صد انسانی گوشت کا مطلب ہے سالانہ اوسطاً ایک انسان کی ہلاکت۔

''اس علاقے کے لوگ اس بات پر راضی ہو گئے ہیں کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے مویشی کو جنگل کی طرف ہانک دیا کریں گے تاکہ شیر ان سے اپنا پیٹ بھر سکیں اور انسانی بستیوں کا رخ نہ کریں۔'' رنجن ملک نے ہمیں آگاہ کیا۔ ''بہتر انتظامی تیکنک کی وجہ سے اب ہر سال صرف چند ہلاکتیں ہوتی ہیں۔'' حکومت کے دعوے اپنی جگہ اور حقائق اپنی جگہ ہیں جو بہت ہی بھیانک ہیں۔

☆......☆

جنگل کے بیشتر پڑاؤ پر ایک چھوٹے سے مندر میں ایک دیوی کی مورتی نظر آتی ہے۔ بھارتی سندر بن کی بستیوں میں ہندو اور مسلمان مل جل کر رہتے ہیں۔ اس جنگل نے دونوں کے ذہنوں میں ایک عجیب و غریب عقیدے کو جنم دیا ہے۔ ان مندروں میں جو مورتی نظر آتی ہے اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بن بی بی ہے جو جنگل کی محافظ اور نگہبان ہے۔ وہ جانوروں یا خون کی بھینٹ قبول نہیں کرتی بلکہ اسے مٹھائیوں کے نذرانے پیش کیے جاتے ہیں۔ ہندو اور بھارت کے توہم پرست مسلمان دونوں ہی جنگل میں داخل ہونے سے پہلے بن بی بی سے اپنی جان کی حفاظت اور سلامتی کی دعا مانگتے ہیں۔ یہ روایت ہے کہ بن بی بی ایک مسلمان فقیر ابراہیم کی بیٹی تھی۔ اس کا ایک بھائی تھا جس کا نام شاہ جنگل ہے۔ بن بی بی کو شیر کی سواری کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ بن بی بی کے ساتھ ہی دکھنی رائے کی بھی پوجا کی جاتی ہے جو پورے دکھن کا دیوتا ہے۔ ایک عورت نے زور دے کر کہا کہ وہ وشنو دیوتا کی طرح ہے۔ وہ جنگل کا بادشاہ ہے۔ ایک اصلی ٹائیگر درحقیقت دکھنی رائے یا وشنو دیوتا ہو سکتا ہے جس کی بن بی بی سواری کرتی ہے۔ بعض مقامات پر ٹائیگر کے بت نظر آتے ہیں جن کی پوجا کی جاتی ہے، ان پر پھول چڑھائے جاتے ہیں اور ان سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ انسانوں کو نقصان نہ پہنچائیں۔

دراصل انسان کا باطنی خوف اس کے ذہن میں دیوی اور دیوتا کے خیالی پیکر تراشتا ہے اور انسان اپنے خوف قوت ارادی کے ذریعے نجات حاصل کرنے کی بجائے ان خیالی پیکر کی پوجا کرنے لگتا ہے اور انہیں اپنا نجات دہندہ سمجھنے کے خبط میں مبتلا ہو جاتا ہے جن کا وجود کہیں اور نہیں، صرف اور صرف اس کے ذہن میں ہوتا ہے۔ بھارتی سندر بن کے برعکس بنگلہ دیشی سندر بن میں کسی بن بی بی یا دکھنی رائے کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ وہ راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ وہاں نہ تو کسی اصلی پیر، جعلی پیر یا تعویذ گنڈے وغیرہ کا وجود ہے اور نہ ہی پیری مریدی یا گدی نشینی کا کوئی تصور ہے۔ بنگال کا جادو جس کا ہمارے ہاں بہت شہرہ ہے، درحقیقت حسنِ بنگال کا ایک استعارہ ہے گویا بنگال کے حسن کو جادو سے تشبیہ دی گئی ہے جسے ان پڑھ اور مفاد پرست لوگوں نے غلط معنی پہنا کر اپنا کاروبار چمکانے کے لیے عوام الناس کو گمراہ کیا ہے۔

☆......☆

ماضی میں شیروں کا شکار راجاؤں، مہاراجاؤں اور نوابوں کا شوق ہوا کرتا تھا جو بڑی بے دردی سے اتنی کثیر تعداد میں ان کا شکار کیا کرتے تھے جس کے مقابلے میں اتنی تیزی سے ان کی افزائش نہیں ہوتی تھی۔ اس شوق کے نتیجے میں شیروں کی تعداد تیزی سے گھٹتی چلی گئی۔ آدم خور شیروں کو ہلاک کرنا شوقیہ شکار سے بالکل مختلف معاملہ ہے۔ انسانی جانوں کو آدم خور شیروں سے محفوظ رکھنے کا یہی ایک طریقہ تھا کہ انہیں ہلاک کر دیا جائے۔ عام طور سے کوئی شیر اسی وقت آدم خور بنتا ہے جب وہ کسی شکاری کے ہاتھوں زخمی ہو گیا ہو اور انتقام لینے پر اتر آیا ہو یا پھر بوڑھا یا کسی وجہ سے معذور ہو کر بڑے جانوروں کا شکار کرنے کے قابل نہ رہا ہو... ایسی صورت میں ایک انسان ہی ہے جسے وہ آسانی سے شکار کر کے اپنا پیٹ بھر سکتا ہے اور زندہ رہ سکتا ہے۔

آزادی کے بعد پیسے کی خاطر شیروں اور دیگر جنگلی جانوروں کے شکار نے رفتہ رفتہ شوقیہ شکار کی جگہ لے لی۔ راجا اور مہاراجا تو چلے گئے، ان کی جگہ نئے شکاری، غیر قانونی

شکاری اور جرائم پیشہ لوگوں کے گینگ میدان میں آگئے جو فوری اور بڑی رقم کے حصول کی لالچ میں نہایت بے دردی سے انہیں ہلاک کرنے لگے۔ وہ شیروں کو ان کی کھال اور جسم کے دیگر اعضاء کے حصول کے لیے ہلاک کرتے۔ اس سے جہاں شیروں کی کھال سے امراء اور رؤسا کے ڈرائنگ روم کی زیبائش میں اضافہ ہوا وہیں ان کے اعضاء کو اپنے تئیں متعدد بیماریوں کے لیے تیر بہ ہدف سمجھ لیا گیا اور یہ چیزیں بطور میڈیسن مارکیٹوں میں دستیاب ہونے لگیں لیکن سب سے زیادہ مانگ قوت مردمی میں اضافہ کرنے والی روایتی دوائیوں کی تھی حالانکہ سائنسی اعتبار سے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ ٹائیگر یا کسی بھی جنگلی جانور کے جسم کے حصوں سے کسی بھی بیماری کا علاج ممکن ہے چہ جائیکہ قوت مردمی میں اضافہ لیکن جنوب مشرقی ایشیا بالخصوص چین کے عوام الناس نے جن میں جہالت عام ہے، اس کی کوئی پروا نہیں کی اور محض سنی سنائی باتوں پر عمل کرتے ہوئے اس امید پر ٹائیگر کا سوپ اپنی ڈشوں میں شامل کرلیا کہ اس کے استعمال سے وہ مرد آہن بن جائیں گے۔ ان باتوں کی زور و شور سے تشہیر کی گئی اور دواسازوں کو لوگوں سے پیسے بٹورنے کا ایک نادر موقع ہاتھ آگیا۔ وہ ٹائیگر کی ہڈیوں سے دوائیاں بنانے میں جُت گئے جب کہ کسی بھی بیماری میں ان کے پُراثر ہونے کے دعوؤں میں کوئی سچائی نہیں ہے۔

اس پروپیگنڈے کے تحت چالاک، زر پرست اور شاطر مجرموں اور غیر قانونی شکار کرنے والوں کے انتہائی منظم گروہوں نے ٹائیگر کو بے دریغ ہلاک کیا اور عوام الناس کو بے وقوف بنا کر لاکھوں کمائے جن میں ان پڑھ اور ہوس پرست روایتی دوا ساز بھی شامل ہیں لیکن کوئی پوچھنے والا نہیں۔ دوسری طرف قرض کے بوجھ تلے دبے، ننگے بھوکے گاؤں والوں کو غیر قانونی شکار میں آسان کمائی کا ذریعہ نظر آیا۔ غیر قانونی شکاری، گاؤں والوں کے اس مال غنیمت میں حصہ دار بننے کے لیے پہلے سے تیار بیٹھے تھے کیونکہ ٹائیگر کے جسم کے اعضاء چین کی بلیک مارکیٹ میں فروخت کر کے لاکھوں ڈالر کمائے جاسکتے تھے۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں شیروں کو بے دردی سے ہلاک کر کے ان کی کھالیں بھی خفیہ راستوں سے چین اسمگل کی جاتی رہیں اور اسمگلروں نے اس بہتی گنگا میں خوب ہاتھ دھوئے۔ رپورٹ کے مطابق روایتی دوائیوں کی چینی مارکیٹ کی گرم بازاری، جنگلی حیات کے معدوم ہونے کی ذمہ دار ہے جس میں ٹائیگر سرفہرست ہے جس نے ٹائیگر کے غیر قانونی شکار کی ترغیب دی اور اسے عروج پر پہنچانے میں مرکزی کردار ادا کیا۔

گاؤں کے لوگ شیروں کو اپنے آس پاس نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ جنگلات کے کٹنے اور زرعی زمینوں نیز کارخانوں کے پھیلاؤ کے سبب شیروں کے ٹھکانے سمٹ رہے تھے اور شکار کے جانوروں کی قلت سے ان میں بے چینی پھیل گئی تھی لہٰذا وہ کھانے کی تلاش میں انسانی بستیوں میں گھس آئے اور ان کے مویشی کو مار کر کھا جاتے۔ اپنے مویشی سے محرومی کسی گاؤں والے کے لیے کوئی چھوٹا موٹا نقصان نہیں تھا حالانکہ حکومت اس نقصان کی تلافی کرتی تھی لیکن سرخ فیتہ ایک بڑی رکاوٹ بن جاتا تھا۔ یہ رکاوٹ صرف بھاری رشوت سے ہی دور ہوتی تھی اور مالی امداد کا بڑا حصہ رشوت کی نذر ہو جاتا تھا۔ لہٰذا گاؤں والے یا تو خود ہی ان شیروں کو زہر دے کر ہلاک کردیتے یا پھر انہیں ختم کرنے کے لیے غیر قانونی شکاریوں کی بھرپور مدد کرتے یہاں تک کہ ایک ایسا وقت بھی آیا کہ بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان کے جنگلات میں پائے جانے والے چالیس ہزار ٹائیگروں کی تعداد گھٹ کر 1972ء میں صرف پندرہ سو رہ گئی۔ تب بھارتی حکومت کو ہوش آیا اور اس نے ٹائیگر کے تحفظ کے لیے سخت قوانین بنائے اور انہیں سختی سے نافذ کیا جس کے نتیجے میں اگلے پندرہ سال میں ٹائیگر کی تعداد میں اضافے کی نوید سنائی گئی لیکن یہ سنہرا دور عارضی ثابت ہوا۔ 1984ء کے بعد ٹائیگر ایک بار پھر خطرناک حد تک معدوم ہونے کے قریب پہنچ گئے۔ غیر قانونی شکاری اور جرائم پیشہ خم ٹھونک کر ایک نئے عزم اور ارادے سے لوٹ آئے تھے۔

جب کہ پیٹرسن اور دیگر ماہرین جنگلی حیات نے بھارتی حکومت کو خبردار کیا کہ روزانہ کی بنیاد پر ایک ٹائیگر کو ہلاک کیا جارہا ہے۔ اگر یہی صورتِ حال برقرار رہی تو اگلے چند ماہ میں ٹائیگر کا مکمل صفایا ہو جائے گا جس کے بعد 2010ء میں ٹائیگروں کے اعداد و شمار سے ظاہر ہوا کہ 2004-5ء میں ایک ہزار چار سو کے مقابلے میں ایک ہزار سات سو ٹائیگر بشمول رائل بنگال ٹائیگر پورے ہندوستان میں پائے جاتے ہیں جو دنیا بھر میں پائے جانے والے ٹائیگرز کی سب سے بڑی تعداد ہے جب کہ چین میں اس شاندار اور نایاب جانور کی پوری آبادی کا مکمل صفایا ہو چکا ہے۔ اب وہاں کوئی ٹائیگر نہیں پایا جاتا۔ انسان کی لالچ اور جہالت کا خمیازہ اس شاندار جانور کو بھگتنا پڑا ہے۔

مہذب گالیاں

محی الدین نواب

معاشرے کے نباض، الفاظ کے جادوگر کی دوسری برسی بھی گزر گئی لیکن وہ اب بھی ہمارے دلوں میں زندہ ہیں۔ عرصہ قبل سرگزشت کے لیے انہوں نے ایک چھوٹی سی تحریر لکھی تھی جو کاغذات کے ڈھیر تلے دبی تھی۔

یہ مختصر سی تحریر یقیناً قارئین کو بھی پسند آئے گی

قارئین! یہ تحریر نواب صاحب نے خصوصی طور پر سرگزشت کے لیے لکھی تھی بلکہ لکھ رہے تھے، اسے طویل کرنا تھا لیکن وقت نے اجازت نہ دی۔ آج کاغذات کے ڈھیر میں یہ چند صفحے نظر آئے تو اسے فوراً کمپوز کرالیا اس لیے کہ یہ نواب صاحب کا خاص انداز تھا کہ ہر صفحہ خود میں مکمل ہوتا، یہ تحریر بھی آپ کو مکمل لگے گی۔ نواب صاحب کی برسی کے حوالے سے اسے شامل کیا ہے۔ (مدیر)

سننا اور بات ہے، سمجھنا اور بات ہے۔ سمجھ کر عمل کرنا

اور بات ہے۔ میں جو بات کہنا چاہتا ہوں اس کی تان یہاں آکر ٹوٹتی ہے کہ حسبِ ضرورت عمل نہ ہو تو وہ بات ڈھول کا پول رہتی ہے۔ مجھے گمان تھا کہ میں بہت کچھ جانتا اور سمجھتا ہوں لیکن ریاض شاہد (مرحوم) نے کچھ ایسی باتیں میرے گوش گزار کیں کہ اپنے متعلق میری خوش فہمی اسی دن ختم ہوگئی۔

یہ آج سے تقریباً پینتالیس برس پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں فلم انڈسٹری کے ناقابل فراموش مکالمہ نگار اور ہدایت کار ریاض شاہد زندہ تھے لیکن خون کے سرطان میں مبتلا تھے۔ ہر چار چھ ماہ میں جسم کا خون تبدیل کرانے کے لیے امریکا جایا کرتے تھے۔ ایسے وقت میں سابقہ مشرقی پاکستان سے ہجرت کر کے میں لاہور پہنچا ہوا تھا۔ برصغیر کے مشہور و معروف ہدایت کار ایس ایم یوسف میری تحریروں کے مداح تھے۔ انہوں نے دیبا کو فون کر کے مجھ سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے ان سے ملاقات کی۔ پھر یہ ملاقات ہم نوالہ و ہم پیالہ کہلانے والی دوستی میں تبدیل ہوگئی۔

ان دنوں ایور نیو اسٹوڈیو کے مالک آغا جی اے گل حیات تھے۔ ان کی ایک فلم ''دیا جلے ساری رات'' ادھوری پڑی تھی۔ فلم کی کاسٹ میں شمیم آرا اور وحید مراد تھے۔ اس فلم کے نامکمل ہونے کی وجہ اس کی کمزور کہانی، غیر دلچسپ مناظر اور مکالمے تھے۔ آغا صاحب نے یوسف صاحب سے کہا کہ وہ اس فلم کو مکمل کریں۔ کسی ایسے مصنف سے کہانی میں تبدیلیاں کرائیں جو فلم کے بے جان مناظر میں جان ڈال دے اور مہنگا اسکرپٹ بھی نہ لکھے کیونکہ مذکورہ فلم میں پہلے ہی خاصی رقم ضائع ہوچکی تھی۔

یوسف صاحب نے مجھے کہانی لکھنے کا موقع دیا۔ میں پیدائشی طور پر بنگالی ہوں۔ ابتداء میں آغا صاحب مطمئن نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا، مجھ جیسا رائٹر اردو فلم کی کہانی نہیں لکھ سکے گا لیکن یوسف صاحب نے ذمہ داری لی اور میں نے لکھنا شروع کیا۔ آغا صاحب نے اپنے اطمینان کے لیے انڈسٹری کی چند نامور ہستیوں کو بلایا تا کہ وہ میری کہانی پر بھرپور تنقید کریں۔ ان نامور ہستیوں میں دو نام بڑے معتبر ہیں۔ ان میں سے ایک راجا غضنفر علی ہیں۔ یہ بھی آج ہماری دنیا میں نہیں ہیں لیکن ہماری انڈسٹری کو بڑے ذہین رائٹر اور ہدایت کار دے گئے ہیں۔ ان ہدایت کاروں میں اقبال کاشمیری کا نام قابل ذکر ہے کہ اس ہدایت کار نے سب سے زیادہ سپرہٹ فلمیں پیش کی ہیں۔ بعد میں انہوں نے میری کئی کہانیوں پر ہدایت کاری کے فرائض انجام دیے ہیں۔

اس داستان کو آگے بڑھانے سے پہلے ان قارئین کی شکایات دور کرنا چاہتا ہوں جو خطوط اور فون کے ذریعے کہتے ہیں کہ میری فلمی کہانیوں کا معیار وہ نہیں ہوتا جو سسپنس ڈائجسٹ کی کہانیوں میں ہوا کرتا ہے۔ میں نے یہی شکایت فلم ساز سجاد گل سے کی۔ ''میں کہانی لکھتا کچھ ہوں۔ آپ حضرات اسے کچھ اور کر دیتے ہیں۔ ایسے لگے بندھے فارمولے ٹھونس دیتے ہیں کہ صرف میرا نام رہ جاتا ہے اور کہانی کسی فارمولا رائٹر کی ہو جاتی ہے۔''

اقبال کاشمیری نے کہا۔ ''آپ جسے فارمولا کہہ رہے ہیں، وہ حقیقتاً ہمارا آزمودہ نسخہ ہے۔ ایک مریض جس دوا سے شفا پاتا ہے اس دوا سے دوسرے مریض کا علاج کرنا فارمولا نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''امراض کی نوعیت مختلف ہو اور دوا وہی دی جائے۔ مریض پر دل کا دورہ پڑا ہو اور اسے ہاضمے کا فارمولا چورن دیا جائے تو وہ سیدھا اوپر چلا جائے گا۔''

اقبال صاحب نے میری پہلی فلم ''رنگیلے جاسوس'' میں تین مختلف فائٹنگ کی سچویشن میں سلطان راہی اور ولن سے کھڑکیوں، دروازوں، میزوں اور فانوسوں کے شیشے تڑوائے۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ نے اتنے شیشے کیوں تڑوائے ہیں؟''

انہوں نے فرمایا۔ ''نواب صاحب! اس سے پہلے میری فلم ''قسم'' سپرہٹ ہوئی ہے۔ اس میں بھی کئی جگہ شیشے توڑے گئے ہیں۔ کانچ کا ٹوٹنا میرے لیے نیک شگون ہوتا ہے۔ ویسے بھی لڑائی جھگڑوں میں شیشے ٹوٹتے ہیں۔ آپ اعتراض نہ کریں۔''

''رنگیلے جاسوس'' میں سلطان راہی اپنی بہن کو اور ولن اپنی بہن کو دل و جان سے چاہتے ہیں۔ وہ اپنی بہنوں کو کانچ سے زیادہ نازک سمجھتے ہیں۔ مجبوراً مجھے شیشے تڑوانے پڑے۔ میری کہانی کے مطابق وہ کبھی یہاں شیشے توڑے کبھی وہاں۔ اب اسے کیا کہا جائے کہ میں نے جو کہانیاں لکھ کر دیں وہ گھسے پٹے فارمولوں کے باوجود سپرہٹ ہوتی رہیں۔

بہرحال میں نے اپنے قارئین کے اطمینان کے لیے یہ چند سطریں لکھ دی ہیں۔ اب اصل کہانی کی طرف آتا ہوں۔

میں نے ''دیا جلے ساری رات'' کی کہانی کو از سرنو لکھا تو اس پر تبصرہ کرنے جو نقاد آئے تھے ان میں راجا غضنفر علی مرحوم اور ریاض شاہد مرحوم بھی تھے اور یہی سب سے نامور اور اہم

تھے۔ میں نے کہانی سنائی جو پسند تو کی گئی لیکن چھوٹی بڑی خامیاں بھی نکالی گئیں۔ میرے آج کے تجربات میں اور پینتالیس برس پہلے کی لکھی ہوئی کہانی میں بڑا فرق تھا۔ خامیاں تو نکلنی ہی تھیں۔

مرحوم ریاض شاہد نے مجھ سے کہا۔ آپ میں وہ جوہر موجود ہیں جو ایک ذہین قلم کار میں ہوتے ہیں۔ آپ لکھتے وقت یہ حقیقت ذہن میں رکھیں کہ ہم ایسے دور سے گزر رہے ہیں جہاں اپنی تہذیب پر فخر کرتے ہیں اور اس کا مذاق بھی اڑاتے ہیں۔ مثلاً ہیر رانجھا کی داستان سب ہی نے پڑھی اور سنی ہے۔ اس کا ایک منفی کردار کیدو ہے۔ ہیر جب بھی چوری چھپے رانجھا سے ملنے جاتی ہے تو کیدو مخبری کرتا ہے۔ ہیر کے گھر والوں کو غیرت دلاتا ہے۔ صحیح اطلاع دیتا ہے کہ وہ تنہائی میں رانجھا سے مل رہی ہے اور خاندان کو بدنام کررہی ہے۔ ہیر کے عزیزان محبت کرنے والوں کو کیدو کی مدد سے رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتے ہیں تو ناکام رہتے ہیں۔ ایسے وقت فلم دیکھنے والے ہزاروں تماشائی خوش ہو کر تالیاں بجاتے ہیں کیونکہ محبت کرنے والے دو دل ملتے رہتے ہیں اور کیدو کی دشمنی ناکام رہتی ہے۔

ریاض شاہد اتنا کہہ کر..... ذرا خاموش ہوئے۔ ابھی میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کس قدر چونکا دینے والی بات کہیں گے۔ اس وقت میں بڑے دکھ سے سوچ رہا تھا۔ اتنا عظیم قلم کار خون کے سرطان میں مبتلا ہے اور موت سے لڑ رہا ہے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس عظیم فنکار سے وہ پہلی اور آخری ملاقات ہے۔ وہ خون تبدیل کرانے اگلے ہفتے پھر امریکا جانے والے تھے۔

بہرحال انہوں نے ہیر رانجھا کی داستان کے سلسلے میں کہا۔ اس داستان سے یہ بات سامنے آئی کہ کیدو ولن ہے اور رانجھا ہیرو...... لیکن نہیں۔ کیا یہی ہماری تہذیب ہے؟ اگر کوئی آکر مجھ سے اور آپ سے یہ پوچھے کہ ہماری بہن فلاں نوجوان سے چھپ کر ملتی ہے تو ہم اس مخبر کو کیدو یا ولن نہیں کہیں گے۔ اس کی عزت کریں گے کیونکہ وہ ہمارے گھر کی عزت رکھنے کے لیے سچ کہہ رہا تھا۔ وہ کیدو ہمارے لیے ہیرو ہوگا اور نوجوان ولن ہوگا جو ہمارے گھر کی عزت تک پہنچ رہا تھا۔

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''واقعی آپ نے عجیب نکتہ پیش کیا ہے۔ ہال میں بیٹھے ہوئے تماش بین ہیرو ہیروئن کے ملاپ پر تالیاں بجاتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ ہمارے گھر کی بہن یا بیٹی نے ایسا کیا تو کیا ہم تالیاں بجائیں گے؟'' واقعی یہ ہمارا دوغلہ پن ہے۔

انہیں کسی ضروری کام سے جانا تھا، وہ چلے گئے لیکن میرے دماغ میں دوغلی تہذیب کی بارود بھر گئے۔ یہ بات سمجھ میں آئی کہ دین اسلام میں عشقیہ شاعری کی ممانعت کیوں ہے؟

اس لیے کہ ہم جس دوشیزہ کے عشق، حسن و شباب کو اس کی رنگینی اور دلکشی کے ساتھ بیان کریں گے اسے پالینے کی تحریک اتنی ہی شدت سے پیدا ہوتی رہے گی اور اگر شاعر کسی خیالی حسینہ کی رعنائی پیش کرے گا تو پڑھنے والا ان حسین اور رنگین اشعار کو کسی دوسرے کی بہن یا بیٹی پر چسپاں کرے گا۔

خون زہریلا ہو جائے تو بلڈ کینسر ہو جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں مرحوم کے اندر خون نہیں تھا۔ تیزاب تھا۔ اگر وہ کچھ عرصہ اور زندہ رہتے تو تہذیب کے منہ پر تیزاب کے مزید چھینٹے مارتے۔ آئینہ دکھاتے کہ ہم اپنی تہذیب کے کیسے امین ہیں؟ اپنے گھر کی لڑکی داغ دار ہو تو ہزار جتن سے عیب چھپاتے ہیں۔ محلے پڑوس کی بدنام ہو تو تالیاں بجاتے ہیں۔

پھر ایک دن خبر ملی کہ وہ اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں۔

کچھ عرصہ بعد ان کے ایک شناسا سے ملاقات ہوئی انہوں نے کہا۔ ''نواب صاحب! جب انہوں نے وفات پائی تو ان کے تکیے کے نیچے سے ایک کاغذ ملا تھا۔ اس کاغذ پر انہوں نے چند اشعار لکھے تھے۔ یہ اشعار ان کے حسب حال ہیں آپ ذرا سنیں۔''

میں نے صرف سنا ہی نہیں، انہیں لکھ کر اپنے پاس محفوظ بھی کرلیا۔ وہ اشعار یہ ہیں۔

دل کا شہر اداس ہے یارو
اور رات آئی ہے غم کی
خاموشی میں یہ آوازیں
اپنے ہی ماتم کی
دیواروں پہ خوف کے سائے
روتے ہیں بازو پھیلائے
ایسا وقت خدا نہ لائے
کہ دل کے ہاتھوں دل مرجائے
رقصِ بسمل دیکھ اور بہتے لہو کا جام دیکھ
اے مرے قاتل مرے بے جان بازو تھام لے

قسط نمبر: 15

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تارعنکبوت میں پھنسا چلا جارہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے ۔

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

رانا بشیر کی بیوی کا قتل ہو گیا تھا اور الزام آیا تھا احمد حسین پر۔ اس جرم میں اسے پھانسی ہو گئی۔ احمد حسین کا بیٹا نعمان ایڈووکیٹ زنیرہ کے ساتھ مل کر اصل قاتل کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران رانا بشیر اپنی بیٹی کے ساتھ نعمان کے دروازے پر پہنچا۔ وہ معافی مانگنے آیا تھا کیونکہ اب اسے بھی لگ رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ایک لاری اڈے کی یونین میں نائب ضلعی صدر بن گیا تھا۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ یہ اڈا ختم ہو جائے اور اس کی زمین پر عمارت بنا کر فروخت کی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ لوگ تندہی سے کام کر رہے تھے لیکن ان کی چال نعمان انھی پر الٹ دیتا۔ ابھی وہ اس مسئلے پر غور کر ہی رہا تھا کہ رانا بشیر کی بیٹی نے اسے ایک ڈائری دی جو مقتولہ کی تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ان دونوں مسئلوں پر کام کر ہی رہا تھا کہ ایک دن اس کے بھائی فہیم نے اس سے کہا کہ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا کہ ہم ایک جوان بہن کے بھائی بھی ہیں اس کے لیے کچھ سوچنا چاہیے پھر اس نے کہا کہ میں نے بہنا کو اکثر رات میں کسی سے فون پر بات کرتے دیکھا ہے۔ باتوں سے لگا کہ وہ کسی کو پسند کرنے لگی ہے۔ فہیم کے جانے کے بعد میں سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ فرحانہ کا میسج آ گیا کہ اسے ڈائری کا پارٹ ٹو مل گیا ہے۔ اگلے دن زنیرہ کے ساتھ میں فرحانہ کے گھر گیا تو ڈائری کے واقعات سنے جس نے رفعت قتل کے واقعے کو مزید الجھا دیا تھا۔ اس دن میں اڈے پر بیٹھا تھا کہ کچھ لوگ آ گئے۔ ان میں عزیر خان بھی تھا جس کو اختر کی بہن ثوبیہ کی گمشدگی کا ذمے دار سمجھا جا رہا تھا۔ میں نے عزیر خان سے کہا کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ کاروباری حضرات کو بھی سہولت ملے لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ معاہدہ پارٹنرز میں پر ہو لیکن ان لوگوں نے منع کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد میں سستا رہا تھا کہ کالیا کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ عارف مچھندر جیل سے فرار ہوتے ہوئے مارا گیا۔ یہ خبر سنتے ہی میں الجھ گیا۔ گڈز ٹرانسپورٹ کی گاڑیاں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ سدو بھائی نے اطلاع دی تھی کہ گڈز کی آڑ میں منشیات کا کاروبار ہوتا تھا۔ سدو کو رخصت کر کے میں بیٹھا ہی تھا کہ کالیا آ گیا۔ اس نے بتایا کہ میری ضمانت منسوخ ہو چکی ہے اور مجھے گرفتار کرنے کے لیے ایس ایچ او دلاور خان آ رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ باہر نکلا اور اس کی بائیک پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ کالیا کے اڈے پر پہنچا تھا کہ بہن کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ پولیس گھر پر آئی تھی اور فہیم کو لے گئی ہے۔ مجبوراً میں نے گرفتاری دے دی۔ وہاں مجھ پر تشدد بھی ہوا۔ میں حوالات میں بیٹھا تھا کہ ایک سپاہی نے آ کر ایک اخبار دیا۔ اخبار میں چھپی خبر دیکھ کر میں پریشان ہو اٹھا۔ فہیم کے تھپڑ نے مجھے بوکھلا دیا تھا۔ وہ تھپڑ مار کر باہر نکل گیا تھا۔ میں اڈے پر پہنچا تو وہاں صوبیہ کے قتل میں ملوث عزیر نظر آ گیا۔ میں اس کے دفتر میں پہنچا اور ان سے صوبیہ کے متعلق پوچھا۔ وہ گھبرا اٹھا۔ میں نے کہا کہ یہ سوال پولیس بھی پوچھے گی اور وہاں سے اٹھ آیا رانا بشیر کے ہاں پہنچا پھر میں نے ٹرک ڈرائیور کی گلوخلاصی کرا دی جس کے ٹرک نے زنیرہ کی کار کو ہٹ کیا تھا۔ گھر آیا تو کاشف ملنے آ گیا جو میری بہن کو چاہتا تھا۔ وہ بھی اغواء کا سن کر پریشان ہو گیا۔ پھر اسی رات کالیا کے ساتھ ہم سیٹھ ستار کے بنگلے میں داخل ہوئے۔ وہاں روزی نام کی ایک لڑکی بھی تھی۔ سیٹھ ستار نے کہا کہ اس نے میری بہن کو ایک جگہ چھپا رکھا ہے ابھی بلواتا ہوں کہہ کر اس نے کسی کو فون کیا کہ لڑکی کو لے کر آ جائے۔ تبھی روزی نے کہا کہ سیٹھ ستار جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے لڑکی کو گلشن حدید میں نہیں کہیں اور رکھا ہے پھر اس نے بتایا کہ میں سیٹھ ستار سے اپنی بہن کا بدلہ لینے کے لیے اس کے ساتھ ہوں۔ بعد میں اس کا کہا سچ نکلا۔ اس کے آدمیوں نے مجھے بھی زخمی کر دیا۔ ساتھیوں سے نمٹ کر میں نے سیٹھ سے اگلوا لیا کہ عاصمہ کو کہاں رکھا ہے اسے باحفاظت نکال لایا پھر روزی کے اپارٹمنٹ میں پہنچا۔ یہ اس کی سہیلی کا فلیٹ تھا۔ ہم اس سے بات کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر باہر سے آواز آئی۔ ”کیبل والا، بل لے کر آیا ہوں۔“ روزی نے دروازہ کھولا تو کیبل والے کو دھکا دے کر دو مسلح شخص اندر آ گئے۔ اس سے نمٹ کر میں نے انسپکٹر کامران کو فون پر کہا کہ روزی کی حفاظت کے لیے دو پولیس والے بھیج دو۔ پھر میں اور کالیا کے ساتھ باہر آ گیا۔ انسپکٹر کامران کی معرفت کئی ایک کو گرفتار کرایا پھر زنیرہ کے گھر پہنچا۔ کچھ ضروری باتیں کر کے میں باہر نکلا تھا کہ ایک ٹیکسی پر نظر پڑی۔ میں اسے نظرانداز کرتا کہ اس ٹیکسی میں بیٹھا ایک شخص اتر کر زنیرہ کے دروازے پر پہنچا۔ میں ہوشیار ہو گیا اور بھاگتا ہوا زنیرہ کے پڑوس والے گھر میں داخل ہو گیا اور چھت کے ذریعے زنیرہ کے گھر میں اتر گیا۔ ٹھیک اسی وقت نیچے سے گولی چلنے کی آواز آئی اور ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ تب تک میں سیڑھیوں تک پہنچ چکا تھا۔ اندر سے زنیرہ پستول تھامے دھمکی دیتی ہوئی نکلی۔ اس کے پیچھے خالہ نجو کھڑی چیخ رہی تھیں۔ میں نے زخمی پر قابو پا کر خالہ سے رسی لانے کو کہا۔ تبھی باہر سے دروازہ دھڑ دھڑایا گیا۔ محلے کے لوگ آ گئے تھے کچھ دیر بعد پولیس بھی پہنچ گئی۔ اسے پولیس کے حوالے کیا اور وہاں سے چل پڑا، ابھی گھر آیا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اسپتال سے بتایا گیا کہ فہیم مل گیا ہے۔ میں اسپتال پہنچا فہیم نے بتایا کہ کچھ لوگ اس پر بے پناہ تشدد کرتے تھے۔ اس کی ٹانگیں بھی کاٹ دی گئی تھیں۔ سیٹھ ستار الگ کالیا کو قتل کرنے پر تلا ہوا تھا کیونکہ وہ مجو کے قتل کا بدلہ لینا چاہ رہا تھا۔ استاد بھا بھا نے مشورہ دیا کہ خود کو چھپا کر رکھوں کیونکہ لیاری کا بچہ بچہ ٹی لے کر ہمیں ڈھونڈ رہا ہو گا ہم نے میک اپ کیا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچے تو اندر دشمن موجود تھے۔ ہم نے ان پر قابو پایا پھر اگلے روز جب اڈے پر پہنچا تو انور شاہ نے بتایا کہ حاجی مہران آیا تھا اور دھمکیاں دے کر گیا ہے۔ میں اپنے دوست فرقان کے دفتر میں جو بندرگاہ میں واقع ہے وہاں پہنچا تو بن رائد سے سامنا ہو گیا۔ اس کا پیچھا کرتا ہوا میں کنٹینروں کے درمیان پہنچا تو کسی نے مجھے مارنے کے لیے کنٹینر گرایا۔ میں تو بچ گیا مگر ایک دوسرا شخص دب کر ہلاک ہو گیا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہاں کئی پارٹیاں ہیں جو ایک دوسرے سے الجھ رہی ہیں۔ میں بن رائد کے جہاز کو ڈھونڈنے میں ناکام ہو کر سائیں داد کے ساتھ ساحل پر آ گیا تھا کہ وہ مجھے نظر آ گیا۔ میں اس کے تعاقب میں آگے بڑھ رہا تھا کہ اسے احساس ہو گیا۔ اس نے پستول نکالنا چاہا تھا کہ میں نے اس پر جست لگا دی مگر وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا، میں اور کالیا رانا بشیر کے ہاں پہنچے تو اسے شاہ میر کے

میوں نے کور کر رکھا تھا۔ ہم نے ان آدمیوں پر قابو پایا۔ رانا بشیر نے پولیس بلوالی۔ پولیس کے سامنے شاہ میر کے آدمیوں نے بیان دیا کہ وہ لوگ شاہ میر ہیں جانتا۔ ہم وہاں سے نکلے تو فوزیہ کا فون آ گیا کہ کچھ کرو۔ میں نے چاچا انور سے بات کی۔ انہوں نے فکرمندی کا انداز اختیار کیا اور اس سوچ میں پڑ گئے کہ انور شاہ ایسی کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔

(اب آگے پڑھیں)

تا دیر تک وہ سوچتے رہے تھے اور میری الجھی ہوئی سوالیہ نظریں جوں کی توں ان کے پُرسوچ چہرے پر جمی ہیں۔

”چلو برخوردار! چل کر دیکھتے ہیں۔ یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔“ وہ ایک دم بولے۔ صاف لگتا تھا کہ وہ کچھ بتانے سے اعتراض برت رہے تھے۔

”نہیں چاچا! مجھے بتاؤ پہلے کیا بات ہے وہ جو آپ کو فکرمند کیے ہوئے ہے۔ آخر کو مجھے بھی تو پتا چلے۔“ میں نے کہا تو وہ اپنا سر جھٹک کر ہنستے ہوئے بولے۔

”بڑے ضدی ہو بھتیجے! اچھا لو سنو۔“ کہتے ہوئے وہ ذرا لمحہ کو تھمے پھر سنجیدہ ہو کے بولے۔ ”بیٹا! کوئی ضروری نہیں کہ میری بات درست بھی ہو، نہ ہی میں تمہارا پہلے سے دل چھوٹا کرنا چاہ رہا ہوں، بس فقط یہی چاہتا ہوں کہ تصویر کے دوسرے رخ پر بھی نظر رکھنی چاہیے، میرا مطلب یہ تھا کہ عطا محمد انکار بھی کر سکتا ہے کیونکہ یہ لوگ اپنے خاندان کے سواء باہر رشتہ نہیں کرتے اور بالخصوص لڑکی کے معاملے میں تو بالکل بھی نہیں، اتنی سی بات تھی۔“

چاچا انور شاہ یہ کہنے کے بعد میرا چہرہ تکنے لگے۔ میں بھی ہونٹ بھینچے سوچتا بن گیا۔ میری پیشانی پر لاتعداد سلوٹیں ابھر آئی تھیں۔

”وہی ہوا نا جس کا مجھے پہلے سے ڈر تھا۔“ مجھے پریشان اور ژولیدہ خاطر دیکھ کر وہ بولے۔ ”ارے بھائی چل کر بات کر لیتے ہیں، تم نے تو ابھی سے ہی منہ لٹکا لیا۔“

”ہاں، چاچا! فوزیہ کا رشتہ تو مانگنے ضرور ہی جائیں گے، پھر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔“ بالآخر میں نے کہا۔

”بس تو پھر میں ابھی کچھ دیر بعد عطا صاحب کو فون کر کے ان سے وقت لے لیتا ہوں۔ آج ملنے کا وہ کہہ دیتے ہیں تو پھر میں آج شام کو تمہاری طرف آ جاؤں گا۔ تم اور عاصمہ بٹی تیار رہنا۔ وہیں سے نکل چلیں گے۔“

یہی پروگرام طے پایا۔ تھوڑی دیر بعد چاچا انور شاہ نے مجھے بتایا کہ عطا صاحب نے آج شام ہی کو وقت دے دیا ہے۔

میں نے خوشی خوشی عاصمہ کو یہ بتایا کہ چاچا انور شاہ نے عطا محمد صاحب سے ملاقات کا وقت لے لیا ہے۔ اس لیے وہ بھی اپنی سی تیاری کر رکھے تو وہ ہنستے ہوئے مذاقاً بولی۔

”بھائی جان! آپ تو ایسے خوش ہو رہے ہیں کہ عطا صاحب نے اپنی بٹی اور ہماری ہونے والی بھابی کا رشتہ دینے کی ہامی بھر لی ہے۔“

”ارے میری پیاری بہنا! اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔ ہامی بھی وہ ضرور بھر لیں گے، بھلا وہ انکار کیوں کریں گے؟“ میں نے اسی لہجے میں کہا۔

”ضرور...... ضرور بھائی جان! کیوں نہیں، بھلا ہمارے بھیا جانی میں کیا کمی ہے، پورے شہزادہ گلفام ہیں۔“ عاصمہ فخر و انبساط سے بولی۔

اچانک دروازے کے باہر گاڑی رکنے کی آواز ابھری۔ ہم دونوں ہی چونکے۔ میرا دل یکبارگی زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے عاصمہ کو کمرے میں ہی موجود رہنے کی تاکید کرتے ہوئے خود کمرے سے نکل کر صحن میں آیا ہی تھا کہ کسی نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

”آ رہا ہوں بھائی! کیا دروازہ توڑ دو گے؟“ میں نے اندر سے ہی بہ آواز بلند کہا اور قریب پہنچ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے نظر پڑی تو چونک گیا۔ باہر پولیس کی موبائل کھڑی تھی جس کے گرد پانچ چھ پولیس والے کھڑے تھے۔ ایک انسپکٹر کی وردی میں اور دو اس کے اسسٹنٹ دروازے پر موجود میری طرف خشمگیں نظروں کے ساتھ گھور رہے تھے۔

”کیا بات ہے بھئی؟ کیا ہوا ہے؟“ میں نے بلاخوف و خطر کہا کیونکہ محلے کے چند اور لوگ بھی آس پاس کھڑے میں نے دیکھے تھے اسی لیے کسی قسم کے ڈر و خوف کے بغیر میں نے انسپکٹر کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

”تمہیں مسٹر شاہ میر کے بیٹے ثمیر کے اغوا کے جرم میں گرفتار کیا جاتا ہے۔“ کہتے ہوئے انسپکٹر نے اپنے ساتھ کھڑے ہوئے دونوں اسسٹنٹس کو مخصوص اشارہ کیا۔ ایک

کے ہاتھوں میں ہتھکڑی جھولتی ہوئی میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔
ان میں سے ایک میری طرف بڑھا۔ میں نے احتجاجاً برہمی سے کہا۔ ''یہ جھوٹا الزام ہے مجھ پر، آپ کے پاس کیا ثبوت ہے، وارنٹ ہے آپ کے پاس؟''
اس نے ایک پرچہ اپنی چیسٹ پاکٹ سے نکال کر میری آنکھوں کے سامنے لہرایا اور کہا۔ ''یہ رہا وارنٹ غور سے دیکھ لو۔'' اس کی آنکھوں میں طنزیہ کاٹ کے علاوہ خشونت بھی رقصاں تھی۔
وارنٹ ایف سی ایم کا جاری کردہ تھا۔ قصہ کھلا کہ شاہ میر کی مدعیت میں اس کی بیوی لیلیٰ نے میرے خلاف اپنے بیٹے کے اغوا کی ایف آئی آر کٹوادی تھی کیونکہ شاہ میر ملک سے باہر تھا۔ الزام یہ بھی تھا کہ میں نے بھاری زرِ تاوان طلب کرنے کے لیے ثمیر کا اغوا کیا تھا۔ مکار اور شاطر شاہ میر اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتا تھا کیونکہ یہ کہنے سے تو وہ قاصر ہی تھا کہ اس کے بیٹے کے اغوا کے پس پردہ خود اسی کے ہی کالے اور ظالمانہ کرتوت کارفرما تھے۔
تاہم مجھے شاہ میر سے اس بات کی توقع نہ تھی کہ وہ اس طرح میرے خلاف پولیس کارروائی عمل میں لانے کی ہمت کرے گا یا پھر ہوسکتا ہے رانا بشر کی بیٹی اس کے قبضے میں تھی اور اسی بات پر اسے یہ تسلی ہو کہ ہم بھی اس کے بیٹے ثمیر کا کچھ نہیں بگاڑ پائیں گے۔
اگرچہ جوا تو اس نے خطرناک ہی کھیلا تھا تاہم وہ میری خطرناکی سے ابھی شاید واقف نہ تھا۔ تبھی اس نے ایسی دیدہ دلیری دکھائی تھی۔ ایسے میں مجھے اس بات پر پچھتاوا ہونے لگا کہ جو کام شاہ میر نے کیا ہے وہی کام رانا بشیر کو کرنا چاہیے تھا لیکن اس میں کئی قباحتیں بھی تھیں۔ ثمیر ہمارے نرغے میں تھا۔
میں یہی چاہتا تھا کہ شاہ میر کو ابھی قانون کے شکنجے میں پھانسنا پیش از وقت ہوگا۔ ابھی اس سے اسی کے انداز میں جنگ کی جائے اور خاطر خواہ جواب دیا جائے لیکن اس نے بزدلانہ کارروائی کی تھی اور پولیس کو میرے پیچھے لگا دیا تھا۔
میں نے اپنی گرفتاری پیش کرنے سے پہلے تھوڑی مہلت چاہی اور مجھے صرف دو منٹوں کی مہلت دی گئی اور پھر میں نے جلدی سے اندر آکر عاصمہ کو تسلی دیتے ہوئے بتایا کہ وہ اس کی اطلاع فوراً کالیا اور ایڈووکیٹ زنیرہ کو کردے۔ وہ بے چاری حیران و پریشان میرا چہرہ تکتی رہ گئی
اور میں پلٹ کر واپس دروازے پر آگیا اور اپنی گرفتاری دے دی۔
محلے کے سبھی لوگ ہونٹوں پر انگلیاں دبائے مجھے پولیس موبائل میں سوار ہوتا دیکھ رہے تھے۔
بہر طور مجھے ہتھکڑیاں پہنا کر تھانے لایا گیا اور لاک اپ کردیا گیا۔ اس کے گھنٹے بھر بعد ہی ایڈووکیٹ زنیرہ بھی متعلقہ تھانے آن پہنچی۔
اس نے میرا وکیل ہونے کے دعوٰی کے ساتھ اپنا تعارف بھی کروادیا۔ انسپکٹر کا نام رجب دین تھا۔ اس نے زنیرہ کو مجھ سے ملاقات کی اجازت دے دی۔
''یہ کیا نیا کھڑاگ پال لیا ہے تم نے نومی؟'' اس نے لاک اپ کے سلاخ دار دروازے کے قریب آکر نیچی آواز میں مجھ سے کہا تو میں بولا۔
''یہ نیا نہیں پرانا ہی کھڑاگ ہے۔''
''کیا مطلب؟'' وہ سوالیہ نگاہوں سے میرا چہرہ تکنے لگی۔ میں نے اسے مختصراً لفظوں میں بتا دیا۔ کچھ حقیقتیں وہ پہلے بھی جانتی تھی۔ تاہم بولی۔
''جب تمہیں اپنی فطرت کا پتا ہے کہ تم ایسی ظالمانہ حرکت نہیں کرسکتے تو پھر ثمیر کو کیوں یرغمال بنا رکھا ہے؟''
''فرحانہ کی وجہ سے۔''
''فرحانہ تمہاری کیا لگتی ہے؟''
''کچھ بھی نہیں۔''
''پھر؟''
''پھر یہ کہ رانا بشیر اب ہمارا باس ہے۔''
''کیا؟'' وہ میری بات سن کر بری طرح چونکی پھر آخر میں جھلا کر بولی۔ ''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔''
''وقت کی نئی چال تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتی ایڈووکیٹ زنیرہ صاحبہ!'' میں نے عجیب سے لہجے میں کہا اور وہ حیرت سے گنگ نگاہوں کے ساتھ میری صورت تکتی رہ گئی۔
''ی ی...... تم آج کیسی باتیں کر رہے ہو نومی؟ مجھے خوف آرہا ہے تم سے۔''
میں تلخی سے ہنسا اور بولا۔ ''تمہیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میری ضمانت کرواسکتی ہو تو ٹھیک، ورنہ تم خود کو ہلکان مت کرو، میری خاطر۔''
''کیا ہوگیا ہے تمہیں نومی؟ تم کیا بننا چاہ رہے ہو؟''

''کھولتا ہوا آتش فشاں جس کے اندر ایک جوالہ مکھی رہتا ہے۔'' میں نے کہا۔ یہ کہتے ہوئے میری آنکھوں میں نفرت و غیض کے شعلے بھڑکنے لگے۔ ''دشمن اپنے اثر و رسوخ اور دولت کے بل بوتے پر مجھے تباہ کرنے کے درپے ہے تو میں کیوں نہ اپنا بندوبست کروں۔ میں بھی انہیں انہی کے ہتھیار سے اب جواب دوں گا۔''
''نومی! خدا کے لیے اپنا نہیں تو اپنی جوان بہن اور معذور بھائی کا ہی خیال کرلو۔ کون ہے ان غریبوں کا تمہارے سوا؟ جواب دو مجھے۔'' زنیرہ نے میری دُکھتی رگ کو چھیڑ دیا۔
میں جو بڑا جوش دکھا رہا تھا ایک دم گھٹ کر رہ گیا۔ فہیم کی معذوری اور عاصمہ کی ہونے والی شادی نے مجھے ایک دم جیسے گھٹنوں کے بل جھکا کر رکھ دیا تھا۔ میں جو تھوڑی دیر پہلے ہی زنیرہ کے سامنے ایک تن آور درخت کی طرح تنا کھڑا تھا۔ یک دم ڈھے سا گیا۔ مجھے اپنی ٹانگوں میں ہلکی ہلکی سی محسوس ہونے لگی اور میں نے سلاخوں کو ہی سہارے کے لیے پکڑ لیا۔ یوں میرا سر بھی ان بے رحم فولادی سلاخوں کے ساتھ ٹک کر رہ گیا۔ یہ سلاخیں میری مجبوریوں سے زیادہ سخت نہ تھیں۔
''بس! ہوا ہوگیا ناں سارا جوش تمہارا میں نہ کہتی تھی کہ تم اس قبیل کے انسان نہیں ہو۔'' زنیرہ نے میری ہیت کذائی کو جیسے اندر کی آنکھ سے محسوس کرکے ہولے سے کہا۔
''یہ کشت و خون اور وحشت و سنگ کا ہولناک کھیل تمہارا وتیرہ نہیں ہے نومی! میں تمہیں بے حوصلہ کرنے ہرگز نہیں آئی بلکہ تمہیں یہ بتانے آئی ہوں کہ اس قسم کے طوفانوں سے طوفان بن کر مقابلہ نہیں کیا جاتا بلکہ بادبان بن کر مقابلہ کیا جاتا ہے اور یہی بہترین راستہ ہوتا ہے۔''
''میں نے بادبان بن کر بھی ایسے حالات کا مقابلہ کیا ہے زنیرہ لیکن جہاں طوفان بننے کی ضرورت پیش آتی ہے وہاں اس ضرورت سے پیچھے بھی نہیں ہٹا جاتا۔'' میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''میں قانون کی ابھی بھول بھلیوں میں ہی سر کھپا رہا ہوتا ہوں ادھر میرے دشمن غیر قانونی انداز میں ایک زقند بھر کر مجھے ناقابلِ تلافی نقصان سے دوچار کرڈالتے ہیں۔ اپنے بھائی فہیم پر شاہ میر جیسے درندہ صفت انسان کا ستم ہائے سوزاں میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔''
''مائی گاڈ! تو کیا تم نے...... ثمیر کے ساتھ بھی؟'' وہ خوف سے بولی۔
''کاش! میں ایسا کرسکتا۔'' میں نے ہولے سے کہا۔
''اسے یرغمال بنانے کا میرا مقصد بھی یہی تھا مگر میں نہ کوشش کے باوجود یہ ہولناک کھیل ایک جیتے جاگتے انسان کے ساتھ نہیں کھیل سکا۔''
''شکر ہے اللہ!'' بے اختیار زنیرہ کے منہ سے دعائیہ کلمات نکلے تھے۔
''لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اپنے بھائی کا انتقام فراموش کر جاؤں گا۔ میں شاہ میر سے اس کا بدلہ ضرور لوں گا۔'' میری آنکھوں سے ایکا ایکی آتشِ انتقام کے شعلے پھوٹنے لگے۔
''ضرور لوگے انتقام بلکہ اسے تو بہت سا حساب چکتا کرنا ہوگا۔'' وہ بولی۔
''اچھا! میں تمہاری ضمانت کی کوشش کرتی ہوں مگر یہ بتاؤ پہلے کہ تم نے اس سلسلے میں پولیس کو کیا بیان دیا ہے؟''
''ابھی کوئی بیان نہیں دیا ہے۔'' میں نے جواباً ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ ایک پولیس والا فرش پر ڈنڈا بجاتا ہوا آیا اور زنیرہ سے بولا۔
''چلیں جی! وکیلہ صاحبہ! ملاقات کا وقت ختم ہوا۔ ملزم کا بیان لکھوانے کے لیے صاحب کے کمرے میں لے جانا ہے اسے۔''
زنیرہ وہاں سے چلی گئی۔ میں یہی سمجھا تھا لیکن ایسا نہیں تھا۔ جب مجھے مذکورہ کانسٹیبل انسپکٹر رجب دین کے کمرے میں لایا گیا۔ تو میں نے زنیرہ کو اس کی میز کے سامنے والی کرسی پر براجمان پایا تھا۔
''آپ جاسکتی ہیں اب میں نے اس کا بیان لینا ہے۔'' انسپکٹر رجب دین نے اکھڑے لہجے میں زنیرہ سے کہا اور اپنی میز پر دھرا سیاہ رنگ کا رول اٹھا کر ہاتھ میں پکڑ لیا پھر اس نے کرسی بھی چھوڑ دی مگر وہ اپنی جگہ ہی کھڑا رہا تھا۔ اس کا رول دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر تھپکیاں دے رہا تھا جیسے وہ کچھ کرنے کے لیے بے چین ہو۔
زنیرہ اس کی بات سن کر اپنی جگہ سے اٹھی اور انسپکٹر سے مخاطب ہوکر بولی۔ ''انسپکٹر صاحب! آپ بے شک اپنی ضابطے کی کارروائی پوری کریں لیکن ایک بات کا دھیان رہے کہ یہ میرا موکل ہے اور پولیس میں اس کا ریکارڈ بھی ایسا ہے کہ قانون کی نظروں میں اسے بہت سی رعایتیں حاصل ہیں اس لیے کوئی قانون کے پردے کی آڑ میں اس کے ساتھ کوئی غیر قانونی یا ماورائے قانون کچھ نہیں ہونا

چاہیے۔''

زنیرہ ڈھکے چھپے الفاظ میں انسپکٹر رجب دین کو یہ دھمکی دے کر وہاں سے چلی گئی، تاہم مجھے دوبارہ آنے کا کہہ گئی تھی وہ۔

زنیرہ کے جاتے ہی انسپکٹر رجب دین بڑے غور اور کرخت سی نظروں سے میرے چہرے کو گھورنے لگا۔

مجھے گھر سے ہتھکڑیاں لگا کر یہاں لانے تک انسپکٹر رجب دین کے تیور کچھ کم خطرناک نظر نہیں آتے تھے، ایسا لگتا تھا جیسے وہ مجھ پر بری طرح ادھار کھائے بیٹھا ہو اور تھانے پہنچنے کے بعد وہ میرے ساتھ سختی سے پیش آسکتا تھا اور ہر وہ حربہ استعمال کرنا جائز سمجھے گا جس کی مثالیں ماورائے قانون تشدد اور پولیس گردی میں خاصی روشن ہیں۔

لیکن اب ایڈووکیٹ زنیرہ کے یہاں آنے اور پھر انسپکٹر رجب دین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے یہ جتانے کے بعد کہ میں کوئی لاوارث انسان نہیں ہوں اور نہ ہی کوئی ایسا بے نام آدمی ہوں جس پر تھانے کی چہار دیواری کے اندر رائج خودساختہ قانون کی حکمرانی کا اطلاق ہوتا ہو جن پر تفتیش کے نام پر اور مرضی کے بیان پر دستخط کرنے پر مجبور کرنے کے لیے انسانیت سوز تشدد کرنے پر کوئی عار نہیں سمجھا جاتا۔

کم از کم مجھے تو ایسا ہی نظر آرہا تھا کیونکہ اب اس بہ ظاہر وردی پوش قانون کے رکھوالے کے غبارے سے مجھے ہوا نکلتی محسوس ہورہی تھی اور اس کے چہرے سے پہلے والی خالص کرختگی اور بے رحمی میں وہ ابال نظر نہیں آتا تھا جو مجھے یہاں لانے اور لاک اپ کرنے تک عروج پر پہنچا ہوا تھا۔ خالص کا لفظ میں نے اسی لیے استعمال کیا کہ اب وہاں بے بسی اور جھنجلاہٹ کی کیفیات مدغم ہوتی دکھائی دیتی تھیں۔ وگرنہ کیا بعید تھا کہ یہ بھی انسپکٹر دلاور جیسا درندہ صفت انسان ثابت ہوسکتا تھا میرے لیے۔

انسپکٹر دلاور ..... کی یاد آتے ہی میرے وجود میں آج بھی پھریری سی دوڑ جاتی تھی۔ یہ نہیں کہ میں اس سے خوف زدہ ہوں، بات یہ بھی نہیں تھی کہ میں کوئی تیس مارخاں ہوں۔ گوشت پوشت کا عام سا انسان ہوں میں بھی، ظلم کی مار سے میرا دل بھی دہل سکتا ہے۔

وہ منظر مجھے نہیں بھولتا تھا جب میں پہلی بار پولیس گردی کا شکار ہوا تھا اور اس ''راتب خور'' پولیس افسر انسپکٹر دلاور نے مجھ پر بہیمانہ اور انسانیت سوز تشدد کے پہا[ڑ] ڈالے تھے۔ یہاں تک کہ اس خبیث نے مجھے اپنے قد[موں] پر جھکنے اور معافی مانگنے پر مجبور کردیا تھا لیکن اس کے بعد [میں] نے بھی اس سے گن گن کر بدلے لیے تھے۔ اس کی ا[ن] اتروائی عدالت کے ذریعے کوارٹر گھاٹ کروایا۔ جو ہا[تھ] اس کی نوکری کے ہمیشہ کے لیے خاتمے پر منتج ہوا۔ اس [کی] ریٹائرمنٹ ماری گئی، گریجویٹی اور پنشن انتہائی لوور گریڈ [میں] جاری رہ سکی تھی اور جب تک اپ گریڈ کی بجائے ڈی [گریڈ] تک کی پنشن اسے ملتی رہے گی وہ مجھے نہیں بھولے گا او[ر نہ] میں اسے۔

اب شاید یہ نیا انسپکٹر رجب دین، دلاور کا پرتو بننے [کی] کوشش میں نظر آتا تھا۔ یقیناً شاہ میر کا خریدا ہوا ہوسکتا تھا۔

سیٹھ ستار کے مقابلے میں شاہ میر میرا کئی گنا زیا[دہ] طاقت ور اور پاور فل دشمن تھا۔ سیٹھ ستار جیسے مہرے تو شا[ہ] میر جیسے بگ ڈان کی جیب میں جانے کتنے ہوں گے۔ تو [کیا] یہ انسپکٹر رجب دین بھی میرے لیے دلاور سے زیادہ سفاک اور درندہ صفت ثابت ہونے والا تھا؟

یہ سوچ کر ہلکی سی تھرتھراہٹ میرے دل میں ہوئی ضرور تھی لیکن زنیرہ کی آمد اور اس کی ڈھکے چھپے لفظوں میں انسپکٹر کو باور کرا کے اسی شان بے نیازی سے لوٹ جانے [سے] مجھے بھی حوصلہ ہوا تھا اور میں نے اپنے چہرے پر دانستہ انداز کی خوداعتمادی سجالی تھی۔

''انسپکٹر دلاور کو جانتے ہو ناں؟''

اچانک انسپکٹر رجب دین کی کھرکھراتی آواز میری سماعتوں میں گونجی اور میرے حلق میں ایک گولہ سا پھنسنے لگا۔ اس کے ایک ہی جملے نے جیسے میری خوداعتمادی ہوا کردی۔ اپنے پٹے بند بھائی کا ذکر کرنے کی ضرورت اسے میرے سامنے کیوں پیش آئی تھی، یہ اس بات کی کھلی دھمکی تھی کہ وہ اس کا انتقام بھی مجھ سے لینے کے لیے پرتولے ہوئے تھا۔

''ہاں!'' میں نے فوراً جواب دیا۔ تاخیر کی صورت میں کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ میں خوف زدہ ہوگیا ہوں۔ ''بہت اچھی طرح یاد ہے مجھے یہ نام کیا وہ آپ کے کوئی دور یا قریب کے رشتے دار لگتے تھے؟''

میں نے آخر میں پوچھ لیا۔ انداز میرا بظاہر لاپروانہ ہی تھا۔

انسپکٹر رجب دین نے اپنی ہتھیلی پر تھپکی دیتا ہوا سیاہ رول ایک دم روک دیا اور اپنی کرسی ذرا پیچھے دھکیل کر مجھے [گھورتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر وہ میرے طرف آنے کے لیے] جانے کے لیے گھورتا ہوا چھوٹے چھوٹے قدم [اٹھاتا میرے] قریب آن کھڑا ہوا اور پھر اپنا بدہیئت چہرہ [میرے] بالکل قریب کرتے ہوئے ڈرامائی انداز میں [بولا ''وہ مے]را چچیرا بھائی ہے وہ اور میرا سالا بھی لگتا ہے، میرا [بہنوئی] بھی۔''

[ا]س نے ایک کے بعد دیگرے اس خبیث ..... کے ساتھ اپنے رشتے جوڑ دیے اور میرے حوصلے اور [ہمت] کی دیوار پر ایک بار پھر دراڑیں پڑتی محسوس ہونے لگیں [اور می]ں حیران تھا کہ ان ساری باتوں اور کڑے حقائق کے [باوجو]د میرے اندر ایسی کون سی طاقت قدرتی طور پر پیدا [ہورہ]ی کہ میرے منہ سے ادا ہونے والے الفاظ میرے [اندر] کی چھپی ہوئی مخدوش کیفیات کے برعکس ہی برآمد [ہورہ]ے تھے جن میں کوٹ کوٹ کر بے خوفی بھری ہوئی تھی۔ [تھ]وڑی سی حیرت ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ ''اوہ اچھا!'' میرے اس ایک لفظ نے شاید اسے ہتھے سے اکھاڑ دیا تھا [و]ہ کسی خار کھائے جنگلی بھینسے کی طرح ہانپنے لگا۔ اس کا [چہر]ے سے لال بھبوکا ہوگیا تھا۔ میرے طمانیت بھرے ایک جملے نے اس کے لیے شاید جلتی پر تیلی کا کام کیا [تھا]۔

تب ہی اچانک میرا دل ایک موہوم سے خدشے تلے [ایک] سا لرزا۔

اگر اس کے معزول انسپکٹر دلاور کے ساتھ اتنے [گہ]رے رشتے تھے تو یقیناً یہ بھی جانتا ہی ہوگا کہ ایسا [میر]ی اور زنیرہ کی وجہ سے ہی ہوا تھا تو پھر اسے تو پہلے ہی مجھ [سے محت]اط ہوجانا چاہیے تھا۔ تو کیا یہ میری محض خوش فہمی تھی کہ [زنیر]ہ کی یہاں آمد کا مقصد میرے لیے یا انسپکٹر رجب دین [کے] لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا؟

وہ ایک دم سانپ کی سی پھنکار مارتا ہوا پیچھے کی طرف [ہٹ] گیا اور صرف دو قدم کے بعد پھر میری طرف مڑ گیا۔ [پھ]ر اس کی شکل دیکھ کر میرے اندر کچھ ہلتا محسوس ہوا۔ [اس] کی آنکھیں شعلہ بار ہورہی تھیں اور چہرہ سرخ۔ ''لیکن تم [نہیں] جانتے کہ دلاور اب کس حال میں ہے۔'' وہ پھر ایک [ایک] لفظ گویا غیظ تلے چبا کر بولا۔

''مجھے جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' میں نے [ق]درتی طاقت کے بل بوتے پر فوراً کہا۔ میری آنکھیں [ہ]نوز اس کی شعلہ برساتی آنکھوں میں گڑی ہوئی تھیں۔

''اس شخص نے اپنی وردی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے قانون کی دھجیاں بکھیرنے کی کوشش چاہی تھی اور اسے اسی بات کی سزا ملی تھی، وہ طاقت کے نشے میں یہ بھول گیا تھا کہ خدا کی بے آواز لاٹھی بھی ایک دن حرکت میں آتی ہے۔''

''تمہیں یہاں درس دینے کے لیے نہیں لایا گیا ہے مسٹر نعمان احمد!'' انسپکٹر رجب دین نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں مجھے گھور کر کہا۔ ''میں تمہیں یہ بتانے والا ہوں کہ دلاور اس وقت سے کوما کی حالت میں پڑا ہے جب سے اس کی تباہی کے تم ذمہ دار بنے، معزولی اور سب کچھ چھن جانے کی صورت میں اسے شدید ڈپریشن ہوگیا تھا جو برین ہیمرج کا سبب بنا۔ بس، وہ اب ایک زندہ لاش کی مثل گھر میں بستر پر پڑا رہتا ہے۔ ایک میل نرس اس کی تیمارداری میں مقرر ہے۔ اس کے بال بچوں کی ذمہ داری میرے کاندھوں پر آن پڑی ہے۔ اس لیے کہ اس کی بیوی میری بہن ہے اور اس کی بہن میری بیوی۔''

انسپکٹر رجب دین یہ سب بتانے کے بعد رکا۔ اس کی سانسوں کا تموج اور خوب گٹھے ہوئے سینے پر وردی والی شرٹ خاصی ٹائٹ ہورہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ سابقہ ایس ایچ او دلاور کے ساتھ اپنے کثیرالاعنوان رشتوں کی فہرست اور اس کی موجودہ ہیئت کذائی کا بیان کیوں دے رہا تھا۔ صاف مطلب تھا اس بات کا کہ وہ مجھ پر ایک نفسیاتی خوف طاری کرنا چاہ رہا تھا کہ اب میں اسی کے (دلاور) کے ساتھی بلکہ قریبی رشتے دار پولیس افسر کے ہتھے چڑھ چکا ہوں اور اب میری خیر نہیں ہے لیکن میں دانستہ بےپروائی کا مظاہرہ کیے جارہا تھا، جیسے مجھے اس کے ''مقصد'' کا اندازہ ہی نہ تھا۔ ازراہِ تاسف بولا۔

''اوہو سن کر بے حد دکھ ہوا۔ کاش کہ تمہارا یہ بدنصیب بھائی (چچازاد)، سالا اور بہنوئی دلاور، مکافاتِ عمل کو یاد رکھتے ہوئے اپنی زندگی صراطِ مستقیم کے تحت گزارتا۔ میں اللہ سے اس کے لیے دعا ہی مانگ سکتا ہوں کہ اگر وہ دنیا میں ہی اپنے کالے کرتوتوں کی سزا بھگت رہا ہے تو آخرت میں اس کی بخشش ہوجائے۔''

''تڑاخ!''

ڈنڈا بجنے کی ایک زوردار آواز ابھری، فطری ردِعمل کے طور پر میرا بدن لمحہ بھر کو کانپ گیا۔ بالآخر انسپکٹر رجب دین کو میرا پُرطمانیت اندازِ گفتگو اور بار بار اسے یہ باور کروانا کہ اس کا کثیرالاعنوان رشتے کا بھائی دلاور کتنا شریف آدمی

تھا، نیز یہ کہ وہ اب جو کچھ بھگت رہا تھا اپنے کیے کی سزا ہی بھگت رہا تھا۔ اس نے رجب دین کو بتھے سے ہی اکھاڑ ڈالا تھا۔ جس سبب اس نے اپنا طیش مجھ پر نکالنے کی بجائے اپنی میز کی سطح پر اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سیاہ موٹے رول کو زور سے مار کر نکالا تھا۔

"تمہاری ساری خوش فہمیاں ناک کے راستے نکال پھینکوں گا نعمان احمد!" انسپکٹر رجب دین بھنّائے ہوئے لہجے میں بولا۔ غصے اور شدتِ غیض تلے وہ پھر ہانپنے لگا تھا۔ حرام خوری اور بے گناہوں پر تشدد کرتے کرتے قدرت نے اسے اعصابی مریض بنا کر رکھ دیا تھا۔

"وہ دلاور تھا یہ میں ہوں، انسپکٹر رجب دین سمجھے تم۔ میں تمہارا حشر نشر کر کے رکھ دوں گا اور دلاور کا بدلہ اور انتقام تم سے ہی، گن گن کر لوں گا۔"

"تو آپ اپنی وردی اور اس چہار دیواری کو جو انصاف کے نام پر قائم کی گئی ہے۔ اپنے ذاتی انتقام اور عناد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں انسپکٹر صاحب؟" میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ پھر تمہارا حشر بھی دلاور جیسا ہی ہو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر بھیانک ہو۔"

میری اس دیدہ دلیری پر انسپکٹر رجب دین کی ایک لمحہ کو آنکھیں پھیل گئیں۔ ان میں غیض آلود حیرت بھی تھی اور نفرت و انتقام کی تپش بھی۔ اپنے غرور کی بکھرتی دھجیاں سمیٹتے ہوئے اس نے بالآخر اپنے اندر کا بغض اور کینہ نکال ہی دیا تھا اور اپنے وہ جارحانہ عزائم بھی جو ذاتی عناد کا منہ بولتا ثبوت بھی پیش کرتے تھے، ظاہر کر دیے تھے۔

"تمہارے بھائی دلاور کو بھی یہی نشہ تھا، طاقت اور وردی کا نشہ۔ پشت پناہی کا زعم اور چور دروازے سے ملنے والا راتب لیکن کیا ہوا اس کا حشر تم نے ہی نہیں بلکہ دنیا نے بھی دیکھ لیا۔" میری زبان رکنے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ "مگر صد ہائے افسوس کہ بجائے اس سے عبرت پکڑنے کے۔"

"بند کرو اپنی بکواس!" وہ ایک بار پھر غصے سے دہاڑا، اب کے وہ آپے سے ہی باہر ہونے لگا تھا۔

اسی وقت مجھے لانے والے دو سپاہیوں میں سے ایک نے آگے بڑھ کر میز پر دھرے ..... پانی سے بھرے جگ سے ایک گلاس میں پانی انڈیلا اور رجب دین کے کان میں کچھ کھسر پسر کرنے کے بعد اسے تھما دیا۔

رجب دین نے پانی کے چند گھونٹ بھرے اور پھر اسی طرح ادھ بھرا گلاس ہاتھ میں تھامے ہوئے وہ اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا اور باقی ماندہ پانی بھی غٹاغٹ چڑھا گیا پھر گلاس میز پر رکھتے ہوئے میری جانب گھورتے رہنے کے دوران اس نے چند گہری گہری سانسیں لیں اور پھر میں بولا تو اس کے لب و لہجے میں حیرت انگیز تحمل پایا جاتا تھا۔ شاید اس کے "سپاہی" نے کان میں کچھ ایسا ہی کہا تھا کہ وہ خود طیش میں آ کر اتنا مت کھولے کہ بعد میں لینے کے دینے پڑ جائیں کیونکہ "بندہ" (یعنی میں) نیا نہیں ہے۔

"میں تم سے دو ٹوک بات کروں گا، ثمیر کا پتا بتا دو۔ میں بات آگے نہیں لے جاؤں گا اور معاملہ ادھر ہی رفع دفع کر دوں گا۔"

"دھونس دھمکیوں کے بعد وہ لولی پاپ دے کر مجھے بے وقوف بنانا چاہتا تھا۔"

"آپ کا بہت شکریہ انسپکٹر صاحب! میں آپ کی اس رعایت کی قدر کرنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے کہا۔ "دو ٹوک بات یہی ہے کہ مجھے ثمیر کا کچھ اتا پتا نہیں ہے، نہ ہی یہ کہ میں اسے اغوا یا یرغمال بنا رکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب معاملہ یہیں رفع دفع ہو جانا چاہیے۔"

وہ کہتے ہیں ناں! بہ قول شاعر مصیبتیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہو گئیں۔

انسان کے دکھ اور درد، پریشانیاں اور مصیبتیں بڑھ جائیں تو وہ خوامخواہ بھی ہنستا اور قہقہے لگاتا ہے۔ اندر کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ میری طبیعت بھی اس وقت بذلہ سنجی پر آمادہ ہو رہی تھی۔

میں نے دیکھا رجب کے چہرے کی مانند پڑتی سرخی دوبارہ گہری ہونے لگی لیکن اس نے فوراً قابو پا لیا۔ بولا "دیکھو! میرے ساتھ یہ مذاق اور تمہارا اس طرح بولنے کا انداز بہت مہنگا پڑ سکتا ہے تمہیں لیکن پھر بھی تمہارا یہی موڈ برقرار رہا تو مجھے سختی سے پیش آنا پڑے گا۔"

اس سے پہلے کہ میری پھر سے رگِ ظرافت پھڑکتی فون بجنے کی بیل ابھری۔ میز پر ایک ٹیلی فون سیٹ موجود تھا مگر بیل موبائل فون کی تھی، جسے انسپکٹر رجب نے اپنی چیسٹ پاکٹ سے نکال کر کان میں لگا لیا۔

"ہیلو! جی جی جناب! میں ابھی آپ سے بات کرتا ہوں۔" کہتے ہوئے وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر ایک دوسرے ملحقہ کمرے میں چلا گیا۔ میں اندر سے کھٹک گیا۔ یہ فون کال

ہ میر کی بھی ہو سکتی تھی۔ میری موجودگی کے سبب وہ یہاں ے سامنے اس سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ کیا شک رہ گیا اس میں کہ شاہ میر بھی انسپکٹر رجب دین کا راتب نواز بن تھا۔ اگرچہ اس میں خود رجب دین کا دلاور کے حوالے ے انتقام کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔

اس نے مجھے دباؤ میں لانے کے لیے دلاور کا ذکر کیا لیکن جب اس نے دیکھا کہ میں اس بات کو خاطر میں نہیں لایا تو اس نے پٹڑی بدل لی۔ ہو سکتا تھا کہ اسے پچھتاوا بھی ہو رہا ہو کہ ابھی اتنی جلدی خود کو میرے سامنے کھولنا پیش از وقت ہی تھا۔

میں خاموش مگر یہی سوچتا کھڑا اس کی واپسی کا بھی منتظر رہا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ بیس منٹ بعد دوسرے کمرے سے واپس لوٹا، سیل ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ اس نے اندر آتے ہی جیب میں رکھنے کی بجائے میز پر رکھ دیا اور میری طرف چند قدم بڑھا کر بولا۔

"اپنے دوست کالیا کا پتا بتاؤ، وہ اس وقت کہاں ملے گا؟"

میں اس کی بات پر چونکا۔ اسے کالیا کا کیسے پتا چلا؟ تو شاید شاہ میر کو بھی معلوم نہ ہو مگر یہ پتا چلا اس کے لیے کیا مشکل تھا۔

"میرا اس نام کا تو کوئی دوست نہیں ہے۔" میں نے جھوٹ بولا۔

"تم مسلسل جھوٹ بولے جا رہے ہو۔" انسپکٹر رجب دین غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔ "کالیا کا اتا پتا چلانا میرے لیے مشکل نہیں، میں ابھی تمہیں کچھ نہیں کہہ رہا ہوں مگر تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ میرے ساتھ تعاون کرو، بصورت دیگر میں نے اپنے طور پر اگر ثمیر کو برآمد کر لیا تو تمہیں لمبے مقدمے میں پھنسا دوں گا۔"

وہ اتنا کہہ کر رکا اور واپس پلٹ کر اپنی کرسی پر جا بیٹھا اور میری طرف دیکھ کر آخر میں بولا۔ اس کے لہجے میں بڑی خطرناک دھمکی پوشیدہ تھی۔

"کالیا آ جائے تو ایک ہی بار تم دونوں سے سارا کچھ اگلوا لیتا ہوں اچھی طرح۔"

"لے جاؤ اسے لاک اپ میں!" آخری الفاظ اس نے سپاہیوں کی طرف دیکھ کر ادا کیے تھے۔

میں ایک بار پھر لاک اپ میں تھا۔ انسپکٹر رجب دین کی آخری بات نے مجھے واقعی تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔

اگر وہ ثمیر کو ہمارے قبضے سے برآمد کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو واقعی میں لمبے عرصے کے لیے نہ صرف قانونی شکنجے میں پھنس جاتا بلکہ میرے دشمن سمیت انسپکٹر رجب دین بھی دلاور کا بدلہ لینے میں مجھ سے بخل سے کام نہ لیتا۔ ریمانڈ ملتے ہی وہ میرے لیے جیل کے اندر بھی مصائب کے پہاڑ کھڑے کر سکتا تھا پھر تو جیسے انہیں کھلی چھٹی مل جاتی مجھے تختۂ مشق بنانے کی۔

میں انہی پریشان کن خیالات میں الجھا رہا تھا اور یہی دعائیں مانگ رہا تھا کہ کالیا اس خبیث انسپکٹر کے ہتھے نہ چڑھے کیونکہ ہم دونوں میں سے ایک کا "باہر" رہنا لازمی تھا۔ ایڈووکیٹ ذنیرہ کے کام کرنے کا الگ انداز تھا اور کالیا کا الگ، بھروسا مجھے دونوں پر ہی تھا مگر کالیا کی پھر بھی بات اور تھی۔

کافی دیر گزر گئی۔ سب کچھ ویسا ہی رہا کوئی پیش رفت دیکھنے میں نہیں آ رہی تھی۔ شام سے رات ہو گئی۔ آج تو ہمیں عطا محمد صاحب کے ہاں بھی فوزیہ کے رشتے کے سلسلے میں جانا تھا، ان سے چاچا انور شاہ نے وقت بھی لے لیا تھا۔ پتا نہیں وہ کیا سمجھیں گے۔ عجیب بدقسمتی تھی میری کہ ساری خوشی خاک ہو گئی تھی۔ تاہم مجھے تسلی تو تھی کہ عطا محمد کو میرے حالات کا علم ہے وہ برا نہیں منا سکتے۔

"چلو تمہاری ضمانت ہو گئی ہے۔" اچانک ایک کانسٹیبل کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور مجھے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آیا۔ میں اس وقت دیوار سے پشت ٹکائے مایوس اور ژولیدہ سا بیٹھا تھا۔ یک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

جو کانسٹیبل یہ خوش خبری لایا تھا۔ وہ اب لاک اپ کا دروازہ کھولنے میں مصروف تھا۔ میں لپک کر اس طرف بڑھا۔ اس نے قفل کھول کر مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا اور پھر مجھے لے کر جب انسپکٹر رجب دین کے کمرے میں پہنچا تو وہاں ایک شخص کو موجود پا کر میں بری طرح چونک پڑا اس کے ہمراہ وہاں دو شخصیات اور بھی موجود تھیں مگر وہ شخص بڑے اطمینان سے کھڑا میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا جبکہ انسپکٹر رجب دین کے چہرے پر بے بسی اور تلملاہٹ کے تاثرات واضح تھے۔

☆......☆

وہ رانا بشیر تھا۔ حسب سابق وہ گرے کلر کے سفاری سوٹ میں ملبوس تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں سیاہ رنگ کا بریف کیس تھا۔ اس کے ہمراہ ایک جوان سا آدمی بھی کھڑا

تھا جو اپنی وضع قطع سے پی اے لگتا تھا۔ دوسری شخصیت بھی میرے لیے شناسا تھی وہ زنیرہ تھی۔

''تو پھر ہم اسے لے جاسکتے ہیں انسپکٹر صاحب؟'' رانا بشیر نے رجب دین کی طرف دیکھ کر کہا اور اپنا بریف کیس انہوں نے پی اے کو تھما دیا۔ ایک بڑا سا ٹائپ شدہ کاغذ انسپکٹر کے ہاتھ میں تھما ہوا نظر آرہا تھا۔

''ہوں!'' انسپکٹر رجب دین نے ایک گھمبیر سا ہنکارہ بھرا اور بولا۔ ''لیکن! یاد رہے کہ یہ حاضر ضمانت ہے جو مشروط ہوتی ہے اور ملزم اس شہر سے باہر نہیں جاسکتا، اسے دوسو کلومیٹر کے اندر موجود رہنا ہے، جس وقت ہمیں اس سے تفتیش کی ضرورت پڑے گی اسے یہاں حاضری دینا ہوگی۔'' رجب دین کے لہجے سے شقاوت قلبی صاف جھلکتی محسوس ہورہی تھی۔ اس پر زنیرہ نے کہا۔

''ہم جانتے ہیں اچھی طرح مگر ایسا نہ ہونے پائے کہ تفتیش کی آڑ میں نعمان کو بلاوجہ تنگ کیا جائے۔ جلد ہی اسے (عبوری ضمانت) بھی ہوجائے گی۔''

''ایک بات میں بھی کہنا چاہوں گا۔'' رانا بشیر نے کہا۔ ''میں بھی اپنی بیٹی فرحانہ کے اغوا کی رپورٹ کرا چکا ہوں۔ شاہ میر اور اس کے بیٹے ثمیر کے خلاف کیونکہ میری بیٹی کو اغوا کرنے والے وہ دونوں مجرم کیماڑی تھانے میں موجود ہیں، پولیس ان سے تفتیش کررہی ہے۔ اُمید ہے کہ وہ جلد ہی اگل دیں گے کہ انہوں نے کس کے کہنے پر میری بیٹی کو اغوا کیا تھا۔''

رانا بشیر کی بات پر میں تو اتنا نہیں چونکا تھا کیونکہ مجھے پیش آمدہ حالات کا علم ہی تھا۔ البتہ میں نے انسپکٹر رجب دین کو چونکتے ہوئے ضرور دیکھا تھا۔ شاید اس کے علم میں یہ آخری بات نہ تھی یا پھر شاہ میر نے ہی اسے بتانا ضروری خیال نہ کیا ہو۔

مال خانے سے میرا مختصر جیبی سامان جس میں میرا سیل فون بھی تھا لاکر میرے حوالے کردیا گیا تھا۔

بہرطور اس کے بعد ہم سب تھانے کی عمارت سے باہر آگئے۔ احاطے میں رانا بشیر کی ہنڈا سوک کھڑی تھی۔ اندازہ ہوا کہ زنیرہ اور رانا بشیر ساتھ رہے تھے اور شام سے ہی میری ضمانت کے لیے دوڑ دھوپ میں مصروف رہے تھے مگر سوچ رہا ہوں میں کہ ان دونوں کو یکجا کرنے کی کامیاب اور دانشورانہ حکمت عملی کس کی ہوسکتی تھی؟

''کالیا!''

یہ نام میرے ذہن رسا میں ابھرا تھا کیونکہ میں نے اپنی گرفتاری سے چند سیکنڈ ہی پہلے عاصمہ کو تاکید کردی تھی کہ وہ میری اس گرفتاری کے بارے میں زنیرہ کو ہی نہیں بلکہ کالیا کو بھی آگاہ کردے۔

ہم سب کار میں سوار ہوگئے۔ کار میں ڈرائیور موجود نہ تھا۔ اس کا اسٹیئرنگ اسی شخص نے سنبھال لیا تھا جسے میں رانا بشیر کا پی اے سمجھے ہوئے تھا۔ اس کے برابر میں رانا بشیر اور عقبی سیٹوں پر ایڈووکیٹ زنیرہ اور میں بیٹھ گئے۔

کار آگے بڑھ گئی۔

''میں آپ سب کا مشکور ہوں۔'' میں نے ہولے سے کہا۔

''ان تکلفات کی اب ضرورت نہیں رہی ہے مسٹر نعمان!'' آگے بیٹھے رانا بشیر نے عقب نما آئینے میں میری طرف دیکھ کر کہا تھا۔

کار میں اے سی لگا ہوا تھا اور الیکٹرونک ونڈوز بند تھے جس کے باعث باہر کے ٹریفک کا شور اندر نہیں آتا تھا۔ کار کی محدود فضا سکون آور تھی۔

''کالیا کو تمہاری بہن عاصمہ بیٹی نے تمہاری گرفتاری کی اطلاع دی تھی۔ وہ سیدھا میرے پاس آگیا تھا۔'' وہ آگے بتانے لگا۔ ''پھر اسی کے مشورے سے میں نے مس زنیرہ سے رابطہ کرلیا۔''

''یوں کالیا کی بروقت عقل مندی سے رانا صاحب کا سکہ اور میری پیشہ ورانہ کارگزاری سے یہ فوری طور پر تمہاری ضمانت عمل میں آگئی۔'' زنیرہ نے بھی مسکرا کر لقمہ دیا۔

''کالیا بہت جینئس آدمی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کب اور کس وقت کس آدمی کو حرکت میں لانا ہے۔'' رانا بشیر نے کالیا کے متعلق تاثر انگیز تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

''بے شک!'' میرے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔ جبکہ اپنی بیٹی فرحانہ کے اغوا کی رپورٹ کے بارے میں رانا بشیر نے یہی بتایا تھا اس نے ایڈووکیٹ زنیرہ کے مشورے سے ہی شاہ میر اور اس کے بیٹے ثمیر کے خلاف ایف آئی آر کٹوا دی تھی جبکہ فرحانہ کی کار پولیس کو شاہ میر کی کوٹھی کی بجائے کسی اور دور دراز ویران مقام سے مل گئی تھی۔

بہرطور ڈرائیور یا پی اے کی موجودگی میں، میں نے مزید کچھ نہیں کہا اور یوں رانا بشیر اور زنیرہ نے بھی خاموشی اختیار کیے رکھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ رانا بشیر کا یہ مذکورہ آدمی کس قدر قابلِ بھروسا ہے۔

باقی سفر اسی خاموشی سے گزرا جس کا اختتام رانا بشیر کی کلفٹن والی رہائش گاہ پر ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہم تینوں آرام دہ نشست گاہ میں تھے۔ وہ آدمی چلا گیا تھا۔ میں نے رانا بشیر سے اس آدمی کے متعلق پوچھا تھا۔

''یہ اطہر علی تھا، میرا پرسنل سیکریٹری قابل بھروسا آدمی ہے مگر میں نے ایک حد تک ہی اسے اپنے حالات سے آگاہ رکھا ہے۔'' رانا بشیر نے جواب دیا۔

اس کے بعد کولڈ ڈرنک آگئی۔ جو ایک ملازمہ ٹرے میں ہمارے لیے رکھ کے لائی تھی۔ رانا بشیر نے اپنے لیے ٹھنڈے پانی کا گلاس لیا تھا۔

بعد میں پتا چلا کہ کالیا بھی وہاں موجود تھا۔ وہ تھوڑی دیر بعد ایک کمرے سے برآمد ہوا تھا مگر میں اسے دیکھ کر ذرا چونکا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ یا خوشی کے تاثرات کے بجائے فکر و تشویش کے سائے متحرک تھے۔ اس کے ہاتھ میں سیل فون تھما ہوا تھا، جس سے یہی لگتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی کسی سے سیل فون پر بات کرتا رہا ہو، تاہم وہ سیدھا میری طرف ہی بڑھا تھا اور میں بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ ہلکی سی مسکراہٹ سے میرے گلے ملا اور رہائی کی مبارکباد دینے کے بعد میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

''کیا بات ہے کالیا؟ تم کچھ فکرمند نظر آرہے ہو؟'' مجھ سے پہلے رانا بشیر نے اس سے پوچھ لیا۔

''میں نے احتیاط کے پیشِ نظر شاہ میر کی رہائش گاہ پر اپنے ایک آدمی زیدی اور سدو بھائی کو بھی فون کرکے اس کے ساتھ ان دونوں کو مقرر کر رکھا تھا۔'' اس نے بتایا۔ سدو بھائی کے ذکر پر میں چونکا تھا۔ کالیا نے بالآخر اسے بھی برت لیا تھا۔ میں نے اس کا نمبر اسے دے رکھا تھا۔

وہ آگے بتانے لگا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی انہوں نے مجھے سیل پر یہ اطلاع دی ہے کہ تین افراد کو شاہ میر کی رہائش گاہ میں داخل ہوتے دیکھا گیا ہے اور وہ تینوں ہی شکل وصورت سے غیرملکی دکھائی دیتے ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ میر کے ہی کہنے پر وہ یہاں دانستہ بھیجے گئے ہیں۔

ان دونوں نے اندر نقب لگا کر ان تینوں کی گفتگو بھی سننے کی کوشش کی تھی۔ کیوں کہ وہ تینوں آپس میں بھی باتیں کررہے تھے اور ساتھ ہی کسی خفیہ آلے پر وہ کسی سے لاسلکی رابطے میں بھی تھے۔ وہ انگریزی میں باتیں کررہے تھے لیکن بدقسمتی سے زیدی اور سدو بھائی دونوں کو ہی انگریزی نہیں آتی اس لیے وہ زیادہ تفصیل اور ان کے آنے کا اصل مقصد تو نہیں جان سکے البتہ جو نام ان کی زبانی، باتوں کے دوران لیے گئے تھے وہ......شوپر، ارغمان اور......راکا......''

''راکا...... راکا......'' یہ نام میرے دماغ میں ہتھوڑے برسانے لگا۔ میں اس نام پر بری طرح چونکا تھا۔

کالیا مزید بتا رہا تھا۔ ''ان کا خیال یہی ہے کہ شاہ میر نے اپنے تین ٹاپ پروفیشنل کرمنلز کو میدان میں اتارا ہے اور وہ خود شرقِ وسطیٰ کی کسی ریاست میں بیٹھا انہیں ہینڈل کرے گا لیکن اصل تشویش اور پریشانی کی بات میرے لیے یہ تھی کہ ان کی زبانی......زیدی اور سدو نے......نعمان اور عاصمہ کے نام بھی سنے تھے۔ اس سے بات واضح ہوجاتی ہے کہ......''

میں اپنی بہن کا نام سن کر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ کالیا بولتے بولتے رک گیا۔

اپنا اور بہن عاصمہ کا نام سنتے ہی میرے اندر فکر و تشویش کا ایک جوار بھاٹا اٹھا تھا۔ حالات ہی ایسے تھے کہ میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ تینوں مردود راکا اور اس کے ساتھی شوپر اور ارغمان کیا چاہتے تھے۔

''مجھے اسی وقت گھر جانا ہوگا۔ میرے بھائی اور بہن کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔'' میں نے چڑھتی اترتی سانسوں کے درمیان کہا تو کالیا نے ازراہِ تشفی مجھ سے کہا۔

''بے فکر رہو ایسی بات ہوتی تو میں تمہیں یہاں نہیں ملتا۔ اسی وقت تمہارے گھر پر اپنے مسلح لڑکوں کے ساتھ ان تینوں کی گھات میں بیٹھا ہوتا۔ بات کی تہہ تک میں بھی پہنچ گیا ہوں لیکن وہ تینوں ابھی وہیں شاہ میر کی اقامت گاہ پر ہی موجود ہیں اور میں نے زیدی اور سدو کی یہی ڈیوٹی لگا رکھی ہے کہ جیسے ہی وہ تینوں وہاں سے کہیں جانے کے لیے نکلیں تو مجھے فوراً آگاہ کریں۔''

میں ایک گہری سانس خارج کرکے بیٹھ گیا مگر تفکیر بھرے لہجے میں بولا۔ ''ہمیں ان تینوں کا بندوبست کرنا ہوگا۔ لگتا ہے شاہ میر نے دیسی بدمعاشوں سے مایوس ہوکر ہائی پروفائل کرمنلز کو میرے پیچھے لگا دیا ہے۔''

''ٹھیک اندازہ لگایا ہے تم نے نعمان بیٹے!'' رانا بشیر نے کہا۔ ''لیکن ہم بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے۔ چوں کہ اس وقت بازی برابر کی ہے، میری بیٹی ان کے قبضے میں ہے تو اس کا بیٹا بھی ہمارے قبضے میں ہے، اسی لیے شاہ میر کچھ زیادہ ہی دیدہ دلیری دکھا رہا ہے۔''

"یہی تو سب سے بڑی پیچ ہے جو ہمیں روکے ہوئے ہے ورنہ شاہ میر جیسا ہاتھی کب کا پہاڑ تلے آچکا ہوتا۔" کالیا نے بھی خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن دیکھا جائے تو پلڑا پھر بھی اسی کا بھاری ہے۔" اس بار زنیرہ نے بھی اظہارِ خیال کیا۔ "شاہ میر کے بیٹے ثمیر کے مقابلے میں بہرحال رانا صاحب کی بیٹی فرحانہ کا معاملہ زیادہ نازک اور حساس ہے۔"

"لیکن اولاد، اولاد ہوتی ہے، چاہے بیٹی ہو یا بیٹا۔" کالیا بولا۔ "لیکن بات آپ کی بھی غلط نہیں ہے مس زنیرہ! صورتِ حال ... دونوں طرف ہی کی بڑی عجیب اور گمبھیر ہے۔"

"اس طرف بعد میں سوچ لیں گے۔" میں نے قدرے جھلا کر پریشانی سے کہا۔ "اس وقت مجھے گھر جانا ہوگا۔"

"ابے لے جگری! تو کیا سمجھتا ہے کہ مجھے گھر کی فکر نہیں۔" کالیا میری طرف دیکھ کر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ "میں پہلے ہی استاد بھابھا کے اڈے پر فون کرکے پانچ مسلح لڑکوں کو روانہ کرچکا ہوں۔ وہ وہاں آس پاس ہی موجود ہیں، الگ الگ سمتوں میں اور انہیں میں نے حکم دے رکھا ہے کہ گھر کے دروازے پر کسی بھی مشکوک آدمی کو دیکھیں تو فوراً حرکت میں آجائیں۔"

"وہ تو صحیح ہے لیکن ہمارا وہاں پہنچنا ضروری ہے۔" مجھے پھر بھی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔

"مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔" کالیا بولا۔ "ہم دونوں تھوڑی دیر بعد نکلیں گے یہاں سے۔"

"تم لوگوں نے ثمیر کو جس جگہ یرغمال بنا کر رکھا ہے وہ جگہ محفوظ تو ہے ناں؟ میرا مطلب ہے شاہ میر کے آدمی کہیں اسے برآمد تو نہیں کرلیں گے؟" رانا بشیر نے کہا۔

"بے فکر رہو سیٹھ صاحب! ثمیر کی گرد کو بھی ان کے فرشتے تک نہ پاسکیں گے۔" کالیا نے جواب دیا۔

"دیکھنا یہ ہے اب کہ شاہ میر کے یہ تینوں آدمی اس کی رہائش گاہ میں بیٹھے آئندہ کی کیا پلاننگ بنانے میں مصروف ہیں؟ اور کدھر کا رخ کرتے ہیں۔ میرا خیال یہی ہے کہ وہ ابھی نومی کے گھر کا رخ کرنے کی بجائے ادھر کا ہی رخ کریں گے۔"

اسی وقت کالیا کے سیل فون کی بیل گنگنائی۔ ہم سب چونک گئے۔ موقع اور حالات ہی ایسے تھے کہ ذرا ذرا سی بات پر دل بے اختیار دھڑک اٹھتا تھا۔

کالیا نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں خاموش رہنے کا کہا اور سیل جلدی سے کان سے لگالیا۔

"ہاں! کہو؟" وہ بولا۔

یقیناً زیدی یا سدو بھائی کا ہی فون ہوسکتا تھا۔ میری دھڑکتی ہوئی نظریں کالیا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے رہ رہ کر اپنے گھر کی فکر ستا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد کالیا نے بتایا کہ وہ تینوں کہیں جانے کے لیے گھر سے نکلے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہی ان کے راستے کا پتا چلے گا کہ انہوں نے کہاں کا رخ کیا ہے۔" کالیا نے بتایا۔ "سدو اور زیدی بائیک پر ان کی کار کے تعاقب میں ہیں۔"

تھوڑی دیر اور گزر گئی تو زیدی نے فون کرکے بتایا کہ ان تینوں کا رخ کلفٹن کی جانب معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے چہرے جوش سے تمتما اٹھے۔ کالیا کا خیال درست ثابت ہوا تھا۔ زنیرہ کچھ پریشان سی نظر آنے لگی اور مشورہ دینے کے انداز میں بولی۔ "ہمیں فوراً پولیس کو انفارم کرنا چاہیے۔"

"اس کی ضرورت نہیں، ہم انہیں راستے میں ہی دھرلیں گے۔" کالیا نے کہا۔ پھر مجھ سے بولا۔ "نومی! تم ادھر ہی رکو میں جا کر ان سے نمٹتا ہوں۔"

"ہرگز نہیں، میں تمہیں اکیلا نہیں جانے دوں گا۔" میں ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "وہ تینوں پیشہ ور اور خطرناک لوگ ہیں۔ تم اکیلے ان کا کیسے مقابلہ کرو گے؟"

راکا سے تو دو دو ہاتھ کرنے کے لیے میں بھی بے چین تھا۔ اس کی طرف میرا حساب نکلتا تھا لیکن میں اس پر ابھی تک قابو نہیں پاسکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کس قدر سفاک اور جلاد صفت انسان تھا۔ اس سے دو دو ہاتھ کرنے کے تصور سے ہی میرا پورا وجود فرطِ جوش سے مرتعش ہونے لگا تھا۔

"تو تم خود کیا کرلو گے نومی؟" ایک دم زنیرہ قدرے خفا ہو کے مجھ سے بولی۔ "تم دونوں یہ بے وقوفی ہرگز مت کرو بہتر یہی ہے کہ پولیس..."

"کسی کو بھی کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں ہے۔" اچانک رانا بشیر نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "ان لوگوں کو ادھر آلینے دو۔ یہاں گھات لگا کر انہیں دبوچ لیں گے۔"

ہم چاروں میں سب کی باتیں مختلف تھیں۔ ایسی صورت میں ایک نقطے پر اتفاق مشکل ہو جائے تو صورتِ

حال ... مزید مخدوش ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یہی کچھ سوچتے ہوئے اچانک میرے ذہن رسا میں ایک ترکیب سمائی۔

راکا شاہ میر کا ہی نہیں بلکہ اصل میں بن رائند کا خاص آدمی تھا۔ اگر ہم اس پر قابو پا لیتے تو بن رائند کا دباؤ اسے چھڑانے کے لیے شاہ میر کے کاندھوں پر آجاتا کیونکہ میرے اب تک کے محتاط اندازے کے مطابق بن رائند، شاہ میر کا آدمی نہیں بلکہ اس کا کوئی کاروباری ساتھی تھا چونکہ دونوں ہی کرمنل مائنڈ کے تھے اسی لیے ایک طرف وہ کالا سونا والا کھیل کھیلے ہوئے تھے اور ایک بڑی بین الاقوامی آئل کمپنی "ووڈ ورتھ آئل کمپنی" کے ساتھ "مونو پولی" کر رہے تھے دوسری طرف یہاں میرے ساتھ بھی ان کی چپقلش چل رہی تھی۔ ممکن تھا بن رائند اور شاہ میر کا آپس میں کوئی باہمی مفاد بھی اس میں کارفرما ہو۔

بالآخر طے یہی پایا کہ اگر وہ تینوں ہرکارے رانا بشیر کی اقامت گاہ کی طرف آرہے تھے تو ان سے ادھر ہی نمٹ لیا جائے۔ رانا بشیر نے اس روز والے واقع کے بعد اپنی کوٹھی پر دو عدد سیکیورٹی گارڈز تعینات کردیے تھے۔ چوکیدار دولت خان بھی تھا۔ لہٰذا ہم نے ایڈووکیٹ زنیرہ کو اس کے گھر روانہ کردیا، وہ بے چاری میرے لیے خاصی فکرمند ہو رہی تھی اور مجھے بار بار اپنا خیال رکھنے کا کہہ رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی تھی کہ وہ میری فکر نہ کرے میں اکیلا نہیں ہوں کالیا جیسا جغادر اور وفادار ساتھی میرے ساتھ ہے جو ہمیشہ اور ہر خطرے کے وقت کو خود کو مجھ سے آگے ہی رکھنے کی کوشش کرتا ہے ایسا میں نے محض اس کا دل رکھنے کے لیے کہا تھا اگرچہ یہ حقیقت بھی تھی، کالیا کی یہی کوشش ہوتی تھی لیکن میں نے کبھی بھی ایسے کسی خطرناک مواقع میں کالیا کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔

کالیا کے پاس ایک ہی ٹی ٹی پسٹل ہوتا تھا جبکہ میں نہتا تھا۔ رانا بشیر کے پاس البتہ ایک جرمن ساختہ ریوالور تھا جو لائسنس یافتہ تھا۔ وہ رانا بشیر نے نکال کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ کالیا نے مجھے رانا بشیر کے ساتھ رہنے کی تاکید کی اور ہم دونوں کو اوپری منزل بھیج دیا اور ہدایت کی کہ ہم وہاں سے باہر چاروں طرف کڑی نظر رکھیں جبکہ خود کالیا باہر نکلتا چلا گیا تھا۔ اگرچہ میں نے بھی اس کے ساتھ جانے پر اصرار کیا تھا مگر اس نے سختی کے ساتھ منع کردیا۔

صورتِ حال... خاصی گمبھیر تھی۔ بہرکیف ہم گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ وقت گزرتا رہا۔ زیدی اور سدو بھائی یقیناً کالیا سے مسلسل رابطے میں تھے۔ تھوڑی دیر اور گزری تو کالیا نے فون پر مجھے بتایا کہ وہ لوگ اس بلاک میں داخل ہوچکے ہیں جہاں یہ کوٹھی تھی۔

رانا بشیر کی یہ کوٹھی کارنر پر بنی ہوئی تھی اسی لیے ہم باآسانی چاروں طرف کے علاقے پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔

کالیا نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ تینوں سیاہ رنگ کی ایک کار میں سوار تھے تاکہ ہمیں بھی اوپر سے انہیں پہچاننے میں آسانی ہوسکے۔

یہ گھڑیاں بڑی اعصاب شکن تھیں۔ لگتا تھا جیسے رانا بشیر کی کوٹھی ایک بار پھر تختۂ مشق بننے والی ہو۔

ابنِ صفی (1928-1980)

الٰہ آباد (بھارت) سے جاری ہونے والے ماہنامہ "نکہت" کے بانی مدیر، ماہنامہ جاسوسی دنیا کراچی کے بانی ابنِ صفی کو پاکستان میں جاسوسی ناول نگاری کے حوالے سے حرفِ آخر قرار دیا جاتا ہے۔ ان کی مقبولیت کے باعث ایم صفی، ابن، صفی اور نجمہ صفی جیسے متعدد جعلی نام اور ناول منظرِ عام پر آئے مگر اصل کام اور شہرتِ دوام ابنِ صفی ہی کے حصے میں آئی۔ ان کا اصل نام اسرار احمد تھا نارہ (الٰہ آباد) میں 26 جولائی 1928 کو پیدا ہوئے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ مصور، شاعر، ناول نگار ابنِ صفی نے جاسوسی ناول نگاری میں انقلاب برپا کیا۔ 1952 میں پاکستان آئے اور کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی اس سے قبل الٰہ آباد سے ماہنامہ جاسوسی دنیا کے عنوان سے ناولٹ پیش کرتے تھے۔ کراچی سے بھی اس کی تجدید کی۔ عالمی خاتون جاسوسی ناول نگار "اگاتھا کرسٹی" ابنِ صفی کے ناولوں کو پسند کرتی تھیں۔ ابتداء میں ابنِ صفی نے اسرار ناروی کے نام سے شاعری بھی کی مگر ناول نگاری مستقل توجہ سے جاری رکھی۔ 22 جولائی 1980 کو اپنی سالگرہ والے دن سید سلمان ندوی صاحب کی طرح آپ بھی راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ پاپوش نگر کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔

مرسلہ: نزہت جبیں۔ چنیوٹ

لیکن پھر اس کے چند سیکنڈوں بعد ہی صورتِ حال اچانک اور غیر متوقع طور پر بدل گئی جب ذرا ہی دیر بعد کالیا کا دوسرا فون آنے کی بجائے وہ خود آ گیا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور چہرے پر قدرے تفکر کے سائے رقصاں تھے۔

''کیا ہوا کالیا! خیریت تو ہے؟'' میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''خیریت نہیں ہے۔'' وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ میں اور رانا بشیر چونک پڑے۔

''عین وقت پر سارا کھیل بگڑ گیا۔'' وہ بولا۔ ''نجانے کیسے ان خبیثوں کو اپنے تعاقب کا شبہ ہو گیا اور وہ اس طرف کا رخ کرنے کی بجائے دوسری جانب پلٹ گئے اور انہوں نے سدو بھائی اور زیدی پر ہلہ بول دیا۔''

''او میرے خدا!'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا، رانا بشیر بھی پریشان ہو گیا۔

''وہ دونوں خیریت سے تو ہیں ناں؟'' میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''زیدی مارا گیا ہے۔ سدو بھائی شدید زخمی حالت میں پڑا ہے۔'' اس نے بھیانک انکشاف کیا اور میرا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ مجھے کالیا کے ساتھی کے مرنے کا افسوس تو تھا ہی مگر سدو بھائی کی زخمی حالت پر میرا دل خون کے آنسو رو پڑا۔ میں نے پوچھا۔

''تمہیں کیسے علم ہوا؟''

''سدو بھائی نے ہی مجھے اس کی اطلاع دی تھی اور اسی وقت اس کا موبائل آف ہو گیا تھا۔ لگتا ہے راکا اور اس کے دونوں ساتھیوں نے سائیلنسر لگے پستولوں سے ان پر حملہ کیا ہوگا۔''

''میں نے انہیں تلاشنے کی کوشش چاہی تھی۔'' کالیا آگے بتانے لگا۔ ''کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ وہ یہیں کہیں قریب ہی ہو سکتے تھے لیکن عین وقت پر کسی مددگار پولیس کی موبائل جائے وقوع پر پہنچ گئی اور مجھے لوٹنا پڑا۔''

''کچھ کرو کالیا! سدو بھائی کو نہیں مرنا چاہیے وہ بہت کام کا آدمی ہے اور میرے لیے اس نے بہت سی قربانیاں دی ہیں۔'' میں نے کالیا سے کہا۔ میرے حلق میں رقت اتر آئی تھی۔

''ابھی ہمارا ان کے قریب جانا بھی خطرناک ہوگا۔'' کالیا بولا۔ ''وہاں قریب ہی ایک رفاہی ادارے کی ایمبولینس کا کیبن دفتر موجود تھا جس کی ایمبولینس فوراً موقع پر پہنچ گئی تھی۔''

''مجھے بہت افسوس ہوا یہ سن کر لیکن اب کیا کیا جائے؟'' رانا بشیر نے تفکر سے پوچھا۔

''راکا اور اس کے دونوں ساتھی بے حد محتاط اور شاطر ثابت ہوئے ہیں۔ تعاقب کا علم ہوتے ہی انہوں نے ان پر حملہ کر دیا تھا۔''

''اور وہ تینوں کہاں گئے؟ میرا مطلب ہے راکا وغیرہ؟''

''اب شاید وہ ادھر کا رخ نہ کریں لیکن جگری! یہ سب بہت برا ہو گیا۔ راکا اور اس کے ساتھی اب پہلے سے زیادہ محتاط ہو جائیں گے کیونکہ انہیں اب تک اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہم ان کی آمد سے باخبر ہو چکے ہیں۔''

''یہ واقعی بہت خطرناک صورتِ حال ... پیدا ہو گئی ہے۔ شاہ میر نے اپنے خطرناک کتے راکا کو ہمارے پیچھے لگا دیا ہے۔ حساب تو میں نے بھی اس سے چکتا کرنا ہے۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے ان سے مقابلہ کرنا صرف ہمارے بس کی بات نہ ہوگا۔ انہیں ملک دشمن عناصر کے غیر ملکی ایجنٹ کے الزام میں اگر ہم کچھ اقدامات اٹھائیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔''

''تمہارا مطلب ہے کسی ذمہ دار آرمی افسر یا خفیہ ایجنسی سے مدد لی جائے؟'' کالیا نے فوراً میری بات کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

''ہاں!''

''ابے لے جگری! یہ تو خود کو بڑی گھمبیرتا میں ڈالنے کے مترادف ہوگا۔ ہمیں خود بھی کڑے سوالوں سے گزرنا ہوگا اور جگری! اعمال ہمارے بھی کچھ اچھے نہیں، ایسا نہ ہو کہ الٹی آنتیں گلے کو آن پڑیں۔''

''اس بارے میں سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کریں گے، ابھی یہ بات ذہن میں رہے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے سدو بھائی کی فکر ہو رہی ہے، کسی طرح پتا کرو یار! اسے پولیس نے کون سے اسپتال میں بھیجا ہے؟''

کالیا نے فوراً اپنے کسی ساتھی سے رابطہ کر کے اسے یہ ذمہ داری سونپ دی۔

''کوئی خطرہ نہیں ہے تو نیچے چل کر ٹی وی پر خبریں سنتے ہیں۔ اس سلسلے میں ضرور کوئی بریکنگ نیوز آ رہی ہوگی یا ذرا دیر میں آ جائے گی۔'' رانا بشیر نے کہا۔

ہم نیچے نشست گاہ میں آ گئے۔ ہمارے ایماء پر رانا بشیر نے انٹرکام کے ذریعے گیٹ پر متعین اپنے گارڈز کو محتاط رہنے کی تاکید کر دی۔

ٹی وی آن کیا گیا۔ گھنٹے بھر بعد ہی بریکنگ نیوز آ چکی تھی جس کے مطابق کلفٹن کے پوش علاقے میں نامعلوم حملہ آوروں نے دو موٹر سائیکل سوار افراد پر فائرنگ کر دی جس کے نتیجے میں ایک شخص موقع پر ہی دم توڑ گیا جبکہ اس کا دوسرا ساتھی شدید زخمی ہو گیا۔

میں یک ٹک دھڑکتے دل کے ساتھ یہ خبریں سن رہا تھا۔ نیوز کاسٹر خاتون کی خبروں کے علاوہ اس کے نیچے بیلٹ نیوز بھی متحرک تھی۔ آگے بتایا جا رہا تھا کہ پولیس کے مطابق یہ کسی دیرینہ دشمنی کا شاخسانہ لگتا ہے۔ تاہم مقتول کا دوسرا ساتھی جو اس فائرنگ میں شدید زخمی ہو گیا تھا وہ بھی اسپتال پہنچنے تک زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے انتقال کر گیا ہے۔

اس آخری جانکاہ خبر پر دکھ کی ایک شدید لہر میرے پورے وجود کو گھائل کر گئی۔

سدو بھائی مر گیا۔ آہ! میرا ایک وفادار اور جاں نثار ساتھی میری خاطر اپنی جان سے چلا گیا۔ اس نے میرے لیے بہت کام کیا تھا۔ لینڈ مافیا کو مات دینے میں اس کی خفیہ خبروں کا بڑا دخل رہا تھا۔ دکھ اور کرب کے باعث بے اختیار میری آنکھیں نمناک ہو گئیں، کالیا میری دلی کیفیت سے واقف تھا وہ ہولے ہولے دلاسا آمیز انداز میں اپنے ایک ہاتھ سے میرا کاندھا تھپکنے لگا۔ میری آنکھیں واقعی بھیگ گئی تھیں۔ رانا بشیر بھی تسلیاں دینے لگے۔

''یار کالیا سدو بھائی میرا ایک وفادار ساتھی ہی نہیں بھائیوں جیسا بھی تھا۔ اس نے میری خاطر اپنی جان کی قربانی دی ہے۔ مجھے تیرے ساتھی زیدی کی موت کا بھی دکھ ہے، پر کالیا! اب اس راکا کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اس کے سر پر کئی بے گناہ لوگوں کے خون کا حساب ہے اور ہم پر واجب ہو گیا ہے کہ راکا اب کسی قیمت پر ہمارے ہاتھوں سے نہیں بچنا چاہیے۔'' میں نے جوشِ غیض تلے لہجے میں کالیا سے کہا۔

''بے غم ہو جا جگری! راکا کوئی بھوت نہیں ہے جو ہمارے ہتھے نہیں چڑھ سکتا۔ دیکھنا ہم کس طرح اسے ایک دن بے بس چوہے کی طرح گھیر کر ماریں گے لیکن ابھی حوصلہ پکڑ حالات ایک بار پھر خطرناک اور اندھیرے میں ہیں۔ اس بدبخت شاہ میر نے راکا کو خون آشام بھیڑیے کی صورت میدان میں اتارا ہے اور اس سے پہلے کہ وہ جلاد اور درندہ صفت انسان ہمیں مزید کوئی گہرا گھاؤ لگائے اس کا قلع قمع کر دینا چاہیے۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ زنیرہ کا فون آ گیا۔ اس نے خیریت چاہی تھی اور شاید خبریں بھی سن لی تھیں۔ ہم نے اس سے مختصراً گفتگو کر کے رابطہ منقطع کر دیا تھا کیونکہ ہم نے آیندہ کا لائحہ عمل طے کرنا تھا۔

موت کا ہرکارہ راکا بدک گیا تھا۔ اسے خبر ہو گئی تھی کہ ہم اس کی یہاں پاکستان موجودگی سے واقف ہو چکے ہیں اور وہ اب فوراً سے پیشتر خود کو غائب کرنے کی کوشش کرے گا اور ہمارے لیے یہی تشویشناک بات تھی کہ وہ تاریکی کے پردے میں سنگین گل کھلا سکتا ہے۔

میں اسی وقت گھر روانہ ہونا چاہتا تھا۔ سچی بات یہ تھی کہ مجھے راکا سے ایک طرح کا نامعلوم سا خوف بھی ہونے لگا تھا۔ میری کوشش تھی کہ جلد از جلد اس موذی کا خاتمہ کر دیا جائے اسی لیے کالیا اور میں نے راکا جیسے خونی بھیڑیے کو گھیرنے کی منصوبہ بندی پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔

رانا بشیر سے ہم نے اجازت لی تو اس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ثمیر کو اب کسی دوسری جگہ منتقل کر دینا چاہیے۔ یہ میں احتیاط کے پیشِ نگاہ کہہ رہا ہوں۔'' ہم نے اس کی بات پر صاد کیا اور وہاں سے روانہ ہوئے۔

ہمارے پاس سردست کوئی سواری نہیں تھی۔ ہم نے رکشا لیا اور گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ سارے راستے میں اور کالیا باتیں کرنے کی بجائے اردگرد نظریں رکھے ہوئے رہے، راکا سے کوئی بعید نہ تھا کہ وہ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ کہیں بھی گھات لگائے بیٹھا ہو سکتا تھا۔ رانا بشیر کو البتہ ہم ازحد محتاط رہنے کی تلقین کر آئے تھے۔

رکشا اب شاہراہِ فیصل پر فراٹے بھر رہا تھا۔ یہ روزگار اسکیم کا سی این جی رکشا تھا اور عام رکشوں سے کشادہ بھی۔ ہم دونوں محتاط نظروں سے گرد و پیش میں آتی جاتی ٹریفک کا جائزہ بھی لیتے جا رہے تھے۔

ملیر ہالٹ کی چورنگی پر ٹریفک کا رش تھا مگر رکشا ڈرائیور جو نوجوان لڑکا تھا اپنی پیشہ وارانہ مہارت کے بل بوتے پر ادھر اُدھر سے راستہ کاٹ کر ٹریفک کے اژدھام سے نکال لے گیا۔ آگے ایک موڑ آ رہا تھا۔

ہمارے الٹے ہاتھ پر سڑک کی مرمت کا کام چل رہا تھا اور وہاں پر کچھ ریتا پھیلا ہوا تھا ایک بلڈوزر بھی کھڑا

تھا۔ یہی موڑ کاٹتے وقت رکشے والے نے ”چار و نا چار“ رفتار ہلکی کی تھی کہ اچانک ایک کار موڑ کاٹتے وقت ہی رکشے کے برابر اور قریب آگئی۔ اسی رخ پر کالیا بیٹھا تھا اور پھر اس کے ساتھ میں تھا۔ ہم دونوں ہی نے بیک وقت اور غیر ارادی طور پر گردنیں گھما کر اس طرف دیکھا تھا۔

تب ہی مجھے تین افراد کی جھلک کے ساتھ ہی ایک شناسا آدمی پر نظر پڑی مگر اس کے ساتھ ہی مجھے ان کے ہاتھوں میں گنیں لہراتی دکھائی دیں۔ میرا چہرہ فق ہوگیا۔ ٹھیک اسی وقت اور اس سے پہلے کہ ان کی گنیں اپنے مہیب دہانوں سے شعلے اگلتیں، میں اور کالیا دونوں ہی یک بیک حرکت میں آئے اور رکشے سے باہر چھلانگیں لگا دیں۔ یہی وہ وقت تھا جب فضاء گولیوں کی بھیانک تڑا بڑی سے گونج اٹھی جیسا کہ مذکور ہوا، رکشا روزگار اسکیم کا تھا اور عام رکشے سے کافی کشادہ بھی۔ دوسری وجہ اس خوفناک فائرنگ سے بچنے کی یہی تھی کہ صرف کالیا نے ہی نہیں بلکہ میری بھی کار میں موجود حملہ آور اور ان کے اسلحے پر نگاہ پڑ گئی تھی ورنہ اگر صرف یہ ہولناک منظر کالیا دیکھتا تو اسے مجھے دھکیلنے میں ہی نہیں بلکہ خبردار کرنے میں بھی کافی سارا وقت لگ جانا تھا۔

ہم دونوں ہی چلتے ہوئے رکشے سے نیچے گرے جس کے باعث چہرے اور جسم میں خراشیں آگئیں مگر ہمیں اس کی کب پرواہ تھی؟ بے رحم موت ہمارے تعاقب میں تھی۔

ہم دونوں دانستہ یا غیر دانستہ لڑھکتے ہوئے زیرِ تعمیر سڑک کے ریتے پر جا پڑے۔ ہماری سماعتوں میں رکشا کے الٹنے کے دھماکے کی آواز سنائی دی اور دیگر ٹریفک بھی درہم برہم ہوگئی، جس کا ہمیں یہ فائدہ ہوا کہ ہم نے خطرہ محسوس کرتے ہی قریب کھڑے بلڈوزر کے عقب میں چلے گئے۔

وہ کار پہلے رکی ہوئی تھی، انہیں معلوم تھا کہ ان کا ”ٹارگٹ“ خالی گیا ہے۔ وہ کار کے اندر ہی بیٹھے باہر کی جانب تکے جا رہے تھے لیکن پھر لوگوں کے شور و غل اور درہم برہم ٹریفک، گاڑیوں کے پُرشور ہارن سے گھبرا گئے اور دوسرے ہی لمحے ان کی کار حرکت میں آگئی لیکن اسی فائر کی آواز گونجی جو میرے قریب سے ابھری تھی جس کے باعث میں بدکا اور مجھے اپنے کان سن ہوتے محسوس ہوئے، یہ کالیا نے اپنے ٹی ٹی پسٹل سے ان کی طرف فائر جھونکا تھا۔

اس نے کار کے ٹائر کو نشانہ بنانے کی کوشش چاہی تھی۔ نشانہ بے خطا نہیں گیا تھا۔ ایک سماعت شکن دھماکے سے ٹائر برسٹ ہونے کی بھی آواز آئی تھی۔ وہاں ہڑبونگ مچ گئی، لوگ ٹریفک میں پھنسی ہوئی گاڑیوں سے اتر کر اِدھر اُدھر بدحواسی میں بھاگنے لگے۔ کالیا نے دوسرا فائر جھونک مارا۔ کار کی بیک اسکرین دھماکے سے کرچیوں ہوگئی۔

”ادھر آجاؤ جگری! اس طرف جلدی۔“ کالیا نے مجھ سے کہا اور پلٹا، میں نے اس کی تقلید کرتے ہوئے جگہ بدلی، جس کا نتیجہ جلد ہی برآمد ہوا۔ اسی طرف پورا برسٹ فائر کیا گیا تھا۔ کئی گولیاں بلڈوزر کی ٹھوس فولادی باڈی سے اچٹ کر اِدھر اُدھر ”شوں......شوں“ کی آوازوں سے پلٹنے لگیں۔

تب تک میں اور کالیا دوسری جانب نکل چکے تھے، یہاں بجری اور پہاڑی پتھروں کا ڈھیر تھا جو چھوٹے پہاڑ کی طرح بنا ہوا تھا، ہم اس کی آڑ میں ہوگئے، کالیا نے بھی دوبارہ گولی نہیں چلائی تھی۔ وہ اسی کار کی جانب تکے جا رہا تھا۔

”بھاگ گئے سالے!“ کالیا ہانپتی ہوئی آواز کے ساتھ بولا۔ ”نکل چلو جگری!“ کہتے ہوئے دائیں جانب بھاگا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ اس نے پستول اڑس لیا تھا۔ لوگ ہماری طرف بھی دیکھ رہے تھے۔ کالیا اندر بازار کی طرف آگیا، بازار کیا تھا بس، ایک چھوٹی سی مارکیٹ تھی، دکانوں کے علاوہ سڑک کے کنارے پھلوں وغیرہ کے ٹھیلے لگے ہوئے تھے۔ رات کا وقت تھا اور روشنی بھی تھی۔

”ابے لے!“ اچانک کالیا کے منہ سے نکلا۔ وہ مڑ کر پیچھے دیکھ رہا تھا یہی وہ وقت تھا جب اس نے اپنا یہ مخصوص جملہ ادا کرتے ہی مجھے کاندھے سے دھکا مارا تھا، میں قریب ایک ٹھیلے کی طرف جا گرا، اس نے خود کو بھی ایک طرف اچھالا تھا، ٹھیک اسی وقت گولیوں کی تڑا تڑ ابھری تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہاں بھی بھگدڑ مچ گئی۔

میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اعصاب تن گئے تھے اور میں سمجھ چکا تھا کہ وہ تینوں موت بن کے ہمارے پیچھے پڑ چکے ہیں اور ان سے بچ کر بھاگنے کی صورت میں ان کے خطرناک ہتھیاروں کی زد میں آسکتے تھے۔ بس! یہی پل کے پل خیال میرے ذہن میں ابھرا تھا اور میرے اندر کا جنگجو انسان انگڑائی لے کر بیدار ہوگیا تھا۔

میں نے اپنی نظریں عقابی کرلیں اور خونی ہرکارے کے اس مختصر ٹولے کو تلاشنے لگا۔ کالیا اپنے پسٹل سے ان پر جوابی فائرنگ کر رہا تھا۔ اس نے دو ایک گولیاں ہی داغی تھیں اور تب ہی مجھے راکا کا ایک آدمی دکھائی دیا۔ اس کے

ہاتھ میں گن تھی اور اس نے ”پبلک اسپاٹ“ میں اپنا چہرہ سیاہ نقاب میں ڈھانپے رکھنے کی حکمت عملی اپنا رکھی تھی۔ وہ میری طرف ہی محتاط مگر بھاگنے کے انداز میں آرہا تھا۔

اس کے انداز سے یہی لگتا تھا کہ ابھی اس کی مجھ پر ٹھیک طرح نظر تو نہیں پڑی تھی مگر اسے میری اس طرف موجودگی کا اندازہ تھا، میں نے فوراً گردشی نظریں دوڑائیں تو مجھے ایک بانس نظر آگیا۔ یہ ویسا ہی لکڑ نما بانس تھا جس کے سرے پر لوہے کا کنڈا لگا ہوتا ہے جس کی مدد سے دکانوں کے شٹر کھینچے جاتے ہیں، میں نیچے جھکا ہوا اس بانس کی طرف بڑھا اور ابھی لپک کر اسے ہاتھوں میں پکڑا ہی تھا کہ ہرکارہ دائیں جانب سے اپنے گرد و پیش میں نظریں ڈالے گزرنے لگا اور دوسرے ہی لمحے میں نے اسے ٹھٹک کر رکتے دیکھا۔ میری سانسیں رک گئیں، بڑے ہی خوناک انداز میں وہ اپنے ہاتھ میں تھمی ہوئی گن سمیت پورا گھوم کر میری جانب مڑا ہی تھا کہ میرے ہاتھ میں آیا ہوا بانس حرکت میں آگیا۔

میں نے اپنے وجود کی پوری طاقت صرف کرکے بانس پر چلایا، میری کوشش تھی کہ بانس کی بجائے اس کے سرے پر لگے ہوئے آہنی کنڈے سے ضرب آئے، خوش قسمتی تھی کہ ایسا ہی ہوا تھا۔ کنڈا ہرکارے کی گردن سے تھوڑا نیچے ہی لگا تھا اور پھر میں نے اسے اذیت ناک چیخ کے ساتھ گرتے دیکھا۔ گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ میں نے بانس کھینچا اور دوبارہ اس پر ضرب لگانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ذہن میں آیا۔ دوسری ضرب اسے لگانے کی بجائے میں نے عقل مندی یہ کی کہ اس کے قریب ہی گری ہوئی گن پر اس طرح ”سویپ“ کے انداز میں رسید کی کہ وہ ہرکارے کی پہنچ سے دور کہیں جا پڑی، جسے اچکنے کی کوشش میں وہ تھا۔

بانس اب مجھے بوجھ محسوس ہونے لگا، جوش تلے میرا دماغ گرم ہو چلا تھا۔ بانس پھینکتے ہی میں اس پر جا پڑا۔ وہ اٹھنے کی کوشش میں تھا کہ میں نے اچھل کر اپنے دونوں پیروں کی ضرب اس کے چہرے پر رسید کردی، وہ اٹھنے کی کوشش میں تھا کہ دوبارہ کراہ آمیز چیخ کے ساتھ گرا۔ اس کے دائیں شانے سے خون مسلسل بہہ رہا تھا۔ میری ساتھ ہی اس کے دوسرے ہرکاروں پہ بھی نظریں تھیں کہ کہیں ان میں کوئی مجھ پر فائر نہ کھول دے لیکن لگتا تھا شاید انہیں کالیا نے اپنے ساتھ مصروف کرلیا تھا۔

ادھر میں نے اپنے شکار کو اٹھنے نہیں دیا اور لاتوں مکوں سے اسے دھنک کر رکھ دیا۔ اس وقت فرطِ جوش تلے میرا رواں رواں مرتعش تھا۔

اسی وقت گولی چلی۔ میں غیر ارادی طور پر جھک گیا۔ مجھے کالیا کی فکر ہوئی۔ میں نے بانس اٹھا لیا، چاہتا تو مضروب ہرکارے کی گن پر قبضہ جما سکتا تھا مگر اسے تلاشنا پڑتا، یوں وقت بھی نہ تھا میرے پاس۔ اثنائے راہ کچھ جری اور بہادر جوشیلے لوگ بھی امڈ پڑے تھے، اس کی وجہ یہ تھی انہوں نے نقاب پوشوں کو دہشت گرد سمجھ لیا تھا۔ انہوں نے میرے مضروب شکار کو دبوچ لیا تھا۔

میں نے گولی کی آواز کی سمت دیکھا۔ وہاں کالیا راکا اور اس کے ساتھی کے ساتھ بڑے عجیب بلکہ قابلِ رحم انداز میں بیک وقت نبرد آزما تھا۔

راکا کے ہاتھ میں گن تھی (نقاب کے باوجود میں نے اسے قد و قامت سے پہچان لیا تھا)، دوسرا ہرکارہ نہتا تھا مگر وہ زخمی تھا، اس کے ایک بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ کالیا ان دونوں پر سوار فضاء میں معلق تھا اور انہی کے رحم و کرم پر بھی یوں کہ اس کی دونوں ٹانگیں زخمی ہرکارے کی گردن کے گرد قینچی کی طرح جکڑی ہوئی تھیں جبکہ اس کے دونوں ہاتھ راکا کی گن کو چھیننے کی کوشش بہ الفاظ دیگر سہارے پر جمے ہوئے تھے۔

میں بانس لے کر اس طرف کو لپکا اور لٹھ کی بجائے بانس کو میں نے نیزے کی طرح قریب پہنچ کر راکا کے پیٹ میں گھونپا۔ اس کے پیٹ سے خون کا فوارہ ابلا اور وہ کئی قدم پیچھے ہٹتا چلا گیا، گن اس کے ہاتھ سے چھوٹی تو کالیا زمین پر آیا اور وہ بھی جس کی گردن پر اس کی ٹانگیں جکڑی ہوئی تھیں، کالیا نے اسے نہیں چھوڑا تھا۔

راکا کو کاری وار لگانے کے بعد تو جیسے میرا روم روم جوش سے تھرک اٹھا۔ میں پھر اس کی طرف بڑھا مگر جوشیلے لوگوں کا جتھا وہاں بھی امڈ پڑا تھا۔ ایک دو فائر ہوئے۔ اس کے کچھ دیر بعد ہی لوگوں کی بھیڑ سے الجھ کر میں گرا۔ مجھے راکا پر جھپٹنے کی حسرت ہی رہی تھی کہ اچانک کسی نے عقب سے میرا کاندھا پکڑا، میں نے چونک کر دیکھا وہ کالیا تھا۔

”بھاگ چل جگری!“

”لل......لیکن وہ راکا؟“

”یہ لوگ انہیں سنبھال لیں گے۔ اسی وقت کچھ لوگوں نے ہمیں بھی دبوچنے کی کوشش چاہی تھی مگر ہم انہیں

دھکے دیتے ہوئے ایک طرف کو دوڑتے چلے گئے۔
اس کے بعد ہم نہیں رکے تھے اور ایک تنگ سی گلی میں آ گئے۔

”رکنا مت جگری! دوڑتے رہو۔ اس طرف سڑک آ جائے گی۔“ کالیا نے کہا اور پھر میں نہیں رکا۔

کالیا کا خیال ٹھیک تھا، یہاں مین روڈ آ گئی تھی، وہاں ابھی تک ہجوم تھا جدھر ہمارا راکا اور اس کے دونوں ہرکاروں کے ساتھ پہلا ٹاکرا ہوا تھا۔ ہم اس جگہ سے تھوڑی ہی دور تھے۔

سامنے اور ہیڈ برج تھا اور اس کے دوسری جانب ٹریفک، ہم اسی طرف کو دوڑتے ہوئے آ گئے، سامنے تاریکی تھی اور میدان سا تھا، ہم اسی طرف کو نکل گئے۔

ایک جگہ تھوڑی دیر ستا کر اپنی سانسیں بحال کیں اور حلیہ تھوڑا درست کیا۔ اسی وقت پولیس سائرن کی آوازیں گونجتی سنائی دینے لگیں۔

”لوگوں کے جوش نے کام خراب بھی کر دیا اور بنا بھی دیا۔“ کالیا بڑبڑایا۔ ”لیکن جگری! تو نے عین وقت پر پالا مارلیا ورنہ تو آج شاید میں گیا تھا۔“

”ایسی بات کیوں کرتا ہے کالیا؟“ میں نے کہا۔ ”اللہ تجھے سلامت رکھے، تجھے مشکل میں دیکھوں اور میں پیٹھ دکھا دوں یہ ناممکن ہے۔“

”ابے لے جگری! کیا کہنے تیرے۔ بس اب نکلنے کی کر!“ وہ خوش دلی سے بولا۔

ہم اب اور ہیڈ برج کے نیچے سے ہو کر دوسری جانب کی سڑک سے ایک اور آبادی کی طرف نکل آئے تھے، تاریک سا میدان بھی ہم نے عبور کر لیا تھا۔ کالیا نے چلتے چلتے بتایا کہ یہاں سے محلہ عظیم پورہ کا شارٹ کٹ راستہ ہے، اس کے بعد ملیر پندرہ پر آ جائے گا۔ وہاں سے رکشا لینے کا ہمارا ارادہ تھا لیکن سوئے اتفاق ایک رکشا ہمیں وہاں قریب ہی ایک آٹو مکینک کی گیراج سے نکلتا ہوا نظر آ گیا، کالیا نے اسے ہاتھ دیا اور پکارا بھی، وہ رک گیا اور اس کے بعد ہم اس میں سوار ہو گئے۔

ان اعصاب شکن گھڑیوں کے بعد میرا رواں رواں جوش تلے لرز رہا تھا۔ میں نے کالیا سے سرگوشی میں کچھ کہنا چاہا تھا مگر اس نے میرا گھٹنا دبا کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ شاید رکشے والے کی موجودگی میں ایسی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

رکشے نے ذرا دیر بعد ہمیں ملیر پہنچا دیا۔ رکشے والے کو کالیا نے احتیاط کے پیشِ نظر گھر سے ذرا دور ہی روک دیا تھا اور اسے فارغ کرنے کے بعد ہم پیدل ہی تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے گھر پہنچے تھے۔ شکر تھا کہ وہاں سب خیریت تھی۔ محلے کے لوگوں نے جو مجھے بہ خیریت واپس لوٹتے دیکھا تو خوشی کا اظہار کیا۔ کیونکہ پولیس مجھے ان کے سامنے ہی گرفتار کر کے لے گئی تھی۔ تاہم پیش آمدہ صورتِ حال کے باعث ہمارے حلیے بھی ایسے ہو رہے تھے کہ کسی نے ازراہِ مذاق یہ بھی مجھ سے کہہ ڈالا کہ ”نعمان میاں! تھانے سے بھاگ کر آ رہے ہو کیا؟“ میں نے خجل سی ہنسی کے ساتھ... جواب دیا تھا کہ میری ضمانت ہو گئی ہے، بس یہ ذرا کسی سے مار پیٹ ہو گئی تھی۔

مجھے شرمندگی بھی محسوس ہو رہی تھی کہ محلے والے کیا سمجھیں گے؟ اگرچہ کئی ایک کو میرے حالات کا علم بھی تھا۔

بر کیف ہم گھر پہنچے تو کالیا نے وہاں آس پاس متعین اپنے لڑکوں سے رابطہ کیا اور انہیں مزید کچھ ہدایات دینے کے بعد مجھ سے بولا۔ ”مجھے اُمید نہیں تھی کہ کلفٹن والے واقعے کے بعد یہ فوراً دوبارہ حرکت میں آ جائیں گے۔“

”ہم!“ میں نے ہنکارہ بھرا۔ ”میں خود حیران تھا اسی بات پر......“ میں نے کہا۔ ”لگتا ہے یہ لوگ وہیں سے ہی ہمارا تعاقب کرتے آ رہے تھے لیکن یار کالیا! ایک بات کی سمجھ نہیں آئی؟“

”کون سی؟“

”ان کی اندھا دھند فائرنگ سے تو صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ ہمیں ہلاک کرنا چاہتے تھے لیکن میرا نہیں خیال کہ شاہ میر اپنا بیٹا برآمد کیے بغیر ہمیں......“

”میں اس پر غور کر چکا ہوں۔“ کالیا نے میری بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”شاہ میر تم سے کافی خوف زدہ لگتا ہے۔ اس نے راکا وغیرہ کو تمہارا قصہ ختم کرنے کا ہی ٹاسک سونپ رکھا ہوگا، رہی بات اس کے بیٹے والی تو یہ سمجھ رہا ہوگا کہ رانا بشیر کو ہمارے ہی ذریعے سے اس کا علم ہوگا چونکہ اس کی بیٹی بھی شاہ میر کے قبضے میں ہے، اس نے سوچا ہوگا کہ بعد میں وہ اس سے بیٹی کے بدلے بیٹے کا سودا باآسانی کر لے گا کیونکہ اس کے خیال میں (اور یہ ایک حد تک درست بھی تھا) رانا بشیر ہماری پشت پناہی کر رہا تھا۔ وہ سب جانتا ہوگا جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی کہ کالیا نے ابھی تک رانا بشیر کو بھی نہیں بتایا تھا کہ قیصر کو کہاں یرغمال بنا

کے رکھا گیا تھا۔

عاصمہ اور فہیم ہمیں اس حالت میں دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے۔ ہم نے دونوں کو تسلی دی اور غسل وغیرہ کر کے فارغ ہوئے تو عاصمہ نے کھانا لگا دیا۔ کھانے کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا مگر تھوڑا بہت زہر مار کرنے کے بعد ہم تازہ صورتِ حال پر غور کرنے لگے۔

راکا اور اس کے دونوں ہرکاروں کو ہم نے کاری وار لگایا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ ان کا لوگوں نے کیا حشر کیا ہوگا۔

میں نے فوراً ٹی وی لگا لیا۔ ابھی تک ایسی کوئی خبر نہیں آ رہی تھی۔

”چل جگری! تو ٹی وی پر نظر رکھ میں چلتا ہوں۔ کوئی خاص خبر ہو جائے تو مجھے بتا دینا۔“ کالیا رخصت چاہتے ہوئے بولا مگر میں نے اسے آج رات اصرار کر کے اپنے گھر میں روک لیا۔

کھانے کے بعد..... عاصمہ کو میں نے چائے بنانے کا کہہ دیا۔ کالیا میرے کمرے میں تھا۔ سامنے ٹی وی بدستور آن تھا۔ کالیا کو فکر تھی کہ ایک بار پھر ہمارا معاملہ پولیس کے سپرد ہونے والا تھا۔ لوگوں نے ہمارے چہرے دیکھ لیے تھے مگر کالیا کا خیال تھا کہ ہڑبونگ اور رات ہونے کے باعث کسی کو ہماری صورتوں پر کب دھیان رہا ہوگا؟

تھوڑی دیر اور گزری۔ عاصمہ چائے لے آئی۔ ماحول کچھ پُرسکون ہوا تو سوچنے سمجھنے کی صلاحتیں بھی بیدار ہونے لگیں۔ اچانک ٹی وی پر خبر چل پڑی۔ ہماری یک ٹک نظریں اسکرین پر جمی رہ گئیں۔ خبروں کے مطابق ان تینوں افراد کو دہشت گرد ہی کہا جا رہا تھا لیکن ایک خبر پر ہم چونک پڑے۔ راکا کا صرف ایک ہرکارہ ہی لوگوں کے نرغے میں آسکا تھا باقی دو فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ نیوز کاسٹر لوگوں کی ”بہادری“ کی داد دے رہا تھا اور ہم دونوں اپنا سر پکڑے بیٹھے رہے تھے۔

”کاش! یہ لوگ بہادری نہ دکھاتے۔“ کالیا اپنی پیشانی مسلتے ہوئے بولا۔ ”اب انہیں کیا پتا کہ ان کی بہادری کی وجہ سے ہمارا اہم شکار فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔“

”گرفت میں کون آ سکتا ہے۔“ وہ آخر میں سوچ کر بولا۔

”وہی ہوگا جس سے میں نبرد آزما تھا۔“ میں نے اندازہ لگایا۔ ”اسے میں نے کافی زخمی کر دیا تھا۔“

”راکا بھی تو ہو سکتا ہے۔“ کالیا نے خیال ظاہر کیا۔

”اسے بھی تو تُو نے زخمی کر ڈالا تھا۔“

”راکا ایک سخت جان آدمی ہے اور شاطر و چھلاوہ بھی وہ خود کو صاف بچا گیا ہوگا۔ اتنا تر نوالہ نہیں ہو سکتا وہ۔“

”چلو بعد میں دیکھتے ہیں۔ ابھی تو تھکن اور نیند سے برا حال ہو رہا ہے۔“ اس نے کہا اور جماہی لی۔

وہ رات ہم نے سو کر گزاری اور اگلے دن چڑھے سوتے رہے۔ میں نے جاگتے ہی ٹی وی لگا لیا۔ اب تک گزشتہ شب والے واقعے کی کافی تفاصیل سامنے آ چکی تھیں۔ ہمارا ذکر بھی نامعلوم حد تک تھا اور راکا کے گرفتار ساتھی کا بھی۔ جس نے پولیس کو الٹا بیان دیا تھا کہ ہم دونوں اسے لوٹ رہے تھے اور مزید یہ کہ اس کا اور کوئی دوسرا ساتھی نہ تھا نہ ہی کسی سے تعلق تھا اس کا۔

لوگوں نے پولیس میں اسے دے کر غلطی کی تھی۔ شاہ میر کے لیے اپنے اس ساتھی کو پولیس سے چھڑا لینا بھلا کیا مسئلہ تھا۔

کالیا مجھے محتاط رہنے کی ہدایت دے کر اور دوبارہ جلد آنے کا کہہ کر چلا گیا۔

کالیا کے جاتے ہی میں نے بھی لاری اڈے جانے کا قصد کیا ہی تھا کہ عاصمہ میرے پیچھے پڑ گئی۔

”بھیا! فوزیہ بھابی کے ہاں جانے کا کب پروگرام ہے؟“ وہ پگلی ابھی سے ہی اُسے ”بھابی“ سمجھنے لگی تھی۔ البتہ مجھے اس کی یہ ادا بھائی تھی۔

”اب دیکھو ناں کل اچھی بھلی تیاری ہوئی تھی، انکل عطا محمد نے وقت بھی دے دیا تھا مگر نجانے کہاں سے یہ کم بخت پولیس آ گئی اور......“

”آج شام کو پروگرام بناتے ہیں۔“ اس کی بات پر میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”تو بھیا! پھر پکا پروگرام ہے ناں آج کا؟ آپ ابھی چاچا انور کو فون کریں ناں تاکہ وہ دوبارہ انکل عطا سے وقت لے لیں۔ میں بھی تیار ہو جاتی ہوں۔“

وہ خوشی خوشی اور بے چینی سے بولی۔ بہنیں بھی کتنی معصوم اور محبت کرنے والی ہوتی ہیں۔ بے چاری کو میرے حالات کا علم ہی نہ تھا کہ میں ابھی تھوڑی دیر پہلے کس قدر خطرناک حالات سے گزرا ہوں۔ میں بتانا بھی مناسب نہیں سمجھا تھا۔ بھائیوں کی خوشیاں انہیں کتنی عزیز ہوتی ہیں، کسی نے سچ ہی تو کہا ہے دنیا کا ہر رشتہ دوبارہ مل جاتا ہے مگر بھائی

بہن کا رشتہ ایک ہی بار ملتا ہے لہٰذا اس کی قدر کرنی چاہیے۔

میں نے ہاں کہہ دی اور وہ خوش ہوگئی۔ میں نے بھی چاچا انور شاہ کو فون پر آج شام کا وقت لینے کا کہہ دیا۔ انہیں ابھی نہیں بتایا گیا تھا کہ کل صبح اور شام میں کیا ہوا تھا۔

چاچا انور شاہ نے آدھے گھنٹے بعد ہی مجھے فون کر کے بتا دیا کہ بھائی بھتیجے! اب پروگرام کینسل مت کرنا۔ یہ اچھا شگون نہیں ہے۔ آج شام تیار رہنا میں گھر پر ہی آؤں گا اور پھر نکل چلیں گے۔

میں اب انہیں کیا بتاتا۔ تاہم میں نے کالیا کو فون کر کے بتا دیا کہ میرا آج شام کہاں جانے کا قصد تھا۔

"ابے لے جگری! بلے بلے ہوگئی یہ تو۔ تجھے سہرا سجانے کی پڑ گئی۔ سلام پیش کرتا ہوں تیری جی داری کو کہ ایسے حالات میں بھی تو زندہ دلی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔" اس نے جیسے چھوٹتے ہی کہا۔

"طنز کر رہے ہو مجھ پر؟" میں نے ہولے سے کہا۔

"ابے لے! میں تجھ پر طنز کروں گا کوئی۔" وہ ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا پھر اس کی ایک گہری سانس لینے کی آواز آئی بعد میں وہ بولا۔

"جگری! سچ پوچھے تو مجھے بڑی خوشی ہوگی، ایک عرصہ ہوگیا ہے کسی اپنے کی شادی دیکھنا نصیب ہو، سر پہ سہرا دیکھوں، خوب بھنگڑے ڈالوں اور دھینگا مشتی کروں، پر یار جگری! کون تھا دنیا میں ایسا جہاں ایسی باجوں گاجوں والی ہنگامہ خیز شادی دیکھنا نصیب ہوتی، تیری شکل میں ایک سچا یار جگری اور بھائی ملا تو سچ پوچھو بڑی خوشی ہوئی ہے مجھے۔"

کالیا کا لہجہ دردانگیز تھا۔ بڑی عجیب کسک محسوس ہوتی تھی اس کی آواز میں وہ واقعی اکیلا ہی تھا دنیا میں کون تھا اس کا؟ مجھے اگر وہ اتنا مان دیتا تھا تو میری یہ خوش قسمتی تھی۔ میں نے کہا۔

"خوشی تو مجھے بھی ہوگی جب تو میری شادی پر یہ سب کچھ کرے گا، پر یار! ابھی بات آگے بڑھانی ہے دعا کر کام بن جائے، عطا محمد ہاں کردے۔"

"ابے لے جگری! کیسے نہیں کرے گا وہ ہاں، آخر کو وہ تجھے اچھی طرح جانتا ہے تیری قربانیاں اور جاں نثاری کو وہ بھول سکتا ہے بھلا۔ پر یار! تو نے پہلے کبھی تذکرہ نہیں کیا، کیا پسند ہے کوئی تیری؟"

"معاف کرنا یار! حالات ہی ایسے رہے اور پھر موقع بھی تو نہیں ملا ہمیں کبھی اس موضوع پر بات کرنے کو، ویسے وہ میری پسند ہے۔ فوزیہ نام ہے اس کا۔"

"ارے واہ بڑا پیارا نام ہے ہماری ہونے والی بھابی کا یقیناً وہ خود بھی پیاری ہوگی۔ میں تو اسے بہت تنگ کروں گا اور کیوں نہ کروں آخر میں اس کا لاڈلا دیور جو کہلاؤں گا۔" وہ واقعی ایک سچی خوشی اور محبت سے کہہ رہا تھا۔ میرے اندر رقت سی اترنے لگی۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں یار! تو یوں بھی ہم سب کا ہی لاڈلا بھائی ہے، میرا، فہیم کا اور سب سے زیادہ عاصمہ بہن کا۔" میں نے محبت سے کہا تو وہ ایک آہ بھر کے بولا۔

"ہائے جگری! خوش کردیا تو نے کتنا خوش قسمت ہوں میں کہ مجھے تم لوگوں کی صورت میں ایک پورا خاندان مل گیا۔"

"تو ہمارے خاندان کا ہی ایک فرد ہے جگری!" میں نے پُرزور لہجے میں کہا۔ "اچھا اب مجھے اجازت دے باقی باتیں بعد میں۔"

"پر جگری! ذرا خیال سے آنا جانا کرنا۔" اس نے کسی خدشے کے تحت کہا۔ "ویسے تو ابھی کچھ عرصے کے لیے راکا اپنے زخم ہی سہلاتا رہے گا مگر پھر بھی احتیاط اچھی چیز ہے۔"

"میں خیال کروں گا اور تو بھی اپنا خیال رکھنا۔" میں نے کہا اور رابطہ منقطع کردیا۔

☆......☆

ٹھیک پانچ بجے چاچا انور شاہ ہمارے گھر آگئے۔ وہ خاصے تیار ہوکے آئے تھے۔ ڈبل گھوڑا بوسکی کی شلوار قمیص اور کاندھوں پر اچھی والی چادر تھی۔ میں نے بھی نئی والی پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ عاصمہ نے بھی حسب دستور اپنی سی تیاری کرلی تھی۔

ہم تینوں کار میں سوار ہوئے اور عطا محمد کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوگئے۔

قائدآباد پہنچنے میں ہمیں بمشکل نصف گھنٹا لگا تھا۔ البتہ سارے راستے میرے دل و دماغ میں طرح طرح کے وسوسہ انگیز خیالات گردش کرتے رہے، ایسا چاچا انور شاہ کی باتیں سننے کے بعد ہی ہوا تھا۔ وہ بہرحال ایک جہاندیدہ اور تجربہ کار انسان تھے۔ بھانت بھانت کے لوگوں کا انہیں تجربہ تھا۔ کون کیا اور کیسا تھا وہ سب انہیں معلوم تھا جبکہ میں فوزیہ کا رشتہ لینے کو جس قدر آسان سمجھے ہوئے تھا وہ اتنا آسان نہ تھا۔

میں معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ میرے دل میں "آسانی" والی بات یہی تھی کہ ایک معذور اور جوان بیٹی کا باپ کتنا مجبور اور دکھی ہوتا ہے۔ میرے خیال میں ایسے باپ کو تو خوشی خوشی اپنی ایسی بیٹی کا رشتہ ایک جوان اور بھلے چنگے آدمی کے ہاتھ میں تھما دینا چاہیے تھا اور پھر معاملہ بھی میرے جیسے آدمی کا ہو جوان کا دیکھا بھالا ہی نہیں بلکہ ان چشیدہ بھی تھا۔ میں پھر صاف گوئی سے کہوں گا کہ مجھے یہی زعم تھا کہ عطا محمد اپنی بیٹی فوزیہ کا رشتہ دینے سے بالکل بھی انکار نہیں کریں گے۔

بہرطور ہم ان کی رہائش گاہ پہنچے۔ ہمارا اور بالخصوص عاصمہ کا عطا محمد نے بڑے پُرتپاک انداز میں استقبال کیا تھا اور خوشی کا اظہار بھی، انہوں نے ازراہِ شفقت سے عاصمہ کے سر پر ہاتھ دھر کر پیار بھی کیا تھا۔ مجھے ان کا انداز اپنا اپنا سا لگا تھا۔ جس سے مجھے کافی حوصلہ ہوا تھا مگر چاچا انور شاہ کی باتیں بھی میرے دماغ میں ہنوز گردش کررہی تھیں۔

ہم کچھ فروٹ اور مٹھائی وغیرہ لے گئے تھے۔ عاصمہ تو پہلے اندر زنان خانے میں فوزیہ کے ساتھ بیٹھی باتیں کرتی رہی تھی اس کے بعد جب اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد ذرا سنجیدہ باتوں کا دور چلا تو وہ اٹھ کر نشست گاہ میں آگئی جہاں ہم، یعنی میں، چاچا انور شاہ اور عطا محمد بیٹھے تھے۔

عاصمہ کو وہاں آکر بیٹھتے پایا تو عطا خاصی حیرت سے بولے۔ "ارے بیٹی! کیا فوزیہ نے تمہیں کمپنی نہیں دی؟ وہ تو بے چاری خود ایسے موقعوں کو ترستی ہے۔"

موقع کی مناسبت سے انہوں نے بھی ہلکے سرمئی کلر میں راسلک کی بیش قیمت شلوار قمیص اور اس پر سفید رنگ کی واسکٹ پہن رکھی تھی۔ بالوں میں تیل لگا کر انہیں سلیقے سے کنگا کر رکھا تھا اور ہلکی داڑھی بھی چھوڑ رکھی تھی جو وسمہ لگی تھی۔ یہ ان کے بھاری چہرے پر جچ رہی تھی۔

"نہیں انکل! ایسی بات نہیں۔" عطا محمد کے کہنے پر عاصمہ نے ہلکی مسکراہٹ سے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ "فوزیہ نے تو مجھے بہت اچھی کمپنی دی، بلکہ وہ تو بے حد خوش ہورہی تھی اور مجھے یہاں آنے ہی کب دے رہی تھی۔ میں ہی اسے تھوڑی دیر کے لیے بہلا کر یہاں آگئی، دراصل انکل آپ سے ہم ایک ضروری بات کرنے آئے تھے۔"

یہ کہتے ہوئے عاصمہ نے عطا محمد کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھے چاچا انور شاہ کی طرف دیکھا تھا۔

"ارے! ضرور کرو بھئی، کیا بات ہے؟" عطا صاحب فوراً کشادہ دلی سے بولے تو چاچا انور شاہ نے ہولے سے کھنکار کر مخاطب کیا۔

"جناب عطا صاحب! آپ سے تو ہم لوگ ڈھکے چھپے نہیں رہے، آپ نعمان میاں کو اچھی طرح جانتے ہیں اور اس کے حالات سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔"

"ہاں ہاں! کیوں نہیں بھئی۔" وہ فوراً میری طرف دیکھ کر بولا۔ "نعمان تو ہمارا اپنا ہے، بہت ہونہار برخوردار ہے اپنا۔ بھلا اس کی قابلیت پر کیا شبہ ہے۔"

مجھے کچھ حوصلہ بھی مل رہا تھا اور اندر سے ایک پریشان کن سی کھٹک کا بھی شکار تھا۔ پتا نہیں کہ اصل بات سنتے ہی وہ کس قسم کے ردِعمل کا اظہار کرنے والے تھے جبکہ مجھے پورا یقین تھا کہ ایسے "نازک" اور اہم وقت میں فوزیہ بھی دروازے کے پیچھے کھڑی یہ سب یقیناً سن رہی ہوگی اور اس کا دل بھی پردے کے پیچھے بے طرح دھڑک رہا ہوگا۔

"عطا صاحب!" چاچا انور شاہ نے کہنا شروع کیا۔ "نعمان میاں کے گھر کا میں ہی بڑا ہوں، ویسے تو یہ باتیں خواتین کے کرنے کی ہوتی ہیں، بدقسمتی سے نعمان کا کوئی نہیں ہے، سوائے ایک بہن عاصمہ کے یہی بے چاری آگئی کہ چلو کچھ بات تو آگے بڑھائی جائے۔" وہ اتنا کہہ کر لحہ بھر کو رکے تو عطا محمد کے چہرے کے تاثرات میں الجھن سی عود کر آئی، اسی لہجے میں بولے۔

"آخر تم کہنا کیا چاہتے انور شاہ! کھل کر کہو یار ایسی کیا بات ہوگئی کہ اتنا جھجک رہے ہو؟"

"جھجک کی بات تو ہے۔" چاچا انور شاہ نے صاف نیتی سے کہا۔ "ڈرتا بھی ہوں کہ کہیں آپ برا نہ منائیں لیکن بات بھی میرا خیال ہے ایسی برا منانے والی نہیں۔"

"اچھا بھئی اب یہ پہیلیاں بجھوانا چھوڑو اور بات کر ڈالو۔" بالآخر عطا محمد نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے ہنس کر کہا تو انور شاہ بولے۔

"عطا صاحب! وہ بات دراصل یہ تھی کہ ہمارے آنے کا مقصد..."

چاچا کہنے لگے اور میرا دل سینے میں اٹکنے لگا۔

"ہماری خواہش ہے کہ آ......آپ......نعمان میاں کو اپنی فرزندی میں لے لیں۔"

میری دھڑکتی نظروں نے دیکھا کہ اس بات پر عطا

محمد کے چہرے کے تاثرات ذرا متغیر سے ہوئے۔ اب بھی وہ شاید سمجھ و نا سمجھنے والی الجھن کا شکار تھے۔ اسی لہجے میں بولے۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں انور شاہ؟''

''انکل!'' اس بار عاصمہ نے ان سے مخاطب ہو کے دھیرے سے کہا تو وہ اس کی طرف گردن موڑ کر دیکھنے لگے کیونکہ وہ ان کے بائیں ہاتھ والے صوفے پر میرے قریب بیٹھی تھی۔

''ہم بھائی نعمان کے لیے آپ کی پیاری بیٹی فوزیہ کا رشتہ مانگنے آئے ہیں۔''

''کیا؟'' عطا محمد نے اس قدر چلا کر یہ جملہ اپنے منہ سے ادا کیا تھا کہ جیسے ہم نے کسی کو گولی مار دینے کی بات کردی ہو اور ساتھ ہی وہ برہمی کے تاثرات چہرے پر لیے کرسی سے ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ میرا چہرہ بجھ گیا۔ میرے اندر امیدوں کا تاج محل جیسے مسمار سا ہونے لگا۔ آنکھوں کی روشنی جیسے تاریکی میں بدلنے لگی۔ دل جیسے مٹھی میں کسی نے لے لیا ہو۔ عاصمہ کا چہرہ کھلا رہ گیا۔ فقط چاچا انور شاہ کے چہرے کے تاثرات واجبی تھے۔ جیسے انہیں پہلے سے ہی اندازہ ہو۔

''انور شاہ! تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ ہم اپنی بیٹی کا رشتہ تمہارے بھتیجے کو دے سکتے ہیں؟'' عطا محمد سخت خفا ہوتے لہجے میں اور ہم لوگوں کی طرف دیکھے بغیر سامنے غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے طنطناتے لہجے میں بولا۔ ان کا چہرہ غصے کی سرخی سے سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں تندی اتر آئی تھی۔

''ہم بہت کم لوگوں کو اپنے گھر کی دہلیز کے قریب کرتے ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہو جاتا کہ جس گھر کا نمک کھاؤ وہیں سیندھ بھی لگاؤ۔ نعمان تو کل کا چھوکرا ہے مگر انور شاہ! مجھے تم سے ایسی بات کرنے کی توقع نہ تھی۔''

بہ ظاہر اعلیٰ اخلاق کے حامل عطا محمد کا یہ روپ میرے لیے نیا اور افسوسناک ثابت ہوا۔ میرا خیال تھا کہ چاچا انور شاہ خاموشی اختیار کرلیں گے جیسا کہ انہیں اس بات کی پہلے سے ہی توقع تھی مگر وہ عطا محمد کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے بولے۔

''عطا صاحب! ہم نے خدانخواستہ آپ سے کوئی غلط بات تو نہیں کردی ہے جو آپ اس قدر غصے میں آگئے ایک رشتہ ہی تو۔''

''بس۔'' عطا محمد نے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر چاچا انور شاہ کو مزید کہنے سے روک دیا۔

''تم لوگ جاسکتے ہو، اس سے پہلے کی مجھ سے کوئی بدمزگی ہوجائے اور مہمانوں کا پاس رکھنا ہمارے لیے مشکل ہوجائے۔''

میں نے دیکھا، چاچا انور شاہ کے چہرے پر بھی ناگواری کے اثرات ابھرے تھے۔ ان کی اس طرح تذلیل ہوتے دیکھ کر مجھے بھی دکھ ہوا تھا۔ یہ سب انہوں نے میری ہی خاطر تو برداشت کیا تھا جبکہ بے چاری عاصمہ تو حیران پریشان سی بیٹھی رہ گئی۔

''بہت بہتر عطا صاحب!'' چاچا انور شاہ نے کھڑے ہوتے ہوئے عطا محمد سے کہا اور میری طرف دیکھ کر بولے۔ ''چلو بیٹا! ہم نے شاید واقعی کوئی غلط بات کہہ دی ہو۔'' ان کے اس جملے میں طنز کی کاٹ تھی۔

ہم تینوں وہاں سے چلے آئے۔ میرا دل اداس بنجر سا ہوگیا۔ مجھے چپ سی لگ گئی۔ ہم کار میں آبیٹھے اور وہاں سے روانہ ہوگئے۔ تب ہی عاصمہ نے کہا۔ ''ہنہ! غصے میں تو ایسے آگئے تھے جیسے ان کی بیٹی کوئی حور پری ہو، لنگڑی لولی بیٹی پر اتنا گھمنڈ۔''

''عاصمہ! مت کہو ایسا اس میں فوزیہ کا کیا قصور بھلا۔'' میں نے بہن کو ٹوکا۔ چاچا انور شاہ نے بھی عاصمہ کو سمجھایا۔

''نہیں بیٹی! ایسا نہیں کہتے، بری بات ہے یہ۔ فوزیہ ان کی اولاد ہے، ان کی مرضی۔''

''سوری بھیا! چاچا جانی! بس، ایسے ہی غصے میں میرے منہ سے نکل گیا تھا۔'' عاصمہ نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''مگر میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ انکار کرنے کا کوئی طریقہ بھی ہوتا ہے۔ وہ تو رشتے کی بات سن کر ایسے ایک دم چراغ پا ہوگئے جیسے ہم نے کوئی گالی دے دی ہو۔''

''عاصمہ بیٹی! میں نے پہلے ہی نومی سے کہہ دیا تھا کہ انہیں یہ بات بری لگ سکتی ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ عطا محمد جیسے لوگ اپنی لڑکیوں کا رشتہ خاندان سے باہر نہیں کرتے ہیں اگر کوئی مانگے بھی تو انہیں بہت برا لگتا ہے۔''

''حیرت ہے۔'' عاصمہ پیشانی مسلتے ہوئے بولی۔

آتے وقت کار میں نے ہی ڈرائیو کی تھی مگر اب لوٹتے سمے چاچا انور شاہ نے دانستہ خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی اور میں ان کے برابر چپ چپ سا بیٹھ گیا تھا جبکہ عاصمہ پچھلی سیٹ پر تھی۔

قاعدہ آباد چورنگی سے کار گھما کر ملیر کی طرف موڑ لی تھی۔

''ویسے سچ پوچھیں تو مجھے خوشی ہی ہوئی ہے ایک طرح سے بھیا کی پسند پر مجھے افسوس تو ہوا تھا اندر سے مگر میں ان کی پسند پر خاموش رہی تھی۔ میرے پیارے بھائی جان کے لیے لڑکیوں کی کیا کمی ہے۔ ایک سے ایک ڈھونڈ کر دکھا دوں گی۔''

وہ شاید میرا اداس اور اترا ہوا چہرہ دیکھ کر ایسا کہہ رہی تھی ورنہ بھلا دل کی بات کون نہیں سمجھتا تھا۔

مجھے ایسی چپ لگ گئی تھی کہ میرا کوئی بھی بات کرنے تک کو دل ہی نہیں چاہا تھا اور میں گھر پہنچنے تک اسی طرح ہی گم صم سا بیٹھا رہا تھا۔ ماسوائے عاصمہ کو ایک ذرا ٹوکنے کے۔

پھر چاچا انور شاہ اور عاصمہ نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ ہم گھر پہنچ گئے۔ چاچا انور شاہ مجھے دلاسہ دے کر لوٹ گئے، اگرچہ عاصمہ نے انہیں رات کے کھانے کے لیے روکنا چاہا تھا مگر وہ نہ رکے تھے جبکہ میں اپنے کمرے میں آگیا اور نڈھال سا بستر پر گر سا گیا۔

مجھے واقعی امید نہ تھی کہ عطا محمد اپنی بیٹی کا رشتہ دینے سے اس قدر سخت لفظوں میں انکار کردیں گے۔ فوزیہ میری پہلی محبت تھی اور شاید آخری بھی میں نے اس سے پہلے بھلا کبھی کسے چاہا تھا؟ بلکہ اس طرف تو کبھی دھیان ہی نہیں گیا تھا میرا کہ دل کے معاملات بھی ہوتے ہیں۔

میں بالکل بجھ سا گیا تھا۔ مجھے اپنی دنیا ہی اندھیرے میں ڈوبی ڈوبی سی نظر آنے لگی تھی۔ میری ہمت میرا حوصلہ جیسے فوزیہ کی محبت کے دم خم سے ہی قائم تھا۔ اس کے حصول کی آس ٹوٹی تو جیسے اندر میرا سب کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا۔ مایوسی اور دکھ کیا ہوتا ہے، اس کا احساس مجھے آج ہو رہا تھا۔ میں نے اس سے پہلے بھلا کب کسی سے محبت کی تھی۔ فوزیہ کا چہرہ چشم تصور میں بار بار ابھر کر محو ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ دونوں ہاتھ میری طرف پھیلائے ہوئے تھی، میری طرف بڑھنے کی کوشش کررہی تھی مگر کوئی اسے مجھ سے دور کھینچے لے جارہا تھا۔ بے اختیار میرے بھی دونوں بازو اسے پالینے کے لیے وا ہوئے تو تصور کی کارستانی کھلی اور میں اپنا دل مسوس کر رہ گیا۔

میں سوچ رہا تھا۔ فوزیہ کی کیا حالت ہو رہی ہوگی؟ اس نے بھی دروازے کے یا پردے کے پیچھے سے ضرور سنا ہوگا، اپنے باپ کا سخت لفظوں میں انکار اور ہمارا بے مرام لوٹ آنا۔ اس غریب کے دل پر بھی تو بیت رہی ہوگی۔

اچانک مجھے فوزیہ سے سیل فون پر بات کرنے کا خیال ابھرا۔ مجھے اس سے بات کرنے کی شدید خواہش ابھری تھی لیکن پھر اس کے باپ کے سخت الفاظ میری سماعتوں میں گونجنے لگے۔ میں کوئی سر پھرا عاشق تو تھا نہیں کہ منہ پھاڑ کپڑے جھاڑ اس کے پیچھے پڑ جاتا۔ نہ ہی کسی فلمی ہیرو کی طرح گنڈاسا ہاتھ میں پکڑ لیتا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہ تھا کہ میں فوزیہ کے حصول اور محبت سے دست بردار ہونے لگا تھا۔

تب ہی ایکا ایکی میرے دل میں پہلی بار سرکشی کی لہر ابھری۔ میں نے فوزیہ سے سچی محبت کی تھی۔ وہ بھی میری وفا کا دم بھرتی تھی تو پھر میں اسے کیوں نہیں حاصل کرسکتا تھا۔

میں ابھی فوزیہ کو فون کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ میرے سیل پر میسج کی بپ ابھری۔ میں نے چونک کر اسکرین پر دیکھا اور میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور فوراً میں نے اس کا میسج پڑھا۔ صرف اسی قدر لکھا تھا۔

''یہ...... سب کیا ہوگیا نعمان؟''

مجھے حیرت ہوئی کہ اس نے فون کیوں نہیں کیا؟ جب میں نے یہ سوچا تو اپنا ارادہ بدل لیا۔ ہوسکتا تھا کہ اسے کوئی مجبوری ہو اور وہ بعد میں کسی وقت فون کرے؟

اسی وقت اس کا دوسرا میسج آگیا۔ میں نے پڑھا۔ لکھا تھا۔

''نومی! میں تھوڑی دیر بعد بات کرتی ہوں۔ اوکے؟'' اس نے آخر میں سوالیہ نشان بنایا تھا۔ میں نے بھی فوراً ''اوکے'' کا ریپلائی کردیا۔

تھوڑی دیر گزری تو عاصمہ کمرے میں آئی۔

''بھائی جان! کھانا ادھر ہی لے آؤں؟''

''تم کھالو مجھے ابھی بھوک نہیں ہے۔'' میں نے اس سے کہا۔

''بھوک تو مجھے بھی نہیں لگ رہی چلیں جب لگے تو مجھے بتا دیجئے گا بھائی جان!''

''نہیں تم کھالینا کھانا مجھے بھوک نہیں ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹی تو وہ چند لمحہ دروازے پر سوچتی کھڑی رہی پھر چند قدم اٹھاتی قریب آئی اور ہولے سے بولی۔ ''بھائی جان! آپ دکھی ہو رہے ہیں؟''

میں نے اپنے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ سجاتے

ہوئے کہا۔ ''ارے نہیں بہنا! ایسی بات تو نہیں۔ بس! تھوڑا سا تو دکھ ہوتا ہی ہے نا۔'' میں نے کسی خاص تاثرات کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا۔ میں اسے بھی دکھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ میری بہن تھی اور مجھے غم زدہ دیکھنا اس کے لیے بھی تکلیف کا باعث بنتا۔

''بھائی جان! ہر کام میں اللہ کی بہتری ہوتی ہے۔ فوزیہ یوں بھی آپ کے ساتھ نہیں چل سکتی تھی۔ وہ تو یوں بھی نہیں چل سکتی ہے۔ آپ دیکھنا، میں خود آپ کے لیے ایک اچھی اور پیاری سی لڑکی ڈھونڈوں گی۔ وہ آپ کو بہت خوش رکھے گی۔'' وہ جیسے بچوں کی طرح خوش ہو کے بولی۔ میں بھی اس کا دل رکھنے کے لیے ہنس دیا۔ وہ چلی گئی اور میرا دل پھر گھٹنے لگا۔

مجھے فوزیہ کے فون کا شدت سے انتظار تھا جو پورے ایک گھنٹا بعد آیا۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔

میں نے ہینڈ فری لگا لیا تھا تاکہ اطمینان اور تسلی سے فوزیہ سے بات کرسکوں اور ضروری تبادلۂ خیال بھی۔

میں نے افسردہ مگر بے قراری سے اسے پکارا۔ ''ہیلو، فوزیہ!''

دوسری جانب فوزیہ کی آواز کی بجائے ہلکی سسکیاں ابھرتی سنائی دی تھی۔

''رو رہی ہو تم؟'' میں نے مرتعش لہجے میں ہولے سے کہا۔

''آ......آپ......ناراض ہیں مجھ سے؟'' اس کی سسکتی ہوئی سی آواز ابھری۔

''ہرگز نہیں، بھلا میں تم سے ناراض ہو سکتا ہوں فوزیہ!'' میں نے فوراً جواب دیا۔ یہ الفاظ واقعی میرے دل کی گہرائیوں سے نکلے تھے۔

''مم...... مجھے تو بابا جانی سے بالکل بھی ایسی امید نہ تھی کہ انہیں میرے رشتے والی بات اس قدر بری لگے گی۔'' اس نے ذرا سنبھل کر کہا۔ لہجہ اب بھی پژمردہ سا تھا۔

''مجھے بھی بے حد حیرت ہوئی تھی اور اس سے زیادہ افسوس بھی ہوا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''وہ تو اچھے بھلے تھے کہ تمہارے رشتے کی بات پر ایک دم برہم ہو گئے اور غصے کے مارے اس قدر لال پیلے ہو گئے تھے کہ بس، ہمیں دھکے دے کر گھر سے باہر نکالنے کی کسر باقی رہ گئی تھی۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں تلخی عود کر آئی تھی۔ آگے بولا۔ ''مجھے بھی یہ ایک اچھی خوش فہمی رہی تھی کہ اپنی بیٹی کے رشتے کی بات سنتے ہی وہ خوشی سے مجھے اپنے گلے سے لگا لیں گے۔ وہ مجھے ذاتی طور پر پسند بھی کرتے تھے۔''

جواب میں فوزیہ نے کوئی ملال بھرا جملہ ادا کیا تھا اور اس دوران اچانک میرے ذہن میں ایک سوال ابھرا اور میں نے کہا۔ ''فوزیہ۔''

''ہاں!''

''ایک بات بتاؤ۔ کیا تمہیں خود کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ تمہارے بابا جانی تمہارا رشتہ میرے ہاتھ میں دینے پر انکار بھی کرسکتے ہیں؟''

فوزیہ سے یہ سوال پوچھنے کا میرا ایک مقصد تھا کیونکہ اس وقت چاچا انور شاہ کی باتیں میرے کان میں گونج رہی تھیں جب میں نے پہلی بار ان سے فوزیہ کے رشتے کے سلسلے میں بات کی تھی۔

''میں تمہاری بات کا مطلب سمجھ رہی ہوں نعمان!'' دوسری جانب سے فوزیہ کی آزردہ سی آواز سنائی دی۔ ''جواب دینے سے پہلے یہ پوچھ سکتی ہوں کہ تم نے یہ سوال کیوں کیا؟ کیا اس لیے کہ میں نے جانتے بوجھتے ہوئے تمہاری اور تمہارے گھر والوں کی......'' اس نے یہ کہتے ہوئے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے بھی صاف گوئی اپناتے ہوئے اسے چاچا انور شاہ کے پیش از وقت خدشات کے بارے میں بتا دیا اور آخر میں وضاحتی لہجے میں بولا۔

''میں یہ سوچ رہا تھا کہ جب چاچا انور شاہ کو اس بات کا اندازہ تھا کہ تمہارے بابا جانی تمہارا رشتہ دینے سے انکار بھی کرسکتے ہیں تو تمہیں کیوں نہیں ہوا؟ حالانکہ تم ان کی بیٹی ہو اور اپنے خاندانی معاملات کا تو تمہیں بھی پورا ادراک ہونا چاہیے تھا؟''

''میں نے تم سے کچھ نہیں چھپایا تھا نومی!'' اس نے ایک گہری اور دکھ بھری سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ ''یہ حقیقت ہی ہے کہ مجھے بھی اس بات کا خدشہ تھا۔ کیونکہ ہمارے خاندان میں آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ کسی لڑکی کی شادی خاندان سے باہر کی گئی ہو مگر مجھے کچھ اُمید تھی۔ کیونکہ میری ایک مجبوری تھی جس سے سب ہی واقف ہیں، دوسرے یہ کہ مجھے بابا جانی کی طرف سے یہ خوش گمانی تھی کہ وہ ایک مختلف سوچ رکھتے ہیں اور شاید انہیں بھی کچھ حقیقت کا اندازہ ہو اور وہ اس رشتے پر ہاں کردیں۔''

اس کی بات سن کر میں ایک گہری سانس کھینچ کر رہ گیا۔ پھر بے چینی سے بولا۔ ''اب تو یہ سب ہو چکا۔ سوچنا یہ

ہوگا اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''تمہارے خیال میں کیا کرنا چاہیے ہمیں؟'' الٹا فوزیہ نے یہ سوال مجھ سے کر ڈالا مگر دوسرے ہی لمحے بولی۔ ''نعمان! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مجھے تم سے محبت ہے اور تم ہی میری پہلی اور آخری محبت ہو۔ تم مجھے نہ ملے تو میں زہر کھا لوں گی۔''

''نہیں فوزیہ! ایسا مت کہو۔'' میں تڑپ کر بولا۔ ''دکھ تو مجھے بھی ہوا ہے کہ ظالم سماج نے ہمارے راستے جدا کرنے کی کوشش کی ہے مگر ہمیں اس طوفان کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ خود میرا بھی یہی حال ہے فوزیہ! تمہارے بابا جانی کے انکار کے بعد تو مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا۔ اپنا آپ بھی نہیں!'' میری آواز اور لہجے میں رقت اترنے لگی تھی۔

''حال تو میرا بھی یہی ہے نومی! مجھے دکھ ہوا کہ بابا جانی نے تم لوگوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا۔ انکار ہی کرنا تھا تو یہ بات آرام سے بھی کرسکتے تھے۔ برہم ہونا مناسب نہیں ہوتا۔'' وہ بولی۔

''اب تو یہ سب ہو چکا آگے کیا کرنا ہے، یہ سوچو؟'' میں نے پیش آئندہ کے بارے میں اس کی رائے لینا چاہی تو وہ فوراً بولی۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں نومی؟ جو کرنا ہے تمہیں ہی کرنا ہے۔ میں تو خود!'' اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ سسک پڑی اور میں اس کی ادھوری بات کا مطلب سمجھ کر اپنا دل مسوس کر رہ گیا پھر فوراً اسے تسلی دی۔

''فوزیہ! تم فکر نہ کرو، میں اس مسئلے کے بارے میں جلد ہی کچھ سوچتا ہوں۔ تم دل چھوٹا مت کرو اور ابھی آرام کرو۔''

''میری آج کی ساری رات اور بعد میں آنے والی راتیں بھی آنکھوں میں ہی کٹیں گی نومی! اب سکون مجھے کہاں نصیب ہوگا۔'' وہ جیسے ٹوٹے ہوئے دل اور لہجے میں بولی۔

''حوصلہ پکڑو فوزیہ!'' میں نے اپنے لہجے اور آواز میں مضبوطی لاتے ہوئے کہا۔

''میں نے کہا ابھی کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا ہماری، کچھ دن گزرنے دو، کچھ باتیں ذہن میں رفتہ رفتہ ہی آتی ہیں، ممکن ہے کوئی حل ذہن میں آجائے۔''

کہنے کو تو میں نے اسے تسلی دے دی تھی مگر خود مجھے بھی اس کا امکان کم ہی نظر آرہا تھا کہ بھلا اس مسئلے کا کیا حل ہوسکتا تھا؟

میں نے وہ رات سونے کی پوری کوشش چاہی تھی مگر نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور رہی تھی۔ میں ابھی سونے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ ایک بار پھر میسیج کی بپ ابھری، دیکھا تو چونک پڑا۔ یہ زنیرہ کا میسیج تھا۔

''جاگ رہے تو کال کرلوں؟'' اس نے پوچھا تھا۔

اس وقت رات کا ایک بجنے والا تھا۔ مجھے حیرت تو ہوئی کہ اس وقت بھلا زنیرہ نے ایسی کیا بات کرنا تھی؟ لہٰذا میں نے اسے میسیج کا جواب دینے کی بجائے خود ہی کال کر ڈالی۔

''تم نے کیوں کیا فون؟ میں کرلیتی، میرا پیکیج ہوتا ہے۔'' دوسری جانب سے زنیرہ کی کھنکتی آواز ابھری۔ سلام کے بعد اس نے کہا۔ میں نے بھی جواب دیا اور بولا۔

''ایک ہی بات ہے۔ خیریت تو ہے ناں سب؟'' میں نے آخر میں پوچھا۔

''اپنی خیریت بتاؤ، یہاں تو سب ٹھیک چل رہا ہے۔'' وہ بولی۔ ''ابھی ایک گھنٹا پہلے ہی عاصمہ سے بات ہوئی تھی فون پر اسی نے مجھے بتایا تھا کہ تم لوگ آج فوزیہ کے ہاں گئے تھے، رشتے کے لیے۔'' اس نے کہا اور میں چونک پڑا۔

جیسا کہ مذکور ہو چکا، زنیرہ کو ایک نازک اور حساس، مجبوری کے تحت میں پہلے ہی فوزیہ اور اپنے معاملۂ دل کے بارے میں بتا چکا تھا لیکن یہ اسے نہیں پتا تھا کہ ہم آج شام (یعنی گزری ہوئی کیونکہ اب رات کا ایک بج رہا تھا) فوزیہ کا رشتہ مانگنے عطا محمد کے ہاں گئے تھے، جہاں سے اب انکار مل چکا تھا۔ عاصمہ بہن سے فون پر ان دونوں کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ یہ اس وقت کی بات تھی جب عاصمہ کو میں نے کچھ عرصے کے لیے زنیرہ کے ہاں اقامت پذیر کر رکھا تھا اور وہیں سے ہی دونوں آپس میں گہری سہیلیاں بن چکی تھیں۔

''تو اس نے تمہیں سب بتا دیا۔'' بالآخر میں نے ایک یاس زدہ سی ہنکاری خارج کرتے ہوئے کہا۔

''تم نے تو مجھے کبھی نہیں بتانا تھا، سدا کا بیر جو رکھتے ہو تم مجھ سے۔'' وہ بولی۔

''اس میں بتانے والی کچھ ایسی خاص بات بھی تو نہ تھی، کیا بتاتا؟''

''بہت اداس اور مایوس لگ رہے ہو۔'' زنیرہ نے کہا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مزید بولی۔ ''نومی! تم ایک باہمت انسان ہو، میں تمہارے نیک مقصد سے بھی اچھی طرح

واقف ہوں لیکن جب تم نے میری طرف سے جانے کیا محسوس کر کے مجھے اپنے اور فوزیہ کے بارے میں حقیقت بتائی تھی تو یقین کرو بہت حیرت ہوئی تھی مجھے اور پہلی بار میرے دل میں یہ خدشہ ابھرا تھا کہ کہیں تم اس راہ میں اپنے اصل مقصد سے نہ ہٹ جاؤ۔ تم سن رہے ہو ناں میری باتیں؟''

میری طرف سے مسلسل خاموشی پا کر وہ ذرا رک کر آخر میں بولی اور مجھے اچھی طرح یاد تھا جب زنیرہ بستر علالت پر تھی اور میں اس کی تیمارداری اور اس کی خاطر کئی ایک مواقعوں میں اپنی جان کو خطرے میں ڈالا تھا تو مجھے اس کے رویے سے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے زنیرہ غیر محسوس طریقے سے مجھ میں خاص قسم کی دلچسپی لینے لگی تھی پتا نہیں یہ محض میرا خیال تھا یا واقعی میرا اندازہ درست تھا تو میں نے گھبرا کر اسے اپنی فوزیہ کی حقیقت بتادی تھی اور تب ہی اس نے اپنے اندر کی کسی کسک کو جیسے ہنسی میں اڑاتے ہوئے یہ سننے کے بعد کہا تھا۔

''اوہو تمھیں یہ خوش گمانی کب سے ہوگئی؟ خود کو تم کیا شہزادہ گلفام سمجھتے ہو؟''

لیکن اس کے یہ کہنے کے دوران میں نے ایک دکھ اور کرب کی جھلک اس کی آواز میں محسوس کی تھی جسے اس نے اپنی ہنسی میں چھپانے کی قدرے ناکام کوشش چاہی تھی۔

''ہیلو......نومی؟''

میری مسلسل پُرسوچ خاموشی پر اس کی دوبارہ پکارتی آواز ابھری تو میں نے مختصراً کہا۔ ''ہاں! میں سن رہا ہوں۔''

''نہیں، تم نہیں سن رہے ہو۔'' وہ بولی۔ ''کہیں اور کھوئے ہوئے ہو۔ عطا محمد کے...... انکار نے تمھیں لگتا ہے بہت غم زدہ کر دیا ہے!'' وہ کہے جارہی تھی اور مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میرا مذاق اڑا رہی ہو۔

''کیا ہم صبح بات کر سکتے ہیں؟'' بالآخر میں نے دل پر جبر کر کے ایک پُر آزاری ہمکاری خارج کر کے کہا تو وہ بولی۔

''ہوں...... ٹھیک ہے، شب بخیر مگر اپنا خیال رکھنا نومی لیکن ایک بات کبھی مت بھولنا کہ تمہارا اصل مقصد کچھ اور ہے جو کسی کے حصول سے زیادہ اہم ہے۔ آگے تمہاری مرضی۔'' یہ کہتے ہوئے ایڈووکیٹ زنیرہ نے رابطہ منقطع کر دیا۔

مجھے زنیرہ کی اس آخری بات پر بے حد غصہ آیا تھا لیکن پھر دوسرے ہی لمحے مجھے اپنے اس فطری ردِعمل پر خود ہی شرمندگی بھی ہوئی۔

میں فوزیہ کے معاملے میں جذباتی ہو رہا تھا لیکن زنیرہ کو کیا حق حاصل تھا کہ وہ میرے بارے میں ایسے کمنٹس کرتی؟ یا مجھے ایسا سمجھتی کہ میں اپنے اصل مقصد سے دور ہو رہا ہوں۔ کیا وہ نہیں جانتی کہ میں نے اب تک اسی مقصد کے پیچھے اپنی جان لڑا رکھی ہے اور کتنے نقصانات بھی اٹھائے ہیں مگر پیچھے نہیں ہٹا۔ کیا زنیرہ یہ بھی بھول گئی تھی کہ میں نے کتنی ہی بار اپنی جان پر کھیل کر اس کی جان بچائی تھی، محض اسی لیے کہ وہ اس نیک مقصد میں میرے ساتھ تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے اس کی کوئی ایسی ناقابل تلافی سزا ملے جو میرے ضمیر پر تاعمر بوجھ بن جائے۔

تو پھر زنیرہ نے یہ کیوں سمجھ لیا تھا کہ میں اپنی محبت اپنی فوزیہ کے حصول کے سامنے اپنے اصل مقصد سے دور ہو رہا ہوں؟ مقصد تو یہی نکلتا تھا اس کی بات کا۔

''نہیں زنیرہ! تمھیں یہ کہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ میرے یہ دونوں معاملات ذاتی اور اہم نوعیت کے ہی ہیں، تم مجھ پر یہ الزام نہیں لگا سکتیں کہ میں ایک مقصد کو تیاگ کر دوسرے مطلب کی برآری میں مگن ہو گیا ہوں۔ ہرگز نہیں۔''

میرے اندر پھر وہی سرکشی کی لہر ابھری تھی۔ میرا جی چاہا کہ اس ضمن میں اسی وقت زنیری کو فون کر کے یہ سب کہہ ڈالوں مگر یہ میں نے کسی اور وقت کے لیے اٹھا دیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆......☆

صبح میری آنکھ دیر سے کھلی۔ وہ بھی عاصمہ نے ہی مجھے جگایا۔ میں... قدرے ہڑ بڑا کر اٹھا اور اس سے شکایت کر ڈالی کہ مجھے دیر سے کیوں جگایا؟ میں نے لاری اڈے جانا تھا۔

''بھائی جان! آپ رات کو دیر سے سوئے تھے۔ آپ کے کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ میں نے یہی سوچا کہ تھوڑی دیر سے ہی آپ کو جگاؤں...... مگر......''

''مگر کیا؟'' اس کے عجیب سے کھوئے کھوئے انداز سے میں نے قدرے چونک کی اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بھائی جان! اب شاید آپ کو لاری اڈے جانے کی ضرورت نہیں رہی ہے۔''

''کیا؟''

''ہاں! چاچا انور شاہ ابھی ابھی آئے ہیں۔ آپ فریش ہو کر آجائیں وہ دوسرے کمرے میں چائے پی رہے ہیں، وہی آپ کو ساری بات بتا دیں گے۔'' عاصمہ عجیب سے مغموم

انداز میں یہ کہہ کر لوٹ گئی اور میں بستر پر حیران و پریشان سا بیٹھا اسے جاتے دیکھتا رہا۔

میں منہ ہاتھ دھو کر سیدھا اسی کمرے میں پہنچا جہاں بقول عاصمہ کے چاچا انور شاہ چائے پی رہے تھے۔ ان کے سامنے ناشتے کے برتن بھی تھے۔ عاصمہ میرے لیے بھی ناشتا لے آئی تھی۔

میں نے چاچا انور شاہ کو سلام کیا اور ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''آؤ برخوردار!'' وہ ہولے سے بولے اور چائے کا مگ میز پر رکھا جو خالی ہو چکا تھا۔ عاصمہ بھی وہاں آخر خاموشی سے بیٹھ گئی تھی۔ میں حیرت اور الجھی ہوئی نظروں سے دونوں کے چہرے.... تکے جا رہا تھا پھر چاچا انور شاہ کے چہرے کی طرف دیکھ کر مستفسر ہوا۔

''چاچا! خیریت تو ہے؟ آج آپ بھی اڈے پر نہیں گئے؟'' پھر عاصمہ کی طرف ایک نظر ڈال کر مزید بولا۔ ''یہ عاصمہ کہہ رہی تھی کہ آپ نے اس سے کہا ہے اب اڈے پر جانے کی ضرورت نہیں رہی؟''

''اس نے ٹھیک کہا ہے۔'' چاچا انور شاہ بولے۔

''میں کچھ سمجھا نہیں، آخر مجھے کھل کر کیوں نہیں بتایا جارہا ہے کہ ہوا کیا ہے؟''

''ہونا کیا تھا بھتیجے!'' وہ بولے۔ ''شاید عطا محمد کو ہماری بات پر کچھ زیادہ ہی غصہ آگیا ہے۔ انہوں نے ہم دونوں کو ہی نوکری سے نکال دیا ہے۔''

''کیا؟'' میرے منہ سے یک دم نکلا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟'' مجھے جیسے یقین نہیں آیا۔

''یہ ہو چکا ہے۔'' وہ بولے۔ ''لگتا ہے عطا محمد نے ہماری رات والی بات کو کچھ زیادہ ہی اپنے دل پر لے لیا ہے۔''

''دل پر نہیں لیا ہے چاچا! یہ کہیں کہ اتنی سی بات کو انہوں نے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔'' عاصمہ نے ان کی بات پر تلخی سے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ وہ اپنا بغض اس طرح نکالنے کی کوشش کرے گا۔ یہ تو اس کی احسان فراموشی ہے۔'' مجھے ایک دم غصہ آگیا۔

''کیا وہ ہماری خدمات بھول گئے، جب ہم نے ہی ان کے اڈے کو بچایا تھا۔ اپنی جان پر کھیل گیا تھا میں چاچا! پولیس کی مار کھائی تھی میں نے ان کا اڈا بچانے کی خاطر، قتل کے ایک جھوٹے مقدمے میں پھنسنے سے بال بال بچا تھا میں۔ سیٹھ ستار اور حاجی مہران خان جیسے بڑے بڑے مافیائی غنڈوں سے میری جنگ چلی تھی اور انہیں ناکوں چنے چبا دیے تھے۔ نہیں چاچا! ہرگز نہیں۔ میں اسے یہ کمین پن نہیں کرنے دوں گا۔ ابھی چلیں میرے ساتھ اڈے پر، دیکھتا ہوں کون ہمیں نوکری سے نکالتا ہے۔'' میں مارے طیش کے اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تو چاچا انور شاہ نے بھی اپنی کرسی چھوڑ دی اور اپنے دونوں ہاتھوں سے میرے کاندھے کو تھام کر شفقت بھرے لہجے میں مجھے سمجھاتے ہوئے بولے۔

''برخوردار نومی! اس بات کا مجھے بھی غصہ ہے۔ بیٹھو، آرام سے بات کرتے ہیں، یوں غصے میں خود کو ہلکان کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

پھر وہ عاصمہ کی طرف دیکھ کر بولے۔ ''بیٹی! نومی میاں کو چائے دو۔''

میں کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ اس اثناء میں فہیم بھی اپنی وہیل چیئر میں وہاں آچکا تھا۔ یہ سب سن کر اسے بھی دکھ ہو رہا تھا۔

عاصمہ بہن نے مجھے توس میں مکھن لگا کر دیا مگر میں نے اسے صرف چائے بنانے کا کہا۔

''بڑی بدلحاظی دکھائی ہے اس شخص نے اسے بھائی جان کی قربانیوں کا ذرا بھی خیال آیا۔'' فہیم بھی برہمی سے بولا۔ ''میرا نہیں خیال کہ اس جیسے پست ذہنیت رکھنے والے شخص کے دوبارہ منہ لگا جائے۔ وہ اپنی ہٹ پر قائم رہے گا اور بلاوجہ کی بدمزگی ہو جائے گی۔''

''فہیم بیٹے! تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔'' چاچا انور شاہ نے اس کی طرف دیکھ کر تائیدی لہجے میں کہا۔

میرا دل و دماغ شدید قسم کے اضطراب اور پریشانی سے دوچار تھا۔ طیش بے بسی اور شکست خوردگی کے ملے جلے جذبات تلے میرا اندر اتھل پتھل کا شکار ہو رہا تھا۔ عطا محمد کا فوزیہ کا رشتہ دینے سے انکار اور آج صبح ہی اس کا مجھے اور چاچا انور شاہ کو نوکری سے بغیر کسی وجہ کے بیدخل کر دینے سے مجھے اس کی پست ذہنیت کا اچھی طرح سے اندازہ ہونے لگا تھا۔ اس کی طوطا چشمی دیکھ کر میں اندر ہی اندر بری طرح کھل رہا تھا۔

تاہم چند لمحات کی خاموشی اختیار کرتے ہوئے میں نے اپنی سلگتی ہوئی کیفیات پر قابو پانے کی کوشش چاہی پھر چائے کی چند چسکیاں لے کر چاچا انور شاہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''آپ کو اس بات کا کیسے علم ہوا؟''

”میں آج صبح لاری اڈے پہنچا۔“ وہ بتانے لگے۔
”وہاں پہنچا تو ہر کسی کو اکھڑے اکھڑے پایا۔ مجھے حیرت ہوئی، پتا چلا کہ عطا محمد آج خود بھی وہاں موجود تھا اور جب میں اس کے کمرے میں گیا تو مجھے اندر جانے سے روک دیا گیا اور کہا گیا کہ اب میرا اور میرے بھتیجے نعمان کا یہاں کوئی عمل دخل نہیں رہا ہے، مزید یہ کہ عطا صاحب نے ہم دونوں کو ہی بغیر کسی وجہ کے نوکری سے نکال دیا ہے۔
مجھے یہ سن کر پہلے حیرت اور پھر غصہ آیا۔ میں نے جب عطا محمد سے خود بات کرنے کے لیے زبردستی اس کے کمرے میں داخل ہونا چاہا تو مجھے اپنے انہی ساتھیوں نے اندر جانے سے روکنے کے لیے دبوچ لیا جن کے حقوق کی خاطر ہم لڑتے رہے تھے، آج وہ میرے ساتھ اس طرح پیش آرہے تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا اور میرا دل اس قدر خراب ہوا کہ میں نوکری پر اور ان سب پر لعنت بھیج کر چلا آیا۔“ اتنا کہہ کر وہ ذرا رکے اور پھر بولے۔
”برخوردار! یہ دنیا ایسی ہی ہے۔ مادہ پرست اور مطلب پرست...... فہیم بیٹا اور عاصمہ بیٹی ٹھیک کہتے ہیں کہ ان کے منہ لگنے کا کوئی فائدہ نہیں۔“
”بھائی جان!“ فہیم نے مجھ سے کہا۔ ”کیا آپ بھول گئے اپنی بات جو آپ نے مجھے ایک نصیحت کرتے ہوئے کہی تھی کہ ہمارا سماج ایک گٹر کی مانند بن چکا ہے، اس میں جتنا ڈنڈا گھمائیں گے، یہ صاف ہونے بجائے اس کے اندر سے اتنا ہی تعفن اٹھے گا۔“
میں نے بے اختیار ایک گہری سانس لی۔
”برخوردار! اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ کیا خبر یہ ہمارے لیے اچھا ہی ہوا ہو۔ اب دیکھو نا، اس نوکری کی وجہ سے تم کتنا پریشان بھی تو رہتے تھے، کتنے لینڈ مافیا کے لوگ تمہاری جان کے دشمن بن چکے تھے۔ نوکری کی بھلا کیا پرواہ ہے ہمیں، کسی بھی جگہ وہ آسانی سے مل ہی جائے گی، میرے جاننے والے ٹرانسپورٹر ہیں۔ میں سب سے پہلے تمہاری نوکری کی ان سے بات کروں گا۔“
یہ بات انور چاچا خود بھی جانتے تھے کہ جو مراعات اور جو پرکشش تنخواہ ہمیں عطا محمد کی نوکری میں ملتی تھی وہ کسی دوسری جگہ ملنا بہت مشکل تھا۔
نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھنا میرے لیے ایک نئی پریشانی کے مترادف تھا۔ فہیم بے چارہ خود آج کل بے کار تھا، اس میں ایک سبب اس کی معذوری کا بھی تھا۔ یہاں دو ٹانگوں والوں کو نوکری نہیں ملتی تو بھلا ایک معذور انسان کو کون پوچھتا۔ رہی عاصمہ تو اس کی ذمہ داری سے بھی مجھے جلد ہی سبکدوش ہونا تھا۔
وہ دن اسی اداسی اور پریشانی میں گزر گیا اور وہ سارا دن میں گھر سے ہی نہیں نکلا حتیٰ کہ اپنے یار کالیا سے بھی فون پر بات کرنے کو جی نہیں چاہا تو اس نے خود ہی فون کر کے میری خیریت اور آیندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں مجھ سے دریافت کیا تو میں بولا۔
”یار کالیا! تو میرے گھر آسکتا ہے؟“
”گھر؟ ابے لے کیا تو آج اڈے پر نہیں ہے جگری؟“ اس نے قدرے چونک کر پوچھا۔
”نہیں یار! آج میں سارا دن... گھر پر ہی رہا ہوں۔“
”تیری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟ گھر پر سب خیریت تو ہے ناں؟“ وہ بھی ہمارے گھر کا ہی ایک فرد بن چکا تھا اور فکر رکھتا تھا پھر جیسے اچانک اسے یاد آیا دوبارہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ”ابے لے میں تو پوچھنا ہی بھول گیا، تم لوگ آج عطا صاحب کے ہاں گئے تھے ناں! کیا ہوا؟ کہیں اس نے خدانا خواستہ ہماری ہونے والی بھابی کا رشتہ دینے سے انکار تو نہیں کر دیا؟“
”یہی بات ہوئی ہے یار!“ میں نے مردہ دلی سے کہا۔
”اوہو! کیا واقعی عطا صاحب نے انکار کر دیا ہے؟ یقین نہیں آتا یار جگری! مگر کیوں؟“
”یار! بس! ساری باتیں چھوڑ تو آجا، باقی باتیں ادھر ہی ہوں گی۔“
”میں ابھی پہنچتا ہوں۔“ اس نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔
ایک گھنٹے بعد وہ گھر پر میرے سامنے موجود تھا اور میں اسے سب بتا چکا تھا۔
جسے سن کر اسے بھی بے حد دکھ ہوا۔ بولا۔
”جگری! عطا محمد نے یہ اچھا نہیں کیا۔ اسی کا تو لاری اڈا بچانے کی خاطر تو نے کتنے پاپڑ بیلے تھے۔“
”ہاں! اور تو نے بھی تو میرا بھرپور ساتھ دیا تھا۔“ میں نے بے تاثر سی مسکراہٹ سے کہا۔
”اس بات کو چھوڑ، تیرے لیے تو جان بھی حاضر ہے جگری! پر یار! عطا محمد کو اس طوطا چشم کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔“
”یہ کام میں نے اللہ کے سپرد کر دیا ہے، وہی بہترین انصاف کرنے والا ہے۔“ میں نے کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے یار! مگر......“
”چھوڑ اب اس معاملے کو اس نوکری کی وجہ سے میں نے بھی خوامخواہ ہی لینڈ مافیا لوگوں سے دشمنی مول لے لی تھی، اب ان سب سے خود ہی جان چھوٹ چکی۔“
”جان تو ہم پہلے ہی ان سے چھڑا چکے تھے۔ انہیں جیل کی ہوا کھلا کر مگر اب بھلا لاری اڈے کو کن سے خطرہ ہے، جو عطا محمد جیسے احسان فراموش آدمی کے لیے پریشانی کا سبب بن سکے؟“
”ایسی بات نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”جس زمین اور جس لوکیشن پر عطا محمد کا یہ لاری اڈا بنا ہوا ہے، اس کے پیچھے صرف سیٹھ ستار اور حاجی مہران خان جیسے لوگ ہی نہیں تھے بلکہ اور لوگ بھی ہوں گے۔ وہ سب میری وجہ سے چھپے بیٹھے تھے۔ اب دیکھنا وہ سب دانت نکوس کر سامنے آجائیں گے۔“
”ابے لے جگری! کہیں یہ تیری خوش فہمی تو نہیں؟“ کالیا بولا۔
”ہرگز نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے چاچا انور شاہ نے ہی یہ بات بتائی تھی کہ لاری اڈے کی اس قیمتی زمین کے پیچھے اور بھی بہت سے لینڈ مافیا کے لوگ نظریں لگائے بیٹھے تھے لیکن میری وجہ سے... سیٹھ ستار اور حاجی مہران کا میرے ہاتھوں حشر دیکھ کر ڈر سے چھپے بیٹھے تھے۔“
”گولی مارو پھر...... لاری اڈے کو...... کوئی اور ڈھونڈ لینا نوکری تجھے کیا کمی ہے نوکری کی۔“
”لیکن اس نوکری کی اور بات تھی۔ یہاں میری اپنی بادشاہت قائم تھی مگر مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے، مجھے تو بس فوزیہ۔“ میں آگے نہ کہہ سکا تھا۔ فرطِ غم سے میرے حلق میں رقت اترنے لگی تھی۔
”ابے لے! تو نے ابھی سے ہی دل چھوٹا کر دیا۔ ابھی تو عشق میں امتحان اور ہوں گے آگے جگری!“ اس نے شاعرانہ لہجے میں کہا۔ ”تو حکم کرے تو میں فوزیہ بھابی کو ہی اٹھا لاؤں یہاں۔“
میں اس کی بات پر ہنس دیا۔ وہ جس کلچر کا بندہ تھا اسی انداز میں ہی بات کرنے کا عادی بھی تھا۔ میں نے کہا۔
”پہلے ہم پر اتنے بکھیڑے پڑے ہیں اور اب ایک نیا پال لیں۔ اس مسئلے کو بعد میں دیکھتے ہیں۔“
”ایک بات بتا جگری۔“ کالیا کچھ سوچتے ہوئے بولا۔
”کیا؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
”فوزیہ بھابی تیرے ساتھ ہے ناں؟ میرا مطلب ہے اب تو خود سمجھ جاناں یار! میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔“
”میں سمجھ گیا، آگے بول۔“
”بس پھر بے غم ہو جا، دنیا کی کوئی طاقت تم دونوں کو جدا نہیں کر سکتی۔“
”یار! وہ لڑکی بھی ہے اور مجبور بھی، ڈرتا ہوں کہیں وہ کمزور نہ پڑ جائے اس کے علاوہ ایک اور بات بھی تجھے پتا نہیں شاید۔“ کہتے ہوئے میں نے اسے فوزیہ کی معذوری“ کے بارے میں بھی بتا دیا۔ جسے سن کر کالیا کو ایک عجیب سی چپ لگ گئی۔
”چل چھوڑ یار! ان باتوں کو۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بعد میں دیکھ لیں گے یہ بتا اب ثمیر کا کیا کرنا ہے؟ شاہ میر سے اس کے بدلے میں ڈیل کرنا پڑے گی۔“
”چاہتا تو میں بھی یہی ہوں مگر وہ راضی نہیں ہوگا، ایک نمبر کا شاطر آدمی ہے۔“ کالیا خیال انگیز لہجے میں کہنے لگا۔
”اس نے ہمیں گھاس چرا ہوا سمجھ رکھا ہے۔ اپنی طاقت اور بدمعاشی کا اسے بہت زعم ہے، وہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے بدمعاش راکا کے ذریعے اپنے بیٹے کو ہمارے چنگل سے باآسانی چھڑا لے گا... اسی لیے تو ایک طرف اس نے تجھے گرفتار کروانے کی کوشش چاہی تھی اور دوسری جانب اپنے ٹاپ پروفیشنل کرمنلو میدان میں اتار دیے۔“
”اس کا تو مجھے بھی اندازہ ہے۔“ میں نے بھی ہونٹ بھینچ کر پُرخیال لہجے میں کہا۔ ”لیکن اب موجودہ صورت حال... میں جبکہ اس کے تینوں مہرے ہمارے ہاتھوں پٹ چکے ہیں، ممکن ہے وہ لے اور دے کی بنیاد پر اب ہم سے ڈیل پر رضامند ہو جائے؟“
”میرا خیال ہے نہیں، وہ ابھی ان کا پانی جانچنے کی کوشش کرے گا، اگلا لائحہ عمل بنائے گا لیکن تب تک اگر ہم راکا کا خاتمہ کر دیں تو بات بن سکتی ہے ورنہ راکا ہمیں بھاری نقصان پہنچانے کے پر تولے بیٹھا ہے، وہ آیا ہی اسی لیے ہے یہاں پر۔“ کالیا بولا۔ ”اسی لیے تو میں نے تیرے گھر پر اپنے لڑکوں کا سخت اور خفیہ پہرا لگا دیا ہے۔ یہی نہیں انہیں پوری چھوٹ بھی دے رکھی ہے کہ کسی بھی مشکوک آدمی کو دیکھو تو اسے موت کے گھاٹ اتار دو۔“
میں چند ثانیے کے لیے گم سم سا ہو گیا۔ کالیا کی بات کا صاف مطلب تھا کہ یا تو راکا کے اگلے وار کا انتظار کیا جاتا اور اسی میں اسے شکار کیا جاتا یا پھر اس کے وار کرنے سے پہلے ہی

اسے دبوچ لیا جائے جبکہ میری ذہنی و دلی کیفیات ایسی ہو رہی تھیں کہ میں ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے گھر اپنے معذور بھائی فہیم اور بہن عاصمہ کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا کہ نجانے کب درندہ صفت راکا ان پر حملہ بول دے۔ خطرہ ہر وقت ہی سر پر منڈلا رہا تھا۔ اگرچہ کالیا کے لڑکے بھی عام لوگوں کے بھیس میں اِدھر اُدھر مٹرگشت کر رہے تھے پھر بھی راکا اور اس کے ساتھی بھی ان سے کم خطرناک نہ تھے بلکہ وہ تو کالیا کے دیسی مارکہ ساتھیوں کے مقابلے میں زیادہ تربیت یافتہ بھی ہو سکتے تھے۔

میری اپنی تسلی کی بات اور تھی۔

اچانک کالیا کے سیل فون کی بیل سنائی دی۔ ہم چونکے۔ کالیا نے اپنا سیل نکال کر ہاتھ میں پکڑا اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

”ابے لے...... خیر ہووے...... جمی کا فون آ رہا ہے۔“ کہتے ہوئے اس نے سیل اپنے کان سے لگا کر کہا۔

”ہاں، جمی! سب خیریت تو ہے ناں؟“

میری دھڑکتی نظریں اس کے چہرے پر گڑھی ہوئی تھیں۔ جمی اس کا وہی ساتھی تھا جسے کالیا نے صفورا چورنگی والے مکان میں شمیر کی نگرانی کے لیے چھوڑ رکھا تھا۔ شمیر کو بھی وہیں یرغمال بنا کر رکھا گیا تھا۔

”کیا؟ آخر ہوا کیا ہے؟ کچھ تو بتا؟ کسی نے حملہ تو نہیں کر دیا مکان پر؟“ کالیا دوسری جانب سے اس کی بات سن کر بولا تھا۔ وہ خاصا پریشان اور جھلایا ہوا نظر آنے لگا تھا۔ نجانے جمی اسے کیا خبر دے رہا تھا۔

”ابے کہیں کوئی تیرے سر پر تو نہیں پہنچ گیا ہے اور گن پوائنٹ پر تجھ سے...... اچھا...... اچھا...... ٹھیک ہے ہم پہنچتے ہیں۔“ بالآخر یہ کہتے ہوئے کالیا نے رابطہ منقطع کر دیا۔ میں نے دیکھا اس کا چہرہ بری طرح گڑبڑایا ہوا تھا۔

”ہوا کیا ہے کالیا آخر؟ خیریت تو ہے ناں؟ کیا کہہ رہا تھا جمی؟“ میں نے بوکھلا کر ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

”کچھ گڑبڑ لگتی ہے جبکہ یہ سالا جمی کہہ رہا ہے کہ کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔“ کالیا پُرسوچ انداز میں بولا۔ ”کہہ رہا ہے کہ بس! آجاؤ یہاں ایک ضروری بات کرنی ہے فون پر بتانے سے اسے ہچکچاہٹ ہو رہی ہے۔“

”گڑبڑ صاف عیاں ہے کالیا!“ میں نے جیسے قیاس کے بل بوتے پر فوراً خطرے کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”کوئی وہاں پہنچ گیا ہے، ہمارا دشمن۔ اسی نے ہی جمی کو گن پوائنٹ پر رکھ کر یہ سب کہلوایا ہوگا۔“

”تمہارا خیال اپنی جگہ سو فیصد درست ہو سکتا ہے جگری!“ کالیا نے فوراً کہا۔ کیونکہ میرے دل میں بھی پہلا خدشہ یہی ابھرا تھا لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے، جمی نے تسلی کر دی ہے۔“

”تو پھر آخر ایسی کیا بات ہے جو جمی ہمیں فون پر نہیں بتا پا رہا؟“ میں نے الجھی ہوئی سوالیہ نظروں سے کالیا کی طرف دیکھا تھا۔

”یہ تو اب وہیں چل کر ہی پتا چل سکتا ہے۔“ وہ بولا۔ ”کم بخت کہیں خوامخواہ کا سسپنس تو نہیں پھیلا رہا؟“ اس نے آخر میں جمی کو کوسا۔

ایسے میں میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا، بولا۔ ”کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ شمیر سے مطلق کوئی بات کہنا چاہ رہا ہو؟“

کالیا میرا چہرہ تکنے لگا۔ میں آگے بولا۔ ”شمیر کو کچھ ہو تو نہیں گیا کہیں؟“

”ابے لے جگری! ایسی غلط فعال تو منہ سے مت نکال۔“ کالیا گھبرا کر بولا۔ ”تو جانتا ہے کہ شمیر ہی ایک ایسا ترپ کا پتا ہے ہمارے پاس جس سے معاملہ کسی حد تک قابو میں ہے۔“

”چلو یار! چلتے ہیں۔ ایسے دماغ ہی خراب ہوگا سوچ سوچ کر۔“ میں نے بھی بالآخر جھلا کر کہا اور پھر ہم اسی وقت روانہ ہو گئے۔

کار موجود تھی مگر کالیا بائیک لایا تھا۔ ہم اسی میں روانہ ہو گئے۔ بائیک کالیا چلا رہا تھا اور خاصی طوفانی رفتار سے کار چلا رہا تھا۔ میں نے کالیا کو پھر بھی احتیاط کے پیشِ نظر خبردار کر دیا تھا کہ ہمیں صفورا والے مکان میں محتاط ہو کر داخل ہونا پڑے گا۔

ہم وہاں پہنچ گئے۔ کالیا نے دروازے پر دستک دی۔ جمی نے ہی دروازہ کھولا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا اور خود اس کی بھی حالت کچھ ناگفتہ بہ دکھائی دیتی تھی۔

”ابے کیا ہوا ہے؟ یہ تیرے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟“

اندر آتے ہی کالیا نے اسے گھرک کر پوچھا تو جمی نے مرتعش سے لہجے میں بتایا۔

”استاد! شمیر مر چکا ہے۔“

(جاری ہے)

بیت بازی

قارئین

(ہادیہ ایمان، ماہا ایمان فورٹ عباس کا جواب)

خالدہ گجیج...... چنیوٹ

اپنے دل بے تاب سے میں خود ہوں پریشان
کیا دوں انہیں الزام میں کچھ سوچ رہا ہوں

فرحت الماس...... فیصل آباد

اِک سراپا حسن پر رنگ شباب
آفتاب اور دوپہر کا آفتاب

کائنات بتول...... ملتان

اک تم سے ملا کرنا، اک تم سے بچھڑ جانا
وہ کل کی حقیقت تھی یہ آج کا افسانہ

ذہین بانو...... ملتان

اس دل کی خلوتوں میں چراغاں ہے آج بھی
اک یاد ہے کہ شمع شبستان ہے آج بھی

ادریس خان...... کراچی

اس شہر بے انا میں انا کا اسیر تھا
جو شخص مر گیا ہے وہی باضمیر تھا

(سدرہ بانو ناگوری کراچی کا جواب)

نعیم احمد...... العین (یو اے ای)

نفرت سے شہر والے ملے اس سے سارے دن
کیا کرتا گاؤں لوٹ گیا، رات ہو گئی

نسرین اشفاق...... مظفر گڑھ

نہ دشت چھانے نہ بن کھنگالے نہ کوہ پیا بنے ہیں
اسی ندامت پہ جی رہے ہیں کسی کی خاطر کیا ہی کیا ہے

(ثاقب احمد عثمانی حیدرآباد کا جواب)

سدرہ بانو ناگوری...... ملیر کراچی

اس جان تکلم کو تم مجھ سے تو ملواتے
تسخیر نہ کر پاتا، حیران تو کر جاتا

نازیہ حمید...... نوشہرہ

آتی ہے تو کانٹے بھی دعا دیتے ہیں اس کو
جاتی ہے تو گلشن کو رُلا جاتی ہے خوشبو

(عبدالجبار رومی انصاری قصور کا جواب)

فہد حسن...... کراچی

یہ حسنِ تصور کی ہے سحر کاری
نہ وہ آرہے تھے نہ وہ آرہے ہیں

سید انیس احمد...... نارووال

یہ مشورے اے دنیا بے جان سہی لیکن
سوچے بھی تو دیوانہ سمجھے بھی تو دیوانہ

نیاز جتوئی...... لطیف آباد

یہ کھلے بال یہ دزدیدہ نگاہوں کا فسوں
ہوش مستی بھری راتوں کے اڑا دے نہ کہیں

امجد بارک پوری...... کراچی

یہ سارے حسین چہرے میری تسبیح کے دانے ہیں
نظر سے گرتے رہتے ہیں عبادت ہوتی رہتی ہے

اسرار احمد...... ملتان

یہ کس خوشی کی ریت پر غموں کو نیند آگئی
وہ لہر کس طرف گئی یہ میں کہاں سما گیا

انجم شاہین...... کوہاٹ

یادوں کو محبت کے گلابوں میں پرو کر
ہم کتنی نفاست سے تمہیں سوچ رہے ہیں

(نزاہت افشاں مہورہ فتح جنگ کا جواب)

امتیاز احمد...... ڈیرہ اسماعیل خان

وہ دیکھ شام کے بستر پہ گر گیا سورج
بدن سے پھوٹ رہی ہے تکان کی خوشبو

عبدالستار...... ساہیوال

واہ رے شوقِ شہادت آج اختر اہلِ دل
سرفروشانہ بڑھے جاتے ہیں قاتل کی طرف

اختر عباس...... نوشہرہ

وہ جو آجاتے تھے آنکھوں میں ستارے لے کر
جانے کس دیس کے خواب ہمارے لے کر

الطاف حسین...... چنیوٹ

وہ بام و در تو ہمیں آج بھی بلاتے ہیں
ہمیں ہی راس نہیں کوئے یار کا موسم

عبدالحلیم ثمر..........کراچی

وہ افسانہ جسے انجام تک لانا ہو ناممکن
اسے ایک خوب صورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا

اختر عباس..........جھنگ

وہ میرے کاندھوں پہ پیر رکھ کر فصیل مشکل کے پار اترا
نئی زمینوں کی دوڑ میں میرے پیر کو ہی کچل گیا وہ

(نظیر نیازی بہاولپور کا جواب)

حسین امجد خان..........لاہور

دو اشک جانے کس لیے پلکوں پر آکر ٹک گئے
الطاف کی بارش تیری اکرام کا دریا تیرا

(شبیر شاہ کشمور کا جواب)

نسیم منظر..........بفرزون کراچی

حیات ناچ اٹھی تھی قریب پا کے اسے
گیا تو چاروں طرف ایک یاس چھوڑ گیا

نظیر احمد..........لاہور

حوصلہ تجھ کو نہ تھا مجھ سے جدا ہونے کا
ورنہ کاجل تری آنکھوں میں نہ پھیلا ہوتا

(مریم بنت کاشف حیدرآباد کا جواب)

نیلوفر شاہین..........اسلام آباد

ان کو نہ چھیڑ رکھتے ہیں قلب و نظر یہ لوگ
جلتے ہیں اپنی آگ میں شام و سحر یہ لوگ

(نورین فاطمہ لاہور کا جواب)

ہادیہ ایمان، ماہا ایمان..........فورٹ عباس

اپنی منزل پہ پہنچ لیں قربتوں کے قافلے
ایک دن تنہائیوں کا در بھی وا ہو جائے گا

جنید ملک..........بہاولپور

اب کے بھی اجڑ جائیں گے بستی کے کئی گھر
اس سال بھی برسات کا امکان بہت ہے

نورعین ملک..........ملتان

اس کی اپنی بیٹی کی ہتھیلی خشک رہتی ہے
جو بوڑھا دھوپ میں دن بھر حنا تقسیم کرتا ہے

نسیم شاہ بخاری..........مظفر گڑھ

اپنی اپنی راحتوں سے جب کبھی فرصت ملے
دوسروں کا درد بھی دل میں جگا کر دیکھیے

سیف اللہ..........ملک وال

ہاتھوں کو دل نے خون کی ترسیل روک دی
اک بار تیری یاد پہ انگلی اٹھائی تھی

عنایت اللہ..........ملتان

ہر حال میں تیرا ہی رہا آسرا مجھے
مایوس کر سکا نہ ہجومِ بلا مجھے

(ثاقب احمد عثمانی حیدرآباد کا جواب)

شبیر شاہ..........گڈو بیراج کشمور

اس کی حرمت کا مرے دل کو بھی ہے پاس بہت
چپ رہے گا مری ناموس کی خاطر وہ بھی

امیر حمزہ اشرف..........بی کوٹ حمزہ

اگر ہوتا ہے اتفاق تو یہ کیوں نہیں ہوتا
وہ راستہ بھولے اور مجھ تک چلا آئے

ناہید سلطانہ..........لاہور

اس ویران دل کی دنیا میں جو شجر تھے وہ اجڑ گئے
تیز آندھی کی زد میں آتے جو عکس تھے وہ بکھر گئے

(سائرہ امتیاز منڈی بہاؤالدین کا جواب)

سید امتیاز حسین بخاری..........سرگودھا

یوں ترے عشق نے بدنام کیا ہے مجھ کو
کوبکو شہرہ ہوا ہے مری رسوائی کا

(امجد بارک پوری کراچی کا جواب)

عبدالحکیم ثمر..........کراچی

آنکھوں میں نمی ہنسی لبوں پر
کیا حال ہے کیا دکھا رہے ہو

محمود انصاری..........مظفر گڑھ

اس دل کے بہلنے کو یہ سامان بہت ہے
وہ اپنی جفاؤں پہ پشیمان بہت ہے

قمر جمال پردیسی..........رحیم یار خان

اپنی زلفیں میرے شانے پہ بکھر جانے دو
دو گھڑی گردشِ دوراں کو ٹھہر جانے دو

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مد نظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش 147
30 اپریل 2018ء

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

نام: ....

پتا: ....

....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے
کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 اپریل 2018 تک علمی آزمائش 147 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ''بیت بازی'' شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شاملِ اشاعت کر لیں (شعر الگ کاغذ پر ہے)

109

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

علمی آزمائش۔ 147

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کرکے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کرکے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 اپریل 2018ء تک موصول ہوجائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

15 فروری 1935ء میں یوپی کے اس شہر میں پیدا ہوئے جہاں بابری مسجد ہے جسے انتہا پسند ہندوؤں نے شہید کردیا۔ اردو شاعری میں ایک بڑا نام ہے۔ ان کے اشعار لوگ دل میں بسا کر رکھتے ہیں۔

علمی آزمائش 145 کا جواب

وزیر آغا 18 مئی 1922ء میں وزیر کوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان کو تاجِ برطانیہ کی جانب سے 750 ایکڑ زمین ملی تھی۔ لاہور گورنمنٹ کالج سے ماسٹر ڈگری حاصل کی اور پنجاب کالج سے پی ایچ ڈی، اردو ادب کے بڑے معماروں میں شمار ہوتا ہے۔ تنقید میں بڑا نام پیدا کیا۔

انعام یافتگان

1۔ زاہد خان، چنیوٹ   2۔ عبدالستار، شیخوپورہ   3۔ نصیر الحسن کاظمی، کوئٹہ

4۔ محمد سعید قریشی، لاہور   5۔ انتساب حسین، کراچی

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے احمد علی، خادم حسین، عبدالحکیم ثمر، نسیم منظر، نگار مصطفی، تبسم زہرہ، نشاط فاطمہ، نعمان علوی، محمد ذیشان احمد، غلام حسین، یاسمین خان۔ عنبر افشاں، آفتاب حسین، تبسم صدیقی، نواب سلیم، انیس اختر، کاظم پاشا، آغا جعفر، ذیشان علی، الیاس محمد، انیس احمد، امتیاز احمد، سعید اختر، فردوس جبیں، زینت تبسم، فیاض حسین، نگار بٹ، محمد شعیب، باسط حسن، صباحت مرزا، صوفی تبسم، انعام گل، محمد کوثر، ملک فیض محمد، ناہید خان، نور علی، ندیم عشرت، وحید علی، انعام اللہ، زاہد طوری بنگش، فصاحت اللہ، ثاقب حسن، عباس ترمذی، ارشد حسن، سعادت علی، ناصر نیازی، انوار یوسف زئی، حیا علی۔ لاہور سے ضیاء الاسلام، سرشفیق احمد، صابر علی، خدا بخش، نیاز بٹ، اشرف الاسلام۔ ملتان سے احمد علی احمد، نعمان خان، باسط سلطان، فیض

۔۔۔، اطہر علی اطہر، عنایت حسین، فیاض احمد، ابرار احمد، سلطان خان، نعمان حسن، اشرف حسن خان، فیض محمد، کاظم زیدی، ۔۔۔بر خان، ظہیر احمد، افتخار حسین، اختر علی، عنایت آرائیں۔ حیدرآباد سے نزہت پروین، مسکان بھٹو۔ سرگودھا سے فیض ۔۔۔ن، نوازش علی۔ حافظ آباد سے خلیق الرحمن، نورعین فاطمہ۔ کشمور سے نیاز جوکھیو۔ شہدادکوٹ سے نصیر اشرف، نگار بانو۔ ۔۔۔راولپنڈی سے معین انور، مسعود اشعر، کاظم اطہر، ملیحہ نقوی، قادر علی، نورعین، سبطین، فرحین، عتیق احمد، افتخار خان، نوشین ۔۔۔تر۔ میرپورخاص سے نثار علی خان، فیض اللہ ڈینو۔ ڈیرہ غازی خان سے ناز خان، طلعت حسن۔ لالہ موسیٰ سے ارشد ۔۔۔لی، نصیر حسن، نگار سلطانہ۔ محمد باشر، اسما جہانزیب، معز اکبر حسین، محمد مناف، فاضلانی، سعید احمد چاند، نعمت مرزا، محمد ۔۔۔ضان، آفتاب منصور، عمار اسلام الدین شیخ، فرمودہ فاطمہ، زبیر احسن، نوید الحسن مرزا، جمیل عثمانی، عامر زبیر ۔۔۔ہدری، زبیر ملک، امیر الدین، نوید احسن، فرید حسن، زبیر اختر، تانیہ احسن، عامر اسلام، حسن خان اچکزئی، ۔۔۔طہر حسین، اختر عباس، سنجیدہ احمد، جاوید اقبال، سلمان مشتاق، سید عزیز الدین، طارق حبیب، بابر توفیق، سید عباس ۔۔۔ضا رضوی تنویر، فرزانہ پروین، سید عزیز الدین، بشریٰ بانو تا گوری، محسن اختر بلوچ۔ لاہور سے: شاہ انوار شاہ، ۔۔۔نازیہ اکرم، بہادر خان اچکزئی، شاہینہ بتول، انوار علی شاہ، شوکت ملک، مہوش جان، اکبر حیات خان، ناہید رحمن، ۔۔۔کیل گوندل، الحاج کرم الٰہی اعوان، ڈاکٹر منور اقبال، شاور علی، صاحب جان، کلیم وٹو، احسان الحسن، احتشام ۔۔۔لاہوری، شاہینہ بتول، مہناز عرفان، صلاح الدین، عشرت حسین۔ ملتان سے: محمد معین چشتی، محمد شفیق بھٹی آڈیٹر، احمد ۔۔۔شفیق، ناصر الحسن، ارشاد لاشاری، نوازش الٰہی، عباس خان، زریاب آفریدی، ملک اشفاق، حسین رند، کاشف ۔۔۔حسین، صدیق احمد صدیقی، کاشان اللہ، خاقان عباسی، زہرا نوید، فلک شیر میو، راؤ ارشاد حسین، نذر حسین، ملک انور ۔۔۔متاز، نور جہاں خلیق، خلیق الزماں۔ رحیم یار خان سے: زاہد بخش، کرم علی، شاہد خان، نیابت خان، ملک سرفراز، کلیم ۔۔۔اللہ۔ لاڑکانہ سے: حاجی مدد علی زنکیجہ جتوئی، فرحت جوکھیو۔ دھنڈ کلا، بھمبر آزاد کشمیر سے: پروفیسر خالد جاوید۔ ۔۔۔مظفر گڑھ سے: رانا محمد سجاد (شاہ جمال) زبیر احسن۔ پشاور سے: شیر نواز گل، عائشہ ابدالی، الطاف سعید، فاخر قمر، ۔۔۔شریٰ مجید، سعید الدین، داروغہ خان، وحید طوری بنگش، نصرت فتح علی، سعید الحسن، ظہیر الحسن، اسد اللہ، زبیر احمد۔ ہری ۔۔۔پور ہزارہ سے: خورشید احمد، صفدر حسین جعفری۔ کنڈیاری سانگھڑ سے: آصف علی۔ حافظ آباد سے: عنایت محمد انسٹرکٹر ۔۔۔الیکٹرونکس، عباس سید۔ کھاٹاں سے: سلیم کامریڈ۔ عیسیٰ خیل میانوالی سے: عبدالخالق۔ کمالیہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ سے: ایم ۔۔۔اشرف خان فاروقی۔ پاک پتن سے: نوید احمد۔ مارٹن پور ننکانہ صاحب سے: فرانسس جیمز۔ تورنگہ میانوالی سے: حکیم ۔۔۔سید محمد رضا شاہ۔ لیہ سے: حمیدہ بیگم۔ جہانیاں ضلع خانیوال سے: سید ابتسام اشرف مشہدی۔ چوآ سیدن شاہ ضلع چکوال ۔۔۔سے: فرحان سعید قاسمی۔ بوریوالہ وہاڑی سے: محمد عمران الحق، محمد ریاض، بالے خان۔ شیخوپورہ سے: امجد علی، نصر خان، ۔۔۔زش احمد، سلطان نصیر۔ حضرو اٹک سے: ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، علی اصغر علی۔ جھنگ سے: عطاء المصطفیٰ، سعید ۔۔۔الدین، ناصر حسین، فرحت اللہ لغاری، کمال حسین۔ نوشہرہ سے: فضل محمد۔ نورپور سے: خواجہ عبدالعزیز۔ حسن ابدال، ۔۔۔ضلع اٹک سے: اعجاز امجد بھٹی، فرحت بٹ کھاریاں سے طاہر علی سید، امداد بشیر۔ بہاولپور سے احمد جاوید، زاہد خان، ۔۔۔ادریس ملک، رؤف آرائیں۔ باغ آزاد کشمیر سے عباس علی، ناہید بٹ۔ کوٹلی آزاد کشمیر سے نیاز احمد، عباس علی۔ بھمبر ۔۔۔آزاد کشمیر سے زاہد علی زاہد، نصیر حسن۔ خانیوال سے ملک فیروز، محمد اقبال، اصغر علی۔ نوشہرو فیروز سے لیاقت علی۔ اٹک ۔۔۔سے فیروز الدین، رحمن ادریس، نعمان اشرف۔ بہاولنگر سے شیر خان، زرولی، فتح محمد، اسد علی، جاوید اختر۔ نوشہرو سے ۔۔۔رت حسن، عنایت علی۔ خوشاب سے عباس علی، ظہیر شاہ، زرولی خان۔ شجاع آباد سے حسن علی زیدی، افتخار الحسن۔ ۔۔۔میانوالی سے احسن علی خان، وقار حسن۔ سکھر سے فیض جوکھیو، اکبر علی، زاہد جوکھیو، علی سنجرانی۔ پاک پتن سے شاہد حیات، ۔۔۔کمال، علی محمد (حسن پورہ)۔ کوئٹہ سے ابراہیم جوئیہ، عباس خان، احمد شاہ ظہیر چنگیزی، رعنا لیاقت حسین، ادریس ۔۔۔ہوی، زرولی شاہ۔ واہ کینٹ سے صابر علی، احمد توقیر۔ فیصل آباد سے شبیر علی سعید، انور علی، قیام الدین۔ میرپورخاص ۔۔۔سے فصیح علی کیف۔ جہلم سے صغیر احمد، ابرار بزمی، ظہیر خان، قیصر ظہیر چغتائی۔ اسلام آباد سے ماہ جبین فاطمہ، عزیز احمد، ۔۔۔قان احمد، محمد ذیشان مصطفائی۔ اکرام اللہ، انور یوسف زئی، غضنفر شاہ، قاضی ساجد احمد، نیلوفر شاہین۔ پشاور سے ۔۔۔یدہ جان (ارمڑ پایان)، اشرف خان (حیات آباد)۔ ملتان سے محمد سرفراز مغل، محمد معین چشتی (پل براراں)۔

انناس کے پھول

محترم مدیر
السلام علیکم
ایک ایسی روداد ارسال خدمت ہے جس نے خود مجھے رلا دیا۔
اس پوری روداد کو میں نے کہانی کے انداز میں پیش کیا ہے۔
اُمید ہے قارئین کو بھی پسند آئے گی۔

محمد ظفر حسین
(نارتھ کراچی)

آج شام کو دفتر سے گھر واپس لوٹتے ہوئے مجھے کچھ دیر ہو گئی تھی۔ گھر پہنچتے پہنچتے آٹھ بج چکے تھے، میں مرکزی شاہراہ سے گزر کر اپنی بائیک دوڑاتا ہوا جب اندر کی جانب سروس روڈ پر مڑا تو کسی نے پیچھے سے مجھے آواز دی۔

"عثمانی صاحب ذرا رکیے گا۔"

میں نے بائیک روکی اور پیچھے مڑ کر آواز کی جانب دیکھا

"وہ مستری عبدالغفار تھا۔ میں اس وقت اس کی موٹر سائیکل کی ورکشاپ کے پاس سے گزر رہا تھا، عبدالغفار اپنے کسی کسٹمر کی موٹر سائیکل کے پرزوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھا، پہلے تو مجھے دیکھ کر اس نے حسب عادت بڑے تپاک کے ساتھ سلام کیا، ہاتھوں میں پکڑے اوزار اپنے ساتھ کھڑے ہیلپر کو پکڑا کر کپڑے کی ٹاکی سے ہاتھ صاف کیے اور مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"بائیک سے آوازیں آرہی ہیں عثمانی صاحب ....؟" عبدالغفار میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ ایسا کریں کہ اسے میرے پاس چھوڑ جائیں اور کل صبح واپسی میں لے جائیں۔ ویسے بھی کل اتوار ہے اور آپ کی چھٹی ہوگی۔" اس نے میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا؟

مستری عبدالغفار کی ورکشاپ میرے گھر کے راستے میں ہی تھی، ایک اور بلاک کراس کرکے ہمارے فلیٹ شروع ہوتے تھے۔

اس پوری پٹی پر فلیٹوں کے نیچے بنی دکانوں پر اب تقریباً موٹر مکینک اور مستریوں کی چھوٹی بڑی ورکشاپس وجود میں آچکی تھیں، کچھ دکانوں میں اسپیئر پارٹس وغیرہ بھی ہاتھ کے ہاتھ دستیاب تھے، دکانوں کے آخری سرے پر عبدالغفار کی چھوٹی سی مگر خوب چلتی ہوئی موٹر سائیکل مرمت اور ٹائر پنکچر کی ورکشاپ تھی۔ مستری عبدالغفار کا کام خوب چلتا تھا۔ اس شہر میں لاکھوں بلکہ شاید کروڑوں کے پاس موٹر سائیکلز تو ہوں گی۔ خود ہمارے گھر میں تین تین بائیکس موجود تھیں۔ اگر مستری ایماندار اور اچھا کاریگر ہو تو کام خود دوڑ کر اس کے پاس آتا ہے۔ اس وقت مستری عبدالغفار کے پاس پانچ ... آٹھ لوگوں کا روزگار وابستہ تھا ان میں سے کچھ تو عبدالغفار کے ہی شاگرد تھے اور کچھ سیکھے سکھائے۔ وہ کمیشن پر یہاں کام کرتے تھے۔ عبدالغفار بڑی جانفشانی اور ایمانداری سے کام کرتا تھا۔ انجن کے صحیح نقص کی نشاندہی کرکے بالکل مناسب اور جائز پیسے بتاتا یہی وجہ ہے کہ اس کی ورکشاپ پر ایک دفعہ آجانے والے گاہک پھر دوبارہ کہیں اور نہیں جاتے تھے۔

مجھے پتا تھا کہ اب وہ اپنی ہی من مانی کرے گا۔ مجھے بغیر بائیک کی مرمت کے نہیں جانے دے گا اور اس کے اصرار کے آگے میری ایک نہ چلنے والی تھی۔ ویسے بھی میرا ارادہ تو یہی تھا، کچھ دنوں سے انجن گڑبڑ کر رہا تھا اور اس کی آوازوں ... اندازہ ہو رہا تھا کہ اب اس کی جلد ٹیوننگ کروا لینی چاہیے مگر دفتر میں دیر تک کام کرنے اور مصروفیت کے باعث میں یہ بات تقریباً روزانہ بھول جاتا تھا۔

ہاں ان سب باتوں کے بیچ ایک اور ضروری بات یہ بھی تھی کہ باوجود یہ کہ مستری عبدالغفار اپنے کام میں بہت ماہر اور ایماندار تھا مگر میں اپنی موٹر بائیک کا کام عبدالغفار ... کرواتے ہوئے کتراتا تھا کیونکہ عبدالغفار مجھ سے اپنی مزدوری کے پیسے بہت کم لیتا اور وہ بھی میرے بہت ... کرنے پر۔ مجھے اچھا تو نہیں لگتا تھا مگر میری اس کوشش ... برعکس اکثر و بیشتر مجھے عبدالغفار کی ورکشاپ سے ہی اپنی بائیک کے چھوٹے موٹے کام کروانا پڑ جاتے تھے۔ ایک تو

...ے بھی وہ مستری بہت اچھا تھا اور دوسرے اس کی ورکشاپ ...ی گھر کے عین راستے میں پڑتی تھی۔ وہ تو جیسے آواز سن کر ہی ...ن لیا کرتا تھا کہ اب انجن کو کاریگر کی ضرورت ہے۔

مزدوری کے معاملے میں میرے کئی دفعہ کے سمجھانے ...ی وہ میری ایک نہ مانتا اور اپنی ہی من مانی کرتا۔

لہٰذا میں نے بھی اس کا ایک حل ڈھونڈ رکھا تھا۔ میں ...ی بھی مختلف مواقع پر بہانے سے اس کے گھر جا کر اس کے ...ں کو کچھ دے دلا کر حساب چکا دیا کرتا۔ خاص طور پر اس کی ...کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لے کر جاتا تھا۔

ہمارے اس باہمی احترام کی ایک بڑی وجہ تھی۔

اور اس وجہ سے مستری عبدالغفار کا بس چلتا تو شاید وہ ...سے اپنی اس کاریگری کی ایک پائی بھی نہ لیتا مگر میرے ...دو دفعہ سختی سے ناراض ہو جانے کے بعد وہ مجھ سے پیسے تو ...ر بہت کم۔

ہمارے اس باہمی احترام کا آغاز چند سال قبل ہی ہوا تھا، اس تعلق کی وجہ اپنے اندر انتہائی جذباتی پیچ و خم سموئے ہوئے مستری عبدالغفار کی زندگی کی ایک سبق آموز کہانی بھی تھی اور اس کہانی میں کچھ میرا کردار بھی شامل ہو گیا تھا جسے میں مستری عبدالغفار کی اجازت سے سرگزشت کی معرفت قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

☆......☆

تقریباً سات آٹھ سال پرانی بات ہوگی۔ مجھے اپنی بائیک میں کچھ کام کروانا تھا۔ ہم لوگ کچھ ہی دن ہوئے ایک نئے علاقے میں منتقل ہوئے تھے اسی لیے میں ابھی تک اپنے پرانے محلے کی ورکشاپ سے ہی اپنی موٹر سائیکل کے سارے کام کرواتا تھا۔ حسب عادت اپنی پرانی من پسند ورکشاپ پر پہنچا تو وہاں پر کچھ رش دیکھا۔ کچھ لوگ مل کر کسی کی پٹائی کر رہے تھے۔ میں نے ماجرا جاننے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ کسی مکینک کی دھلائی ہو رہی ہے۔ کچھ نوجوان غصے میں اس مکینک کی پٹائی لگا رہے تھے۔ وہاں موجود مارکیٹ کے دوسرے افراد

نے مل کر معاملہ رفع دفع کروانے کی کوشش کی تھی مگر نوجوانوں کا ٹولہ مان کر نہیں دے رہا تھا۔ واضح طور پر ان میں سے ایک دو کے پاس شاید اسلحہ بھی تھا، وہ جوش میں تھے بجائے معاملہ سلجھنے کے الجھتا ہی جا رہا تھا انہوں نے اس ورکشاپ کے باہر بھی توڑ پھوڑ مچا دی تھی ورکشاپ کی باہر والی سائیڈ میں ایک لکڑی کا کیبن الٹا پڑا تھا۔ ٹائر ٹیوب میں ہوا بھرنے والے کمپریسر کو لاتیں مار مار کر توڑ پھوڑ کر اس پر پانی والا ٹب الٹ دیا تھا۔ بات چونکہ محلے کی تھی اور سب ہی سے علیک سلیک تھی اس لیے میں بھی مروتاً اپنی عادت سے مجبور ہجوم کے بیچ میں گھس کر دوسروں کے ساتھ ان نوجوانوں کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ہماری محنت رنگ لائی یا وہ نوجوان ہی اب کچھ ٹھنڈے پڑ گئے تھے بہرحال یہی موقع تھا معاملہ رفع دفع کرنے کا۔ لوگوں کے سمجھانے پر وہ نوجوانوں کا ٹولہ وہاں سے بکتا جھکتا اپنی موٹر سائیکلوں پر سوار ہو کر آناً فاناً یہ جا اور وہ جا۔

بعد میں تفصیلات پتا چلیں تو مدعا کھلا کہ پٹنے والے مذکورہ مکینک پر ان نوجوانوں کی طرف سے موٹر سائیکل کے پرزے چوری کرنے کا الزام لگایا گیا تھا۔

فرمان صاحب، جن کی ورکشاپ سے میں باقاعدگی سے اپنی موٹر بائیک کی سروس کروایا کرتا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ مذکورہ موٹر سائیکل مکینک اس علاقے میں نیا ہے اور انہی صاحب کی دکان کے ساتھ اپنا چھوٹا سا کیبن لگا کر ٹائر پنکچر اور موٹر سائیکل مرمت کا کام کیا کرتا ہے۔

عرفان صاحب کی کارنر کی دکان تھی اور کچھ ہی دن قبل عرفان صاحب نے ازراہ ہمدردی اسے اپنی ورکشاپ کے ساتھ اس کا چھوٹا سا کیبن لگانے کی اجازت دی تھی۔ کیونکہ ٹائر پنکچر کا کام چوبیس گھنٹے ہی چلتا ہے اس لیے رات کو بھی ایک لڑکا اسی کیبن میں موجود رہتا اور اس وجہ سے ان کی اپنی ورکشاپ کی بھی چوکیداری ہو جاتی تھی۔

عرفان صاحب نے مجھے بتایا کہ اس مکینک کی رنچھوڑ لائن میں اپنی ورکشاپ تھی لیکن حالات کی وجہ سے وہاں سے نکلنا پڑا اور اب لگتا تھا کہ جیسے قسمت نے اسے یہاں بھی لات مار کر نکالنے کی تیاری کر لی تھی۔

میں نے بائیک ورکشاپ میں عرفان صاحب کے حوالے کی۔ بائیک کی سروس میں تقریباً دو ڈھائی گھنٹے لگ جانے تھے۔ مجھے مارکیٹ میں کچھ کام وغیرہ تھے۔ میں وہاں سے چلا آیا۔ مطلوبہ وقت پر میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ پٹنے والا مذکورہ مکینک سڑک کنارے اپنے ٹوٹے پھوٹے سامان اور کیبن کے ساتھ سر پر ہاتھ رکھے پریشان بیٹھا تھا۔ غالباً اس معرکہ میں اس کے کمپریسر اور کیبن کو بہت نقصان پہنچا تھا اور کمپریسر تو شاید اب استعمال کے قابل ہی نہیں لگتا تھا۔ میری بائیک کی سروس کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ سروس چارجز کی ادائیگی کرتے وقت عرفان صاحب سے پتا چلا کہ مارکیٹ والوں نے مل کر اس مکینک کو یہاں سے نکالنے کا فیصلہ کیا ہے اور مارکیٹ یونین نے عرفان صاحب سے کہہ کر اس کا سامان بھی اٹھوا دیا ہے۔ اب اس مکینک کو یہاں سے کہیں اور جانا ہوگا کیونکہ اس پر لگے الزام اور مسلح نوجوانوں کی ہنگامہ آرائی کے بعد ارد گرد کے بقایا ورکشاپ مالکان کوئی رسک نہیں لینا چاہ رہے تھے کہ مبادا وہ نوجوانوں کا ٹولہ دشمنی میں رات کے وقت دھاوا بول کر کسی اور کی ورکشاپ کو بھی نقصان نہ پہنچا دیں۔

گو کہ میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں تھا اور میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ درحقیقت اس مکینک نے چوری کی بھی ہے کہ نہیں پھر بھی مجھے نجانے کیوں اس مکینک سے ہمدردی سی ہو رہی تھی۔ ایک آدمی محنت سے اپنی روزی کما رہا ہو تو وہ کیوں چور بننے پر مجبور ہو۔ کچھ نہ کچھ تو ایسا ہوا ہوگا کہ اسے محنت کرتے کرتے چور بننا پڑے۔ ہم لوگ معاشرے میں رہ کر بہت ساری خرابیوں کے خود ذمہ دار ہیں۔ چند ہی گھنٹوں میں ایک محنت کش سے اس کی جائے پناہ چھین کر اسے روڈ پر لے آئے اس کی روزی کی جگہ چھین کر بے آسرا کر دیا اور کسی کو اصل بات تک جاننے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ میں جاتے جاتے رک گیا میں نے اس مکینک سے اصلیت جاننے کی کوشش کی. تاکہ میں اس کی کوئی مدد کر سکوں۔ یہی سوچتے ہوئے پلٹ کر میں اس کے پاس چلا آیا۔

☆......☆

میرا سوال سن کر اس مکینک نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا. صورت سے وہ ایک معقول شخص نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

جیسا کہ میں نے سوچا تھا اس شخص کی غلطی کے پیچھے کوئی بڑی وجہ ہوگی اور بات وہی نکلی۔ میں اسے روڈ کراس کر کے سامنے والے ہوٹل میں لے آیا تھا وہاں اس نے ہاتھ دھو کر میرے ساتھ بیٹھ کر چائے پی اور اپنا دکھ ہلکا کیا۔ اس کی مصیبت کی داستان سن کر مجھے اندازہ ہوا کہ اس شخص کی اپنی غلطی سے زیادہ تقدیر اور گردش حالات کی ٹھوکروں نے اسے آج اس حالت میں سڑک پر پہنچا دیا ہے کہ کوئی اس کی بات سننے کے لیے تو کیا اس کی بات سننے اور ماننے کو تیار نہیں۔

اس مستری کا نام عبدالغفار تھا۔ مستری عبدالغفار کے والد صاحب کی دور اندیشی تھی یا وقت کی ضرورت کہ انہوں نے سستے زمانے میں شہر کے قدیم علاقے رنچھوڑ لائن میں پگڑی سسٹم کے تحت ایک دکان لے لی تھی۔ یہ کافی پرانی عمارت تھی اور شہر کے پھلنے پھولنے کے ساتھ اس کی کاروباری ویلیو میں مستقل اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سب کچھ اچھا چل رہا تھا۔ بڑے بیٹے عبدالغفار نے باپ کی ورکشاپ کو سنبھال لیا۔ وہ بچپن سے ہی اپنے والد کے کام میں ہاتھ بٹایا کرتا۔ گو کہ والد نے اپنے دونوں لڑکوں کو پڑھنے لکھنے اسکول جانے سے کبھی منع نہیں کیا پھر بھی عبدالغفار کا دل پڑھائی سے زیادہ مشینوں اور ان کی مرمت میں لگتا۔ دن گزرتے گئے دونوں بھائیوں میں سے چھوٹے بھائی نے تعلیم میں دلچسپی لیتے ہوئے گریجویشن کر لی اور عبدالغفار نے بس میٹرک کرتے ہی دکان کا کام سنبھال لیا۔ چھوٹے بھائی کو ایک سرکاری اسکول میں کلرک کی نوکری مل گئی تھی اور اس دوران دونوں کی شادیاں بھی ہو گئیں۔ شادی کے کچھ ہی عرصے کے بعد والدین ایک ایک کر کے اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

چائے پینے کے ساتھ ساتھ مستری عبدالغفار اپنی کہانی بھی سناتا جا رہا تھا۔ شادی کے چند سال بعد چھوٹے بھائی کے ہاں ایک ایک کر کے ہر سال اولادیں پیدا ہوتی رہیں مگر میرے ہاں ابھی اللہ کی مرضی نہیں تھی۔ لہٰذا بیوی کی گود خالی رہی، گو کہ علاج معالجہ کروا کے بھی دیکھا مگر ڈاکٹروں نے کوئی خرابی نہیں بتائی بس اللہ کی مرضی بتا کر انتظار کرنے کو کہا۔ چھوٹے بھائی کی فیملی بڑھی تو اس کے لیے گھر چھوٹا پڑنا شروع ہو گیا۔ حالانکہ اتنا زیادہ مسئلہ تو نہیں تھا مگر شاید چھوٹے بھائی اور اس کی بیوی اب الگ رہنا چاہتے تھے۔ انہوں نے مختلف کمیٹیاں ڈال کر کچھ پیسا جمع کر لیا تھا۔ اتفاق سے اسی محلے میں ایک اسی گز کا مکان بکنے والا تھا۔ چھوٹے بھائی نے اس کی بات چلائی، اپنی بچت اور بیوی کے زیور بیچ دیے اور پھر کوشش کر کے بینک سے سود پر قرضہ لے لیا مگر اب بھی کافی پیسے کم پڑ رہے تھے تو انہوں نے دبے دبے لفظوں میں والد صاحب کے چھوڑے ہوئے ترکے میں سے اپنے حصے کی بات کی۔ ویسے تو اتنی جلدی ترکہ تقسیم نہیں ہو سکتا تھا۔ ورکشاپ والی دکان آمدنی کا مستقل اور مستحکم ذریعہ تھی۔ ہر مہینے باقاعدگی کے ساتھ ایک رقم چھوٹے بھائی کو بغیر محنت کے مل جاتا تھا۔ اسے آپ دکان کے کرایہ میں سے حصہ سمجھ لیں۔ یہ ہم بھائیوں میں والد کے زمانے سے طے تھا اور گھر میں بھی ہم دونوں بھائیوں کا نصف حصہ تھا۔ گھر بیچنے کے لیے پوری منصوبہ بندی کی ضرورت تھی۔ اتنی جلدی اسے بیچتے تو اونے پونے بکتا اور پھر مجھے بھی اپنے سر چھپانے کا ٹھکانا چاہیے تھا۔ مارکیٹ میں اس مکان کی موجودہ قیمت کا تخمینہ لگا کر ہم دونوں میاں بیوی نے اپنی ساری جمع پونجی کا حساب لگایا۔ میری بیوی راحیلہ نے بھی ان چند سالوں میں اچھی بچت کر لی تھی، ایک ساتھ کئی کمیٹیاں ڈالی ہوئی تھیں۔ گھر میں بچے تو نہیں تھے خرچا اتنا زیادہ بھی نہیں تھا اور دکان سے کافی اچھی آمدنی ہو جاتی تھی۔ اللہ نے کافی مہربانی کر رکھی تھی۔ میں نے ایک اچھی خاصی رقم بینک کے مخصوص طے کردہ منافع کی بنیاد پر جمع کر رکھی تھی اور اس سے بھی ہر مہینے اچھے پیسے مل جایا کرتے تھے۔ چھوٹے بھائی کو گھر کے حصے میں پیسے دینے کے لیے بیوی راحیلہ بھی اپنے زیور بیچنے پر راضی ہو گئی۔ میں نے مارکیٹ کے جاننے والوں سے کچھ ادھار لیا اور اس طرح چھوٹے بھائی کو اس کا حصہ دے کر بری الذمہ ہو گیا۔ دکان کے معاملے میں فی الحال ابھی کوئی معاملہ طے نہیں ہوا تھا۔

کیونکہ چھوٹے بھائی کو بھی گھر بیٹھے ایک اچھی رقم مل جاتی تھی تو اس نے دکان کی تقسیم کا کوئی تقاضہ نہیں کیا۔

دن گزرتے گئے چھوٹا بھائی اپنے نئے گھر میں منتقل ہو کر اپنی زندگی میں مگن تھا، اس دوران اللہ نے انہیں ایک اور اولاد سے نواز دیا اور وہ پانچ بچوں کا باپ بن گیا، چند سال یونہی ہنستے کھیلتے سکون سے گزرے کہ اللہ نے ایک بڑا امتحان لے لیا۔ نجانے اللہ نے چھوٹے بھائی کی زندگی ہی اتنی مختصر رکھی تھی یا اس میں اس کی کوئی مصلحت تھی کہ ایک دن بیٹھے بٹھائے اسے دل کا دورہ پڑا اور اسپتال لے جانے سے پہلے ہی وہ دیکھتے ہی دیکھتے اس بھری جوانی میں ہی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اللہ کے کام اللہ ہی جانے ایسا لگتا تھا کہ جیسے اللہ نے اسے مختصر زندگی میں ہی اولاد کی نعمتوں سے جلدی جلدی نواز دیا تھا۔ اس کا جانا تو طے تھا مگر اب بیوہ اور بچوں کی ذمہ داری ہم پر آن پڑی تھی۔ میں نے راحیلہ سے مشورہ کر کے بیوہ بھابی سے بات کی اور وہ بھی اس طریقۂ کار پر آمادہ ہو گئیں کہ دکان کا حساب لگا کر موجودہ شرح کی لحاظ سے دکان کی قیمت نکال کر بیوہ بھابی کو ہر ماہ ان پیسوں کی قسط ادا کرنا شروع کر دی۔ اسی دوران اللہ نے ہمارے آنگن میں ایک پھول کھلنے کی خوشخبری سنائی۔

☆......☆

گھر میں ایک چاند سی ننھی پری نے قدم رکھا تو یوں لگا کہ جیسے کائنات کی سب سے بڑی خوشی مل گئی۔ ہماری خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ ہمیں شاید صبر کا پھل مل رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مزید دو سال گزر گئے کہ اچانک پھر ہماری خوشیوں کو کسی کی نظر لگ گئی۔

ورکشاپ جس علاقے میں تھی اس علاقے میں کافی پرانی بوسیدہ عمارتیں تھیں۔ خود ہماری بلڈنگ بھی کافی پرانی ہوتی جارہی تھی۔ اسے رنگ روغن کے ساتھ مرمت کی بھی ضرورت تھی۔ اکھڑتے ہوئے پلستر اور جھڑتے ہوئے چھجوں پر سالخوردہ زنگ آلود آہنی جال نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔ عمارت کی وائرنگ کا حال بھی بہت برا تھا۔ بجلی کے بیشمار تار ہر طرف لٹکے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان جابجا غیر قانونی کنڈے بھی بے ترتیب انداز میں چاروں طرف بدنظمی سے بکھرے ہوئے تھے۔ ٹریفک کی بھیڑ بھاڑ اور آس پاس جابجا پھیلے ہوئے رہائشی علاقے میں غیر قانونی کھلے ہوئے چھوٹے بڑے کارخانوں اور ورکشاپوں کے جال اور سارا دن گاڑیوں کے کثیف دھوئیں کی سیاہی سے آس پاس کی سبھی عمارتوں پر سیاہی مائل تہہ سی چڑھتی جارہی تھی۔

ایک دن جب صبح سویرے اٹھا تو ٹی وی پر ایک المناک خبر سننے کو ملی کہ ورکشاپ والی دکان کے نزدیکی علاقے میں رات گئے ایک پرانی بلڈنگ اچانک دھماکے سے ڈھے گئی ہے۔ رات بھر امدادی کارروائیاں ہوتی رہیں۔ ملبے سے بچنے والوں کو نکالنے کا آپریشن جاری تھا۔ وہاں آنے جانے والے راستے بند کر کے صرف علاقہ مکیں اور امدادی ٹیموں کو جانے ہی کی اجازت دی جارہی تھی۔ یہ عمارت ہماری دکان والی بلڈنگ سے دو بلڈنگ چھوڑ کر تھی۔ اس کا مطلب ہفتے بھر کی چھٹی ہوگئی تھی کیونکہ عمارت کا ملبا اور امدادی کارروائیاں کرنے اور آس پاس کا علاقہ کلیئر ہونے میں تقریباً اتنا وقت تو لگ ہی جاتا۔

ہفتے سے زیادہ ہی گزر گیا تھا اور کئی لوگ اس حادثے میں لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ تقریباً روزانہ ملبے سے مکینوں کا بچا کھچا سامان اور لاشے برامد ہوتے رہے۔ ٹی وی پر بریکنگ نیوز اور امدادی کارروائیوں کے چرچے اور حادثے میں بچ جانے والے مالکان اور لواحقین کی چیخ و پکار سے وہ شور اٹھا کہ حکومت نے اس پورے علاقے میں موجود مخدوش عمارتوں کے سروے کا حکم دے ڈالا اور بدقسمتی سے اس میں ہماری ورکشاپ والی عمارت بھی خطرناک عمارتوں والی فہرست میں آگئی۔

☆......☆

اس فہرست کے آتے ہی مقامی این جی اوز نے آسمان سر پر اٹھا لیا اور بالآخر عدالت نے ان عمارتوں کو خالی کرنے کا حکمنامہ جاری کردیا۔ ہماری بلڈنگ کے مکینوں اور دکان مالکان نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا، اسٹے آرڈر تک بات پہنچی ہی تھی کہ ایک اور حادثہ ہوگیا۔ اس بلڈنگ میں ایک روز ایک لٹکے ہوئے بے ہنگم بجلی کی تاروں میں رات کو شارٹ سرکٹ کی وجہ سے آگ لگ گئی، آگ نے پھیل کر دو چار دکانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور جب تک فائر بریگیڈ کی گاڑیاں وہاں تک پہنچیں آگ مزید پھیل چکی تھی۔ نیچے کی دکانوں کے ساتھ پہلی منزل کے چند فلیٹ جل کر خاکستر ہو چکے تھے۔ اگلے چند دنوں میں بلڈنگ کی مخدوش حالت کے پیشِ نظر عدالت نے اسے فوری طور پر خالی کروا کر منہدم کروانے کا فیصلہ سنا دیا۔

☆......☆

میں نہیں جانتا تھا کہ زندگی کی گاڑی کیسے چلے گی۔ دکان ہمارے روزگار کا ایک بہت بڑا ذریعہ تھی۔ مجھے کام آتا تھا، میں محنت سے نہیں گھبراتا تھا مگر برسوں ایک جگہ کام کرتے کرتے ساکھ بن چکی تھی۔ علاقے میں لوگ جانتے تھے۔ گاہک بندھے ہوئے تھے۔ اب کہاں نئی جگہ جا کر کام شروع کرتے۔ زیرو سے اسٹارٹ لینا پڑتا۔ اوّل تو اس پورے علاقے میں کوئی جگہ ملنے والی نہیں تھی، یہ پہلے ہی کافی گنجان علاقہ تھا۔ پرانی آبادی تھی، کوئی جگہ اب خالی نہیں بچی تھی اور اگر کوئی جگہ بیچ بھی رہا ہو تو اس کی قیمت اتنی ہوتی کہ لینا بس سے باہر۔ ہمیں تو ویسے بھی حکومت نے.... صرف وعدوں پہ ٹرخا دیا تھا۔ معاوضہ کا اعلان تو ہوا مگر کوئی عملی اقدام نہیں ہوا۔ کچھ عرصے سیاسی بہروپیوں کی آمد رہی مسائل کو حل کروانے اور معاوضہ دلوانے کے دلفریب نعروں کا شور مچا رہا، مختلف این جی اوز بھی اپنی بین بجا کر چلی گئیں اور جب اس اجتماعی شعبدہ بازی کا زور ٹوٹا تو مہینوں کی خواری اور بے روزگاری کے بعد جب بچا کھچا سرمایہ خالی ہو چکا تو پتا چلا کہ اس دوران پورا سال ہی گزر گیا اور نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ میری دکان جس بلڈنگ میں تھی اس کی زمین بکنے یا نئی عمارت کے بننے تک یہ الجھا ہوا معاملہ سلجھتا نظر نہیں آرہا تھا حکومت کی طرف سے مسئلہ حل کرنے میں عدم دلچسپی اور معاوضہ دلوانے کا ابھی فی الحال دور دور تک کوئی اشارہ نظر نہیں آرہا تھا۔

زندگی کی گاڑی تو کھینچنی ہی تھی۔ ایک نئے علاقے میں کرائے پر ایک دکان لے کر کام شروع کردیا۔ دکان کے ایڈوانس کے لیے راحیلہ نے اپنے آخری سونے کے کنگن بیچ دیے تھے اور ساری بچت تو ویسے ہی سارا سال فارغ بیٹھے رہنے کی وجہ سے ختم ہو چکی تھی۔

☆......☆

اس نئی کرائے کی دکان میں ورکشاپ کا کام ابھی تک جما نہیں تھا نہ ہی پرانی ورکشاپ کی طرح کسٹمرز کا رش تھا۔ نئے کسٹمرز بنانے کے لیے بہت محنت کرنی پڑ رہی تھی پھر اس دوران نئی ورکشاپ کو سیٹ کرنے کے لیے سامان بھی ضروری تھا، صرف ایئر کمپریسر ہی دس سے بارہ ہزار تک کا ملتا ہے۔ پرانی ورکشاپ میں ہم نے ضروری آٹو پارٹس اور انجن آئل بھی رکھے تھے۔ اس سے اضافی آمدن مل جاتی تھی اور کاروبار بھی پھل پھول رہا تھا مگر یہاں تو بڑی مشکلوں سے ایڈوانس کے پیسے اکھٹے کیے اور سیکنڈ ہینڈ کمپریسر سے گزارہ چل رہا تھا۔

اگر تو میرے سر پر چھوٹے بھائی کی فیملی کی ذمہ داری نہ ہوتی تو شاید مالی دباؤ کچھ کم ہو جاتا اور میں اس قلیل کمائی میں بھی گزارہ کر لیتا مگر میرے ساتھ بھائی کی بیوہ اور پانچ بچوں کی بڑی فیملی بھی تھی جن کو دکان کے حصے کی طے شدہ ہر مہینے رقم کی ادائیگی بھی لازمی کرنی پڑ رہی تھی۔ ان حالات میں کم آمدنی کے ساتھ گزارہ کرنا اور بھی مشکل ہوتا جارہا تھا۔ پورے سال بیٹھ کر کھایا۔ بھاگ دوڑ کرتے رہے مگر فی الحال نہ تو متبادل جگہ ملی اور نہ ہی معاوضہ۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیسے حالات کو منظم کرسکوں۔ پرانی روٹین بنانے کے لیے بھی پیسا چاہیے تھا جو کہ جیب میں نہیں تھا۔ ورکشاپ میں کسٹمرز کے ساتھ اچھے تعلقات بنانے کے لیے اچھے کام کے ساتھ سارا سارا دن چائے، ٹھنڈا وغیرہ بھی ضروری ہوتا ہے۔ پہلے تو پرانی والی ورکشاپ میں سارا سارا دن دودھ پتی کی چینک آتی رہتی تھی۔ مجھے سگریٹ کی عادت تھی اور سارا دن میں ایک سے ڈیڑھ پیکٹ تو ختم کر ہی دیتا تھا جس میں سے آدھی سے زیادہ کام کرنے والے ہیلپر اور گاہک پی جاتے تھے۔ اس کے علاوہ دوپہر کا کھانا اور پان وغیرہ بھی چل رہا ہوتا تھا۔ گو کہ میری مالی حالت مستحکم نہیں تھی پھر بھی اس نئی جگہ میں بھی میں نے اپنے پرانے سسٹم کو چلانے کی بھرپور کوشش کر رکھی تھی کیونکہ مجھے بھی ایک عرصے سے اسی طرزِ زندگی کی عادت تھی۔ خرچے زیادہ اور آمدنی کم کاروبار بھی صحیح سے جما نہیں تھا، گو کہ میں محنت کر رہا تھا مگر پرانی کمائی اور اس نئی جگہ کی کمائی میں زمین آسمان کا فرق تھا اور ان حالات میں مجھے اس دکان کا کرایہ بھی نکالنا تھا۔ میں کھینچ تان کر گزارہ کر رہا تھا۔

☆......☆

اللہ نے اولاد کی جس نعمت سے ہمیں نوازا تھا۔ ہم نے گھر میں آنے والی اپنی اس ننھی پری کا نام تو کچھ اور رکھا تھا مگر پیار سے اس کو "منیا" کہا کرتے تھے۔ منیا تیسرے سال میں لگ گئی تھی۔ شروع میں جب حالات اچھے تھے تو ہم میاں بیوی اس کی ہر فرمائش پوری کر کے اس کے لاڈ اٹھایا کرتے تھے۔ اچھے کپڑے اور کھلونے دلوایا کرتے، اب تو یہ حالات تھے کہ اسے دلانے کے لیے کسی مناسب چیز کی طرف نظر بھی اٹھتی تو فوراً اپنی کمتر مالی حیثیت کی طرف خیال چلا جاتا۔ منیا کے پاس اب نئے کپڑے تو نہیں تھے کیونکہ پرانے والے سب سائز میں چھوٹے ہوتے جارہے تھے مگر کچھ اچھے کھلونے اچھے دنوں کی یادگار کی نشانی کے طور پر ساتھ تھے جن سے منیا کا دل لگا رہتا اور وہ ان سے کھیل کر خوش رہتی۔ اللہ نے ہم کو اتنا پیارا اور انمول تحفہ دیا تھا کہ وہ ہم کو ذرا بھی تنگ نہیں کرتی تھی۔ نہ ہی بلاوجہ دوسرے بچوں کی طرح ضد کرتی۔ اس پریشانی میں ایک منیا ہی تھی جس کی وجہ سے زندگی میں رنگ بکھرے تھے ورنہ تو حالات نے ٹھوکر مار کر زندگی کے سارے خواب بکھیر دیے تھے۔

جب تک حالات خراب نہیں ہوئے تھے، منیا روزانہ شام کو میرا انتظار کرتی۔ تب تک میں بھی اس انتظار میں سارا دن گزار کر روزانہ گھر جانے سے پہلے یہی سوچتا کہ آج اپنی منیا کے لیے کچھ نہ کچھ کھانے پینے کی کوئی چیز ضرور لے جاؤں گا۔

منیا ہم میاں بیوی کی ساری امیدوں کا مرکز تھی۔ اس کی شوخی اور شرارتوں نے ہمارا دل موہ لیا تھا۔ ویسے بھی بچیاں باپ سے زیادہ پیار کرتی ہیں۔ جب بھی میں گھر واپس آتا منیا دوڑ کر مجھ سے لپٹ جاتی، میری گود میں اچھل کود کرتے ہوئے کبھی کندھے پر چڑھ جاتی پھر وہاں سے چھلانگ لگا کر دوبارہ میری گود میں گر جاتی۔ کبھی میرے کان پکڑ کر مجھے گھوڑا بنا کر خوب سواری کرتی۔ میں تو جیسے اپنی ننھی پری کی ان اداؤں پر قربان ہو چکا تھا سارا دن کام کر کے مجھے بس گھر پہنچنے کی ہی جلدی ہوتی۔ راستے میں کبھی جلیبی، مٹھائی اور کبھی ٹافیاں اس کے لیے ضرور خرید لیتا اور سیدھا گھر پہنچ کر منیا کو جب وہ چیزیں دکھاتا تو وہ خوشی سے کھل اٹھتی اور مجھ سے لپٹ کر خوب لاڈ کرتی۔

ہم نے اپنی منیا کو کھلونے دلوائے تھے جن میں کھلونا ٹی

سیٹ، کچن سیٹ، چولہا برتن اور چھوٹا سا گھر شامل تھا۔ ضیا روزانہ شام کو وہ کھلونا گھر اور برتن نکال کر ان سے کھیلنے بیٹھ جاتی۔ وہ اس طرح کہ زمین پر کپڑا بچھا کر دستر خوان سا سجا لیتی اور پیار سے گاتی۔

''چندا ماموں آئیں گے دودھ جلیبی لائیں گے
کھیلتے کھیلتے بھوک لگی کھالو بیٹا مونگ پھلی
مونگ پھلی میں دانہ نہیں ہم تمہارے نانا نہیں''

ادھر سے ضیا یہ گا رہی ہوتی تو دوسری طرف راحیلہ اس کے ساتھ کورس میں شامل ہو جاتی۔

اور دونوں مل کر پوری نظم دہراتیں ضیا کو تو وہ نظم زبانی یاد ہو گئی تھی اور وہ بار بار یہی راگ الاپ رہی ہوتی۔

مگر اب جیسے ہی حالات نے کروٹ لی، برے دن آ گئے تو گھر واپس آتے ہوئے کچھ خریدنے کے لیے کم از کم ہزار دفعہ سوچنا پڑتا تھا۔

اب تو ایسا کتنی دفعہ ہوتا کہ ضیا اپنا دستر خوان سجائے جب چندا ماموں شروع کرتی اور گاتے ہوئے۔ ''کھیلتے کھیلتے بھوک لگی پر پہنچتی'' تو رک کر مجھے دیکھتی اور پھر میری تھوڑی پر ہاتھ رکھ کر کہتی۔

''ابو آپ میرے لیے مونگ پھلی کب لائیں گے۔''

''دودھ جلیبی لائیں گے نا؟'' پھر خود ہی ہنستے ہوئے جھوٹ موٹ کی دودھ جلیبی اپنے چھوٹی سی کھلونا پلیٹ میں لا کر مجھے دیتی۔ میں جھوٹ موٹ اس کا دل رکھنے کے لیے مزے لے لے کر وہ دودھ جلیبی کھاتا۔

''اچھا اب چائے بناؤں آپ کے لیے۔ آپ تھکے ہوئے آئے ہیں نا۔ ابھی ٹھہر جائیں میں جلدی سے آپ کے لیے چائے بنا دوں۔ وہ راحیلہ کی نقل کرتی۔

میں اقرار میں سر ہلاتا اور وہ جھوٹ موٹ کی چائے بنا کر مجھے دیتی۔ بچوں میں غضب کی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ ہو بہو راحیلہ کی نقل کرتی۔ مجھے جھوٹ موٹ کی چائے کا کپ یوں احتیاط سے پیش کر رہی ہوتی جیسے وہ ابھی کپڑوں پر چھلک جائے گا۔ میں چائے کا کپ ایک طرف رکھ کر اسے زور سے اپنے سینے سے لپٹا لیتا اور کبھی ہوا میں اچھالتا۔ وہ بس۔ بس کرتے ہوئے خوب شور مچاتی۔

''کیا بس بس کی رٹ لگائی ہے۔'' میں اس کے گالوں کو چوم کر کہتا۔

''اچھا چلیں اب چائے تو پی لیں۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ پیتے کیوں نہیں۔'' وہ پھر سے ماں کی نقل کرتی۔

ضیا مجھے اپنے ہاتھ سے جھوٹ موٹ کی چائے پلاتی اور مجھے یوں لگتا کہ جیسے کوئی آبِ حیات میرے اندر انڈیل رہا ہو۔ ایک طمانیت بھری ترنگ میرے اندر اترتی آتی۔

''ضیا'' کی فرشتوں جیسی مسکراہٹ اور معصوم اداؤں سے سارے دن کی تھکن اتر جاتی تھی۔

مگر اب میں کیا کرتا۔ ضیا کی خوشی کے لیے کچھ نہیں کر پا رہا تھا اور وہ بھولی بھالی گڑیا جب مجھ سے کھیل ہی کھیل میں دودھ جلیبی کی فرمائش کرتی تو دل مسوس کر رہ جاتا۔ کیا کرتا؟ دکان کا کرایہ، روزانہ کے خرچے، بھائی کی بیوہ کو ہر مہینے ایک مخصوص رقم کی ادائیگی۔ بڑی مشکل سے گھر کا چولہا جلا پا رہا تھا۔ اپنی بچی کی فرمائشیں کہاں سے پوری کرتا۔ حالانکہ وہ صرف کھیل ہی کھیل میں فرمائش کر رہی ہوتی۔ کھیل ختم ہوتے ہی مجھے کبھی تنگ نہیں کرتی۔ بس مجھ سے لپٹ جاتی اور اپنی معصوم شرارتوں سے خود بھی خوب ہنستی اور مجھے بھی گدگداتی۔ وہ ہنستی تو میری آنکھیں ہنس رہی ہوتیں مگر دل اندر سے رو رہا ہوتا۔

ضیا کو کچھ دنوں سے پیٹ میں درد کی شکایت رہنے لگی تھی، راحیلہ نے مجھے بتایا تھا کہ پہلے تو وہ سمجھتی رہی کہ بچی ہے کھانے پینے میں بے احتیاطی کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ پیٹ میں گڑبڑ ہو اور نظام ہاضمہ صحیح نہیں ہو۔ اس نے احتیاطاً کھانے پینے کا خیال رکھنا شروع کر دیا اور کچھ ہاضمے کا شربت وغیرہ پلا دیا۔ وقتی طور پر سب ٹھیک ہو گیا اور راحیلہ بھی بھول بھال گئی مگر چند دن بعد پھر سے ضیا کے پیٹ میں درد اٹھا۔ راحیلہ نے پھر اسے ہاضمے کی دوا دے دی۔

اور پھر جب تواتر سے دوبارہ ضیا کو درد کی تکلیف ہوئی تو راحیلہ نے مجھ سے ذکر کیا۔ ہم نے اسے ڈاکٹر کو دکھانے کا ارادہ کیا۔ محلے کے ڈاکٹر نے راحیلہ کے بتانے پر درد کی دوا تو دے دی مگر آرام نہ آنے کی صورت میں چائلڈ اسپیشلسٹ کو دکھانے کی تاکید بھی کر دی۔

ڈاکٹر صاحب نے ضیا کی خوراک اور بازاری چیزوں مثلاً فاسٹ فوڈ اور کھانے پینے میں احتیاط کا مشورہ بھی دیا، ٹافی، چاکلیٹ، پاپڑ اور سلانٹی وغیرہ کی جگہ موسم کے تازہ پھل اور ان کے جوس پلانے کا مشورہ دیا۔ یہ ڈاکٹر صاحب اس محلے میں بہت پرانے وقتوں سے اپنا کلینک چلا رہے تھے۔ محلے کے ایک ایک شخص کو جانتے تھے اور ہم بھی بچپن سے پولیو کے قطرے پینے سے لے کر سارے ٹیکے انجکشن وغیرہ انہیں کے ہاتھوں لگوا کر بڑے ہوئے تھے گویا آپ انہیں پورے محلے کا فیملی ڈاکٹر سمجھ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کافی عمر رسیدہ

تھے اور محلے کی ماں بہنوں اور بڑوں تک کو بیٹا کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ کئی لوگ تو ان سے اپنے ذاتی مسائل بھی ڈسکس کر لیا کرتے۔ میری موجودہ مالی حالت کا ڈاکٹر صاحب کو بخوبی علم تھا۔ پھل اور تازہ جوس والی بات پر میں نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ میری مالی حیثیت اچھی نہیں تو وہ کوئی اچھا سیرپ لکھ کر دے دیں۔

میری بات سن کر ڈاکٹر صاحب نے چشمہ اتار کر میز پر رکھ دیا اور میری جانب دیکھ کر سمجھانے کے انداز میں بولے۔

''بیٹا موسم کا کوئی بھی پھل پچاس سے سو روپے تک میں بڑے آرام سے شام کے وقت مل جاتا ہے۔ کیا اپنی یہ پان سگریٹ، گٹکے اور چائے کی عادت چھوڑ کر اپنے بچوں پر سو پچاس بھی نہیں خرچ کر سکتے۔ خدا کے لیے اپنے بچوں کی صحت پر دھیان دو، انہیں پھل کھانے کی عادت ڈالو۔ اگر درجن بھر نہ سہی، پچاس یا ساٹھ روپے میں چھ عدد مالٹے، موسمی یا کینو بھی نہیں خرید سکتے اپنے بچوں کے لیے؟''

ڈاکٹر صاحب نے دوبارہ چشمہ میز سے اٹھا کر پہنتے ہوئے کہا۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ان سے گھر والوں اور خصوصاً بچوں کی صحت پر کتنا اچھا اثر پڑے گا۔ قوت مدافعت بڑھے گی۔ نہ وہ بیمار ہوں گے اور نہ ہمیں ڈاکٹروں کی فیس دینی پڑے گی۔ ڈاکٹر صاحب نے شفقت بھری چپت میرے سر پر لگاتے ہوئے مذاقاً کہا۔

ڈاکٹر صاحب کی حکیمانہ باتوں میں وزن تھا۔ میں نے ان کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے اس پر عمل کرنے کی ہامی بھری اور ضیا کو لے کر گھر واپس آ گیا۔

☆......☆

کچھ دن گزر گئے اور ضیا نے پیٹ میں درد کی شکایت نہیں کی ویسے بھی ضیا کو پیٹ میں نہیں بلکہ پیٹ کے پاس درد ہوتا تھا جو کہ بعد میں جا کر ہمیں پتا چلا جب ہم نے ضیا کے ٹیسٹ کروا لیے۔ مجھے ڈاکٹر صاحب کی نصیحت یاد تھی میں نے کوشش کر کے اپنی سگریٹ کی طلب کو کم کر کے نصف کر لیا تھا۔ اور ان پیسوں سے کچھ نہ کچھ پھل گھر میں لے ہی آتا تھا اور کچھ نہ سہی نصف درجن کیلے ہی سہی جو کہ پچیس سے تیس روپے میں مل جاتے تھے۔

آج شام گھر آ کر کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر حسب عادت ضیا کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ ضیا نے مجھ سے ایک عجیب طرح کی فرمائش کی۔

اس نے مجھ سے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔

''ابو کیا آپ مجھے اناس کے پھول لا کر دیں گے؟''

پہلے پہل تو میری کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا کی ہماری لاڈلی بیٹی کس چیز کی فرمائش کر رہی ہے۔ بعد میں راحیلہ نے مجھے اصل ماجرا سنایا۔

ہمارے پڑوسی منیر صاحب کے گھر میں جب کبھی کوئی پھل آتا تو ان کے بچے اپنے گھر کے باہر بنے ہوئے چبوترے پر بیٹھ کر اسے کھایا کرتے، نجانے انہیں باہر کی کھلی فضا میں آ کر موسم کا پھل کھانے میں مزہ آتا یا پھر سب کو دکھا دکھا کر کھانے میں۔ بہر حال وہ بچے تھے مگر ان کے والدین کا تو فرض بنتا تھا کہ وہ اپنے بچوں کی اس عادت پر ان کی سرزنش کریں اور گھر سے باہر اس طرح نمائش کر کے دوسروں کا دل للچا کر کھانے پینے کا مظاہرہ کرنے سے روکیں، رواداری کا مظاہرہ کریں، دین میں بھی یہی سکھایا گیا ہے کہ کھانے پینے کی نمائش نہ کی جائے، حتیٰ کہ چھلکے بھی گھر کے سامنے نہ پھینکے جائیں مبادا کسی کی دل شکنی ہو، کسی کو اپنی کمتر مالی حیثیت اور کم مائیگی کا احساس ہو۔

مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا، موسم کا ہر فروٹ فراوانی سے منیر صاحب کے گھر آتا اور اس کی خوشبو آس پڑوس کے گھروں میں پہنچتی مگر ساتھ ساتھ ٹراپیکل فروٹ جیسے اسٹرابیری، چیری، اناس اور کیوی فروٹ جیسے کمیاب پھل بھی ان کی دسترس میں تھے اور حسب عادت ان کے چھلکے بھی گھر سے باہر فخریہ انداز میں پلاسٹک کے ادھ کھلے شاپر میں نمائشی انداز میں پھینک دیئے جاتے۔

ایک دن راحیلہ ضیا کو اپنے ساتھ لے کسی کام سے پڑوس میں منیر صاحب کے گھر گئی تو اتفاق سے اسی دن ان کے گھر اناس آیا تھا اور منیر صاحب کے بچے مزے لے لے کر اسے کھا رہے تھے، بقول راحیلہ اس دن ضیا بڑی حیرت سے انہیں شیرا ٹپکاتی اناس کی خوش رنگ قاشوں کو کھاتا دیکھ رہی تھی۔ کسی نے یہ احساس تک نہیں کیا کہ کم از کم جھوٹے منہ ہی سہی گھر آئے مہمان کو اس معصوم ننھی بچی کو پوچھ لیتے، ایک آدھ قاش ہی عنایت کر دیتے، راحیلہ نے بچی کی دل آزاری کے خیال سے اسے گھر سے باہر کھیلنے بھیج دیا اور خود بھی جلدی وہاں سے اٹھ آئی۔ ضیا کو اٹھا کر گود میں لیا اور دل ہی دل میں ہمسایوں کی کنجوسی کو کوستی گھر آ گئی، گھر آ کر اس نے دیکھا تو ضیا نے بند مٹھی میں کوئی چیز دبائی ہوئی تھی، راحیلہ نے جب پیار سے اسے پچکارتے ہوئے اس کی مٹھی کھلوائی تو پتا چلا کہ ضیا نے اناس کے بالائی حصے کے سخت چھلکوں میں سے ایک ٹکڑا

اپنی مٹھی میں لیا ہوا تھا۔

بات کچھ یوں تھی کہ جب راحیلہ نے اسے گھر سے باہر کھیلنے کے لیے بھیجا تھا تو ضیا نے منیر صاحب کے دروازے پر پڑے پلاسٹک کے لفافے سے جھانکتے ہوئے چھلکوں میں سے ایک ٹکڑا اٹھا لیا تھا، اس لیے کہ وہ اس کے لیے انوکھی چیز تھی، بچے کھیل ہی کھیل اور تجسس میں چیزوں کو اٹھا کر الٹ پلٹ کر چیک کر کے اپنے تجسس کا مظاہرہ کرتے ہیں اسی لیے ضیا نے بھی اس سخت اور عجیب نظر آنے والے ہرے رنگ کے پتے کو اٹھا لیا تھا اور اب اس کے سارے سوالوں کے جواب راحیلہ اور مجھے دینے تھے، بڑی مشکلوں سے راحیلہ نے اسے جھوٹ موٹ بہلا دیا اور ویسے ہی اسے ٹالنے کے لیے کہہ دیا کہ اس سخت کھردرے ہرے پتے کو اناناس کا پھول کہتے ہیں اور پھر جلدی سے اس کے پسندیدہ کھلونے نکال کر اپنے من پسند کھیل میں لگا دیا مگر شام تک ضیا نے وہ ہرے سخت اناناس کے پتوں کا پیچھا نہ چھوڑا اور پھر شام کو میرے کام سے آتے ہی مجھ سے اناناس کے پھول لانے کی فرمائش کر دی، میں نے اسے گود میں اٹھا کر چوم لیا اور اس کا دل بہلانے کی خاطر جھوٹ موٹ وعدہ بھی کر لیا، بچی بہل گئی اور ہم بھی خوش ہو گئے کہ اسے بہانہ بنا کر بہلا دیا مگر اگلے ہی دن اس نے پھر مجھ سے اناناس کے پھول لانے کی فرمائش کی، وہ ہماری راج دلاری تھی کبھی کبھی فرمائش کرتی تو بڑی کوششوں سے اس کی فرمائش پوری کرنے کا سوچتے سو طرح کے اخراجات بیچ میں آ جاتے۔ کبھی دل مسوس کر رہ جاتے اور کبھی کسی مناسب موقع کا انتظار کر کے چھوٹی موٹی خواہشات کو پورا کر دیتے تو ضیا کی خوشی دیدنی ہوتی، ہم بھی اس کی خوشی میں خوش ہو جاتے، اپنے محدود وسائل سے اپنی ضیا کو کچھ نہ کچھ دلوا ہی دیتے، ضیا کی ان دنوں ایک ہی جگہ سوئی اٹکی ہوئی تھی اور وہ تھی اناناس کے پھول۔ اس کی یہ گردان بڑھتی گئی پھر تو میں نے بھی آج دل ہی دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ میں اپنی پیاری ضیا کے لیے ایک عدد ''اناناس'' یعنی بقول ضیا کے اناناس کے پھول لے آؤں گا۔

☆......☆

شام کو کام جلدی سمیٹ کر ورکشاپ بند کی، سورج غروب ہو چکا تھا، مغرب کے بعد کا وقت تھا، آج دن میں کوئی خاص کام نہیں آیا تھا، توقع کے برعکس دیہاڑی کچھ کم ہی لگی تھی۔ دن بھر میں ضروری اخراجات کے پیسے نکال کر میرے پاس اتنے ہی پیسے تھے کہ دو ڈھائی سو روپے میں شام کو کوئی سستا اور اچھا اناناس مل جائے تو ضیا کی فرمائش پر خرید کر گھر لے جاؤں۔ دل میں ایک شک سا تھا کہ نجانے اتنے کم پیسوں میں مطلوبہ اناناس ملے کہ نہ ملے اور گھر میں خالی ہاتھ پہنچنے پر ضیا کا مایوس چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔ بہرحال دھڑکتے دل سے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور صدر ایمپریس مارکیٹ کا رخ کیا۔ مارکیٹ سے کچھ دور موٹر سائیکل پارک کی اور اب میں صدر ایمپریس مارکیٹ کے سامنے کھڑا تھا۔

رنگا رنگ خوشنما موسمی فروٹس کی بہار سی آئی ہوئی تھی، موسم کا ہر فروٹ وافر مقدار میں دستیاب تھا، گرمیاں کب کی ختم اور سردیوں کا موسم بس آنا ہی چاہتا تھا، پھلوں کا بادشاہ آم اپنی دکان سمیٹ کر بہت پہلے رخصت ہو چکا تھا اور اب مختلف ٹھیلوں پر سیب، خربوزے، مالٹے، امرود، کیلے اور انار اپنی بہار دکھلا رہے تھے، میں نے ٹھیلوں کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر اپنے مطلوبہ پھل کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو ایمپریس مارکیٹ کے سامنے روڈ کراس کر کے جہانگیر پارک کے جنگلے کے اندر کھڑے چند ٹھیلوں پر اناناس نظر آئے۔ ایمپریس مارکیٹ اور اس کے آس پاس کے تمام علاقے میں جابجا ٹھیلے و تھیارے بکثرت بکھرے نظر آتے ہیں، تاحد نظر ان ٹھیلوں کے جمگھٹے میں عموماً شام کے وقت سستا پھل دستیاب ہوتا ہے، مگر ساتھ ہی ساتھ بہت احتیاط بھی ضروری ہوتی ہے۔ یہاں سارا دن نوسر باز اپنے فن کے مظاہرے میں مصروف عمل نظر آتے ہیں، مقامی پولیس کی سرپرستی میں غیر قانونی طور پر ٹھیلوں کا بلاشبہ جنگل بلکہ شہر کہنا مناسب ہوگا آباد ہے، لہٰذا جہاں بیشمار محنت کش اور ایماندار پھل فروش اپنے لیے رزق حلال کمانے کی کوشش میں سارا دن لگے رہتے ہیں ان کے ساتھ ہی جعل سازی بھی اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ دوائیاں بیچنے والے ڈھونگی بیچ سڑک پر اپنی دکان لگائے بیانگ دہل جنسی بیماریوں کے علاج سے لے کر جوڑوں کے درد، شوگر اور کینسر جیسے موذی مرض کے علاج کا دعویٰ کرتے نظر آتے ہیں تو کہیں پر بولی لگا کر دو نمبر الیکٹرونکس کے آئٹم پر کھلے عام لوگوں کو لوٹا جا رہا ہوتا ہے۔ آجکل جہانگیر پارک کی تزئین و آرائش ہو رہی ہے مگر ان دنوں یہاں پر قبضہ مافیا کا راج تھا، پارک کے آہنی جنگلے تک کو مختلف نشے کے عادی افراد اور ہیروئنچیوں نے کاٹ کر بیچ ڈالا۔ پارک کے اندر جرائم پیشہ اور قبضہ مافیا کا راج تھا۔ بہرحال میں لوگوں کے رش اور ٹھیلوں سے بچتا بچاتا اپنے مطلوبہ مقام تک پہنچا۔

ڈھیلے ڈھالے شلوار قمیص میں ملبوس اور سر پر بڑی سی پگڑی باندھے زیادہ تر پھل فروشوں کا تعلق ایک مخصوص علاقے سے تھا۔ اکثریت میں ہونے کی وجہ سے یہ کبھی آپ سے نرم اور نسبتاً تمیزدارانہ لہجے اور کبھی اپنے مخصوص اکھڑ اسٹائل میں دھتکار کر بات کرنے کے عادی تھے۔

''یہ کتنے کا دیا ہے بھائی۔'' ایک زردی مائل سنہرے خوشبودار اناناس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے جھجکتے ہوئے پھل فروش کو مخاطب کیا۔

وہ لمبا چوڑا موٹا تازہ پہلوان نما پھل فروش بہت گھاگ نظر آتا تھا۔ میری جھجک شاید اس نے فوراً محسوس کر لی اور کڑک کر بولا۔ ''تم کو لینا ہے یا صرف ریٹ پوچھ کر ہمارا ٹائم خراب کرنا ہے۔''

''لینا ہے بھائی۔'' اپنی مالی حالت کو مدِنظر رکھ کر دبے لہجے میں، میں نے تھوک نگل کر کہا۔

''بات کرو کتنا دے گا؟ یہ ساڑھے تین سو روپے کا دانہ ہے۔ صبح سے چار سو روپے کا بیچا ہے......'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے چار انگلیاں دکھائیں۔

''ساڑھے تین سو روپے۔'' میں نے اناناس کو اٹھا کر اس کے وزن کا اندازہ کرتے ہوئے غیر یقینی لہجے میں پوچھا۔

''جاؤ یہاں سے۔'' اس نے میرے ہاتھ سے اپنا اناناس چھین لیا۔

''ہم کو پتا ہے تم لوگ صرف دام پوچھنے آتا ہے۔ جاؤ خوامخواہ دکانداری خراب نہیں کرو۔ اس پھل فروش نے درشت لہجے میں کہا۔''

میرے پاس کل ملا کر پانچ سو اسّی روپے تھے۔ صبح کا ناشتا۔ چھوٹی موٹی ضروریات اور پان سگریٹ کے لیے بھی پیسے چاہیے تھے۔ میں مایوس ہو کر لوٹنا ہی چاہتا تھا کہ اس پھل فروش نے اپنے ٹھیلے پر اناناس کے ڈھیر میں سے ایک اور اناناس اٹھایا، یہ نسبتاً چھوٹا اور سیاہی مائل سبز سا تھا، پہلے والے دانے کے مقابلے میں کچھ سخت تھا، غالباً ابھی پوری طرح پکا ہوا نہ تھا اور خوشبو بھی نہ تھی۔

''یہ تین سو روپے میں لے جاؤ۔'' اس نے گویا کمال فیاضی کا مظاہرہ کیا۔

میں جاتے جاتے رکا اور اس اناناس کو ہاتھ میں لے کر اندازہ کیا، مجھے وہ کچھ خاص اچھا نہیں لگ رہا تھا، پھر بھی میں نے اس سے جان چھڑانا چاہی۔

''مجھے کم پیسوں والا چاہیے۔'' یہ میری گنجائش سے زیادہ ہے۔

''تمہارا گنجائش کتنا ہے۔'' اس نے آنکھیں پھاڑ کر میری طرف دیکھا۔

''تین سو سے کم۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

سوچو نہ میرے بھائی۔ یہ ساڑھے تین سو کا دانہ ہے تمہاری خاطر تین سو میں دوں گا۔ شاباش ضد چھوڑو۔ یہ تین سو سے کم کا نہیں ہے۔ اس بار اس نے نسبتاً نرم لہجے میں عیاری سے کہا۔

وہ اناناس میرے دل کو نہیں بھایا تھا، اس کے اندر کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ میں اسے تین سو میں خرید لیتا، پھل فروش کا اصرار بڑھ رہا تھا وہ زور شور سے اپنے مال کی قصیدہ خوانی میں مصروف تھا، اچھے برے لوگ ہر جگہ ہیں۔ صدر میں ہی یہ عام سی بات ہے کہ آپ نے اچھے اچھے فروٹ چھانٹ کر خریدے اور پھر پیسے نکالتے وقت یا پھر ذرا دھیان اِدھر اُدھر بھٹکا اور اِدھر آپ کے شاپر سے دوسرا شاپر تبدیل۔ گھر جا کر دیکھا تو گلے سڑے فروٹ آپ کا منہ چڑا رہے ہوتے ہیں۔ میں خود ایک دفعہ بھگت چکا ہوں کہ صاف ستھرے کیلے خرید کر گھر پہنچا تو اندر سے نرم اور زیادہ پکے ہوئے کیلے نکلے۔ میں اسی سوچ میں گم تھا کہ پھل فروش نے میرے کندھے کو جھنجوڑ کر ہلایا۔ اس کا رویہ ہتک آمیز تھا۔

''چلو بھائی تم سے اس دانے کے دو سو اسّی لے گا۔ ابھی تو تمہاری گنجائش کے اندر ہے نا۔'' اس نے گویا احسان کرتے ہوئے تحقیر آمیز انداز میں پھر میرے کندھے کو ہلایا۔

مجھ سے غلطی ہو گئی تھی اسے اپنی گنجائش بتا کر۔

میری بتائی ہوئی اس گنجائش میں وہ کمتر اور کم معیار کا پھل من مانی کے انداز میں جتا کر میرے سر تھوپنا چاہ رہا تھا۔

''جلدی کرو دوسرا گاہک انتظار کر رہا ہے۔ دھندے کا سارا ٹائم خراب کیا تم نے۔ اس دفعہ اس نے سختی سے میرا بازو جکڑ کر چلا کر کہا۔''

میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر دیکھا۔ وہاں اِکّا دُکّا راہگیر اور دوسرے ٹھیلوں پر چند لوگ اپنی اپنی مرضی کے فروٹ خرید رہے تھے۔ میں مین روڈ سے کچھ اندر آ گیا تھا یہاں ٹھیلے تو کم تھے مگر عارضی طور پر پھلوں کے اوپن ایئر گودام کا ماحول سا وجود میں آیا ہوا تھا۔ لکڑی کی خالی پیٹیوں کا انبار تھا۔ تھوڑی ہی دور اجڑی ہوئی کیاریوں اور پانی کے سوکھے تالاب میں میلے کچیلے بستروں میں چرسی اور ہیروئنچی آزادانہ نشہ کر رہے تھے۔ قانون نام کی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی وہاں۔

مجھے تو کسی بھی قیمت پر وہ اناس نہیں لینا تھا، دل کو ٹھک نہیں رہا تھا، نہ کوئی خوشبو نہ وزن، میری جیب اجازت نہیں دے رہی تھی اچھا دانہ خریدنے کی ورنہ اتنی بحث ومباحثہ کی ضرورت ہی نہ پیش آتی اور ویسے بھی اب وہ خرانٹ پھل فروش مجھے ٹھگنے کے چکر میں تھا۔ میں وہاں سے نکلنے کے چکر میں تھا اور سمجھ میں نہیں آرہا تھا کس طرح اس چالاک شخص سے اپنی جان چھڑاؤں ۔۔۔ کہ اس نے ایک بار پھر زوردار ٹھوکا مارتے ہوئے مجھے متوجہ کیا۔

جلدی کرو نماز کا ٹائم جا رہا ہے۔ تم لوگ تو نماز بھی نہیں پڑھتا ہے بے شرم لوگ۔ وہ منہ ہی منہ میں بظاہر بڑبڑاتے ہوئے اپنے غصہ کا اظہار کر رہا تھا۔

یہ پھل فروش ان چالاک قسم کے دکانداروں میں سے تھا جو باتوں ہی باتوں میں گاہک کو گھیر کر اتنا پریشر ڈال دیتے ہیں کہ شریف اور بے بس گاہک اپنی تذلیل سے بچنے کے لیے بلا چوں چرا کیے ان کی مرضی پر قربان ہو جاتا ہے اور دکاندار بیکار اشیاء ۔۔۔ اپنی مرضی کے داموں بیچ ڈالتے ہیں۔ ٹھگ قسم کے دکاندار اکثر باتوں ہی باتوں میں ان گاہکوں کی بے عزتی بھی کرنے سے باز نہیں آتے ہیں۔ میں نے ہمت کی اور دل کڑا کے اسے کہہ دیا۔

معاف کرنا بھائی۔ مجھے نہیں لینا، تم پیسے زیادہ بتا رہے ہو میں کسی اور ٹھیلے سے بھی پوچھ کر دیکھتا ہوں۔ اگر ریٹ ایک جیسا ہوا تو پھر تم سے ہی لوں گا، میں نے حتی الامکان بات بنانے کی کوشش کی۔

”کس سے پوچھے گا ریٹ؟“ اس نے آنکھیں نکال کر کہا۔

”یہ سامنے ہمارا بھائی ہے اس سے پوچھو اگر یہ ساڑھے تین سو سے کم میں دے گا تو میں مفت دوں گا۔ اس نے زوردار آواز میں آس پاس کے پتھارے داروں کو متوجہ کرتے ہوئے اعلان کیا تاکہ سب کو پتا چل جائے اور کوئی اس سے کم دام میں مجھے اناس فراہم نہیں کرے۔ وہ تقریباً چیخ کر بول رہا تھا۔“

”چلو اس سے پوچھو یہ کتنے کا ہے؟“ اس نے اپنا وہ اناس اٹھا کر برابر والے ٹھیلے والے کو اپنے مقرر کردہ دام بتائے اور اپنی مادری زبان میں کچھ کہا۔

”اس نے بھی سر ہلا کر اس کے بتائے ہوئے دام کی تائید کی۔ بڑا زبردست ایکا تھا ان کا آپس میں۔“

”لے جاؤ بھائی جان بہت اچھا دانہ نکال کر دیا ہے۔ آج لے کر جاؤ گے تو پھر روزانہ بس ادھر ہی آؤ گے۔“ اس برابر والے پھل فروش نے بھی دانت نکال کر اس کے مؤقف کی تائید کی۔

”لے جاؤ اللہ کا نام لے کر“ اس دوسرے پھل فروش نے میری طرف دیکھ کر حکیمانہ انداز میں کہا۔ ان کی زبردست اداکاری دیکھ کر میں ابھی تک سوچ میں ہی ڈوبا ہوا تھا وہ میری طرف دیکھ کر بیزاری سے بولا۔ ”ارے بابا یہ پینٹ شرٹ والا تو بہت کنجوس ہوتا ہے۔ بہت ایمان کمزور ہوتا ہے۔“ اس نے بڑبڑاتے ہوئے اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر کہا۔

میں نے حیرت سے اس ایماندار کا چہرہ غور سے دیکھا۔

پارک میں ایک مسجد تھی اور اسی کے ساتھ منسلک وہ دیوار بھی تھی جہاں مسجد میں بیت الخلاء کی سہولت میسر ہونے کے باوجود یہ شلوار قمیص والے ایماندار حضرات اپنی رفع حاجت کی ضروریات اسی دیوار کی آڑ میں پوری کرلیا کرتے تھے، حالانکہ اسلام نے صفائی کو نصف ایمان کا درجہ دیا ہے۔ بڑا عجیب امتزاج تھا۔

میں ان کی باتوں سے عاجز آچکا تھا۔ میں نے آخری پتا پھینکا۔

”میرے پاس اس کے لیے دو سو سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ لاؤ دو سو روپے ہی دو۔ جاؤ لے جاؤ اسے۔“

اس پھل فروش نے اپنا حتمی فیصلہ سنایا اور اناس اٹھا کر شاپر میں ڈال کر میری جانب رکھ دیا۔

”میں نے سوچا تھا کسی طرح کم دام بتا کر ہی اس مسئلے سے جان چھڑا پاؤں مگر اچانک ہی پھل فروش کے جواب نے میرے ہوش اڑا دیے۔“

مجھے ٹھنڈے پسینے چھوٹ گئے، اس چالباز نے چال الٹ دی تھی، بہت گھاگ شخص تھا۔ میں نے اسے ٹالنے کی خاطر کہا مگر اب اس کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گیا، اتنی لمبی بحث وتمحیص کے بعد اب کوئی چارہ نہ تھا۔ میں اپنے ہی منتخب کردہ دام میں اب کوئی بہانہ نہیں بنا سکتا تھا۔ اپنے ہی دام میں پھنس گیا تھا۔ دراصل یہ اس کی چال تھی کہ میں جیسے ہی دام کم کروں وہ ایک دم سودا پکا کردے۔ دراصل موہ بے رنگ اور بے بو چھوٹے سائز کا اناس دو سو روپے میں بھی مہنگا تھا بلکہ کوئی بھی سمجھدار گاہک تو شاید اسے خریدنے کی نیت سے دیکھنا بھی پسند نہ کرتا۔ اس طرح کے پھل جب چھانٹی کے

بعد بچ جاتے ہیں تو گلے سڑے بقایا پھلوں کے ساتھ رات گئے آواز لگا کر سو پچاس کی ڈھیری میں اکھٹے بک جاتے ہیں۔

نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کے مصداق میں نے کوئی راستہ نہ دیکھتے ہوئے ناچار اپنا پرس کھول کر پانچ سو کا نوٹ نکالا اور اسے عنایت کیا۔

"کھلے نکالو دو سو روپے۔" وہ آنکھیں پھاڑ کر بولا۔

"کھلے نہیں ہیں بھائی۔" میں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"بہت کا فر لوگ ہے، پانچ سو کا نوٹ جیب میں رکھ کر جھوٹ بولتا ہے کہ پیسے نہیں ہیں۔ حرام خور کہیں کا۔" وہ بظاہر آہستگی سے بڑبڑاتے ہوئے زبان درازی کر رہا تھا مگر صاف طور پر مجھے سنائی دے رہا تھا۔

"تم ادھر ہی رکو ہم کھلا لے کر آتا ہے۔" پھل فروش نے برابر والے سے پوچھا مگر اس کے پاس بھی کھلا نہ تھا۔ دوسرے تیسرے ٹھیلے والوں سے پوچھتے ہوئے وہ روڈ کے کنارے تک پہنچ گیا تھا۔ وہ چند گز اور دور چلا تو میرے دماغ میں کھڑکی سی کھلی۔ وہ خوشبودار سنہرے رنگ والا خوشنما اناناس اس ٹھیلے کے بیچوں بیچ پڑا دعوت نظارہ دے رہا تھا جسے میں نے پہلے پہل دیکھا تھا۔ میرے اندر کا ایمان کمزور ہونے لگا۔ وہ پھل فروش پیسے کھلے کروانے کچھ زیادہ ہی آگے چلا گیا تھا، میں نے ایک دو بار چوری چوری نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا۔ سب لوگ اپنے اپنے کام میں مگن تھے۔ پھل فروش پیسے کھلے کروانے میں مگن۔ موقع مناسب تھا۔ میں نے شاپر سے وہ چھوٹا اناناس نکال کر ٹھیلے پر دھرے باقی اناناسوں کے ڈھیر کے بیچوں بیچ دبا دیا اور وہ خوشبودار اناناس اٹھا کر اپنے شاپر میں منتقل کر دیا۔ اس بے ایمانی پر میرا دل دھڑک رہا تھا مگر شیطان مستقل پیچھے پڑا ہوا یقین دہانیاں کروا رہا تھا کہ اس پھل فروش نے بھی تو میرے ساتھ زیادتی کی ہے۔

میرے ساتھ بے ایمانی سے سودا کیا۔ میں نے تو بس اس کا بدلہ اس سے لے لیا ہے اور کچھ نہیں اور ویسے بھی مجھے صدر میں ٹھیلے بدلنے والے واقعات بھی یاد تھے۔

"ان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔" میں نے دل کو مطمئن کرنا چاہا۔

مگر نجانے دل کیوں مطمئن نہیں ہو رہا تھا اور جتنی دیر میں ضمیر جاگا اور دماغ نے ملامت کرتے ہوئے اس غلطی کی تلافی کرنی چاہی بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں نے ابھی اپنے شاپر سے وہ اناناس نکال کر اسے اپنی جگہ واپس رکھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ سامنے سے وہ پھل فروش سر پر پہنچ چکا تھا۔

وہ پھل فروش پیسے کھلے کروا کر لے آیا تھا۔ میں نے دھڑکتے دل سے بقایا تین سو روپے لیے، شاپر کو پہلے ہی کندھے پر لٹکا لیا تھا اب بس حتی الامکان کوشش یہی تھی کہ جلد از جلد وہاں سے نکل جاؤں۔

ٹھیلوں کے بیچوں بیچ جگہ بناتا ہوا تیزی کے ساتھ وہاں سے نکلا۔ مین روڈ پر قدم رکھ کر ابھی اطمینان کا سانس لیا ہی تھا کہ ایک سخت ہاتھ نے میرے کندھے کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

میں نے گھوم کر پیچھے دیکھا تو میری شامت کہ وہی پہلوان نما پھل فروش اپنی خونخوار آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔

"یہ شاپر مجھے دکھاؤ ذرا۔ میرے ہاتھوں سے شاپر چھین کر اس نے جونہی اسے کھولا۔ اس کے تن بدن میں جیسے آگ سی لگ گئی۔ ایک آتش فشاں تھا جو ابل آیا تھا۔"

اس نے گندی گالیاں دیتے ہوئے میرا گریبان پکڑ کر دو تین تھپڑ رسید کر ڈالے۔

"اتنی دیر میں اس کے بقایا ساتھی بھی وہاں پہنچ گئے۔ میرا گریبان اس پہلوان کے ہاتھ میں تھا۔ تھپڑوں کے بیچ اس نے گرفت ڈھیلی کی تو میں نے آزادی پا کر بھاگنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی مگر یہ بھول گیا تھا کہ یہ ایک گنجان آباد علاقہ تھا۔ بھاگ کر کہاں جاتا ابھی دو چار قدم ہی نکالے ہوں گے کہ انہوں نے اپنی زبان میں چلّا کر سب کو خبردار کر دیا۔ بس چند قدم پر ہی پکڑا گیا۔ اس دن کی ذلت میں بتا نہیں سکتا۔ بیشک میں نے غلطی کی تھی مگر وہاں ان سب نے مل کر میری جی بھر کر دھنائی کی۔ وہاں چند قدم دور ہی پولیس کی ایک موبائل کھڑی تھی۔ ان کو خبر تک نہیں ہوئی۔ مجھے جی بھر کر ذلیل کیا گیا میری جیب خالی کر دی گئی۔ گھڑی اور موبائل کہیں گر گیا۔ یہ شکر تھا کہ موٹر سائیکل کی چابی جیب میں موجود تھی اچھے برے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں انہی کے بیچ آخر چند خدا ترس لوگوں کو مجھ پر رحم آیا تو میری گلوخلاصی ہوئی۔"

چہرے پر شرمندگی اور چال میں لڑکھڑاہٹ لیے جب میں وہاں سے ہارے ہوئے جواری کی طرح نکلا تو تمسخر میں ڈوبے ہوئے قہقہے میرا پیچھا کر رہے تھے۔ حقارت اور غرور لیے ہوئی نگاہوں کا سامنا کرتا ڈگمگاتے قدموں سے وہاں سے نکل رہا تھا کہ مذکورہ پھل فروش کے کسی ساتھی نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھوں میں ایک شاپر پکڑا دیا۔

"یہ اپنا امانت ساتھ لے کر جاؤ اور یاد رکھنا پولیس کو بتانے کی غلطی نہ کرنا۔" اس نے میرا بازو پکڑ کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دھمکی دی۔ "یہ سارا علاقہ ہمارا ہے۔" اس

نے ہاتھ کے اشارے سے ایک چکر گھما کر بتایا۔ "جاؤ جلدی سے دفعہ ہو یہاں سے خدائی خوار۔" اور پھر کندھے سے پکڑ کر اس نے مجھے آگے کی جانب دھکیل دیا۔ میں نے شاپر سنبھالا اور جہاں موٹر سائیکل کھڑی کی تھی وہاں پہنچا۔ میرے دل سے آہیں نکل رہی تھیں، گالوں کے اندر جہاں جہاں کٹ لگے ہوئے تھے وہاں بڑی جلن مچی ہوئی تھی غلطی میری تھی۔ مجھے یہ سب نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بہرحال جو ہونا تھا ہو چکا۔ بائیک اسٹارٹ کر کے تھوڑی دور آگے جا کر ایک مسجد سے منہ ہاتھ دھو کر حتی الامکان حلیہ درست کیا۔ بال بنائے اور قسمت کو کوستا ہوا گھر پہنچا۔

راحیلہ نے میرا سوجا ہوا چہرہ دیکھا تو پریشان سی ہو گئی۔ میں نے بہانہ بنا کر اسے مطمئن کیا کہ کسی دوسری موٹر سائیکل کے ساتھ معمولی سی ٹکر لگی تھی اور بس اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا۔ ضیا بار بار میرا چہرہ چھو کر دیکھ رہی تھی۔ رات کا کھانا زہر مار کر کے ضیا کے ساتھ کھیلنے بیٹھ گیا۔ ضیا نے اپنے کھلونا برتن نکالے اور پھر جھوٹ موٹ کی چائے بنانا شروع کر دی۔ اس دوران مجھے وہ شاپر یاد آیا جو میں نے موٹر سائیکل کے اسٹینڈ پر دبا دیا تھا۔ پریشانی میں وہ مجھے یاد ہی نہیں رہا اور جب ضیا کے ساتھ کھیلنے بیٹھا تو یاد آتے ہی جا کر شاپر نکالا اور ضیا کے سامنے رکھ دیا۔

ضیا اپنی جھوٹ موٹ کی چائے چولہے پر چڑھائے مگن بیٹھی تھی۔ اس نے جو شاپر کو دیکھا تو کھل اٹھی۔

اسے پتا تھا کہ اس کے اندر ضرور کوئی کھانے پینے کی ہی چیز ہوگی۔

"ذرا بتاؤ تو سہی کہ آج ہم آپ کے لیے کیا لائے ہیں؟" میں نے لہجے کو خوشگوار بنانے کی کوشش کرتے ہوئے ضیا سے پوچھا۔

ضیا اٹھلاتے ہوئے مختلف چیزوں کے نام لے رہی تھی۔ راحیلہ بھی اپنے کام سے فارغ ہو کر ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئی اور دلچسپی سے باپ بیٹی کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہی تھی۔

"چلو اب دونوں کا امتحان ہے۔ کون صحیح جواب دے گا پہلے۔ بتاؤ بھئی اس شاپر میں کیا چیز ہے؟" میں نے ضیا اور راحیلہ دونوں کو ایک ساتھ متوجہ کر کے پوچھا۔

راحیلہ نے ضیا کو گود میں اٹھا لیا اور پھر اس کے کان میں کچھ سرگوشی سی کی۔ (شاپر کے ادھ کھلے حصے سے اناناس کا کچھ حصہ جھانک رہا تھا) ضیا کا چہرہ راحیلہ کی سرگوشی سن کر کھل اٹھا

حضرت بابا فرید کو مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ مثلاً خواجہ فریدالدین مسعود گنج شکر، فریدالدین مسعود شکر گنج، گنج شکر اور صرف فرید گنج شکر اور شکر گنج کے معانی ایک ہیں۔ اوّل الذکر لقب کا مطلب ہے شکر کا خزانہ اور موخر الذکر کو مختصر کر کے اردو کا جامہ پہنا دیا گیا ہے۔ ان القابات کے علاوہ آپ کو شیخ العالم اور قطب اکبر بھی کہا جاتا ہے۔ آپ 14 اپریل 1179ء کو کوتھوال (یا کوہتوال) میں پیدا ہوئے جو ملتان کے نزدیک 10 کلومیٹر کے فاصلے پر ایک غیر معروف سا گاؤں یا قصبہ تھا اور 17 اکتوبر 1265ء کو 86 برس کی عمر میں پاک پتن میں وفات پائی۔ والد کا نام جمال الدین سلیمان تھا اور والدہ محترمہ کا اسم گرامی مریم بی بی تھا (بعض تذکروں میں قرسوم بی بی بھی لکھا ہوا ہے) جو شیخ وجیہہ الدین خجندی کی صاحبزادی تھیں۔ ابتدائی تعلیم ملتان میں پائی جو اس زمانے میں اس علاقے میں علوم متداولہ کا مرکز تھا۔ وہیں ان کی ملاقات حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ سے ہوئی جو بغداد سے دہلی جا رہے تھے۔ حضرت کاکیؒ نے آپ کو دیکھ کر فرمایا تھا "اس بچے کا ستارہ اوج پر ہے اور مستقبل میں اللہ کریم اس سے دین اسلام کی تبلیغ و توسیع کا کام لے گا۔"

تھا۔ وہ تالیاں بجاتے ہوئے میری گود میں آ گری۔ میں نے اس کے گال چوم کر اپنا سوال دہرا دیا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"آج ابو ہمارے لیے لے کر آئیں ہیں......" اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ پیار بھرے انداز میں خاموش ہو گئی۔

اصل میں یہ اس کا شرارت بھرا انداز تھا جس میں وہ اٹھلا کر آدھی بات کر کے خاموش ہو جایا کرتی تھی۔ ہم میاں بیوی اس کی اس عادت کو جانتے تھے اور پھر اس کی ادھوری بات کو مکمل کر دیا کرتے۔

میں نے شاپر کو اٹھایا اور پکڑ کر الٹا کرنے سے پہلے ڈرامائی انداز میں اپنی پیاری ضیا کا جملہ مکمل کیا۔

"آج ابو ضیا کے لیے اناناس...... اتنا کہتے ہی میں رکا اور شاپر کو ضیا کے سامنے الٹ دیا۔"

"شاپر سے جو چیز برآمد ہوئی تھی اس نے مجھے اور راحیلہ کو ہکّا بکّا کر دیا تھا۔ اس شاپر میں اناناس نہیں بلکہ اناناس کے اوپری حصے کے سخت نوکیلے پتوں کا بڑا سا گچھا تھا۔"

”مجھے سکتہ سا ہو گیا تھا۔ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کہوں کیا نہ کہوں۔“

”ابو آج اپنی ضیا کے لیے انناس کے پھول لے کر آئے ہیں۔“ راحیلہ سمجھ گئی کہ میرے ساتھ ہاتھ ہو گیا ہے۔ صورتِ حال کو سنبھالتے اپنے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجائے۔ ضیا کا دل بہلانے کی خاطر میرا ادھورا جملہ مکمل کرتے بول اٹھی۔

آج کی بے عزتی کو بھلا کر ضیا کے سامنے اس کی روزانہ کی فرمائش پر انناس سمجھ کر جو چیز اٹھا لایا تھا اس نے تو مار کی اس تکلیف کو بھی ایک طرف چھوڑ دیا تھا جو تکلیف اپنی پیاری ضیا کے سامنے اس بے مصرف جھاڑ سے پتوں کو دیکھ کر ہو رہی تھی۔ ان بے رحموں نے مار پیٹ کر اپنا حساب تو چکا ہی دیا تھا مگر پھر بھی ان کا دل نہ بھرا اور میرے ساتھ ہاتھ کر ہی دیا۔ شاید ان کے سینے میں پتھر کا دل تھا۔ میرے دل سے آہ نکل رہی تھی۔

بچے کس قدر بھولے اور معصوم ہوتے ہیں۔

وہ بیچاری بچی ان بیکار جھاڑ جھنکاڑ پتوں سے ہی بہل گئی۔ میں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا تھا۔ دل کٹ سا گیا تھا میں قصوروار تھا مگر ان کم بختوں نے بھی حد ہی کر دی تھی۔ میری خطا کی اتنی بڑی سزا دی تھی۔ خود تو بے ایمانی کی حد کرتے ہوئے کمتر اور حقیر شے مجھے مہنگے داموں بیچ رہے تھے اور میرا قصور معاف نہ کیا۔ کیا ہو جاتا کہ وہ چھوٹا ہی سہی مگر اصلی انناس ہی مجھے دے دیتے۔ اس کے علاوہ موبائل اور نقدی الگ گنوائی۔

میں اندر سے رو رہا تھا اور راحیلہ بھی رنجیدہ سی ہو گئی تھی۔ اس بیچاری کو بھی اصل بات کا پتا نہیں تھا۔ اس دن ہم میاں بیوی نے ان انناس کے سخت پتوں کو کاٹ کاٹ کر مختلف جانوروں اور چیزوں کی اشکال بنا کر اپنی ضیا کے دل کو بہلا تو دیا تھا مگر خود ہمارے دل پر ایک آرا سا چل گیا تھا جس نے دل کے ٹکڑے کر ڈالے تھے۔

☆......☆

عبدالغفار اپنی کہانی بیان کر رہا تھا۔ چائے ختم ہو گئی تھی میں نے ٹیبل مین کو اشارے سے بلا کر اور چائے منگوائی اور ساتھ میں بسکٹ بھی، عبدالغفار نے بتایا کہ ایک دفعہ ہمارے گھر میں.... ایک فقیر نے صدا لگائی، راحیلہ گھر کے باہر دروازے پر کسی کام سے ضیا کو لیے کھڑی تھی کہ اس فقیر نے ضیا کے صدقے کی دعا کرتے ہوئے آٹا مانگا۔ شاید اس وقت گھر میں واقعی آٹا نہیں تھا، وہ فقیر ضد پکڑ کر کھڑا رہا کہ وہ تو آٹا لے کر ہی جائے گا۔ اس کی تکرار سے تنگ آ کر راحیلہ نے اسے جھڑک دیا، فقیر وہاں سے دھتکارے جانے پر بکتا جھکتا بددعائیں دیتا چلا گیا، ساتھ والی پڑوسن سب سن رہی تھی اس نے راحیلہ کو ڈرایا کہ کیا غضب کر دیا یہ فقیر بڑے کرامات والے ہوتے ہیں اور ان کو ناراض نہیں کرنا چاہیے، مگر اس پڑوسن نے اس بات کو غلط رنگ دے کر اس دن راحیلہ کو کچھ اس طرح ڈرایا کہ راحیلہ کے دل میں سو طرح کے وہم آنے شروع ہو گئے۔ پڑوسن نے راحیلہ کو ایک پیر بابا کا بتایا کہ وہ کس طرح بددعا اور بری نظر کا توڑ کر کے تعویز دیتے ہیں۔ اس نے تو ہمارے خراب حالات کا ذمہ دار بھی بندش یا کسی کے حسد کا پیش خیمہ قرار دیا تھا۔ راحیلہ اس کی باتوں میں آگئی اور پڑوسن نے بھی باتوں میں راحیلہ کو پیر بابا کے پاس لے جا کر تعویز لے کر آنے کی منصوبہ بندی کر لی۔

شام کو جب میں کام سے گھر واپس آیا تو راحیلہ نے مجھے فقیر کی بددعاؤں اور پیر صاحب کے تعویز کے بارے میں بتایا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ مجھے بھی اب یہ احساس ہونے لگا تھا کہ ہمارے ان بگڑتے حالات کی وجہ شاید کچھ اور ہو اور ممکن ہے کہ پڑوسن صحیح کہہ رہی ہو۔ میں نے راحیلہ کو سوچ کر جواب دینے کے لیے کہا مگر دوسرے ہی دن اتفاق سے ہماری ورکشاپ پر ایک ایسا کسٹمر آیا کہ اس نے میری آنکھوں سے یہ بندش، جادو اور بداعتقادی کی پٹی ہٹا دی۔

عبدالغفار نے بتایا کہ جس جگہ اس نے دکان کھولی تھی اس کے پاس ہی ایک مسجد تھی۔ اسی مسجد کے پیش امام صاحب ہماری ورکشاپ پر اپنی موٹر سائیکل کا کچھ کام کروانے آئے تو برسبیل تذکرہ ان سے بندش اور حسد کے بارے پوچھ لیا اور بری نظر وغیرہ کی کاٹ کے لیے پیر صاحب کا تعویذ لینے کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ میری بات سن کر ہنس دیئے اور مسکراتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ میاں نماز وغیرہ بھی پڑھتے ہو؟

امام صاحب کا سوال سن کر میں خاموش ہو گیا۔

سچی بات تو یہ تھی کہ ایک عرصہ ہوا تھا کہ جمعہ کے دن بھی نماز کے وقت ورکشاپ میں کام کا اتنا رش ہوتا تھا کہ نماز ہمیشہ ہی رہ جاتی تھی۔ پہلے تو چلتی ہوئی مارکیٹ میں بیٹھے ہوئے تھے دکان بھی کبھی نہیں بند کی اور صرف میں ہی نہیں یہ روٹین اردگرد کے سب ورکشاپ والوں اور مارکیٹ کی اکثریت کا تھا۔

امام صاحب میری خاموشی سے میرا جواب سمجھ گئے۔

کچھ دیر خاموشی کے بعد بولے۔ ”اچھا یہ بتائیں مستری صاحب کہ کچھ صدقہ، خیرات وغیرہ تو اللہ کی راہ میں

کرتے رہتے ہوں گے۔“

والد صاحب کے زمانے سے یہ معمول چلا آرہا تھا کہ جو کھلے سکے روزانہ جمع ہوتے تھے وہ آنے جانے والے بھکاریوں کو دے کر جان چھڑالی جاتی تھی، اس کے علاوہ سوچا تو کبھی کوئی خاص صدقہ خیرات تو یاد نہیں آیا جو کبھی کیا ہو۔

مجھے سوچ میں دیکھ کر امام صاحب نے پھر ایک سوال کر ڈالا۔ ”اچھا میاں یہ بتائیے کہ اس سال کی زکوٰۃ آپ نے کہاں خرچ کی؟“

امام صاحب جو سوال مجھ سے پوچھ رہے تھے ان کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

مولوی صاحب نے مجھے ایک نظر دیکھا اور پھر اپنی نظر دوسری طرف پھیر لی۔ کچھ دیر سوچتے رہے اور کہا۔ دیکھو میاں مجھے پتا نہیں کہ آپ صاحب نصاب ہو کہ نہیں۔ زکوٰۃ آپ پر فرض ہے کہ نہیں مگر اس کے علاوہ بندوں کے بندوں پر حقوق تو ہیں ہی۔ ہم پر اللہ کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ جس اللہ نے آپ کو اپنی برکتوں سے نوازے رکھا اور ہر طرح کی نعمتیں عطا کیں اس کا حق ادا کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

یہ جادو وغیرہ جب ہی اثر کرتے ہیں جب اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کو ہم چھوڑ دیتے ہیں۔ امام صاحب نرمی سے سمجھا رہے تھے۔ ”اس اللہ کے بتائے ہوئے رستے پر چل کر دیکھو۔ کسی بھی پیر کے پاس جانے اور تعویذ کی ضرورت نہیں رہے گی انشاء اللہ۔“

امام صاحب پتے کی بات بتا کر چلے گئے تھے اور آنکھوں سے پٹی اتار دی تھی۔ ہم دونوں بھائیوں کا یہی حال تھا نہ ہی نماز پڑھتے اور نہ ہی رمضان میں روزے رکھتے تھے۔ کام کا بہانہ کر کے پورا رمضان گزر جاتا اور پھر اگلے سال تک بات پہنچ جاتی اور سچی بات تو یہ تھی کہ ہم نے کبھی زکوٰۃ نکالی ہی نہیں تھی نہ کبھی اپنے مال کا اندازہ کیا اور نہ کبھی اپنے اردگرد کسی کو مصیبت میں دیکھ کر مدد کرنے کا سوچا، حالانکہ راحیلہ اور چھوٹے بھائی کی بیوہ کے پاس جب تک زیور تھے انہوں نے بھی کبھی اپنے زیورات کی زکوٰۃ نہیں نکالی۔ امام صاحب کی بات سمجھ میں آرہی تھی مگر اب کیا فائدہ۔ اب نہ کوئی پیسا رہا نہ کوئی زیورات نہ وہ اچھے حالات۔ کاش کہ وہ دن لوٹ آئیں اور میں ساری کمی پوری کر سکوں جو اب تک کر نہیں سکا، وہ سارے حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ اللہ نے ہم کو ڈھیل دے رکھی تھی جب ہمیں پھر بھی عقل نہیں آئی تو رسی کھینچ لی۔

میں نے سوچا چلو اور کچھ نہیں تو جلد ہی نماز پڑھنا شروع کر دوں اور راحیلہ کو بھی اس بات کا شعور دلانا چاہیے۔

میں نے دل میں ارادہ کیا اور گھر جا کر راحیلہ کو امام صاحب کی تمام باتیں بتائیں۔ ہم میاں بیوی نے ارادہ کیا اور راحیلہ نے تو اس بات کا اتنا اثر لیا کہ فوراً ہی توبہ کی کہ آئندہ جو کبھی سوچا بھی کسی پیر کے پاس جا کر تعویز وغیرہ لینے کے لیے۔ میں نے دل میں نماز کا ارادہ تو کیا تھا مگر دوسرے ہی دن اللہ نے میرا ایک اور امتحان لے لیا۔

ضیا کے پیٹ میں اچانک درد سا اٹھا، وہ درد اتنا بڑھا کہ شام کو میں اسے لے کر بچوں کے اسپتال پہنچا۔ وہاں ڈاکٹر نے کچھ ضروری ٹیسٹ لکھ کر دیے اور کچھ دوا وغیرہ لکھ کر دی۔ ہم نے دوا لی اور گھر آگئے کیونکہ فی الحال ہمارے پاس ٹیسٹ کے پیسے نہیں تھے۔ ڈاکٹر کی دوا سے ضیا کے درد میں کچھ افاقہ ہوا تھا۔ ہم کچھ مطمئن سے تھے ابھی ٹیسٹ نہیں کروائے تھے۔ میں نے لیبارٹری سے پتا کیا تو تقریباً ڈھائی ہزار کے ٹیسٹ تھے۔

میں اپنی دکان میں بچپن سے کام کر رہا تھا۔ ہمارے اس کام میں بہت سے ایسے کاریگر تھے جو دو نمبری کر کے پیسا کما رہے تھے۔ بوقت ضرورت ایک کسٹمر کی بائیک سے پرزے نکال کر دوسری میں فٹ کر دیا کرتے تھے اور پھر دوسرے کو اس کی بائیک میں بلاوجہ کی خرابیاں نکال کر اس کے پارٹس بدلوا دیا کرتے تھے۔ وہ گاہک جو مستریوں کی چال بازی نہیں سمجھتے تھے یا اپنے پرانے اور دیکھے بھالے ہونے کا لحاظ کرتے تھے وہ تو ان باریکیوں کو نہیں سمجھ پاتے مگر پرانے گھاگ قسم کے گاہک یا کچھ اس کام کی سمجھ رکھنے والے فوراً محسوس کر لیا کرتے وہ یا تو اپنا مکینک بدل لیتے یا پھر اپنے شک کا اظہار کر کے مکینک کو خبردار کر دیا کرتے۔ ہماری پرانی ورکشاپ میں یہ روٹین نہیں تھا اگر کبھی مجبوری میں ایمرجنسی ہو اور کسی کسٹمر کو ہاتھ کے ہاتھ کام کر کے دینا ہو تو شاید کبھی ایسا کر لیا ہو۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ہم مرکزی مارکیٹ میں بیٹھے تھے اور خود ہماری اپنی ورکشاپ میں اسپیئر پارٹس کا ایک وسیع کلیکشن تھا جہاں تقریباً سارے ہی ضروری پارٹس ہر وقت دستیاب ہوتے تھے۔ جان بوجھ کر کبھی کسی گاہک کے اعتماد کو دھوکا نہ دیا تھا اور ساتھ کام کرنے والوں ہیلپروں پر بھی نظر رکھی ہوئی تھی۔ ہاں ایسا ضرور تھا کہ اپنے پارٹس بیچنے کے لیے کسٹمرز کو تھوڑا بہت ڈرانا تو پڑتا تھا اور کبھی کبھی معمولی ضرر پر بھی ہم گاہک کو فوراً نیا پرزہ بدلوانے کی رائے دے دیا کرتے تھے جس سے کام کے معاوضہ کے ساتھ ہمیں اپنی دکان میں

دستیاب پارٹس بیچنے کا کمیشن بھی مل جاتا تھا۔

مگر یوں لگتا تھا کہ جیسے میری وہ بے ایمانی اور دو نمبری نہ کرنے کی قسم اب ٹوٹنے والی ہے اور پھر یہی ہوا۔

میں حالات سے اتنا تنگ آیا ہوا تھا کہ مولوی صاحب کی بات کو بھول کر بے ایمانی پر اتر آیا۔ بجائے اللہ تعالیٰ پر یقین رکھنے اس کی مدد مانگنے اور اس کے آگے جھکنے اور دعا مانگنے کے اِدھر اُدھر دوڑتا رہا۔ ضیا کے پھر درد شروع ہو گیا تھا اور بقول ڈاکٹر جلدی ٹیسٹ نہ کروائے تو معاملہ بگڑ سکتا تھا۔ میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ وہ جمعہ کا ہی دن تھا جب میں نے دن میں کئی دفعہ بے ایمانی سے گاہکوں کو جھوٹ بول کر بیوقوف بنایا اور چند پرزے اِدھر سے اُدھر کر کے ان کے پیسے جیب میں ڈال لیے۔ دوسرے تیسرے دن جب ٹیسٹ کے پیسے اکٹھے ہوئے تو ٹیسٹ کروا کر جب ڈاکٹر کو اگلے دن رپورٹ دکھائی تو اس میں ڈاکٹر نے ہرنیا تشخیص کیا تھا اور چند ہفتوں میں ہی اس کے آپریشن کی ڈیٹ دے دی۔

مجھے آپریشن کے لیے بیس سے پچیس ہزار چاہیے تھے۔ میں یہ رقم کسی سے ادھار لینا چاہتا تھا مگر نئی جگہ تھی کوئی صحیح طرح جانتا بھی نہیں تھا۔ پرانی مارکیٹ کے سب جاننے والوں کا حال میری طرح ہی تھا۔ بہت کوشش کی اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارے دن رات کام کرنے کی کوشش بھی کی مگر پیسے تھے کہ جمع ہی ہو کر نہیں دے رہے تھے۔ میں نے جو طریقۂ کار شروع کیا تھا وہ بھی مجھے راس نہیں آ رہا تھا۔

ہو سکتا ہے کہ اگر میں غلط کام شروع نہیں کرتا، اللہ کے گھر میں حاضری دیتا اور اللہ سے دعا کرتا تو حالات ٹھیک ہو جاتے اور ضیا کے وہ ٹیسٹ بالکل صحیح ہوتے اسے کوئی بیماری نہیں ہوتی مگر میں گھبرا گیا تھا کہیں سے کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔ کوئی مدد کو تیار نہیں ہو رہا تھا۔ شاید یہ اسی بات کا صلہ تھا کہ جب ہمارے حالات اچھے تھے ہم اپنے حال میں مست تھے۔ زکوٰۃ، صدقہ، خیرات وغیرہ چھوڑ کر بس اپنی دنیا میں مگن تھے۔ ہم نے بھی کبھی کسی کی حاجت روائی نہیں کی تھی۔ کبھی اپنے ارد گرد نہیں دیکھا اور آنکھیں کھل جانے کے بعد بھی شیطان نے آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ میں اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کا ارادہ کر کے پلٹ رہا تھا۔ سزا تو ملنی تھی۔ حرام مال گھر میں لے کر آیا تو ساتھ میں بیماری بھی آ گئی۔ جتنا کمایا اس سے زیادہ بیماری پر خرچ ہونے لگا۔ بہر حال میری آنکھوں پر پٹی بندھ چکی تھی اور میں معمول کی اس چوری کو اب برا نہیں سمجھنے لگا تھا، بلکہ اس کا عادی ہو رہا تھا۔

رزق حلال کی برکت اٹھتے ہی بھائی کی بیوہ اور ان کے بچوں کی بھی کفالت کرنا مشکل ہوتا جا رہا تھا، میں نے دکان کے حصے کا ان سے وعدہ کیا تھا اور ماہانہ حصہ باندھا ہوا تھا مگر اب دکان والی بلڈنگ کے ڈھائے جانے کے بعد نجانے کب اور کس طرح دکان کی جگہ معاوضہ دیا جاتا یا پھر دوبارہ عمارت کی تعمیر ہوتی، کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اب تک جتنا ہو سکتا تھا میں نے کیا مگر اب حالات اجازت نہیں دے رہے تھے چنانچہ بھائی کے تینوں بڑے لڑکوں کو مدرسے میں داخل کروا دیا کیونکہ اسکول کی فیس اور کتابیں وغیرہ کے اخراجات برداشت کرنے مشکل ہو رہے تھے۔ بھائی کی بیوہ بی اے پاس تھی اس نے ایک اسکول میں ٹیچر کی نوکری کر لی اور ساتھ اسی اسکول میں اپنی دونوں بچیوں کا داخلہ کروا دیا۔ ویسے تو اسکول کی پالیسی تھی کہ والدین کے اسکول میں نوکری کی وجہ سے ایک بچے کی فیس معاف ہو جاتی مگر بیوہ ہونے کی وجہ سے دوسری بچی کی بھی فیس معاف ہو گئی تھی۔ میں نے بھی بیوہ بھابی سے معذرت کر لی کیونکہ اب ان کے لیے کچھ کرنا ممکن نہ رہا تھا۔

مستری عبدالغفار نے جب مجھے اپنے یہ حالات سنائے تھے تو اس کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے اور اس دن وہ جی بھر کر رویا تھا میں نے بھی اس کی بھڑاس نکل جانے دی تھی۔ اس نے آگے بتایا۔

”اگر تو میں اللہ کی رضا پر شاکر و صابر رہتا تو ہو سکتا ہے کہ اللہ دوبارہ مجھے اپنے پیروں پر کھڑا کر دیتا۔ یتیم بچوں کی کفالت کرنا بہت ہی ثواب کا کام ہے۔ ہو سکتا ہے اللہ ان کی دعاؤں کے طفیل مجھے پھر سے صاحب حیثیت اور غنی کر دیتا تھا اور اس میں کوئی شک ہی نہیں تھا کہ اللہ اپنا وعدہ پورا نہ کرتا۔ اللہ تو ہمیں اپنے امتحان کی چکی میں پیس کر ہمارے پچھلے گناہ دھو ڈالنا چاہتا تھا لیکن بندہ بھی اللہ کی رضا سمجھے۔ جو نہ سمجھے تو پھر وہ میری طرح پریشان رہتا ہے۔“ مستری عبدالغفار نے ایک بار پھر اپنے آنسو پونچھے۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ”ایک وقت تھا کہ میرے کام کی پوری مارکیٹ میں دھوم تھی اور دور دور سے گاہک اپنی موٹر سائیکل کی سروس کے لیے میرے پاس آتے تھے اور پھر دوبارہ کسی اور مکینک کے پاس نہیں جاتے تھے، اب یہ حال ہے کہ میں مکینک سے چور بھی بن گیا۔ نام، ساکھ سب کچھ خراب ہوا عزت بھی گئی اور ہاتھ کچھ نہ آیا۔“

پھر ہوا یوں کہ مجھے اپنی جان سے پیاری ضیا کے علاج کے لیے دکان چھوڑنی پڑی اور اس کے واپس ملنے والے ایڈوانس سے میں نے اپنی بچی کا آپریشن کروایا۔ اس کے بعد عرفان صاحب کی مہربانی تھی کہ انہوں نے مجھے بغیر کسی ایڈوانس کے اپنی دکان میں جگہ دی لیکن آج میری بدبختی نے مجھے یہاں ذلیل و رسوا کروا کے دم لیا۔

مستری عبدالغفار نے اپنی کہانی ختم کی تو مجھے بھی کچھ یاد آ گیا۔ برسوں بیت گئے ہم نے بھی اپنے نصاب کا حساب نہیں رکھا تھا۔ والد صاحب جب تک حیات تھے اپنے طور پر خود ہی زکوٰۃ نکلوا کر تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ اب یہ حال تھا کہ گھر میں زیور وغیرہ تو موجود تھے مگر کبھی ان کا حساب نہیں کیا نہ ہی زکوٰۃ نکالی۔

والد صاحب کے بعد جب ترکے کی تقسیم ہوئی تو ہم دو بھائیوں کے حصے میں گھر کی تقسیم اس طرح ہوئی دونوں بھائیوں کو اوپر نیچے بنا ہوا ایک ایک حصہ مل گیا اور اس کے علاوہ کچھ نقد رقم بھی تھی جو والد صاحب نے عرصے سے جمع کر کے بینک میں رکھی تھی جس میں ہم دونوں بھائیوں میں ہر ایک کو علیحدہ سے چھ لاکھ ملے تھے۔ دو سال سے یہ رقم میں نے بینک میں رکھی ہوئی تھی اور ابھی تک اس کا کوئی مصرف نہیں سوچا تھا اور نہ ہی اس کی زکوٰۃ نکالی تھی اور اس پر بینک کی طرف سے منافع کی شکل میں سود بھی مل رہا تھا اس کے علاوہ میں نے کبھی اہلیہ سے اس کے زیورات کا پوچھا اور نہ کبھی انہوں نے مجھ سے اس بات کا ذکر کیا۔ مستری عبدالغفار کی کہانی سن کر میری بھی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کے واضح احکامات کے باوجود میں نے اپنے پیسے کو سود پر بینک میں رکھا ہوا تھا۔ گویا اللہ سے کھلم کھلا جنگ مول لی تھی۔ زکوٰۃ کے معاملے میں کوتاہی کر رکھی تھی۔ مجھے نہیں پتا کہ کیا وجہ تھی اللہ تعالیٰ نے ابھی تک میری رسی کیوں دراز کر رکھی تھی۔ شاید مجھے ابھی تک آزمائش کا موقع ملا ہوا تھا لیکن مستری عبدالغفار کی کہانی سن کر مجھے کچھ نہ کچھ سمجھ آ رہی تھی۔ اللہ اپنے بندوں کو مال و دولت دے کر آزماتا ہے پھر ان سے چھین کر بھی۔ جو اس کے شکر گزار بندے ہوتے ہیں وہ دونوں حالتوں میں سجدہ شکر بجا لاتے ہیں اور ناشکرے ہر حال میں روتے رہتے ہیں۔ شیطان انہیں سبز باغ دکھا کر ان کے حال میں مست رکھتا ہے اور ایک دن اللہ کی دراز کی ہوئی رسی کھینچ لی جاتی ہے۔ مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ میں نے مستری عبدالغفار کا چہرہ دیکھا۔ وہ ایک آئینہ تھا۔ مجھے سمجھ آ رہی تھی کہ مجھے اب کیا کرنا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ نماز روزہ تو ساتھ ساتھ چل رہا تھا مگر میں اللہ ہی کے دیئے ہوئے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کر رہا تھا۔ جب اللہ انسان کو سیدھی راہ دکھاتا ہے تو رہنمائی بھی فرما دیتا ہے۔ میرے دل نے مجھے سمجھایا کہ شاید اللہ نے مجھے اس بندے سے اسی لیے ملوایا تھا کہ میری بھی آنکھوں سے پٹی ہٹ سکے اور میں اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کر سکوں۔

☆......☆

مستری عبدالغفار سے ملنے کے بعد مجھے تقریباً ایک ہفتہ لگا یہ تمام کام کرنے میں جو میں نے اسی وقت سوچ لیے تھے کہ میں نے انہیں کرنا ہے۔ اللہ کی رضا اور اس کے حکم کے مطابق۔ میں نے گھر آ کر سب سے پہلے اپنی اہلیہ سے بات کی اور پھر چھوٹے بھائی اور اس کی بیوی کو بٹھا کر ساری بات سمجھائی۔ تفصیل سے ساری بات سمجھنے کے بعد اللہ کا شکر ہے کہ انہوں نے بھی میرا ساتھ دینے کا وعدہ کر کے اس کی یقین دہانی کروائی۔ ہم دونوں بھائیوں نے اپنے نصاب کا حساب لگا کر تقریباً دو سال کی زکوٰۃ نکلوا لی۔ میں نے اپنا پیسا نکلوا کر ایک اسلامی بینکاری والے بینک اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروانے کا فیصلہ کر لیا۔ اب تک جتنا منافع سود کی شکل میں میں لے چکا تھا اس کی توبہ کی۔ اللہ توبہ قبول فرمانے والا ہے۔ سچی نیت سے کی گئی توبہ ضرور قبول ہوتی ہے۔ جب ہم نے گزرے ہوئے ان چند سال کی زکوٰۃ کا تخمینہ لگوایا تو کچھ لوگوں کی طرح ہم بھی یہی سوچ رہے تھے کہ زکوٰۃ صرف رمضان کے ہی مہینے میں ادا کی جاتی ہے۔ میں نے اس معاملے میں محلے کی مسجد کے پیش امام مفتی صاحب سے بھی مشورہ کیا تو انہوں نے میری اس بات کی تصحیح کر دی یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہم صرف رمضان کے مہینے ہی میں اپنی زکوٰۃ تقسیم کریں۔ سال پورا ہونے کی صورت میں بوقت ضرورت یہ سال کے کسی بھی مہینے میں کسی کو بھی شرعی حساب سے ادا کی جا سکتی ہے اور اس کے پہلے حقدار آپ کے اپنے رشتہ دار، پڑوسی اور نزدیکی احباب ہو سکتے ہیں۔ الحمدللہ اس وقت ہمارے رشتے داروں میں اور پڑوس میں ایسا مستحق کوئی نظر نہیں آ رہا جو کہ شرعی حساب سے ہماری اس زکوٰۃ کا حقدار ہوتا۔ لہٰذا متفقہ طور پر ہم دونوں بھائیوں نے یہ رقم مستری عبدالغفار کو دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

مشہور جاپانی کہاوت ہے کہ اگر کسی کی مدد کرنی ہے تو اسے مچھلی نہیں جال خرید کر دے دو۔

ہمارے گھر کے سامنے والی پٹی پر حال ہی میں ایک نیا پلازہ تعمیر ہوا تھا۔ جس میں نیچے کی تقریباً تمام ہی دکانوں پر

موٹر مکینکس اور اسپیئر پارٹس کی دکانیں کھل رہی تھیں۔ یہ ایک نیا علاقہ تھا اور ابھی ادھر اتنی آبادی نہیں ہوئی تھی لیکن کراچی کی آبادی بانس کے جنگل کی طرح بڑھتی نہیں اگتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے جو لوگ اس علاقے کو بہت دور سمجھ رہے ہوتے ہیں وہ کچھ ہی دن میں اپنی حماقت پر افسوس کر رہے ہوتے ہیں۔

ہم دونوں بھائیوں نے بھی یہی سوچ کر ان پیسوں میں سے ایک چھوٹی دکان کے کرایہ کا ایڈوانس اور پیشگی چھ مہینے کا کرایہ ادا کر کے اس میں ضرورت کا سامان مثلاً ائر کمپریسر وغیرہ کا بندوبست کیا اور عبدالغفار کی ورکشاپ کا آغاز کروادیا۔

عبدالغفار کو ہم نے ساری بات بتادی تھی کہ ہم نے اپنی زکوٰۃ کے پیسے سے یہ سارا انتظام کروایا ہے اور اس بات کا مقصد خالص اللہ کے بتائے ہوئے احکامات کی اطاعت اور اس کی رضا حاصل کرنا ہے۔ اللہ گواہ ہے۔ یہ بات ہمارے اور عبدالغفار کے درمیان ہی تھی اور اب عبدالغفار کی اجازت سے یہ سچ بیانی آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔ ہم نے اس کو یہ بھی بتادیا کہ اس کی اس داستان سے ہم نے کتنا بڑا سبق لیا ہے۔۔۔۔ ہم دونوں بھائیوں نے مل کر مستری عبدالغفار کو ساتھ لیا اور محلے کی مسجد میں جا کر مفتی صاحب کو تمام حالات سے آگاہ کیا اور ان کو اپنے اس اقدام کے بارے میں بتایا۔ امام صاحب کی موجودگی میں عبدالغفار نے ہم سے وعدہ کیا کہ وہ ہمارے اس عمل کے نتیجے میں ایمانداری اور نیک نیتی سے کام کرے گا۔ مفتی صاحب نے ہمیں بھی مبارکباد دی کہ اللہ نے ہم پر اپنا کرم کیا اور ہمیں بھی عقل عطا فرمائی ہماری بھی آنکھیں کھلیں کہ اللہ کے دیے ہوئے مال میں بخل سے بچنا چاہیے اور اس مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کر کے اللہ کے بندوں کی مدد کرنا کتنا اہم ہے۔ اللہ نے دین میں اس کے لیے باقاعدہ ایک مکمل نظام بنایا ہے۔ جو اس نظام سے انکار کرے گا تو اس کے عذاب سے بچ نہ پائے گا۔ دیر سے ہی سہی ہم نے اپنا کام کر دیا اب عبدالغفار کے پاس ایک موقع ہے کہ وہ اللہ پر بھروسا کر کے ایمانداری سے اپنا کام شروع کرے اور آزمائش کی اس گھڑی میں ثابت قدم رہے۔ ہم نے مفتی صاحب کا شکریہ ادا کیا اور واپس آگئے۔

☆......☆

ماشاءاللہ جو بیج ہم نے نیک نیتی سے بویا تھا آج عبدالغفار نے اپنی محنت اور ایمانداری کی بدولت اسے تناور درخت میں تبدیل کر دیا ہے۔ اللہ نے اس کی مدد کی اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ہم نے جو دکان اسے کرائے پر دلوائی تھی اس نے محنت کر کے اسے ایک بھرپور کامیاب ورکشاپ میں تبدیل کر دیا ہے۔ عبدالغفار نے اپنی بیوہ بھابی اور بچوں کی کفالت کا ذمہ اٹھا لیا ہے۔ اس کے دو بھتیجے مدرسے کی تعلیم مکمل کر کے ٹیکنیکل اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ وہ دونوں دن میں چند مخصوص گھنٹوں کے لیے باری باری باقاعدہ عبدالغفار کی ورکشاپ میں کام سیکھنے کے لیے بھی آجاتے ہیں اور کام میں اس کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ عبدالغفار نے اپنی زندگی کو بدل لیا ہے۔ نماز کی پابندی اور خصوصاً جمعہ کے دن وہ اپنی ورکشاپ بند رکھتا ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی اب تقریباً ساری ہی ارد گرد کی ورکشاپ والے اتوار کی جگہ جمعہ کو چھٹی کرنے لگے ہیں۔

اس کا کاروبار ماشاء اللہ خوب پھل پھول رہا ہے۔ اس کے پاس کام کرنے والے بھی اس سے خوش ہیں۔ وہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کو بروقت اچھا معاوضہ دیتا ہے اور ان کی خوشی غمی میں خاموشی سے کام آتا رہتا ہے۔ ورکشاپ میں اکثر ہی موسم کے فروٹ منگوا کر ورکرز کو وقتاً فوقتاً کھلاتا رہتا اور جب سردیوں کی آمد ہوتی ہے تو مہینے میں ایک دفعہ تمام کام کرنے والے ایک خاص سرپرائز کے انتظار میں رہتے ہیں اور وہ سرپرائز ہوتا سنہری رس ٹپکاتا خوشبودار اناناس کا۔ وہی اناناس کے پھول جو پہلے کبھی اس کے لیے پھل نہ بن سکے تھے اور اس کی دسترس میں نہیں تھے اب ایمانداری اور محنت کی بدولت ان پھولوں نے اناناس کے پکے ہوئے خوش ذائقہ پھل کا روپ دھار لیا تھا۔

اور ہاں چند سال بعد عبدالغفار کو ایک خوشخبری اور ملی کہ ان کی پرانی ورکشاپ والی عمارت کی از سرِ نو تعمیر کا بندوبست ہوگیا ہے۔ ایک بہت ہی مشہور اور بڑے بلڈر نے وہ جگہ لے کر اس کی جگہ ایک عظیم الشان ہائی رائز کمرشل پلازہ اور رہائشی فلیٹس کا پلان بنایا ہے۔ جس میں ان تمام مالکان کو ان کی پرانی دکانوں اور فلیٹوں کا قبضہ دے دیا جائے گا اور بقایا منزلیں اس بلڈر کی ملکیت ہوں گی تاکہ اس نے جو انویسٹمنٹ کی ہے وہ اسے منافع کے ساتھ واپس مل سکے۔

دین میں تمام مسلمانوں کی مثال انسانی جسم کی طرح ہے۔ اگر کسی ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم ہی بے آرام رہتا ہے۔ اسلام نے جو سسٹم بنایا ہے اس پر چلیں تو معاشرے میں کوئی بھیک نہ مانگے اور نہ ہی چوری پر مجبور ہو۔ ایک دوسرے کی مدد ہم پر فرض ہے۔ یہی انسانیت اور دین کا پیغام ہے۔

مشورہ

جناب معراج رسول

سلام شوق

ایک سچ بیانی بھیج رہی ہوں۔ یہ میری عزیز ترین سہیلی ساجدہ کی ہے۔ اس نے بروقت فیصلہ کر کے اپنی زندگی کیسے سدھار لی یہی میں نے بیان کیا ہے۔

میمونہ اختر
(کراچی)

رحمت علی کا اترا ہوا چہرہ اور لڑکھڑاتے ہوئے قدم دیکھ کر ساجدہ سمجھ گئی کہ آج پھر کوئی دفتر میں نئی بات ہوئی ہے یا کسی نئی پریشانی نے ان کے دروازے پر دستک دی ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ جب سے اس گھر میں بیاہ کر آئی تھی اس نے پریشانی کے سوا کچھ نہیں دیکھا حالانکہ اس کی پرورش بڑے ناز و نعم میں ہوئی تھی۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی اس کی ہر فرمائش بغیر کہے پوری کردی جاتی تھی لیکن اس کے والد بڑے روایتی اور قدامت پسند شخص تھے۔ اولاد بالخصوص لڑکیوں کو ایک حد سے زیادہ آزادی دینے کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ ساجدہ کے لیے بھی میٹرک تک تعلیم کافی سمجھی گئی اور وہ شدید خواہش کے باوجود کالج میں داخلہ نہ لے سکی۔ والد محترم نے نادر شاہی فرمان جاری کر دیا کہ مزید آگے پڑھ کر کیا کرنا ہے ہم نے تم سے نوکری تو کروانی نہیں اس لیے بہتر ہے گھر کے کاموں میں دلچسپی لو کیونکہ یہی چیزیں آئندہ زندگی میں کام آتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہیں بیٹی کی شادی کی فکر بھی سوار ہوگئی۔ ان کا خیال تھا کہ

لڑکی جتنی جلدی اپنے گھر کی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔

ساجدہ ابھی اٹھارہ سال کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کے لیے رحمت علی کا رشتہ آگیا۔ وہ اس کا چچازاد تھا اور اس نے انٹر کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ جب اس کے باپ نے دیکھا کہ بیٹے کا دل پڑھائی میں نہیں ہے تو انہوں نے بھاگ دوڑ کر کے ایک سرکاری محکمے میں کلرک لگوا دیا۔ ان کا خیال تھا کہ عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سنجیدہ ہو جائے گا اور دوبارہ پڑھائی شروع کر کے اپنی قابلیت میں اضافہ کرنے کی کوشش کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ رحمت علی میں آگے بڑھنے کی لگن ہی نہیں تھی۔ وہ اسی ملازمت پر قناعت کر کے بیٹھ گیا۔ اس کا حل یہ سوچا گیا کہ اس کی شادی کر دی جائے جب ذمہ داری پڑے گی تو خود ہی آگے بڑھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے گا۔

جب ساجدہ کے لیے رحمت علی کا رشتہ آیا تو اس کے باپ نے ایک دفعہ بھی سوچنے کی زحمت گوارہ نہیں کی اور فوراً ہی رشتہ منظور کر لیا حالانکہ ساجدہ کی ماں اس کی سخت خلاف تھی کیونکہ رحمت علی بہت ہی معمولی ملازمت کر رہا تھا وہ لوگ ایک چھوٹے سے مکان میں رہ رہے تھے۔ اس کے باپ کا چھوٹا موٹا کاروبار تھا اور اسے مکان سے زیادہ اپنے کاروبار کو بڑھانے کی جلدی تھی۔ ساجدہ کی ماں نے اس کے باپ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی اور یہاں تک کہہ دیا کہ ان کی بیٹی کی پرورش بڑے نازونعم میں ہوئی ہے۔ وہ ایک کم حیثیت شخص کے ساتھ گزارا نہیں کر سکے گی لیکن ساجدہ کے باپ نے بری طرح جھڑک دیا اور کہا۔ ”جب تم بیاہ کر آئیں تھی تو میری کیا حیثیت تھی۔ آج اللہ کے فضل سے میرے پاس سب کچھ ہے۔ پیسا عورت کی قسمت سے آتا ہے اگر ساجدہ کی قسمت میں ہوا تو وہ بھی عیش کرے گی۔“

بھائی کی محبت اور اپنی من مانی کی وجہ سے ساجدہ کے باپ نے بیٹی کے مستقبل کے بارے میں سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور اس کی شادی رحمت علی سے ہو گئی۔ شروع میں تو کچھ محسوس نہیں ہوا اور پانچ چھ سال سکون سے گزر گئے کیونکہ گھر میں مشترکہ خاندانی نظام تھا اور رحمت علی کے والد اچھا کما رہے تھے اس لیے انہوں نے کبھی یہ توقع نہیں کی کہ رحمت علی اپنی تنخواہ میں سے گھر کے خرچے کے لیے کچھ دے۔ البتہ انہوں نے دبی زبان سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ رحمت علی کو آگے بڑھنے کے بارے میں سوچنا چاہیے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی قابلیت میں اضافہ کرے ورنہ ساری عمر کلرکی ہی کرتا رہے گا۔

رحمت علی کے پاس بھی اس کا جواب موجود تھا۔ جب باپ کا اضطراب حد سے بڑھنے لگا تو اس نے کہہ دیا۔ ”یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے لیے مجھے نوکری چھوڑنا پڑے گی جو کہ ممکن نہیں۔ ویسے بھی اب پہلے جیسا زمانہ نہیں رہا۔ سرکاری نوکری ملنا مشکل ہو گئی ہے۔“

”تم پرائیویٹ بھی پڑھ سکتے ہو۔“ باپ نے کہا۔

”بی اے، ایم اے کرنے کا کوئی فائدہ نہیں آج کل کامرس کی مانگ ہے لیکن اس کی پڑھائی بہت مشکل ہے۔ میں اپنے طور پر اس کی تیاری نہیں کر سکتا۔ دعا کریں کہ یہیں ترقی ہو جائے۔“

باپ کو اس کی سادہ لوحی پر ہنسی آ گئی۔ اول تو ترقی ملنے میں کئی سال لگ جاتے کیونکہ سنیارٹی میں کئی لوگ اس سے آگے تھے اور اگر ترقی ہو گئی تو وہ زیادہ سے زیادہ اسسٹنٹ بن جائے گا۔ اس سے اگلے عہدے پر جانے کے لیے گریجویٹ ہونا ضروری ہے۔ اس کے بعد باپ نے کچھ نہیں کہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ رحمت علی میں آگے بڑھنے کی لگن نہیں ہے اس لیے اس نے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

پہلی بیٹی راشدہ پیدا ہوئی تو ساجدہ نے روز اول سے ہی سوچنا شروع کر دیا۔ وہ جانتی تھی کہ رحمت علی کی آمدنی اتنی نہیں ہے اس لیے ابھی سے جوڑ جمع کرنا ہوگی۔ اس نے رحمت علی سے کہا تو وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”میرے پاس بچتا ہی کیا ہے جو میں جمع کروں۔“

”پھر بھی کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا۔ لڑکی کو جوان ہوتے کتنی دیر لگتی ہے۔ اس وقت شادی کا انتظام کیسے ہوگا؟“

”اللہ مالک ہے جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔“ رحمت علی نے اطمینان سے کہا اور چادر اوڑھ کر سو گیا۔

لیکن ساجدہ اس کی باتوں سے مطمئن نہیں ہوئی۔ اسے اپنے باپ پر غصہ آ رہا تھا جس نے اسے آگے پڑھنے نہ دیا ورنہ وہ بھی کہیں ملازمت کر کے رحمت علی کا سہارا بن سکتی تھی حالانکہ اس کے باپ کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اب پچھتانے کا کیا فائدہ ہوتا۔ ساجدہ کے حالات کو دیکھتے ہوئے وہ روپے پیسے سے مدد کرتا رہتا۔ عید بقرعید اور موسم کے لحاظ سے نئے کپڑے بنا دیتا اس کے علاوہ ساجدہ کی ماں جب بھی آتی اس کے لیے شیمپو، پرفیوم بسکٹ کے ڈبے اور ایسی کئی چیزیں لے کر آتی

لیکن یہ سلسلہ کب تک چلتا رہتا۔ ماں باپ ہمیشہ نہیں رہتے۔ یہی سوچتے سوچتے اس نے ایک کوشش کرنے کی ٹھانی۔

ایک روز اس نے محلے کے پرائیویٹ اسکول میں پرنسپل کو اپنے حالات بتاتے ہوئے کہا۔ ”اسے ملازمت کی سخت ضرورت ہے اگر ٹیچر کی جگہ نہیں ملتی تو اسے چپڑاسن یا ماسی کا کام دے دیا جائے۔ وہ اس کے لیے بھی تیار ہے۔“

پرنسپل نے اس کی بات ہمدردی سے سنی اور کہا۔

”بی بی یہ میرے اختیار میں نہیں ہے میں مالک سے بات کروں گی تم دو دن بعد پتا کر لینا۔“

کہتے ہیں کہ نیت صاف ہو تو منزل آسان ہو جاتی ہے۔ دو دن بعد پرنسپل نے خوش خبری سنائی کہ اسے چپڑاسن کی جاب مل سکتی ہے لیکن اسے دوسرے متفرق کام بھی کرنا ہوں گے فی الحال تین ہزار تنخواہ ملے گی۔

ساجدہ نے گھر آ کر رحمت علی کو بتایا تو اس نے کوئی... ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ البتہ ساس نے بھرپور مخالفت کی اور بولی۔

”ارے بہو تمہیں کس چیز کی کمی ہے ہم تو رحمت علی کی تنخواہ سے ایک پیسا نہیں لیتے۔ اللہ رکھے تمہارے ماں باپ بھی بہت کچھ دیتے رہتے ہیں پھر تمہیں نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”اللہ آپ سب کو سلامت رکھے۔“ ساجدہ نے ادب سے کہا۔ ”لیکن بچی کی پیدائش نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس کے بہتر مستقبل کی خاطر میں یہ سب کر رہی ہوں۔“

اس کے بعد ساس خاموش ہو گئی اور ساجدہ نے اسکول جانا شروع کر دیا۔ بچی کو پڑوس کی خالہ زینب کے پاس چھوڑ جاتی اور واپسی میں ایک بجے لے لیتی۔ اس کی غیر موجودگی میں ساس ہنڈیا پکا لیتیں۔ اسے واپس آ کر صرف روٹیاں ڈالنا ہوتیں۔

پرنسپل اس کے کام سے بہت خوش تھیں اور پرائیویٹ اسکولوں کی روایت کے مطابق اس سے متفرق کام بھی لینے لگیں۔ وہ صرف استانیوں کے لیے چائے ہی نہیں بناتی بلکہ اگر کبھی کوئی ٹیچر غیر حاضر ہو تو وہ اس کی جگہ کلاس لے لیتی۔ اسے فیسیں وصول کرنے کا کام بھی سونپ دیا گیا تھا۔ وہ اپنی مجبوری کی خاطر یہ سارے کام... کر رہی تھی پھر ایک دن اس نے سوچا وہ کب تک ٹیچرز کو چائے پلاتی رہے گی۔ خود کیوں نہ ٹیچر بن جائے۔ اس نے پرنسپل سے مشورہ کیا تو انہوں نے بھی حوصلہ افزائی کی چنانچہ اس نے انٹر میں پرائیویٹ امیدوار کے طور پر اپنا رجسٹریشن کروا لیا۔

اسکول اور گھر کے کاموں کے بعد اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا تھا کہ وہ اپنی پڑھائی پر توجہ دے سکے لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ رات کو نو بجے تک سارے کام نمٹا کر پڑھنے بیٹھ جاتی اور دو ڈھائی گھنٹے پڑھتی رہتی۔ اس کی محنت رنگ لائی اور وہ پہلے سال کے تمام پرچوں میں کامیاب ہو گئی۔ وہ سیکنڈ ایئر کی پڑھائی شروع کرنے کے لیے سوچ ہی رہی تھی کہ دوبارہ اُمید سے ہو گئی۔ یہ اس کے لیے ایک نیا چیلنج تھا۔ اس نے سوچا کہ کیا اُمید سے ہونے کے بعد عورتیں اپنے کام چھوڑ دیتی ہیں پھر کیوں وہ گھر بیٹھ جائے چنانچہ اس نے اپنے معاملات جاری رکھے اور جیسے تیسے سیکنڈ ایئر بھی پاس کر لیا۔

ساجدہ کا خیال تھا کہ اس کو پڑھتا دیکھ کر رحمت علی کو بھی جوش آئے گا اور وہ اپنا تعلیمی سلسلہ شروع کرنے کے بارے میں سوچیں گے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ رحمت علی کی روش میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ دفتر سے آنے کے بعد ٹی وی دیکھتے اور سو جاتے۔ ان کی دنیا صرف دفتر اور گھر تک محدود تھی۔ ساجدہ کا ارادہ بی اے کرنے کا تھا لیکن وہ سوچ کر پریشان ہو گئی کہ اگر وہ تعلیم میں رحمت علی سے آگے نکل گئی تو کہیں وہ احساس کمتری کا شکار نہ ہو جائیں چنانچہ اس نے رحمت علی کو اعتماد میں لیتے ہوئے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔

وہ حسب معمول پُرسکون انداز میں بولا۔ ”سوچ لو۔ دو بچوں کی پرورش، گھر اور ملازمت کی مصروفیت، اس کے بعد تمہارے پاس پڑھنے کا وقت کہاں ہوگا۔“

”یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں مجھے بس آپ کی اجازت چاہیے۔“

”ٹھیک ہے اگر تم کر سکتی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

یوں ساجدہ نے بی اے میں اپنا ایڈمیشن کروا لیا اور تن من دھن سے پڑھائی میں جت گئی لیکن اس کی مشکلات بڑھتی جا رہی تھیں۔ چھوٹا بیٹا عامر اسے بہت تنگ کرتا تھا۔ وہ اسے بار بار سلانے کی کوشش کرتی لیکن اس کی ریں ریں کسی طرح ختم نہیں ہوتی تھی۔ کبھی کبھی تو گیارہ بارہ بج جاتے اور وہ اسے گود میں لے کر ٹہلتی رہتی لیکن اسے اُمید تھی کہ یہ صورتِ حال زیادہ دیر نہیں رہے گی۔

وقت گزرتا رہا اور ساجدہ نے دیکھتے ہی دیکھتے بی اے

کرلیا۔ اسے اسی اسکول میں ہی ٹیچر کی جاب مل گئی اور تنخواہ میں بھی اضافہ ہوگیا جب کہ رحمت علی ابھی تک وہیں کے وہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ تنخواہ میں سالانہ انکریمنٹ لگ جاتا۔ جس ترقی کا خواب وہ دیکھ رہا تھا اس کا کہیں پتا نہ تھا۔ ساجدہ نے بینک میں اکاؤنٹ کھول لیا تھا اور وہ اپنی تنخواہ اس میں جمع کر رہی تھی پھر اچانک اس کے والد کا انتقال ہوگیا اور وہ ان کی مدد سے محروم ہوگئی۔ دونوں بھائی برسرِ روزگار تھے لیکن انہیں کبھی اتنی توفیق نہیں ہوئی تھی کہ وہ بہن کے ہاتھ پر چار پیسے رکھتے۔ ان کا یہ ہی احسان کم تھا کہ مہینے دو مہینے میں ایک دو کلو پھل لے کر بہن کی خیریت کے لیے آجاتے۔

ساجدہ کی پریشانیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ یکے بعد دیگرے اس کے ساس سسر بھی دنیا سے رخصت ہوگئے۔ ان کے جانے کے بعد گھر کا شیرازہ بکھر گیا۔ نندیں بیاہی جاچکی تھیں۔ دیوروں نے بھی اپنے نئے نئے ٹھکانے تلاش کر لیے تھے اب اس گھر میں رحمت علی اور اس کی فیملی رہ رہی تھی۔ رحمت علی کو اس وقت ہوش آیا جب انہیں گھر کے خرچ کے ساتھ بچوں کی تعلیم کے اخراجات اور یوٹیلٹی بل بھی ادا کرنے پڑے۔ ان اخراجات کے لیے ان کی تنخواہ ناکافی تھی چنانچہ ساجدہ کی تنخواہ بھی گھر میں خرچ ہونے لگی اگر وہ کچھ پس انداز کرنے کی کوشش کرتی تو ہنگامی ضرورتوں کے لیے اسے بینک سے نکالنے پڑ جاتے اور یوں دھیرے دھیرے اس کی جمع پونجی ختم ہوتی چلی گئی۔

وقت کچھ اور آگے بڑھا۔ اس دوران صرف یہ تبدیلی آئی کہ رحمت علی کی ترقی ہوگئی اور وہ اسسٹنٹ ہوگئے لیکن تنخواہ میں معمولی سا اضافہ ہوا۔ دو سال بعد راشدہ نے میٹرک کرلیا اور کالج میں داخلہ لینے کی ضد کرنے لگی۔ ساجدہ کو اپنا وقت یاد تھا اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ چٹنی روٹی کھا کر بھی بچوں کو پڑھائے گی۔ عامر اپنے باپ پر گیا تھا۔ اس کا بھی پڑھائی میں دل نہیں لگتا تھا لیکن ساجدہ اس کے پیچھے لٹھ لے کر پھرتی تھی جیسے تیسے کرکے اس نے میٹرک کیا اور مزید پڑھنے سے انکار کردیا۔ اسے باہر جانے کی دھن سوار ہوگئی تھی۔ ساجدہ نے اسے بہت سمجھایا کہ وہ پہلے اپنی تعلیم مکمل کرے پھر باہر جانے کی سوچے لیکن اس نے صاف کہہ دیا کہ اس کا پڑھائی میں دل نہیں لگتا اور گھر کے حالات کے پیشِ نظر اس کا باہر جانا ضروری ہے۔

اس کے بعد اس نے بیرونِ ملک جانے کی کوشش شروع کردی۔ ایک ایجنٹ نے اسے مشورہ دیا کہ اگر وہ کوئی ٹیکنیکل کورس کرلے تو وہ اس کا ویزا منگوا دے گا۔ ایجنٹ کے مشورے پر اس نے ایک کمپیوٹر انسٹیٹیوٹ سے ایک سال کا کورس کیا اور ایجنٹ کے پاس اپنا پاسپورٹ اور کاغذات جمع کروا دیے۔ ایجنٹ نے اس کام کے لیے تین لاکھ کا مطالبہ کیا جسے اسے پورا کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی لیکن عامر بضد تھا کہ وہ یہاں رہ کر کچھ نہیں کرسکے گا اس لیے اس کا باہر جانا بہت ضروری ہے۔

رحمت علی خود بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ بیرونی ملک چلا جائے کیونکہ گھر کے اخراجات ان کے بس سے باہر ہوتے جارہے تھے اور انہیں کسی سہارے کی شدت سے ضرورت محسوس ہورہی تھی۔ اس کے علاوہ راشدہ کی شادی بھی کرنی تھی۔ اس کی ماں نے جو کچھ بچایا وہ گھریلو اخراجات کی نظر ہوگیا اور اب ساجدہ کے اکاؤنٹ میں چالیس پچاس ہزار روپے پڑے ہوئے تھے لیکن سوال یہ تھا کہ اتنی بڑی رقم کا انتظام کیسے کیا جائے۔

انہوں نے دفتر کے ساتھیوں سے مدد مانگنے کی کوشش کی لیکن سب ان جیسے ہی تھے۔ کوئی بھی اتنی بڑی رقم نہیں دے سکتا تھا۔ رحمت علی نے ہر ایک کو یقین دلایا کہ ان کا بیٹا باہر چلا گیا تو وہ یہ چھ مہینے میں واپس کردیں گے۔ اس کے باوجود بات نہ بنی پھر ان کے ایک ساتھی نے مشورہ دیا کہ بہت سے لوگ سود پر سرمایہ فراہم کرتے ہیں اگر انہیں یقین ہے کہ وہ چھ ماہ میں رقم واپس کردیں گے تو وہ انہیں ایک ایسے شخص سے ملوا سکتا ہے۔ زیادہ سود بھی نہیں دینا پڑے گا۔

رحمت علی نے کہا کہ گھر میں مشورہ کرکے جواب دیں گے لیکن جب انہوں نے ساجدہ کو بتایا تو اس نے شدت سے اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ وہ کبھی ایسا نہیں ہونے دے گی۔ بے شک عامر باہر نہ جائے۔ انہیں یہاں بھی کوئی نہ کوئی کام مل جائے گا۔ راشدہ بھی اس کے حق میں نہیں تھی۔ اس نے بھائی کو سمجھایا۔

”سود پر رقم لینے سے بہتر ہے کہ تم یہیں رہ کر کام کرو جب تین لاکھ جمع ہوجائیں تو باہر چلے جانا۔“

”یہاں رہ کر میں کچھ نہیں کرسکتا۔ امی ابا کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ انہوں نے ساری عمر نوکری کرکے کیا جمع کرلیا جو میں سال دو سال میں کرلوں گا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ ابا شروع ہی میں باہر چلے جاتے۔ کم سے کم ہمیں آج یہ دن نہیں دیکھنا پڑتا۔“

رحمت علی کے دل پر یہ طعنہ تیر کی طرح جا کر لگا۔ وہ دوسرے ہی دن اپنے دوست کے ہمراہ گئے اور ضروری کارروائی کے بعد پیسے لے کر آگئے۔ ضمانت کے طور پر انہوں نے مکان کے کاغذات اس کے پاس رکھوا دیے۔ عامر نے اگلے روز ہی پیسے جمع کرا دیے اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ ایک مہینے کے اندر اس کا ویزا منگوا دے گا۔

ان دنوں راشدہ ایم ایس سی کے آخری سال میں تھی۔ ہر جوان اور خوب صورت لڑکی کی طرح اس نے اپنی آنکھوں میں کچھ خواب سجا رکھے تھے اور اب ان کی تعبیر ملنے کا وقت آگیا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا ماموں زاد وسیم اس میں غیر معمولی دلچسپی لے رہا ہے۔ اس کے ماموں تو کبھی کبھار ہی آتے تھے لیکن وسیم کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن کسی نہ کسی بہانے آجاتا تھا اور کافی دیر راشدہ سے باتیں کرتا رہتا۔ وہ بھی اس کی گفتگو میں دلچسپی لیتی۔ وسیم بے حد دلکش شخصیت کا مالک تھا اور اسے باتیں کرنے کا ہنر آتا تھا۔ اس کی تعلیم مکمل ہوچکی تھی اور کسی کمپنی میں اچھی پوسٹ پر فائز تھا۔

چند ہی دنوں میں راشدہ اس کی گرویدہ ہوگئی۔ وہ وسیم کی دلچسپی کو محسوس کر رہی تھی گو کہ اس نے ابھی زبان سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن راشدہ جانتی تھی کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور کے بارے میں نہیں سوچ رہا۔ اس نے بھی دل ہی دل میں وسیم کو اپنا ہمسفر چن لیا تھا اور اسے یہ بھی اطمینان تھا کہ وہ نیک دل اور صاف طبیعت انسان ہے اس لیے اس کی جانب سے جہیز وغیرہ کا مطالبہ نہیں ہوگا۔

ایجنٹ نے وعدے کے مطابق ایک مہینے کے اندر عامر کا ویزا منگوا دیا اور اس نے مسقط جانے کی تیاری شروع کردی لیکن ساجدہ اب بھی مطمئن نہیں تھی کیونکہ ابھی صرف ویزا آیا تھا۔ ملازمت عامر کو وہاں جا کر خود ڈھونڈنا تھی ایجنٹ نے اسے یقین دلایا تھا کہ جب ملازمت مل جائے گی تو کفیل اسے ریلیز کردے گا۔

عامر چلا گیا۔

اس نے اپنے پہنچنے کی اطلاع بھی دے دی اور بتایا کہ کفیل نے اسے ملازمت ڈھونڈنے کی اجازت دے دی ہے۔ فی الحال اس کے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے اور کفیل نے ہی اسے رہنے کے لیے جگہ دے دی ہے۔ اس کمرے میں چار آدمی پہلے سے ہی رہتے ہیں اور وہ زمین پر بستر لگا کر سوتا ہے۔

چھ ماہ گزر گئے لیکن عامر کو اس کے مطلب کی ملازمت نہیں ملی۔ وہ چھوٹے موٹے کام کرکے اپنا گزارا کرتا رہا۔ کفیل نے اسے بتایا کہ اس کے ویزے کی مدت ایک سال ہے۔ اس دوران اسے ملازمت نہ ملی تو اسے واپس پاکستان جانا پڑ جائے گا۔ یہ سن کر عامر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اس نے شدت سے ملازمت کی تلاش شروع کردی۔ اب اسے معلوم ہوا کہ ماں ٹھیک ہی کہتی تھی۔ اس کے پاس تعلیم تھی نہ ہنر جو اسے کوئی ڈھنگ کی ملازمت ملتی۔ بہت دوڑ دھوپ کے بعد اسے ایک تعمیراتی کمپنی میں لیبر کی جاب مل گئی۔ اسے سخت گرمی اور چلچلاتی دھوپ میں صبح سے شام تک کھلے آسمان کے نیچے مزدوری کرنی پڑتی اس کے عوض اسے اتنے پیسے ملتے کہ اس کا اپنا گزارا مشکل سے ہوتا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ کفیل نے اسے ریلیز کردیا اور اسے اقامہ مل گیا۔

چھ مہینے گزرنے کے بعد عاشق علی نے پیسوں کی واپسی کا مطالبہ شروع کردیا۔ یہ اس شخص کا نام تھا جس نے رحمت علی کو سود پر رقم دی تھی۔ جب کہ عامر نے اس دوران ایک پیسا بھی نہیں بھیجا تھا۔ وہ ہر بار ٹیلیفون کرکے یہی کہتا کہ دوسری ملازمت ڈھونڈ رہا ہے۔ جیسے ہی اس کے حالات بہتر ہوئے وہ پیسے بھیجنے شروع کردے گا۔

ساجدہ جانتی تھی کہ دیوانے کا خواب ہے۔ اسے ڈھنگ کی ملازمت مل ہی نہیں سکتی تھی۔ اب اس کے پاس دو ہی راستے تھے کہ وہ ساری عمر مسقط میں مزدوری کرتا رہے یا پاکستان واپس آجائے۔ سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ عاشق علی کا قرض کیسے واپس کیا جائے۔ دونوں میاں بیوی نے مل کر فیصلہ کیا کہ عاشق علی سے مزید مہلت مانگی جائے۔ ممکن ہے اس وقت تک عامر کو کوئی اچھی ملازمت مل جائے اور وہ قرضہ واپس کرنے کے قابل ہوجائیں۔

عاشق علی مزید مہلت دینے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن رحمت علی کے دوست کی سفارش پر راضی ہوگیا۔ البتہ اس نے یہ شرط رکھی کہ رحمت علی ہر مہینے سود دینا شروع کردے ورنہ سود در سود کی صورت میں اصل رقم سے کہیں زیادہ قرضہ ہوجائے گا۔

رحمت علی کے لیے یہ ایک نئی مشکل آن پڑی۔ ان کے گھر کا خرچ ہی بامشکل تمام پورا ہوتا تھا وہ سود کہاں سے دیتے لیکن عاشق علی کی بات بھی صحیح تھی سود نہ دینے کی صورت میں قرضہ اصل رقم سے زیادہ ہوجاتا۔ مجبوراً انہیں اپنے اخراجات میں کٹوتی کرنا پڑی اور وہ جیسے تیسے ماہانہ سود

کی قسط ادا کرنے لگے۔

چھ ماہ مزید گزر گئے۔ عامر کے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اور وہ واپس آنے کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن رحمت علی نے اسے منع کر دیا اور کہا کہ وہ کوشش جاری رکھے۔ ایک نہ ایک دن اسے ڈھنگ کی نوکری مل ہی جائے گی۔

ایک سال پورا ہوا تو عاشق علی نے ایک بار پھر رقم کی واپسی کا تقاضا شروع کر دیا۔ اس بار اس کا انداز جارحانہ تھا۔ اس نے رحمت علی کو دھمکی دی کہ اگر اس نے ایک ماہ کے اندر اس کی رقم واپس نہ کی تو وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور ہو جائے گا۔ یہ سن کر رحمت علی کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی اور وہ سوچنے لگے کہ اگر ایک بار معاملہ عدالت میں چلا گیا تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے عدالت ان کے مکان کی قرقی کے احکامات جاری کر دے گی اور وہ اپنی چھت سے بھی محروم ہو جائیں گے۔

جب یہ بات انہوں نے ساجدہ اور راشدہ کو بتائی تو وہ بھی پریشان ہو گئیں۔۔۔اور سوچ بچار کے بعد یہ ہی طے پایا کہ مکان بیچ کر عاشق علی کا قرض واپس کر دیا جائے اور خود کسی کرائے کے مکان میں منتقل ہو جائیں۔ اس طرح کم از کم عزت تو بچ جائے گی جب عامر کے حالات بہتر ہوئے تو دوسرے مکان کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔

راشدہ کو اس تجویز سے اختلاف تھا۔ اس نے کہا۔ ’’آپ لوگوں کے حالات ایسے نہیں کہ آپ کرائے کا مکان افورڈ کر سکیں پھر مالک مکان آئے دن تنگ کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کرایہ بڑھانے کا مطالبہ تو کبھی مکان خالی کرانے کی دھمکی اور عامر سے تو آپ کوئی توقع نہ رکھیں۔ اسے اگر کوئی نوکری ملنا ہوتی تو اب تک مل چکی ہوتی۔‘‘

’’پھر تم ہی بتاؤ کہ کیا کیا جائے؟‘‘

’’آپ عاشق علی سے مزید مہلت مانگیں۔‘‘

’’کس اُمید پر؟‘‘ رحمت علی نے جل کر کہا۔ ’’تم ہی کہہ رہی ہو کہ عامر سے کوئی اُمید نہ رکھی جائے۔‘‘

’’ہاں لیکن حالات بدلتے دیر نہیں لگتی شاید بہتری کی کوئی صورت نکل آئے۔ شاید کوئی ایسا سبب بن جائے کہ ہم اس کا قرض اتار سکیں آپ اس سے بات کریں کہ وہ ہمیں تھوڑی سی مہلت دے دے۔‘‘

’’اُمید تو نہیں کہ وہ مان جائے لیکن تم کہہ رہی ہو تو کوشش کر کے دیکھ لیتا ہوں۔‘‘

☆......☆

رحمت علی کی حالت دیکھ کر ساجدہ سمجھ گئی کہ کوئی غیر معمولی بات ہے ورنہ اس سے پہلے بھی عاشق علی قرض کی واپسی کا مطالبہ کر چکا تھا لیکن رحمت علی کی یہ کیفیت نہیں ہوئی تھی۔ وہ کسی سے بات کیے بغیر اپنے کمرے میں چلے گئے ساجدہ بھی ان کے پیچھے پیچھے آئی۔ راشدہ نے کمرے میں جانا مناسب نہیں سمجھا اور وہ دروازے سے لگ کر ان کی باتیں سننے لگی۔

ساجدہ نے کہا۔ ’’کچھ بتائیں تو سہی کیا ہوا ہے؟ آپ نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟‘‘

رحمت علی نے نظریں اوپر اٹھائیں ان کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ اب ساجدہ کی برداشت جواب دے گئی۔ اس نے چلاتے ہوئے کہا۔ ’’آپ بتاتے کیوں نہیں۔ کیا بات ہے رو کیوں رہے ہیں؟‘‘

رحمت علی نے بھرائی آواز میں کہا۔ ’’اس بدبخت عامر نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔ اس کی وجہ سے آج میری اتنی بے عزتی ہوئی......‘‘

’’ظاہر ہے جو ادھار دے گا وہ بے عزتی بھی کرے گا۔ یہ کون سی نئی بات ہے اس نے مہلت دینے سے انکار کر دیا ہوگا۔‘‘

’’اگر وہ صرف انکار ہی کرتا تو میں برداشت کر لیتا لیکن اس نے ایک بات ایسی کہہ دی کہ میرا خون کھول اٹھا۔ یقین جانو میرے پاس ریوالور ہوتا تو میں چھ کی چھ گولیاں اس کے سینے میں اتار دیتا۔‘‘

’’اف پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہیں۔‘‘ وہ بھناتے ہوئے بولی۔

’’صاف صاف کیوں نہیں بتا دیتے کہ اس نے کیا کہا؟‘‘

’’اس نے ایک ایسی بات کہہ دی جسے کوئی بھی غیرت مند باپ برداشت نہیں کر سکتا۔ اس نے کہا کہ اب مہلت کی گنجائش نہیں البتہ ایک شرط پر وہ یہ قرض معاف کر سکتا ہے۔‘‘

’’کیسی شرط؟‘‘ ساجدہ چونکتے ہوئے بولی۔

’’اس نے کہا کہ اگر میں راشدہ کی شادی اس سے کر دوں تو وہ نہ صرف مکان کے کاغذات واپس کر دے گا بلکہ قرض بھی معاف کر دے گا۔‘‘

’’ہائے اللہ۔‘‘ وہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ’’اس کی ہمت کیسے ہوئی۔ یہ بات کرنے کی؟‘‘

’’وہ نیچ ذات اور گھٹیا انسان ہے کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔‘‘ وہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولے۔

’’پھر آپ نے کیا جواب دیا؟‘‘

’’ظاہر ہے میں اس کی بات سن کر طیش میں آ گیا اور کہا کہ میں اس کا قرض ادا نہیں کر سکتا جب میرے پاس پیسے ہوں گے تو دے دوں گا اسے جو کرنا ہے کر لے۔‘‘

’’اچھا کیا اس کی بات کا یہی جواب ہو سکتا تھا۔‘‘

’’وہ تو ٹھیک ہے اب یہ سوچو کہ کیا کرنا ہے۔‘‘

’’وہی جو ہم نے پہلے سوچا تھا آپ آج شام کو ہی کسی ایجنٹ سے بات کر کے اس مکان کو سیل پر لگا دیں۔‘‘

’’پھر ہم کہاں جائیں گے؟‘‘ رحمت علی نے پوچھا۔

’’کہیں بھی چلے جائیں گے خدا کی زمین بہت بڑی ہے۔ ہزاروں لوگ کرائے کے مکانوں میں رہ رہے ہیں اور پھر اس کے تین لاکھ دینے کے بعد ہمارے پاس کافی رقم بچ جائے گی۔ اس سے ہم کوئی چھوٹا موٹا فلیٹ بھی خرید سکتے ہیں۔‘‘

راشدہ دروازے سے لگی یہ سب باتیں سن رہی تھی اس نے جب مکان بیچنے کا سنا تو پریشان ہو گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے ماں باپ اس عمر میں چھت سے محروم ہو جائیں۔ وہ پرانے وقتوں کا کشادہ مکان تھا اور اب زندگی بھر انہیں اس طرح کی رہائش نصیب نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر فلیٹ خریدنے کے لیے پیسے بچ گئے تب بھی وہ اس کے حق میں نہیں تھی۔ کہاں تین کمروں کا مکان اور کہاں تابوت نما فلیٹ۔ اس کا تو دم گھٹ جائے گا۔

وہ اپنے کمرے میں آ کر سوچنے لگی کہ کیا وہ ترکیب ہو سکتی ہے کہ قرض ادا ہو جائے اور مکان بھی بچ جائے۔ ایسا اسی وقت ہو سکتا تھا جب عاشق علی کی شرط مان لی جاتی۔ واقعی اس کی ہمت کیسے ہوئی کہ وہ ساٹھ سال کا بوڑھا ایک جوان کنواری لڑکی سے شادی کرنے کا خواب دیکھے اسے اس تصور سے ہی گھن آ رہی تھی۔ بہت سوچنے کے بعد اس نے وسیم سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسے امید تھی کہ وہ ضرور اس مسئلے کا حل نکال لے گا۔ اس کے دونوں ماموں خوش حال زندگی بسر کر رہے تھے اور وہ خود بھی ایک اچھی پوسٹ پر تھا اگر وہ سب مل کر کوشش کرتے تو یہ قرض ادا ہو سکتا تھا۔ بعد میں جب عامر کو جاب مل جاتی تو انہیں یہ رقم واپس

انتظار حسین کہتے ہیں۔ میں ستمبر 1948ء میں کراچی آیا۔ جب یہ شہر ویران تھا، صدر جیسا علاقہ آدمیوں سے خالی تھا۔ اس وقت ہندوستان سے لٹے پٹے قافلے پاکستان پہنچ رہے تھے۔ اکتوبر 1948ء میں جب میں ملیر کی سیر کے لیے گیا تو اس علاقے کی ویرانی دیکھ کر خوف آتا تھا۔ میں نے کئی برس تک پاکستان چوک کے ایک فلیٹ میں 14 افراد کے ساتھ زندگی بسر کی لیکن کسی کے لبوں پر بھی شکایت نہیں تھی۔ روزگار کے مواقع کم تھے۔ ایک بار میں اور راغب مراد آبادی ایک صاحب خواجہ شہاب الدین سے ملنے گئے۔ وہ راغب کے جاننے والے تھے۔ وہ سرکاری محکمے میں تھے اور مکانوں کی الاٹمنٹ کا کام ان کے ذمے تھا، ان سے جب بھی کوئی ملنے جاتا تھا وہ گھبرا جاتے تھے کہ یہ اب کوئی مطالبہ نہ کرے، یہاں سے آپ اندازہ کریں کہ ہجرت کے بعد کس قدر مسائل تھے۔
اقتباس: باتوں کی پیالی میں ٹھنڈی چائے۔ از۔ خرم سہیل

کر دی جاتی۔ پہلے اس نے سوچا کہ ساجدہ سے کہے۔ وہ اپنے بھائیوں سے بات کرے لیکن راشدہ جانتی تھی کہ وہ کبھی ان سے مدد نہیں مانگے گی، اس لیے اس نے خود ہی وسیم سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس نے موبائل اٹھا کر نمبر ڈائل کیا اور بولی۔ ’’مجھے تم سے کوئی ضروری بات کرنی ہے کل تم میرے ساتھ لنچ کرو۔‘‘

’’کہاں؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’جہاں تمہیں آسانی ہو میں وہیں آ جاؤں گی۔‘‘

’’ٹھیک ہے پھر لالازار میں ملتے ہیں ٹھیک ایک بجے۔‘‘

دوسرے روز وہ مقررہ وقت پر ریسٹورنٹ پہنچ گئی۔ وسیم پہلے سے وہاں موجود تھا دونوں نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ پھر وسیم نے چائے منگوائی اور بولا۔ ’’ہاں اب بتاؤ وہ کیا بات ہے جس کے لیے تم نے یہاں بلوایا ہے۔‘‘ راشدہ نے جھجکتے ہوئے اسے ساری بات بتا دی اور جب وہ کہانی کے آخری حصے پر پہنچی تو الفاظ اس کے حلق میں اٹکنے لگے اور وہ بڑی مشکل سے اسے عاشق علی کی شرط کے بارے میں بتا سکی۔ وسیم کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ بولا۔ ’’کمال ہے اس نے اتنی بڑی بات کیسے کہہ دی میرا خیال

ہے وہ تم سے عمر میں زیادہ ہوگا۔“

”زیادہ نہیں بلکہ بہت زیادہ، ابا بتا رہے تھے کہ وہ ساٹھ سے زیادہ کا ہے۔ پہلی بیوی مر چکی ہے اور وہ بے اولاد ہے اسی لیے وہ دوسری شادی کرنا چاہ رہا ہے۔“

”تاکہ دوسری کو بھی بیوگی کا داغ دے کر دنیا سے چلا جائے۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو تمہیں کیا معلوم کہ وہ کتنی عمر لکھوا کر لایا ہے۔“

”پاکستان میں مردوں کی اوسط عمر عموماً 67 سال ہے۔ اس حساب سے اسے تین سال اوپر ہو گئے ہیں اور وہ کسی وقت بھی لڑھک سکتا ہے۔ ویسے بھی اس عمر میں انسان کو بہت سی بیماریاں گھیر لیتی ہیں۔“

”ہاں ابا بتا رہے تھے کہ اس کا بائی پاس ہو چکا ہے۔ اسے بلڈ پریشر اور شوگر کی بھی شکایت ہے۔ تم ہی بتاؤ ایسے مریض اور بوڑھے شخص سے میں شادی کر سکتی ہوں۔“

”پھر تم نے کیا سوچا ہے؟“

”یہ ہی مشورہ کرنے تمہارے پاس آئی ہوں تمہارے خیال میں اس مسئلے کا کیا حل ہو سکتا ہے۔“

”بظاہر تو دو ہی حل ہیں۔ اس کا قرض واپس کر دو یا اس کی شرط مان لو۔“

اس کا جواب سن کر اسے بہت مایوسی ہوئی اس کا خیال تھا کہ وہ بھی یہ ہی تجویز کرے گا جو راشدہ کے ذہن میں تھا۔ لیکن اس نے ایک طرح سے کورا جواب دے دیا. پھر بھی اس نے ڈھیٹ بنتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری نظر میں اس کا کوئی تیسرا حل نہیں ہے؟“

”تم ہی بتاؤ کہ تیسرا حل کیا ہو سکتا ہے سوائے اس کے کہ کوئی تمہیں یہ رقم دے دے اور تم ایک سے نکل کر دوسرے کے چکر میں پھنس جاؤ۔ پہلے تم نے عاشق علی سے یہ کہہ کر قرضہ لیا تھا کہ عامر بیرون ملک کما کر اسے اتار دے گا۔ اب تو یہ گارنٹی بھی نہیں ہے کون تمہیں قرض دے گا۔“

راشدہ بڑا مان لے کر اس کے پاس آئی تھی لیکن وہ تو بالکل اجنبیوں جیسی باتیں کر رہا تھا۔ اس وقت اسے احساس ہوا کہ خونی رشتے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ سب اپنے مفادات کے اسیر ہیں۔ چند لمحوں بعد ہی اس کا ثبوت بھی سامنے آ گیا۔ وہ مایوس ہو کر اٹھنے والی تھی کہ اس نے کہا۔ ”تم نے بتایا کہ وہ شخص بوڑھا اور بیمار ہے۔“

”ہاں۔“

”میں سمجھتا ہوں کہ اس کی زندگی کے دن بہت تھوڑے رہ گئے ہیں۔“

”یہ میں نہیں جانتی ممکن ہے کہ وہ آج ہی مر جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سو سال تک زندہ رہے۔“

”میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہے گا۔“

”تمہیں اس کے جینے مرنے سے اتنی دلچسپی کیوں ہو گئی؟“

”دراصل میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔“

”وہ کیا؟“

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور جھجکتے ہوئے بولا۔

”تم اس سے شادی کر لو۔“

”کیا؟“ وہ زور سے چلائی۔

”تم ہوش میں تو ہو تم نے یہ کیسے سوچ لیا۔“

”اتنا غصہ کرنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”پہلے تم میری پوری بات سن لو۔“

”میں کچھ سننا نہیں چاہتی میرے پاس فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔“

”جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں، پہلے میری پوری بات سن لو۔ اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔“

وہ حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگی پھر اس نے کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس شادی سے مجھے کیا فائدہ ہوگا؟“

”وہ ہی تو بتا رہا ہوں۔“

”اچھا بتاؤ۔“

”تمہیں یہ فائدہ ہوگا کہ قرضے سے نجات مل جائے گی اور وہ تمہارے مکان کے کاغذات واپس کر دے گا لیکن یہ صرف نام کی شادی ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا آدمی حقوق زوجیت ادا کرنے کے قابل بھی نہیں ہے اس لیے تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا اور تم پہلے کی طرح کنواری ہی رہو گی۔ کوشش کرنا کہ وہ تمہارے قریب نہ آئے۔ اسے کسی طرح رات کو سوتے وقت دودھ میں خواب آور دوا ملا کر دے دینا۔ اس طرح وہ اپنی تشنہ آرزوؤں کی تکمیل سے پہلے ہی سو جائے گا۔ بہانے بہانے زیادہ وقت میکے میں گزارنا تاکہ وہ تمہارے قریب نہ آ سکے چند ماہ بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔ اس کی کوئی اولاد نہیں ہے اس لیے

اس کی تمام دولت و جائیداد تمہارے حصہ میں آئے گی۔ عدت ختم ہونے کے بعد میں تم سے شادی کر لوں گا۔“

”اگر وہ اتنی جلدی نہیں مرا تو......“ راشدہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”پھر مجبوری ہے۔ تم اس سے خلع لے لینا تاکہ میں تم سے شادی کر سکوں۔“

راشدہ کے تن بدن میں آگ لگ رہی تھی۔ اس نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”یہ کسی فلم یا ڈرامے کا اسکرپٹ تو ہو سکتا ہے لیکن حقیقی زندگی میں ایسے تماشے نہیں ہوتے۔ تم مجھے قربانی کا بکرا بنانا چاہتے ہو۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ تمہاری اتنی گھٹیا سوچ ہوگی۔ میں نے ہی تمہیں سمجھنے میں غلطی کی اور تم سے مشورہ کرنے چلی آئی۔ بہرحال تمہارے قیمتی مشورے کا شکریہ۔ آئندہ مجھ سے ملنے یا فون کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ آج سے میرے اور تمہارے راستے جدا ہیں۔“ اس نے اپنا پرس اٹھایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

وسیم نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”بات تو سنو تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔“

وہ اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولی۔ ”ہوٹل میں تماشا مت بناؤ تمہارا جو مطلب تھا وہ میں خوب سمجھتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ پیر پٹختی ہوئی وہاں سے چلی آئی۔

گھر آ کر اس نے کمرا بند کیا اور بستر پر لیٹ کر زار و قطار رونے لگی اس دوران ساجدہ دو مرتبہ اسے کھانے کے لیے بلانے آئیں لیکن اس نے اندر سے ہی انکار کر دیا۔ نجانے کتنی دیر وہ تکیے میں سر دیے کر روتی رہی۔ جب اس کا دل ہلکا ہوا تو وہ بستر سے اٹھی، وضو کیا اور اپنے کمرے میں ہی جائے نماز بچھا کر دو رکعت نفل ادا کیے پھر بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ سکون اور عافیت کی دعا مانگی اور کچن میں جا کر اپنے لیے چائے بنانے لگی۔

رات کے کھانے پر اس نے خود ہی موضوع چھیڑ دیا اور انجان بنتے ہوئے بولی۔ ”کیا ہوا ابا جان آپ نے عاشق علی سے بات کی؟ وہ مزید مہلت دینے پر تیار ہوا یا نہیں۔“

رحمت علی نے چور نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا اور راشدہ سے نظریں چراتے ہوئے بولے۔ ”نہیں بیٹی وہ کسی طرح بھی نہیں مان رہا۔“

”پھر آپ کیا کریں گے۔“

”کرنا کیا ہے۔“ ساجدہ تڑپ کر بولی۔ ”یہ مکان ہی بکے گا عزت سے زیادہ تو کچھ بھی قیمتی نہیں۔“

”یہی مناسب ہے۔“ راشدہ نے کہا۔

”قرضہ دینے کے بعد جو پیسے بچ جائیں وہ بینک میں رکھوا دیں۔ اس کا منافع آتا رہے گا۔ اگلے مہینے میرے امتحان ختم ہو جائیں گے تو میں بھی کوئی جاب کر لوں گی۔ اس طرح ہم مل جل کر مکان کا کرایہ دیتے رہیں گے۔“

ایک مہینے میں مکان کا سودا ہو گیا۔ رجسٹری کے لیے کاغذات کی ضرورت پڑی تو عاشق علی فائل دینے میں ٹال مٹول کرنے لگا اس مرحلے پر رحمت علی سے جس دوست نے قرضہ دلوایا تھا۔ اسی نے ضمانت دی کہ مکان کی پیمنٹ ہوتے ہی اس کا قرضہ ادا کر دیا جائے گا۔ اس طرح یہ مرحلہ بھی بخیر و خوبی سر ہو گیا۔

رحمت علی نے بقیہ رقم بینک میں رکھوا دی اور کرائے کے فلیٹ میں منتقل ہو گئے۔ ساجدہ چاہ رہی تھی کہ بینک میں پیسے رکھنے کے بجائے ان پیسوں سے کوئی سستا سا فلیٹ خرید لیا جائے تاکہ کرائے سے جان چھوٹ جائے لیکن عامر نے انہیں انتظار کرنے کا مشورہ دیا۔ ایک جگہ اس کی بات چل رہی تھی اور اسے پوری اُمید تھی کہ اس بار وہ معقول ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک دو سال بعد وہ فلیٹ کی جگہ کوئی مکان خرید لیں گے۔

نئے فلیٹ میں شفٹ ہونے کے بعد ہی عامر کا فون آیا کہ اسے معقول جاب مل گئی ہے اور وہ ہر مہینے کچھ نہ کچھ پیسے گھر بھیجنے لگا۔ راشدہ بھی ایم ایس سی کرنے کے بعد ایک لیبارٹری میں جاب کرنے لگی۔

عامر کی طرف سے اطمینان ہوا تو ساجدہ کو بیٹی کی شادی کی فکر ستانے لگی۔ اس کی نظریں بھی وسیم پر تھیں لیکن اس نے اچانک ہی آنا چھوڑ دیا تو اسے فکر لاحق ہو گئی اور ایک دن اس نے راشدہ سے پوچھ ہی لیا۔ ”کیا بات ہے آج کل وسیم نہیں آ رہا؟“

”مجھے کیا معلوم۔“ وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ”اس کا جواب تو وسیم ہی دے سکتا ہے۔“

”اس نے فون بھی نہیں کیا؟“

”نہیں۔“

”تم ہی اسے فون کر لیتیں۔“ پھر سانس لے کر بولیں۔ ”میرا خیال ہے کہ اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ ہم فلیٹ میں شفٹ ہو گئے ہیں۔“

’’مجھے کیا ضرورت ہے اسے فون کرنے کی، اگر اسے آنا ہوگا تو خود ہی فون کر کے پتا معلوم کر لے گا۔‘‘

ساجدہ سمجھ گئی کہ ان کے درمیان کوئی کھٹ پٹ ہوگئی ہے یا پھر ان کے تعلقات کی نوعیت ایسی نہیں جو یہ سمجھ رہی تھی لیکن اسے راشدہ کی شادی تو کرنا ہی تھی وسیم نہیں تو کوئی اور سہی اسی لیے اس نے راشدہ کو گھیر لیا اور بولیں۔ ’’ہم تمہاری شادی کرنا چاہ رہے ہیں اگر کوئی پسند ہو تو بتا دو ورنہ ہم خود تمہارے لیے رشتہ ڈھونڈتے ہیں۔‘‘

’’میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی جب تک اپنا مکان نہ ہوجائے۔‘‘ راشدہ نے ماں کو ٹکا سا جواب دے دیا۔

’’پہلے تمہاری شادی ہونی چاہیے مکان ہمارے لیے اتنا اہم نہیں۔ اس کے بغیر بھی گزارا ہو رہا ہے۔‘‘

ساجدہ وقتی طور پر خاموش ہوگئی وہ سمجھ گئی تھی کہ راشدہ کو وسیم سے تعلق ختم ہونے کا رنج ہے گو کہ اسے اس کی وجہ معلوم نہیں تھی لیکن جانتی تھی کہ یہ زخم اتنی آسانی سے بھرنے والا نہیں۔ اس نے سوچ لیا کہ کچھ وقت گزرنے کے بعد وہ راشدہ سے دوبارہ بات کرے گی۔

وسیم بھی اپنی غلطی پر بہت پشیمان تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی تلافی کس طرح کی جائے۔ اس نے کئی مرتبہ راشدہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار اسے ناکامی ہوئی۔ راشدہ اس کا فون نہیں اٹھا رہی تھی۔ وہ اس کے پرانے مکان پر بھی گیا وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وہ کسی دوسری جگہ شفٹ ہوگئے ہیں۔ تب اس نے ساجدہ کے نمبر پر فون کر کے پتا پوچھا اور ایک دن ان سے ملنے پہنچ گیا۔

ساجدہ بھتیجے کو دیکھ کر خوشی سے نہال ہوگئی۔ اس نے وسیم کی خوب آؤ بھگت کی۔ اس وقت راشدہ جاب پر گئی ہوئی تھی اس لیے وسیم جان بوجھ کر ایسے وقت آیا جب اس سے سامنا نہ ہو۔ پہلے وہ ساجدہ سے مل کر صورتِ حال کا جائزہ لینا چاہ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پہلے وہ پھوپی کو اپنی مٹھی میں لے لے تاکہ وہ راشدہ کے سامنے اس کی وکالت کر سکیں۔

ساجدہ نے باتوں باتوں میں اس سے پوچھ ہی لیا۔ ’’کیا بات ہے بیٹا تم نے تو ہمارے گھر آنا ہی چھوڑ دیا؟‘‘

وسیم نے معصوم صورت بناتے ہوئے کہا۔ ’’کیا کروں پھپھو! میرا تو بہت دل چاہتا ہے لیکن راشدہ کے ڈر سے نہیں آتا۔‘‘

’’اس سے کیا ڈرنا۔‘‘ ساجدہ بولی۔ ’’تمہاری تو اس سے بہت بے تکلفی ہے۔‘‘

’’آپ کو شاید معلوم نہیں ان دنوں وہ مجھ سے ناراض ہے۔ میرا فون بھی نہیں اٹھا رہی۔‘‘

’’اس ناراضگی کی وجہ جان سکتی ہوں۔‘‘ ساجدہ نے پوچھا۔

’’کوئی خاص وجہ نہیں ایک معمولی سی بات پر وہ مجھ سے ناراض ہوگئی۔ حالانکہ مجھے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور میں نے اس سے معذرت بھی کر لی لیکن وہ میری کوئی بات سننے کو تیار نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اسے سمجھائیں۔‘‘

’’ضرور سمجھاؤں گی۔‘‘ ساجدہ نے پیار سے کہا۔

’’آپ جانتی ہیں کہ میں زیادہ دیر کسی کی ناراضگی برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے بے چینی ہونے لگتی ہے اور راشدہ تو مجھے بہت عزیز ہے۔ اس سے دور رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔‘‘

ساجدہ کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔ وسیم نے کھل کر اپنی چاہت کا اظہار کر دیا تھا۔ اس سے زیادہ انہیں کیا چاہیے تھا۔ انہوں نے وسیم کو تسلی دی اور کہا کہ میں راشدہ کو سمجھاؤں گی اور وہ خود بھی اسے منانے کی کوشش کرے۔

شام کو راشدہ گھر آئی تو ساجدہ نے اسے وسیم کی آمد کے بارے میں بتایا۔ یہ سنتے ہی راشدہ ہتے سے اکھڑ گئی اور تڑپ کر بولی۔ ’’اسے یہاں کا پتا کس نے بتایا؟‘‘

’’میں نے۔‘‘ ساجدہ مسکراتے ہوئے بولیں۔ ’’اس نے مجھے فون کیا تھا۔‘‘

’’کیا ضرورت تھی اسے یہاں کا راستہ دکھانے کی۔ اب روزانہ یہاں آ کر بیٹھ جایا کرے گا۔‘‘

’’کیا ہوگیا ہے تمہیں کیسی باتیں کر رہی ہو۔ پہلے تو اس کی بڑی حمایت کرتی تھیں۔‘‘

’’پہلے بے وقوف تھی اب مجھے عقل آگئی ہے۔‘‘

’’لگتا ہے تمہیں کچھ غلط فہمی ہوگئی ہے وہ بھی تمہاری ناراضگی سے بہت پریشان ہے اور تم سے بات کرنا چاہ رہا ہے۔ اسے صفائی کا موقع تو دو۔‘‘

’’آپ کیوں اس کی وکالت کر رہی ہیں۔‘‘ راشدہ تنک کر بولی۔ ’’مجھے نہیں کرنی اس سے کوئی بات وات۔‘‘

’’ماں ہوں تمہاری۔‘‘ ساجدہ تیز لہجے میں بولی۔ ’’تم سے زیادہ دنیا دیکھی ہے میں نے۔ اس کی باتوں سے لگ رہا

تھا کہ وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔ میری مانوں تو غصہ تھوک دو اور صلح کر لو۔ آج کل اچھے لڑکے ملتے کہاں ہیں؟‘‘

’’بس رہنے دیں امی! دنیا وسیم پر ہی ختم نہیں ہوجاتی مجھے بھی کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا۔‘‘

’’اگر تم کسی شہزادے کا انتظار کر رہی ہو تو یہ تمہاری بھول ہے۔ خاندان میں کوئی لڑکا تمہارے جوڑ کا نہیں۔ غیروں میں رشتے تعلقات کی بنیاد پر ہوتے ہیں اور تمہارے باپ کنویں کے مینڈک ہیں۔ دفتر کے دو چار لوگوں کے علاوہ ان کی کسی سے جان پہچان نہیں۔ اس کے مقابلے میں وسیم ہر لحاظ سے بہتر ہے۔ خوش شکل، خوش مزاج، پڑھا لکھا، برسرِ روزگار اور سب سے بڑھ کر اپنا خاندان اور ہمیں کیا چاہیے۔‘‘

راشدہ دل میں سوچنے لگی کہ کاش اس نے اتنی گھٹیا بات نہ کی ہوتی جس نے اس کی ساری خوبیوں کو گہنا دیا۔ اسے وسیم سے نفرت ہوگئی تھی۔ اس کے باوجود وہ اسے دل سے نہیں نکال سکی۔ اس کی یاد اسے بے چین کیے دیتی تھی۔ اس نے بھی وسیم کے علاوہ کسی اور کا تصور نہیں کیا تھا۔ اسے خاموش دیکھ کر ساجدہ بولی۔ ’’اگر تمہیں میرا ذرا سا بھی خیال ہے تو میری بات مان لو۔ وہ ہیرا ہے ہیرا۔ ہاتھ سے نکل گیا تو زندگی بھر پچھتاؤ گی۔‘‘

اس نے ساجدہ کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔ ماں کی باتوں نے اسے ایک عجیب کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔ ساجدہ نے وسیم کے بارے میں جو کچھ کہا وہ اسے جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ وہ خود بھی اس کی خوبیوں کی معترف تھی لیکن اب وہ اس کی نفرت میں اتنی دور نکل آئی تھی کہ واپسی کا راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا پھر اس نے سوچا کہ ماں کی بات مان لینے میں کیا حرج ہے۔ دیکھتی ہوں کہ وہ اپنی صفائی میں کیا کہتا ہے۔

دوسرے دن وسیم آیا تو راشدہ گھر پر تھی۔ ساجدہ نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور راشدہ کے پاس آ کر بولی۔ ’’اس کی بات صبر اور سکون سے سن لو مجھے اُمید ہے کہ اس کے بعد تمہاری غلط فہمی دور ہوجائے گی۔‘‘

راشدہ منہ بناتے ہوئے اٹھی اور ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ وسیم اسے دیکھتے ہی کھڑا ہوگیا اور بولا۔ ’’کیسی ہو راشدہ؟‘‘

’’ٹھیک ہوں تم سناؤ کیا کہنا چاہ رہے ہو۔‘‘

وسیم نے رک رک کر کہنا شروع کیا۔ لگتا تھا وہ لفظوں کے انتخاب میں بڑی احتیاط سے کام لے رہا ہے۔ کہیں پھر کوئی غلطی نہ ہوجائے۔

’’مانتا ہوں کہ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی مجھے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی لیکن تمہاری پریشانی دیکھ کر میں خود پریشان ہوگیا، یقین جانو اگر میرے پاس تین لاکھ روپے... ہوتے تو میں ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر تمہیں دے دیتا لیکن میری ملازمت کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ میرے اکاؤنٹ میں چند ہزار روپے ہوں گے میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ تمہارا مکان نیلام ہوجائے اور تم لوگ در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہوجاؤ۔ جب تم نے اس کی عمر اور صحت کے بارے میں بتایا تو میں سمجھ گیا کہ وہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہے گا اسی لیے میں نے دل پر جبر کر کے یہ مشورہ دیا کہ قرض سے نجات اور اپنا مکان بچانے کے لیے تم اس سے وقتی طور پر شادی کر لو اور وہ اگر پانچ چھ مہینے میں نہ مرا تو تم اس سے خلع لے لینا۔ میں نے تو یہاں تک سوچ لیا تھا کہ اگر تم کنواری نہ رہیں تب بھی میں تم سے شادی کر لوں گا۔ میں نے نیک نیتی سے مشورہ دیا تھا لیکن تم چراغ پا ہوگئی اور یہ سمجھی کہ شاید میں تم سے جان چھڑانا چاہ رہا ہوں۔ اگر ایسی بات ہوتی تو میں کبھی اپنی صفائی پیش کرنے نہ آتا۔‘‘ ’’مجھے تم بہت عزیز ہو لیکن مسئلہ بھی بڑا تھا۔ میں کسی بھی طور پر تمہارا مسئلہ حل نہیں کر سکتا تھا اسی لیے میں نے وہ واہیات مشورہ دیا تھا۔

راشدہ کچھ دیر خاموش رہی پھر آہستہ سے بولی۔ ’’میں جانتی ہوں کہ تم ایک سچے اور ایک ایماندار شخص ہو اور اس وضاحت کے بعد مجھے یقین ہوگیا ہے کہ تم نے نیک نیتی سے ہی مشورہ دیا تھا لیکن کم از کم اتنا تو سوچ لیتے کہ یہ بات سن کر میرے دل پر کیا گزرے گی۔ میں کوئی گائے بھینس تو نہیں کہ جس کھونٹے سے چاہو باندھ دو۔ بہرحال میں نے تمہاری بات سن لی اب کیا چاہتے ہو؟‘‘

’’تمہارا ساتھ زندگی بھر کے لیے۔‘‘

’’ایک شرط پر۔‘‘ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

’’وہ کیا؟‘‘

’’وعدہ کرو کہ آیندہ ایسا احمقانہ مشورہ نہیں دو گے۔‘‘ وہ کان پکڑتے ہوئے بولا۔

’’میری توبہ احمقانہ تو کیا عقل مندانہ مشورہ بھی نہیں دوں گا۔‘‘ راشدہ کو یوں لگا کہ جیسے ہاتھ سے پھسلتے ہوئے ہیرے کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہے۔

وعدہ

محترم مدیر

السلام علیکم

میں ایک بار پھر ایک دلچسپ روداد کو کہانی کی شکل دے کر حاضر ہوں، یہ صرف ایک سچ بیانی نہیں ایک سبق سے بھری روداد ہے۔ قارئین بھی اسے پڑھتے ہوئے چونک اٹھیں گے۔

محمد فاروق انجم

(فیصل آباد)

ڈاکٹر ثاقب نے کلائی میں قیمتی گھڑی ڈالنے کے بعد اپنی بیوی ریحانہ کی طرف دیکھا جو بیڈ پر بیٹھی ڈاکٹر ثاقب کی طرف دیکھے جارہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی مصور کے سامنے براجمان ہو اور مصور اس کو دیکھتے ہوئے اس کی تصویر بنا رہا ہو۔

ریحانہ کی عمر بیالیس سال تھی وہ ڈاکٹر ثاقب سے عمر میں پانچ سال چھوٹی تھی۔ دونوں میاں بیوی اپنی صحت سے اتنی عمر کے نہیں لگتے تھے لیکن ریحانہ چھ ماہ قبل سیڑھیوں سے گر گئی تھی

جس کی وجہ سے اس کی کمر کی ہڈی کو اتنا نقصان پہنچا تھا کہ وہ اب طویل سفر نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی وہ کسی صحت مند عورت کی طرح چاق و چوبند چل سکتی تھی۔

ڈاکٹر ثاقب اور ریحانہ کی شادی کو بائیس سال ہو گئے تھے اور وہ بے اولاد تھے۔ ڈاکٹر ہونے کے ناطے ڈاکٹر ثاقب نے اپنا اور اپنی بیوی کا میڈیکل چیک اپ بھی کرایا تھا۔۔۔ سب کچھ ٹھیک ہونے کے باوجود قدرت نے ان کو اولاد سے محروم رکھا ہوا تھا۔

ریحانہ کی شدید خواہش تھی کہ اس کے آنگن میں بھی پھول کھلتے اور وہ بھی ان کے درمیان رہ کر زندگی کو اور بھی حسین محسوس کرتی۔ ڈاکٹر ثاقب کے دل میں اولاد کی کتنی خواہش تھی اس کا اس نے کبھی ریحانہ کے سامنے اظہار نہیں کیا تھا۔

دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور ایک دوسرے کا بہت خیال بھی رکھتے تھے۔ ریحانہ کے دل میں اولاد کی کسک تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ اولاد کی خواہش اس کے دل میں اور بھی مضبوط ہوتی جارہی تھی۔

ڈاکٹر ثاقب نے کلائی پر گھڑی باندھنے کے بعد اپنی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ ریحانہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ کیا دیکھ رہی ہو؟"

"آپ کو دیکھ رہی ہوں۔" ریحانہ نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا مگر نگاہیں ڈاکٹر ثاقب کے چہرے پر مرکوز رہیں۔

ڈاکٹر ثاقب اس کے قریب جا کر بولا۔ "پہلی بار دیکھ رہی ہو؟"

ریحانہ نے کہا۔ "میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ ابھی بھی جوان ہیں اور کسی جوان کی طرح فٹ بھی ہیں۔"

"جوان اور فٹ تو تم بھی ہو۔" ڈاکٹر ثاقب نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں بات کی۔

"میں اب پہلے جیسی نہیں رہی لیکن تم اسی طرح ہو جس طرح بائیس سال پہلے تھے۔ ایک مشورہ دوں؟" ریحانہ کا لہجہ متانت میں ڈوب گیا۔

ریحانہ کے چہرے پر ایسی متانت دیکھ کر ڈاکٹر ثاقب بھی چونکا کہ ایسا سنجیدہ مشورہ کیا ہے۔

"کیا مشورہ دینا چاہتی ہو؟" ڈاکٹر ثاقب نے پوچھا۔

ریحانہ نے بلا تامل کہا۔ "تم دوسری شادی کرلو۔"

ریحانہ کی بات سن کر ڈاکٹر ثاقب پہلے چونکا اور پھر مسکرایا۔ "مجھے دوسری شادی کا مشورہ اس لیے دے رہی ہو کہ میں جوان ہوں اور بائیس سال پہلے والا ثاقب نظر آتا ہوں؟" ڈاکٹر ثاقب کہہ کر ہنسا۔

"ثاقب...... میں سنجیدہ ہوں۔" ریحانہ بولی تو ڈاکٹر ثاقب نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔

"کیوں شادی کروں میں؟" ڈاکٹر ثاقب نے وجہ پوچھی۔

"اولاد کے لیے...... تم دوسری شادی اولاد کے لیے کرلو۔ اس گھر میں بھی خوشیاں کھیلیں...... رونق لگے اور وہ اداسی جو بائیس سالوں سے ہمارا پیچھا کر رہی ہے وہ اس گھر کی دہلیز سے چلی جائے۔" ریحانہ نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"میں دوسری شادی نہیں کروں گا اور آئندہ تم ایسی باتیں مت سوچا کرو۔" ڈاکٹر ثاقب نے ریحانہ کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے کر محبت بھرے لہجے میں کہا۔ "میرے نصیب میں اولاد ہوتی تو تم سے ہو جاتی میں قدرت کے فیصلے پر خوش ہوں۔ جو خدا کی رضا ہے، اسی میں ہماری بہتری ہے۔"

"ثاقب میں پوری ذمہ داری اور سنجیدگی سے بات کر رہی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ ہماری اولاد ہو۔ مجھ سے نہیں تو تمہاری دوسری بیوی سے اولاد ہو جائے تو مجھے ایسا ہی لگے گا کہ وہ میری سگی اولاد ہے۔"

"ریحانہ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ یہ کیا باتیں کر رہی ہو۔ تم تھوڑی دیر باہر دھوپ میں بیٹھ جاؤ مجھے کلینک سے دیر ہو رہی ہے، میں جا رہا ہوں۔" ڈاکٹر ثاقب کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا تو عقب سے ریحانہ کی آواز آئی۔

"میری بات پر غور کرنا ثاقب۔"

ڈاکٹر ثاقب نے رک کر ریحانہ کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ "ٹھیک ہے، مجھے سوچنے کے لیے تھوڑا وقت دو، تھوڑا وقت مطلب بیس، بائیس سال...... پھر میں کوئی نہ کوئی فیصلہ کر لوں گا۔" ڈاکٹر ثاقب ہنسا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر ثاقب کے جانے کے بعد بھی ریحانہ اسی بارے میں سوچتی رہی۔ یہ خیال اس کے دل میں کئی دنوں سے سر اٹھا رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ ثاقب سے بات کر کے وہ اسے دوسری شادی کے لیے رضا مند کر سکے تاکہ اس آنگن میں اولاد کی خوشیاں جنم لیں۔ اس نے بات تو کر لی تھی لیکن ڈاکٹر ثاقب کے رویے سے نہیں لگتا تھا کہ اس نے اس کی بات کو سنجیدگی سے سنا ہے، لیکن ریحانہ فیصلہ کر چکی تھی وہ ثاقب کی دوسری شادی ضرور کرائے گی۔ اسے سوکن برداشت تھی کیونکہ

اولاد کی کمی اسے شدت سے محسوس ہونے لگی تھی، اور وہ کمی ہر چیز پر غالب آ چکی تھی۔

☆......☆

ڈاکٹر ثاقب صبح دس بجے سے دوپہر دو بجے تک کلینک میں ہوتا تھا۔ اس کے بعد وہ گھر آ جاتا، دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد وہ آرام کرتا اور شام چھ بجے سے لے کر رات دس بجے تک دوبارہ کلینک چلا جاتا تھا۔

ڈاکٹر ثاقب کی مصروفیت اسے ایسی باتوں اور اولاد کی محرومی کی سوچوں سے دور رکھتی تھی۔ ریحانہ بڑے سے گھر میں اکیلی ہوتی تھی۔ جب سے اس کی کمر میں چوٹ لگی تھی، اس کا گھر سے جانا بہت کم ہو گیا تھا۔ وہ گھر میں اکیلی ہوتی تھی اس لیے ایسی سوچیں اسے ہر وقت اپنے حصار میں رکھتی تھیں۔

سہ پہر کی چائے کے بعد ایک بار پھر ریحانہ نے اسی موضوع کو چھیڑ لیا۔ ”کیا سوچا ہے آپ نے؟“

”صبح جاتے ہوئے سوچنے کے لیے وقت مانگا تو ہے۔ اب مجھے سوچنے دو۔“ ثاقب پھر مسکرایا۔

”ثاقب میں سنجیدہ ہوں۔“

”لیکن میں بالکل بھی سنجیدہ نہیں ہوں۔ پلیز تم اب اس موضوع پر کوئی بات نہ کرنا۔ تمہارا دل لگانے کے لیے میں نے ایک بات سوچی ہے۔“ ثاقب نے کہا۔

”میرا دل لگانے کے لیے آپ نے کیا سوچ لیا ہے؟“ ریحانہ نے پوچھا۔

”آج کل فیشن کا دور ہے۔ تم ایک بڑا سا بوتیک کھول لو۔ بزنس بھی کرو گی اور تمہیں ایک مصروفیت بھی مل جائے گی پھر تمہارے دماغ میں ایسی فضول باتیں آنا بھی بند ہو جائیں گی۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ میں نے جو بات کی ہے وہ فضول ہے؟“ ریحانہ نے اس کی طرف دیکھا۔

”میں اس بحث میں نہیں جانا چاہتا۔ تم اس بارے میں سوچو جو ابھی میں نے کہی ہے۔“ ثاقب بولا۔

”بزنس کرنا میرا کام نہیں ہے۔“

”تمہارے پاس بزنس کی ڈگری ہے۔ تم بزنس کر سکتی ہو۔“ ثاقب نے زور دیا۔

”جب سے کمر میں چوٹ لگی ہے تب سے جسم میں وہ توانائی نہیں رہی۔ میرا دل اب یہ چاہتا ہے کہ اس گھر کی اداسی ختم ہو جائے۔“ ریحانہ نے دائیں بائیں خالی نظروں سے دیکھا۔

”تم میری تجویز کے بارے میں سوچ لو۔“ ثاقب اپنا کوٹ اُٹھا کر پہنا اور پھر بولا۔ ”آج رات کا کھانا ہم باہر کھائیں گے اس لیے کھانا مت کھانا۔“

”اوکے۔ میں انتظار کروں گی۔“ ریحانہ نے مسکرا کر کہا۔ ڈاکٹر ثاقب اس پر ایک دلکش مسکراہٹ نچھاور کر کے چلا گیا۔

☆......☆

کلینک میں مصروف رہنے کے بعد جب ڈاکٹر ثاقب کے جانے کا وقت ہوا اور وہ اپنا سامان سمیٹ کر اپنے بیگ میں رکھ رہا تھا کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک پچاس سال سے زائد عمر کا شخص نمودار ہوا اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”ڈاکٹر صاحب ایمرجنسی ہے۔ میری بہن کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی ہے اور وہ بے ہوش ہو گئی ہے۔“

”مریضہ کو اندر لے آئیں۔“ ڈاکٹر صاحب نے جلدی سے کہا۔

”میں مریضہ کو لے کر نہیں آیا۔ اسے لانا میرے لیے مشکل ہے۔ میرا گھر کلینک سے کچھ ہی فاصلے پر ہے براہ مہربانی اسے میرے ساتھ چل کر دیکھ لیں۔“ وہ شخص اسی لہجے میں بولا۔

”میں کسی کے گھر جا کر مریض چیک نہیں کرتا۔“ ڈاکٹر ثاقب نے کہا۔

”میں آپ کو منہ مانگی فیس دے دوں گا۔ پلیز ڈاکٹر صاحب میرے ساتھ چلیں، میرے گھر کے نزدیک ترین صرف آپ کا کلینک ہے۔“ اس شخص کے لہجے میں التجا تھی۔

”بات فیس کی نہیں ہے۔“ ڈاکٹر ثاقب کہتے ہوئے رک گیا اور اس نے اپنا وہ بیگ جس میں ایمرجنسی کے لیے کچھ دوائیاں ہر وقت موجود رہتی تھیں، اسے اُٹھایا اور بولا۔ ”چلیں......“

ڈاکٹر ثاقب اس آدمی کے پیچھے باہر نکل گیا۔ جاتے ہوئے ڈاکٹر ثاقب نے اپنے ملازم سے کہہ دیا کہ وہ کلینک بند کر دے وہ مریضہ کو دیکھ کر اسی جگہ سے گھر چلا جائے گا۔ کلینک سے گھر دور نہیں تھا لیکن پھر بھی ڈاکٹر ثاقب اس آدمی کے ساتھ اپنی گاڑی میں گھر تک پہنچا۔

اس شخص کی بہن ایک کمرے میں بیڈ پر بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ اس شخص کی بیوی اور پندرہ سالہ بیٹی بے ہوش خاتون کے ہاتھوں کو پکڑے، اس پر اپنے ہاتھ رگڑ رہی تھیں۔

جونہی ڈاکٹر ثاقب نے اس کمرے میں قدم رکھا وہ ٹھٹھک گیا۔ اس کا دل زور سے دھڑکا اور نگاہیں ایک جگہ مرکوز ہو گئیں۔ اس کی آنکھوں میں حیرت عیاں ہو گئی اور چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔ شاید ڈاکٹر ثاقب اسی حالت میں کھڑا دیکھتا رہتا، اگر وہ شخص یہ نہ کہتا۔

”آ جائیں ڈاکٹر صاحب۔“

ڈاکٹر ثاقب آگے بڑھا۔ اس نے مریضہ کو چیک کرنا شروع کر دیا اور پوچھا۔ ”انہیں کوئی ٹینشن ہے؟“

”ایسی کوئی ٹینشن تو نہیں ہے لیکن کچھ دنوں سے بہت چپ رہنے لگی تھی اور خوراک بھی کم ہو گئی تھی۔“ مریضہ کے بھائی نے بتایا۔

ڈاکٹر ثاقب نے علاج شروع کیا اور تھوڑی دیر کے بعد مریضہ کو ہوش آ گیا۔ ڈاکٹر ثاقب نے کچھ دوائیں لکھ کر پرچہ مریضہ کے بھائی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ دوائیں استعمال کرائیں اور مجھے کل پھر چیک اپ کے لیے بلا لیں۔ ان کی خوراک پر توجہ دیں پلیز۔“

”جی شکریہ! میں آپ کو کس وقت بلا لوں ڈاکٹر صاحب؟“ مریضہ کے بھائی نے پوچھا۔

”کل دوپہر کے وقت مجھے بلا لیں۔ ایک ڈیڑھ بجے۔“

ڈاکٹر ثاقب نے کہہ کر اپنا بیگ بند کیا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ مریضہ کا بھائی بھی تھا، جس کا نام عباس تھا۔

”ڈاکٹر صاحب آپ کی فیس؟“ عباس نے پوچھا۔

ڈاکٹر ثاقب نے چونک کر عباس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”میں آپ کو ڈبل فیس کا کہہ کر لایا تھا۔“

”میں گھر جاتا نہیں ہوں اور اب اگر آیا ہوں تو فیس نہیں لوں گا۔“ ڈاکٹر ثاقب کا لہجہ کھویا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے خیالات اس کے قابو میں نہیں ہیں۔

”شکریہ ڈاکٹر صاحب۔“ عباس ممنون لہجے میں بولا۔

ڈاکٹر ثاقب اپنی کار تک آیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ ڈاکٹر ثاقب ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان اپنی سوچوں میں ایسے مستغرق تھا گویا وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا ہو اور اس کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا ہو اور اب ثاقب کو یہ سمجھ میں نہ آ رہی ہو کہ اسے گاڑی کو اسٹارٹ کیسے کرنا ہے؟

تھوڑی دیر تک اسی طرح بیٹھا رہنے کے بعد اس نے کار اسٹارٹ کی اور اس جگہ سے چلا گیا۔

ثاقب کے گھر سے پہلے ایک بڑا سا پارک آتا تھا۔ وہ اس علاقے کا سب سے بڑا پارک تھا جہاں مرد و خواتین اور بچوں کا رش رہتا تھا۔ اس پارک کے پاس ثاقب نے اپنی کار کھڑی کر لی۔ اس کی سوچیں کہیں اور تھیں اور اس کا جسم اس کی کار کے اندر تھا۔

جس مریضہ کو ثاقب دیکھ کر آ رہا تھا اس کا نام نجمہ تھا۔ نجمہ کا باپ لال دین ایک زمیندار آدمی تھا جو مزاج کا سخت اور غصے کا بھی تیز تھا۔ وہ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھا لیکن اس نے اپنی ساری اولاد کو پڑھایا تھا۔ اس کی ساری اولاد اپنے باپ کے آگے زبان کھولنا تو دور کی بات، آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی بھی جرأت نہیں کرتی تھی۔ لال دین کو سب پر حکم چلانے کی عادت تھی۔ وہ مہینے میں بیس دن گاؤں اپنی زمینوں پر اور دس دن شہر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اگر بچوں کو پڑھانے کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ کبھی شہر میں رہائش نہ رکھتا۔

جب تک لال دین گاؤں میں رہتا تھا، اس کے گھر کا ماحول خوشگوار ہوتا تھا اور جونہی اس کے قدم اس گھر میں پڑتے تھے وہی گھر جہاں قہقہے گونجتے تھے، وہاں افسردگی کا راج ہو جاتا تھا۔ اتنے افراد کے ہوتے ہوئے بھی گھر سنسان ہو جاتا تھا، اگر کسی کی گونج سنائی دیتی تھی تو وہ لال دین کی آواز کی گونج ہوتی تھی جو کسی بھی اپنے ناپسندیدہ کام پر بادلوں کی طرح گرجتا تھا اور اس کا غصہ اپنی بیوی اور بچوں پر موسلا دھار بارش کی طرف برستا تھا۔

لال دین کے غصے اور بے جا اعتراضات کی وجہ سے اس کی بیوی اور اولاد گن گن کر دس دن نکالتے تھے۔ نجمہ اس کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ جس جگہ نجمہ اکیڈمی جاتی تھی اسی اکیڈمی میں ثاقب کا باپ بھی کالج کے بعد پڑھاتا تھا اور ثاقب بھی وہاں پڑھنے کے لیے آتا تھا۔

اسی اکیڈمی میں ثاقب اور نجمہ نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا اور اسی اکیڈمی میں پہلی بار ثاقب نے ہمت کر کے نجمہ سے کہا تھا۔ ”آپ چائے پیتی ہیں؟“

”اگر چائے اچھی بنی ہو تو پی لیتی ہوں۔“ نجمہ نے جواب دیا تھا۔

”میں ایک جگہ جانتا ہوں جہاں اچھی چائے بنتی ہے۔“ ثاقب نے جلدی سے کہا تھا۔

”مجھے وہ جگہ بتا دیں، وقت ملا تو میں وہاں جا کر چائے ضرور پیوں گی۔“ نجمہ بولی تھی۔

”آپ اکیلی جائیں گی اس جگہ؟“

”میری دوست بھی ہوں گی۔“

’’بہت سارے دوستوں میں ایک دوسرے سے گپ شپ لگاتے ہوئے چائے پینے کا مزہ کیا آئے گا؟ بلکہ باتوں میں چائے کا ذائقہ ہی پتا نہیں چلے گا۔‘‘ ثاقب نے کچھ بات آگے بڑھائی تھی۔

’’مجھے چائے پینے کا ایسا بھی شوق نہیں ہے، اس لیے میرا وہاں جانا اتنا بھی ضروری نہیں ہے۔‘‘ نجمہ نے کندھے اچکائے۔

’’ایک بار چائے پی لیں آپ کو اچھی لگے گی، بس آپ چائے پینے میرے ساتھ چلیں۔‘‘ ثاقب نے ہمت کر کے پیشکش کر ہی دی۔

اس کی بات سن کر نجمہ نے پہلے تو ثاقب کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا دی تھی۔ اس مسکراہٹ نے پل کا کام کیا اور دونوں ایک دوسرے کے قریب آگئے اور جونہی ان کو موقع ملا وہ چائے پینے اس ہوٹل میں چلے گئے جو اکیڈمی سے کچھ ہی دور تھا۔

اس چائے نے ان کو اور بھی قریب کر دیا اور وہ ایک دوسرے کے خیالوں میں رہنے لگے۔ پھر ان کی ملاقاتیں ہونے لگیں اور اکیڈمی میں وہ ایک دوسرے سے آنکھوں اور مسکراہٹوں میں باتیں کرتے۔

ایک دن وہ اسی ہوٹل میں چائے پی رہے تھے کہ نجمہ نے متانت سے کہا۔ ’’ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔‘‘

’’ہاں کہو کیا بات کہنا چاہتی ہو۔‘‘ ثاقب اس کی طرف متوجہ ہوا۔

’’ہم ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئے ہیں۔ زندگی ایک دوسرے کے ساتھ گزارنے کا دل ہی دل میں فیصلہ کر چکے ہیں۔ میری واپسی ممکن نہیں ہے اور تمہاری واپسی کا مجھے پتا نہیں ہے......‘‘

’’میں تمہارے بغیر زندگی گزارنے کا اب سوچ بھی نہیں سکتا۔‘‘ اس کی بات سنتے ہی ثاقب نے جلدی سے کہا۔

’’مجھے ایک چیز کا ڈر ہے۔‘‘ نجمہ کے چہرے پر متانت تھی۔

’’کس چیز کا ڈر ہے؟‘‘ ثاقب نے پوچھا۔

’’میرے ابا بہت سخت مزاج اور زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہیں۔ بعض اوقات وہ سوچنے سے بھی پہلے بول پڑتے ہیں۔ ان سے کسی بھی بات کی توقع کی جاسکتی ہے۔ مجھے ڈر لگا رہتا ہے کہ شاید وہ ہمیں ایک نہ ہونے دیں۔‘‘ نجمہ نے اپنا اندیشہ بیان کیا۔

’’میں تمہارے گھر اپنے والدین کو باعزت طریقے سے رشتہ لینے کے لیے بھیجوں گا۔ میرے والدین ہم بچوں کے ساتھ دوستوں کی طرح ہیں۔ ہم آزادی سے ان کے ساتھ بات کر سکتے ہیں۔‘‘ ثاقب نے اسے یقین دلایا۔

’’تم اپنے والدین کو میرے گھر بھیجو گے یہ اچھی بات ہے لیکن میں اپنے باپ کو بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ ان سے کسی بھی توقع کی بات کی جاسکتی ہے۔ ان سب باتوں کے اندیشے کی وجہ سے میں تم سے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں اور تم سے وعدہ کرنا چاہتی ہوں۔‘‘

’’کیسا وعدہ......؟‘‘ ثاقب نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

کچھ توقف کے بعد نجمہ بولی۔ ’’اگر ہم کسی وجہ سے مل نہ سکے اور ہمارے راستے جدا ہو گئے اور تم نے حالات کو دیکھتے ہوئے کہیں شادی کر لی اور وقت کے کسی حصے میں ہم آپس میں پھر مل گئے اور میں نے شادی نہ کی تو تم مجھ سے شادی ضرور کرو گے۔‘‘ نجمہ نے کہہ کر ثاقب کی طرف دیکھا اور ثاقب فوراً بولا۔

دنیا کے سب سے دراز اور پست قد صدر

امریکا کے صدور میں سے سب سے طویل القامت صدر کا اعزاز ابراہام لنکن کو حاصل ہے۔ ان کا قد 6 فٹ 4 انچ تھا جب کہ جیمز میڈیسن سب سے کوتاہ قامت تصور کیے جاتے ہیں۔ وہ کل 5 فٹ 4 انچ لمبے تھے۔

اقتباس: حیرت کدہ

انتخاب: ردا نور۔ فوجیوں والا

جنگ آزادی 1857ء

انگریز اسے غدار کا نام دیتے ہیں۔ یہ بڑے پیمانے پر سول نافرمانی تھی جس میں بعد میں فوج نے بھی حصہ لیا۔

لوگوں نے بہادر شاہ ظفر (آخری مغل بادشاہ) کے حق میں انگریز حکومت کے خلاف تحریک چلائی۔ نانا صاحب اور جھانسی کی رانی جنرل بخت خاں اہم لیڈر تھے مگر اس تحریک کو سختی سے کچل دیا گیا۔

’’ایسا نہیں ہوگا کہ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو نگے۔‘‘

’’تم وعدہ کرو کہ تم مجھے اپنا لو گے۔‘‘

’’میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر ہم جدا ہو گئے اور میری کہیں اور شادی ہو گئی اور ہم زندگی کے کسی موڑ میں ملے تو میں تم کو ضرور اپنا لوں گا خواہ کچھ بھی ہو جائے۔‘‘ ثاقب نے وعدہ کر لیا۔

’’اگر میں نے بھی شادی کر لی اور ہم کو زندگی نے ایک بار پھر ملا دیا تو پھر تم میری زندگی میں ماضی کے سیاہ اوراق نہیں بکھیرو گے اور ہم اپنی اپنی زندگی جئیں گے۔‘‘ نجمہ کہہ کر چپ ہوئی اور پھر بولی۔ ’’میں کتنی خود غرض ہوں لیکن میری شادی نہ ہونے کی صورت میں میں تمہاری زندگی میں لازمی آنا چاہتی ہوں اور میری خود غرضی کی وجہ یہی ہے۔‘‘

’’میں یہ بھی وعدہ کرتا ہوں اور تمہاری زندگی میری وجہ سے خراب نہیں ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے بہت محبت کرتی ہو اور اس کو تم اپنی خود غرضی کا نام دے رہی ہو۔‘‘ ثاقب نے کہا۔

نجمہ بولی۔ ’’ثاقب یہ باتیں میں نے اس لیے کی ہیں کیونکہ میں اپنے باپ کو اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ میرے دل و دماغ میں بہت سے اندیشے پل رہے ہیں۔ تم سے شادی شدہ ہونے کے باوجود اپنانے کا وعدہ اس لیے لیا ہے کہ میں تمہارے سوا کسی اور کا تصور نہیں کر سکتی۔ میں چاہوں گی کہ اگر ہم اب نہیں تو زندگی کے کسی موڑ میں ہی ایک دوسرے کے ہو جائیں کیونکہ وقت کے ساتھ بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ بہت کچھ دنیا میں نہیں رہتا۔‘‘

’’تم یہ سب باتیں نہ سوچا کرو۔ مجھے یقین ہے کہ جب میں اپنے والدین کو تمہارے گھر بھیجوں گا تو تمہارے والد صاحب انکار نہیں کریں گے، میرے والد صاحب پروفیسر ہیں۔ ان کی معاشرے میں اچھی عزت ہے، اور وہ بات کرنا جانتے ہیں۔‘‘

’’کاش سب کچھ ٹھیک ہو جائے اور میرے ابا اپنے روایتی غصے کی وجہ سے ہمیں جدائی کے اندھیروں میں نہ دھکیل دیں۔‘‘ نجمہ بولی۔

’’تم فکر نہیں کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔‘‘ ثاقب نے تسلی دی تھی۔

☆......☆

اس بات کو ایک ہفتہ گزرا تھا اور ثاقب چاہتا تھا کہ وہ اپنے والدین سے بات کرے۔ لیکن اس سے قبل وہ ہو گیا جو انہوں نے سوچا نہیں تھا۔

اس دن بھی وہ اسی ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے کہ نجمہ کا باپ لال دین اسی ہوٹل میں چائے پینے کے لیے آگیا۔ جونہی اس کی نظر نجمہ پر پڑی اس کے قدم اسی جگہ رک گئے۔ لال دین کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ شاید اسی وقت نجمہ کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا ہوٹل سے باہر لے جاتا اور ثاقب کا خون کر دیتا لیکن اس وقت اس کے ساتھ اس کے گاؤں کے کچھ لوگ تھے جو کچھ دیر قبل اس کے پاس کسی کام سے آئے تھے۔ ان کی موجودگی میں وہ اپنی عزت کا جنازہ خود اپنے ہاتھوں سے نہیں نکال سکتا تھا۔

اچانک نجمہ کی نظر بھی اپنے باپ پر پڑ گئی۔ اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے اپنے خشک ہوتے حلق سے بس اتنا کہا۔ ’’میرے ابا......‘‘

ثاقب نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا بھی نہیں تھا کہ نجمہ اسی وقت اُٹھ کر چلی گئی۔ جب ثاقب اپنی جگہ سے اُٹھا تو تب تک لال دین اپنے ساتھیوں کو یہ کہہ کر باہر لے گیا تھا کہ کسی اور جگہ چلتے ہیں......

ثاقب نے متلاشی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا اور وہ بھی ہوٹل سے چلا گیا۔

☆......☆

نجمہ نے گھر جاتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ اس نے ساری بات سچ سچ اپنی ماں کو بتا دی جسے سن کر اس کی ماں دم بخود رہ گئی اور وہ اس کی طرف ایسے دیکھنے لگی جیسے وہ اس کا آخری دیدار کر رہی ہو۔

’’مجھے لگتا ہے کہ اب اس گھر میں قیامت آجائے گی۔‘‘ اس کی ماں کے منہ سے نکلا۔

’’امی میں سب کچھ آپ کو بہت پہلے بتا دینا چاہتی تھی لیکن میرے اندر ہمت نہیں ہو رہی تھی۔‘‘ نجمہ نے رو دینے انداز میں ماں کے سامنے اپنے ہاتھ جوڑ دیے۔

’’اس بات کو چھوڑو نجمہ...... یہ سوچو کہ اب جو تیرے باپ نے دیکھا ہے اس بات کا لاوا اس گھر کو بہا کر اپنے ساتھ لے جائے گا۔‘‘ اس کی ماں بہت پریشان تھی۔

’’امی مجھے بچا لیں۔ ابا مجھے نہیں چھوڑیں گے اور ایک بات یہ بھی ہے کہ میں ثاقب کے علاوہ کسی اور سے شادی بھی نہیں کروں گی۔‘‘ نجمہ نے کہا۔

’’ثاقب سے شادی کرنے کا سوال تو تب پیدا ہوگا جب تیرا باپ تجھے زندہ چھوڑے گا۔‘‘

”میں کیا کروں امی...... میں کہاں چلی جاؤں؟“ نجمہ نے ناچاری سے ماں کی طرف دیکھا۔

”اب جو بھی ہوگا اس کا سامنا کر۔ کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس کی ماں نے نجمہ کا بازو پکڑ کر اسے ایک طرف بیٹھا دیا۔ نجمہ کا جسم خوف سے کانپ رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں بے چینی تھی۔ اس کی نگاہیں بار بار دروازے کی طرف چلی جاتی تھیں۔

نجمہ کی ماں کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ کچھ سوچنے کے بعد وہ اسے کمرے میں لے گئی اور تاکید کی۔

”اندر سے دروازہ بند کرلے۔ جب تک میں نہ کہوں دروازہ مت کھولنا۔ اگر تیرا باپ دروازہ توڑ دے تو پھر تیری قسمت ہے۔“ اس کی ماں کی آواز کانپ گئی تھی اور نجمہ کے جسم میں مزید خوف بھر گیا تھا۔

”امی تم بھی میرے ساتھ یہیں رہو۔“ نجمہ نے ماں کا بازو پکڑلیا۔

”تم بیٹھ جاؤ اور دروازہ اندر سے بند کرلو۔“ ماں نے پھر تاکید کی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ نجمہ نے دروازے کی اندر سے چٹخنی لگائی اور ایک طرف بیٹھ گئی۔ کچھ دیر تک وہ اسی طرح خوف میں مبتلا کانپتی رہی پھر اچانک اسے ثاقب کا خیال آیا اور اس نے ایک دم سے خوف کو ایک طرف دھکیل دیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اس نے چٹخنی کھول دی۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ بے خوف کہہ دے گی کہ وہ ثاقب کو پسند کرتی ہے اور اسی سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اس کے بعد جو ہوگا وہ سہہ لے گی۔

اس گھر میں مکمل سناٹا چھایا تھا بالکل ویسا جب سمندر خاموش اور چپ ہو اور وہ اپنے سینے میں کوئی بڑا طوفان لیے اپنی خاموشی کو بس توڑ دینا ہی چاہتا ہو۔

نجمہ کی ماں برآمدے میں بیٹھی تسبیح کر رہی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ہلکی سی آہٹ بھی اسے چونکا دیتی تھی اور اس کی نگاہیں دروازے کی طرف چلی جاتی تھیں۔

آخر لال دین گھر میں آگیا۔ اسے دیکھ کر نجمہ کی ماں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی متوحش نگاہیں لال دین کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ عجیب بات تھی کہ لال دین کو جس طوفانی غصے سے آنا چاہیے تھا وہ طوفان اس کے چہرے پر نظر نہیں آیا تھا۔

لال دین ایک جگہ کھڑا ہوگیا۔ وہ اپنی بیوی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے لال دین نے آج بڑی ہمت کا کام کیا ہے اور اپنے اندر اٹھے طوفان کو بمشکل قابو کیا ہوا ہے۔

”نجمہ کہاں ہے؟“ لال دین نے دھیمے مگر غصے کی آگ میں لپٹے لہجے سے پوچھا۔

”وہ کمرے میں ہے۔“ نجمہ کی ماں نے جواب دیا۔

”اس نے تجھے بتایا کہ وہ باہر کیا کرتی پھر رہی ہے؟“ لال دین نے پوچھا۔

”میرے ساتھ بات کی ہے۔“ نجمہ کی ماں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا۔

”آج زندگی میں پہلی بار میں نے اتنی ہمت کی ہے اور اپنے ان ہاتھوں کو لہو میں رنگنے سے بچایا ہے۔ اس سے پہلے میری عزت کا جنازہ نکلے نجمہ کو اس گھر کی دیواروں میں قید کرلو۔ اس کی پڑھائی اور باہر نکلنا بالکل بند۔ وہ اب دو صورتوں میں ہی اس گھر کی دیواروں سے باہر نکلے گی۔ اس کا جنازہ اٹھے گا یا پھر وہ کسی کی بیوی بن کے گھر سے باہر قدم رکھے گی۔ اسی ہفتے میں اس کا نکاح کردوں گا۔ گاؤں میں میرا دوست مجھے کہہ چکا ہے کہ میں نجمہ کو اس کی بہو بنا دوں۔ میں نے آج ہی اسے فون کرکے بتا دیا ہے کہ مجھے اس کے بیٹے کا رشتہ منظور ہے۔“ لال دین اپنا حکم سنا کر چلا گیا۔

نجمہ کی ماں اسی جگہ کھڑی سوچتی رہی کہ زندگی میں پہلی بار لال دین نے چیخ وپکار اور ہاتھ چلانے کی بجائے محض زبان چلائی تھی اور وہ بھی اس لہجے میں کہ اس دیوار سے پار آواز نہیں گئی تھی۔

ابھی نجمہ کی ماں اسی جگہ کھڑی تھی کہ لال دین پھر اپنی پھولی ہوئی سانس کے ساتھ آگیا۔ ”تم اور نجمہ اپنا سامان پیک کرو ہم ابھی اسی وقت گاؤں جا رہے ہیں۔“

لال دین کا نیا فیصلہ سن کر نجمہ کی ماں منمنائی۔ ”یہ اچانک آپ نے کیا فیصلہ کرلیا ہے؟“

”مجھ سے زیادہ سوال نہ کرو۔ یہاں اگر ہمارے پتر رہنا چاہیں تو وہ رہ لیں۔ ہم تینوں یہاں نہیں رہیں گے۔“ لال دین کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

”بچوں کو آلینے دیں پھر کوئی فیصلہ کرلیتے ہیں۔“ نجمہ نے ڈرتے ہوئے کہا۔

لال دین نے اس کی بات سن کر اسے گھورا۔ ”میں یہ بات نجمہ کے بھائیوں کے کان تک بھی نہیں جانے دینا چاہتا۔ تم ابھی سامان پیک کرو اور میرے ساتھ گاؤں چلو۔“ لال دین کہہ کر پھر وہاں سے چلا گیا۔

نجمہ دروازے کے ساتھ لگی سب سن رہی تھی۔ اس نے

فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنے باپ کے سامنے کھڑی ہو کر صاف کہہ دے گی کہ وہ ثاقب کے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کرے گی۔ لیکن لال دین کے رعب اور دبدبے کے آگے کون کھڑا ہو۔ نجمہ کی ماں اس کے پاس جاکر کھڑی ہوگئی۔ اس کے ہونٹ بند تھے اور آنکھوں میں سوال تھا کہ جیسے وہ پوچھ رہی ہو کہ اب کیا کرنا ہے؟ نجمہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس کے اندر اتنی ہمت نہیں پیدا ہو رہی تھی کہ وہ باپ کے سامنے کھڑی ہو کر بات کرسکے۔

آخر وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔ ”میں کہیں نہیں جاؤں گی...... ابھی ابا سے بات کرتی ہوں۔“

نجمہ کی بات سن کر اس کی ماں نے اس کا بازو پکڑ کر اسے کھینچ لیا۔ ”تم پاگل ہوگئی ہو، تم چاہتی ہو کہ باپ جس ضبط کے ساتھ اس چار دیواری میں موجود ہے وہ لاوے کی طرح پھٹ جائے؟ تمہارا خون ہوجائے۔ چپ چاپ ہمارے ساتھ واپس گاؤں چلی چلو۔ کچھ دن انتظار کے بعد دیکھتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔“

نجمہ چپ ہوگئی۔ وہ سوچنے لگی شاید اس کی ماں ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس کی ماں بھی اس وقت مصلحت سے کام لے رہی تھی۔ اسے شوہر بھی رکھنا تھا اور بیٹی کو بھی...... ورنہ وہ نجمہ کی چوٹی پکڑ کر اس سے پوچھتی کہ وہ گھر سے باہر پڑھنے جاتی ہے کہ کسی غیر لڑکے سے مل کر اس گھر کی شرافت کا جنازہ نکالنے جاتی ہے؟ نجمہ کی ماں کچھ نہیں بول سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ دونوں طرف آگ بھڑکی ہوئی ہے۔ اسے بجھانے کے لیے خاموشی بہترین حل تھا۔

سامان پیک ہوچکا تھا۔ نجمہ کے بھائی بھی آگئے تھے۔ لال دین نے ان سے کہا تھا۔

”میرا اس شہر میں بالکل دل نہیں لگتا اس لیے ہم تینوں واپس گاؤں جا رہے ہیں۔“

لال دین کے آگے کس کی جرأت تھی کہ وہ اس سے کوئی سوال کرسکتا. اس لیے وہ چپ رہے۔ ویسے بھی باپ کی گھر میں موجودگی سے ان کی آزادی سلب ہوجاتی تھی۔

اسی وقت گاڑی نکلی اور وہ تینوں گاؤں کی طرف روانہ ہوگئے۔ نجمہ سوچ رہی تھی کہ وہ کچھ دن حالات ٹھیک ہوجانے اور باپ کا غصہ ختم ہونے پر واپس شہر آجائے گی۔ لال دین سوچ رہا تھا کہ جیسے بھی ہو وہ نجمہ کی شادی کردے گا اور نجمہ کی ماں کے دماغ میں تھا کہ وہ نجمہ کو پیار اور امید کے بیچ معلق رکھ کر اپنے شوہر کا ساتھ دیتے ہوئے اس کی شادی گاؤں میں ہی کردے گی۔ تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔

☆......☆

ثاقب کی متلاشی نگاہیں نجمہ کو اکیڈمی اور اس ہوٹل میں تلاش کرتی تھی۔ کوئی ایسا رابطہ نہیں تھا کہ جہیں سے نجمہ کی خیریت دریافت کرسکتا۔ وہ انتظار کی سولی پر لٹکا نجمہ کی امید میں تھا۔

ثاقب نے فیصلہ کیا کہ وہ نجمہ کے گھر چلا جائے گا۔ ایک دن نجمہ نے اسے اپنے گھر کا پتا سمجھایا تھا۔ وہ تھوڑی سی کوشش سے اس کا گھر تلاش کرسکتا تھا اور اگر گھر نہ ملتا تو اسے یہ تاسف نہ رہتا کہ اس نے نجمہ کا گھر تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔

ثاقب کا ارادہ تھا کہ وہ اکیڈمی سے سیدھا نجمہ کے گھر کی تلاش کے لیے نکل جائے گا لیکن ثاقب کے ابو نے اسے اپنی گاڑی میں بیٹھایا اور بولے۔ ”تمہارے تایا ابو آئے ہیں کراچی سے۔“

تایا ابو کا سن کر ثاقب چپ ہوگیا۔ وہ ان سے مل کر بھی نجمہ کی تلاش میں نکل سکتا تھا۔ وہ گھر پہنچے تو تایا ابو اپنی پوری فیملی کے ساتھ آئے تھے، ان کے ساتھ نشست، کھانا اور پھر باتوں میں آدھی رات ہوگئی۔ ثاقب سونے کے لیے چلا گیا۔

صبح ناشتے کی میز پر ثاقب کے ابو نے انکشاف کیا۔ ”رات ہم نے تمہارا رشتہ طے کردیا ہے۔“

یہ سنتے ہی ثاقب نے چونک کر اپنے ابو کی طرف دیکھا۔

”میرا رشتہ طے کردیا ہے؟ کس سے؟“

”مجھے تم پر اتنا بھروسا ہے کہ میں نے بھائی صاحب اور بھابی جی سے رات ہی کہہ دیا تھا کہ میری ہاں پر ثاقب بالکل اعتراض نہیں کرے گا۔ وہ بہت اچھا بیٹا ہے اور ماں باپ کا مان رکھنا بھی جانتا ہے۔“ ثاقب کے ابو نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر بتایا۔ ”ہم سب نے رات فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری شادی ریحانہ سے کردیں۔“

ثاقب دم بخود سب کا چہرہ دیکھے جا رہا تھا۔ وہ سب خوش تھے اور ان سب نے فیصلہ کرلیا تھا۔ ثاقب کا رشتہ جس لڑکی سے طے ہوا تھا وہ اس کے تایا ابا کی بیٹی تھی۔ ثاقب کے لیے بولنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

ثاقب سوچتا رہا کہ وہ کیا کرے۔ کیسے انکار کرے۔ انکار کا کوئی راستہ نکلتا بھی ہے کہ نہیں...... اسی سوچ بچار میں کئی دن گزر گئے۔ اس دوران وہ نجمہ کا گھر بھی تلاش کرتا رہا۔ جب کوشش کے بعد وہ نجمہ کا گھر تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا تو اسے پتا چلا کہ وہ لوگ گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ لال دین

نے اپنے بیٹوں کو بھی گاؤں میں بلا لیا تھا۔ ثاقب کو یہ معلوم نہیں ہوسکا تھا کہ نجمہ کا تعلق کس گاؤں سے ہے، چنانچہ وہ اسے مزید تلاش نہیں کرسکا۔

☆......☆

کئی سالوں کے بعد آج ثاقب نے نجمہ کو دیکھا تھا۔ وہ پہلے سے صحت مند ہوگئی تھی لیکن اس کا حسن ماند نہیں پڑا تھا۔

ثاقب گاڑی میں بیٹھا اسی کے بارے میں سوچتا رہا اسے یہ بھی احساس نہ ہوا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے اور اس نے ریحانہ سے رات کا کھانا باہر کھانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

ثاقب نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گھر چلا گیا۔ ابھی اس نے گاڑی کھڑی کی ہی تھی کہ ریحانہ دروازے سے نمودار ہوئی۔ اس نے بہترین لباس زیب تن کیا ہوا تھا اور چہرے پر ہلکا میک اپ بھی تھا۔ ثاقب کے انتظار اور بھوک نے ریحانہ کو پریشان کردیا تھا لیکن اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ انتظار کی اذیت سے دوچار ہوئی ہی نہ ہو۔

"بہت دیر کردی آپ نے۔" ریحانہ بولی۔

ثاقب چونکا۔ "ہاں......آج ایک ایمرجنسی مریض آگیا تھا۔ اس کی وجہ سے دیر ہوگئی۔" ثاقب کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا تو ریحانہ نے پوچھا۔

"آپ چینج کریں گے؟"

"میں تھک گیا ہوں۔" ثاقب اپنے ہی خیالوں میں کمرے کی طرف چلا گیا۔ ریحانہ اداس سی ہوگئی۔ وہ اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

ریحانہ کمرے میں گئی تو ثاقب کپڑے تبدیل کرچکا تھا اور بیڈ پر کھویا سا بیٹھا تھا۔ ریحانہ نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"خیریت تو ہے۔"

"سب ٹھیک ہے۔" ثاقب کہہ کر بستر پر لیٹ گیا اور کمبل لے لیا۔ ریحانہ کچھ دیر کھڑی رہی اور پھر کمرے کی لائٹ بند کر کے کچن میں چلی گئی۔

☆......☆

ثاقب ناشتے کی میز پر بھی چپ چپ رہا اور کلینک چلا گیا۔ کلینک میں مریضوں سے زیادہ ثاقب کا دھیان گھڑی پر رہا۔ اسے کلینک کے بند ہونے اور نجمہ کے بھائی کے آنے کا انتظار تھا۔ جونہی ڈیڑھ بجا، نجمہ کا بھائی آگیا۔ اسے دیکھتے ہی ثاقب چونکا۔

"ڈاکٹر صاحب چلیں......"

"اب کیسی طبیعت ہے ان کی؟" ثاقب نے پوچھا۔

"بہت بہتر ہے۔" نجمہ کے بھائی اسرار نے بتایا۔

ثاقب اس کے ساتھ اس کے گھر چلا گیا۔ جونہی وہ اس کمرے میں داخل ہوا جہاں نجمہ بیڈ پر بیٹھی تھی، اس نے ثاقب کی طرف دیکھا اور وہ مضطرب سی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ کئی سالوں کے بعد ثاقب ایک بار پھر اس کے سامنے اس کے معالج کی صورت میں کھڑا ہے۔ نجمہ اُٹھ کر گزرے سالوں کی کہانی ایک سانس میں بیان کردینا چاہتی تھی لیکن اس وقت اس کا بھائی اور بھابی بھی اس کمرے میں موجود تھیں، اس لیے ضبط کرنا ضروری تھا۔

ثاقب نے چیک کیا اور پوچھا۔ "کوئی ٹینشن ہے؟"

"ٹینشن تھی......اب نہیں ہے۔" نجمہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب کے لیے چائے بناؤ۔" اسرار نے اپنی بیوی سے کہا اور اس کی بیوی باہر چلی گئی۔ ثاقب نے ایک انجکشن لکھ کر اسرار کو دے دیا اور کہا کہ وہ ابھی لے آئے۔ اسرار بھی چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی نجمہ بولی۔ "تم کہاں چلے گئے تھے؟"

"میں تمہاری تلاش میں تمہارے گھر تک چلا گیا تھا لیکن تم لوگ گھر چھوڑ چکے تھے اور پھر میری شادی ہوگئی۔"

"تمہاری شادی ہوگئی؟ میں نے تو ابھی تک شادی نہیں کی۔" نجمہ ایک دم سے بولی۔

"تمہارے ابا نے کیا کیا تھا تمہارے ساتھ؟" ثاقب نے پوچھا۔

"وہ مجھے گاؤں لے گئے تھے اور مجھے گھر کے اندر قید کردیا تھا۔ میرے رشتے کی بات گاؤں کے ایک لڑکے کے ساتھ چل پڑی جو ابا کے دوست کا بیٹا تھا۔ میری منگنی بھی ہوگئی اور ایک ماہ کے بعد میری شادی تھی۔ شادی سے پانچ دن پہلے میرے منگیتر کے ہاتھ سے ایک آدمی زخمی ہوگیا اور وہ جیل چلا گیا۔ دشمن داری میں بہت وقت گزر گیا اور میرے ابا دنیا سے چل بسے......پھر وہ رشتہ بھی ختم ہوگیا اور میں تمہارے انتظار میں بیٹھی رہی۔" نجمہ نے اختصار سے بتایا۔

"تم نے شادی نہیں کی؟"

"نہیں۔ صرف انتظار کیا ہے۔" نجمہ متانت سے بولی۔ "بھائی اور بھابی نہ آجائیں باقی باتیں بعد میں کریں گے۔ تم مجھے اپنا موبائل نمبر دے دو۔"

"جس پیڈ پر میں میڈیسن لکھ کر دوں گا اس پر میرا نمبر اور کلینک کا پتا لکھا ہوا ہے۔"

اسی وقت نجمہ کی بھابی چائے لے کر آگئی۔ نجمہ نے ایک گلاس پانی کا مانگ لیا۔ جونہی وہ باہر گئی نجمہ نے ثاقب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم کو اپنا وعدہ یاد ہے ثاقب؟"

ثاقب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے سب یاد ہے۔ اور اب وہ وعدہ نبھاؤں گا بھی۔"

نجمہ اس کی طرف دیکھ کر آہستہ سے مسکرا دی۔ اسرار انجکشن لے کر آگیا۔ ثاقب نے انجکشن لگایا، کچھ میڈیسن لکھی اور چائے پینے کے دوران وہ اسرار سے گپ شپ بھی کرتا رہا اور دونوں کسی نہ کسی بات پر مسکراتے بھی رہے۔ اس کے بعد وہ اجازت لے کر چلا گیا۔

ثاقب کا چہرہ کھل گیا تھا۔ ریحانہ اسے دوسری شادی کے لیے کہہ رہی تھی اور وہ انکار کررہا تھا لیکن اب اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ ریحانہ سے دوسری شادی کی رضا مندی کا اظہار کردے گا۔ اس کے لیے نجمہ کو اپنانا مشکل نہیں تھا۔ وہ اس سے کیا ہوا وعدہ آسانی سے نبھا سکتا تھا۔

ثاقب خوشی خوشی اپنے گھر چلا گیا۔

☆......☆

چائے کا آخری گھونٹ لینے کے بعد ثاقب نے ریحانہ کی طرف دیکھا جو ہلکے میک اپ میں بہت خوبصورت اور پرکشش لگ رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ بھی کھلی ہوئی تھی۔

ثاقب نے بات شروع کی۔ "تمہاری کہی ہوئی بات کے بارے میں میں نے بہت سوچا، تم ٹھیک کہتی ہو ہمارے سونے گھر میں رونق اور خوشی کی ضرورت ہے۔ ایسی خوشی جو ہمیں کوئی بچہ ہی دے سکتا ہے اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں دوسری شادی کرلوں۔"

ریحانہ اس کی طرف دیکھتی ہوئی توجہ سے اس کی بات سن رہی تھی۔ ریحانہ نے خود ہی اسے دوسری شادی کے لیے کہا تھا اور وہ اس کے لیے بضد بھی رہی تھی۔ ثاقب کے مسلسل انکار سے ریحانہ کے دل میں اولاد کی طلب اور بھی بڑھ گئی تھی لیکن اب جب ثاقب نے اس کی بات مانتے ہوئے شادی کرنے کی ہامی بھرلی تھی تو ریحانہ کے دل میں ایک عجیب سی تکلیف اُٹھی تھی۔ پھر اس کی مسکراہٹ عیاں ہوگئی، وہ اپنے سونے گھر میں اور ثاقب کے صبح شام کلینک چلے جانے سے جس تنہائی کا شکار تھی اس کی دوری بھی وہ چاہتی تھی۔

"کیا واقعی تم دوسری شادی کے لیے رضا مند ہو؟"

"ہاں......میں دوسری شادی کروں گا۔" ثاقب بولا۔

"میں صغراں کو بلاتی ہوں۔ وہ تمہارے لیے کوئی رشتہ بتائے گی۔" ریحانہ نے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا ایک مریض تھا جس سے میری اچھی جان پہچان ہوگئی ہے وہ یہی کام کرتا ہے۔ میں اس سے بات کروں گا۔" ثاقب کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے کلینک جانے کا وقت ہوگیا تھا۔

ثاقب چلا گیا تھا لیکن ریحانہ کی عجیب کیفیت ہورہی تھی۔ وہ خوش بھی تھی اور اداسی بھی چہرے سے عیاں تھی۔ ان سب باتوں کے باوجود ریحانہ اس گھر کے آنگن میں ایک بچے کی موجودگی چاہتی تھی جس سے وہ کھیل کود کرسکے اور اس کا دل لگ سکے۔ اکیلے پن میں اس گھر کی دیواریں اس کو گھورتی تھیں۔

☆......☆

کلینک کا وقت ختم ہوا تو نجمہ آگئی۔ نجمہ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور وہ ہلکے میک اپ میں بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ ثاقب نے اسے اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھا لیا۔

"جانتے ہو مجھے خوشی میں ساری رات نیند نہیں آئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے ہم دونوں کی جدائی کے بیچ جو طویل خلیج تھی وہ ایک دم ختم ہوگئی اور جیسے وہ خلیج تھی ہی نہیں۔" نجمہ نے خوش ہوتے ہوئے بتایا۔

"تم میری خوشی کا بھی اندازہ نہیں لگا سکتی۔"

"میں نے بھابی سے بات کرلی ہے۔ ماضی کے تمام اوراق ان کے سامنے کھول دیے ہیں۔ بھابی نے ساری باتیں بھائی کو بھی بتادی ہیں۔ میں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ میں ثاقب سے شادی کروں گی۔" نجمہ بولی۔

"پھر کیا جواب دیا انہوں نے؟" ثاقب نے اس کی طرف دیکھا۔

"اسرار بھائی اور بھابی تو ایک عرصے سے میری شادی کرنے کے لیے بضد تھے، لیکن میں ہی نہیں مان رہی تھی۔ دونوں نے اپنی رضا مندی کا اظہار کردیا ہے، انہیں کچھ اندیشے تھے جو انہوں نے میرے ساتھ بیان کیے ہیں میں نے ان کے تمام اندیشے دور کردیے ہیں۔"

"میں بھی اپنی بیوی سے دوسری شادی کی بات کرچکا ہوں۔" ثاقب نے بتایا۔

"واقعی......؟ کیا وہ مان گئیں؟" نجمہ نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔

"تمہارے ساتھ شادی کرنے کا مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے، میری بیوی کو بھی کوئی اعتراض نہیں......"

''وہ کیسے مان گئیں؟ ایک عورت اپنی سوکن لانے پر کیسے رضامند ہوگئیں۔'' نجمہ کو حیرت ہوئی۔

''بس تمہارے لیے اتنا جاننا ضروری ہے کہ تم کو میری دوسری بیوی کے روپ میں میری پہلی بیوی بخوشی قبول کرے گی۔ تم دونوں ایک ہی چھت تلے ہنسی خوشی رہو گی۔''

''مجھے ان باتوں کے علاوہ اور کچھ جاننا بھی نہیں ہے۔ ہم کب شادی کر رہے ہیں؟''

''اسی ہفتے تم دلہن بن کے میرے گھر آجاؤ گی۔'' ثاقب مسکرایا۔

''اب انتظار کی اذیت برداشت نہیں ہوتی، اس لیے جتنی جلدی ہوسکے تم مجھے نکاح کرکے اپنے گھر لے جاؤ۔ میں اپنی محبت امر کرنا چاہتی ہوں۔ تم اپنی پہلی بیوی کے کہنے پر مجھے زندگی کے کسی موڑ پر چھوڑ تو نہیں دو گے؟'' نجمہ اس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

''بالکل بھی نہیں چھوڑوں گا۔'' ثاقب نے مصمم لہجے میں کہا۔

''وعدہ ہے ناں؟''

''وعدہ اور پکا وعدہ...... تم بالکل فکر نہیں کرو۔'' ثاقب بولا۔

......☆☆☆☆......

ثاقب نے ریحانہ کو یہ تو نہیں بتایا کہ نجمہ کا تعلق کب سے وہ سینے میں دبائے پال رہا ہے، اس نے محض یہ بتایا کہ رشتہ کرانے والے نے نجمہ کے گھر والوں سے ملوایا اور ہم دونوں ایک دوسرے سے شادی کے لیے رضامند ہیں۔

ثاقب کی بات سننے کے بعد ریحانہ کسی سوچ میں پڑ گئی۔ ایک دم سے اس کے دل میں خیال آیا کہ کہیں وہ اپنے پیر پر خود ہی کلہاڑی تو نہیں مار رہی؟ ثاقب کی آنے والی نئی بیوی اس سے ثاقب کو دور بھی کرسکتی ہے۔ اور کل کو جب دوسری بیوی سے اولاد ہوگی تو ممکن ہے کہ وہ بچے کو اس کے پاس ہی نہ آنے دے۔ اور جب دوسری بیوی سے اولاد ہوجائے گی تو یہ بھی ممکن ہے کہ ثاقب کا رجحان اپنی دوسری بیوی اور بچے کی طرف مبذول ہوجائے اور وہ تنہائیوں کے مزید گڑھوں میں کہیں دور گم ہوجائے؟

''کیا سوچ رہی ہو؟'' ثاقب نے پوچھا۔

ریحانہ چونکی۔ ''وہ خوبصورت ہے؟''

''تم سے زیادہ خوبصورت نہیں ہے۔''

''کل کو جب تمہاری دوسری بیوی کے ہاں اولاد ہوگی تو کیا میں اس بچے کو چھو سکوں گی اور اس کے ساتھ کھیل بھی سکوں گی؟''

''میں نے ساری بات کرلی ہے۔ وہ اسی گھر میں تمہارے ساتھ رہے گی۔ ہمارا آنے والا بچہ ہم سب کا بچہ ہوگا۔ وہ پڑھی لکھی ہے۔'' ثاقب نے اسے یقین دلایا۔

کچھ توقف کے بعد ریحانہ نے متانت سے کہا۔ ''تم دوسری شادی میری اجازت اور رضامندی سے کر رہے ہو۔ ثاقب دوسری شادی کے لیے میری ایک شرط ہوگی۔ تم کو وعدہ کرنا پڑے گا کہ تم اسی شرط پر اس سے شادی کرو گے اور میرے ساتھ کیا ہوا وعدہ نبھاؤ گے۔''

''کیسی شرط...... اور کیسا وعدہ؟'' ثاقب نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

کچھ سوچنے کے بعد ریحانہ بولی۔ ''ایک سال بعد اگر تمہارے ہاں دوسری بیوی سے بھی اولاد نہ ہوئی تو تم اسے طلاق دے دو گے۔''

ریحانہ کی شرط سن کر ثاقب چونکا اور اس کی طرف دم بخود دیکھنے لگا۔ ریحانہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرے ساتھ وعدہ کرو کہ تم اولاد نہ ہونے کی صورت میں اسے ایک سال کے بعد ٹھیک اسی تاریخ کو اور اسی مہینے کو طلاق دے دو گے جس تاریخ کو تمہارا اس سے نکاح ہوگا۔''

''یہ کیسا وعدہ لے رہی ہو تم۔ اولاد دینا نہ دینا خدا کے ہاتھ میں ہے۔'' ثاقب نے کہا۔

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ میں تمہیں دوسری شادی کی اجازت اولاد کے لیے دے رہی ہوں۔ اگر دوسری بیوی سے بھی اولاد نہ ہوئی تو اس کا مطلب ہوگا کہ خدا کو منظور نہیں ہے۔ جب خدا کو منظور نہیں ہوگا تو پھر میں سوکن کا بوجھ کیوں برداشت کروں۔''

''ریحانہ اولاد پیدا کرنا انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔'' ثاقب نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''مجھے دوٹوک جواب دو۔ میرے ساتھ وعدہ کرتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ میں تم کو دوسری شادی کی اجازت نہیں دوں گی۔'' ریحانہ نے صاف الفاظ میں کہہ دیا۔

اس نئی شرط کا سن کر ثاقب دم بخود ریحانہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ کشمکش و پیچ میں مبتلا ہوگیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اگر نجمہ سے بھی اولاد نہ ہوئی تو اپنے وعدے کے مطابق اسے نجمہ کو طلاق دینی پڑے گی، اور اگر وہ اس وقت انکار کرتا ہے تو وہ نجمہ سے کبھی نہیں مل سکے گا۔ ثاقب نے

کبھی ریحانہ کو کوئی تکلیف نہیں دی تھی اور ثاقب نے کبھی ریحانہ سے کیا ہوا وعدہ بھی نہیں توڑا تھا۔ اور یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ جو بھی ریحانہ سے وعدہ کرتا، وہ اسے ہر حال میں نبھائے گا بھی۔

ثاقب نے سوچنے کے بعد کہا۔ ''میں تمہاری شرط قبول کرتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ اگر اولاد نہ ہوئی تو میں اسے طلاق دے دوں گا۔'' ثاقب کو یقین تھا کہ نجمہ ضرور ماں بنے گی۔

ثاقب کی بات سن کر ریحانہ نے اس کی طرف ایک نظر دیکھا اور اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ اور پھر بولی۔ ''تم مجھ سے کچھ چھپا تو نہیں رہے؟''

اس سوال نے ثاقب کو ایک دم سے چونکا دیا۔ ''کیا مطلب؟ میں تم سے کیا چھپاؤں گا؟''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ تم وعدہ کرکے بعد میں مکر جاؤ؟ مجھ سے کیا ہوا وعدہ ضرور نبھانا ثاقب! ورنہ میں گھر چھوڑ کے چلی جاؤں گی۔ اب تم جب چاہو اس سے نکاح کرکے گھر لے آؤ میں خود اس کا استقبال کروں گی۔''

''میں وعدہ نبھاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ اس آنگن میں ہمیں اولاد جیسی نعمت نصیب ہوگی۔'' ثاقب بولا۔

''خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔''

''میں اسی ہفتے، کسی دن اس سے نکاح کرلوں گا۔ مجھے یہ بھی اُمید ہے کہ تم دونوں دوستوں کی طرح رہو گی۔'' ثاقب نے کہا۔

''میری طرف سے کبھی تمہیں شکایت نہیں ملے گی۔'' ریحانہ بولی۔ ریحانہ کی نگاہیں مسلسل ثاقب کے چہرے پر تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ریحانہ کے دل میں کوئی بات تھی جو وہ دبا کر بیٹھی ہوئی تھی، وہ اس بات کا اظہار کرنا چاہتی تھی لیکن چپ تھی۔

☆......☆

ثاقب اور نجمہ نے نکاح کرنے میں کسی تغافل سے کام نہیں لیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس سے قبل کہ کوئی رکاوٹ ان کے درمیان میں آئے وہ ایک ہوجائیں۔ ثاقب کے انتہائی قریبی دوستوں اور نجمہ کے بھائیوں اور بھابیوں کی موجودگی میں اس کا نکاح ثاقب سے ہوگیا۔

نجمہ کے بھائیوں کو ثاقب سے شادی کرنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ سب بھائی اپنے اپنے گھروں میں آباد تھے اور وہ چاہتے تھے کہ نجمہ کی شادی ہوجائے۔

ثاقب اسے اپنے گھر لے آیا تو ریحانہ نے خود اس کا استقبال کیا۔ اس کے لیے اوپر ایک کمرا تیار کروادیا تھا۔ جب نجمہ اپنے گھر میں پہنچ گئی تو ریحانہ نے اس کا گھونگٹ اُٹھایا اور نجمہ کی خوبصورتی دیکھ کر ایک لمحے کے لیے پریشان سی ہوگئی۔ ریحانہ کو لگا جیسے نجمہ اس سے زیادہ خوبصورت ہے۔ حالانکہ ریحانہ بھی نجمہ سے کسی صورت کم نہیں تھی۔

ریحانہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ساری رات وہ ایک پل کے لیے بھی نہیں سوسکی۔ وہ مضطرب کمرے کے اندر ایک دیوار سے دوسری دیوار تک ٹہلتی رہی، کبھی بیٹھ جاتی، لیٹ جاتی۔ اس کی آنکھوں میں نہ تو نیند تھی اور نہ چین تھا۔

اطہر نفیس (1933-1980)

وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا اب اس کا حال بتائیں کیا
کوئی مہر نہیں کوئی قہر نہیں پھر سچا شعر سنائیں کیا

اس شعر کے خالق اطہر نفیس ہیں اور اسے احمد ندیم قاسمی نے اپنے ادارے ''مکتبہ فنون لاہور'' سے شائع کیا تھا۔ نیز یہی شعر کنور اطہر علی خان اطہر نفیس کے مزار کے کتبے پر بھی درج ہے۔ 22 فروری 1933 کو علی گڑھ میں پیدا ہونے والے کنور اطہر علی خان شاید اتنے مشہور نہ ہوتے جتنا انہیں اطہر نفیس نے مشہور کردیا اور اس شہرت میں اس معشوق کا بھی دخل ہے جو ان سے روٹھ گیا تھا اور انہوں نے نہ صرف اس کا حال نہیں بتایا بلکہ تمام عمر مجرد رہے اور عمر بھی تو کیا ففٹی بھی تو نہ بنا سکے۔ 47 رنز بنا کر آؤٹ ہوئے۔ جی ہاں 21 نومبر 1980 کو اردو اور فارسی میں ماسٹر کی ڈگری لینے والے امیر خسرو پر نامکمل پی ایچ ڈی کرنے والے، روزنامہ جنگ کراچی کے ''ابن عوام'' نگار صہبائی، ساقی فاروقی، رئیس فروغ، اسد محمد خان، عبیداللہ علیم، جمال پانی پتی، نسیم درانی، شمس زبیری، سلیم احمد، شمیم احمد اور قمر جمیل کے ساتھ انور جاوید ہاشمی کے اطہر بھائی کے لیے ہم اور کیا کہیں؟ جانے والوں کی یاد آتی ہے۔ جانے والے کبھی نہیں آتے۔ شاہ فیصل کالونی میں مقیم اطہر نفیس 21 اپریل 1980 کو سخی حسن قبرستان میں سپرد خاک کیے جانے والے شاعر کراچی کے والد کا نام چوہدری معصوم علی خاں تھا۔

اقتباس: خاک میں پنہاں صورتیں از سید محمد قاسم
مرسلہ: قرۃ العین۔ اقراء سٹی، کراچی

ریحانہ کو لگا جیسے وہ دنیا کی سب سے بڑی بے وقوف بیوی ہے جس نے خود اپنے شوہر کی دوسری شادی کرائی ہے۔ اپنے فیصلے اور سوچ پر اسے پچھتاوے کے انگاروں پر قدم رکھنے پڑ رہے تھے۔

☆......☆

دن کے دس بج گئے تھے۔ ثاقب بیڈ پر نیم دراز نجمہ کی طرف دیکھ رہا تھا جو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے براجمان اپنے بالوں میں برش کر رہی تھی۔

”تم کتنی خوبصورت ہو نجمہ۔“ ثاقب نے پیار بھرے لہجے میں اس کی تعریف کی۔

نجمہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ ”اب میری تعریف کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اب میں تمہاری بیوی بن چکی ہوں۔“

”قدرت نے ہمیں پھر ملا دیا۔ میں بہت خوش ہوں۔“

”ایک بات تو بتاؤ ثاقب۔“

”ہاں پوچھو کیا بات ہے؟“

”ریحانہ نے دوسری شادی کی اجازت کیسے دے دی۔“ نجمہ نے پوچھا۔

”تم میری بیوی ہو اس لیے میں کوئی بات نہیں چھپاؤں گا۔ دراصل ہماری اولاد نہیں ہے، ریحانہ مجھے مسلسل مجبور کر رہی تھی کہ میں دوسری شادی کرلوں تاکہ ہماری اولاد ہو۔ میں پہلے تو انکار کرتا رہا لیکن جب اچانک تم مجھے دوبارہ ملی تو میں نے شادی کرنے کی ہامی بھرلی اور تم سے شادی کرلی۔“ ثاقب مسکراتے ہوئے بتایا۔

ثاقب کی بات سن کر نجمہ کے چہرے پر اداسی کے بادل چھا گئے اور اس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ ثاقب نے دیکھا تو وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس کے پاس آ گیا۔

”کیا ہوا نجمہ...... تم اچانک اداس ہوگئی ہو؟“

”کاش یہ بات تم مجھ سے پہلے کرتے تو میں تم سے شادی نہ کرتی۔“ نجمہ نے اداسی بھرے لہجے میں کہا۔

”یہ بات جان کر مجھ سے تم شادی نہ کرتی؟ مگر کیوں؟“ ثاقب کو حیرت ہوئی۔

چار، پانچ سال پہلے میں اپنے بھائی کے ساتھ گاڑی میں جا رہی تھی کہ ہماری گاڑی حادثے کا شکار ہوگئی۔ مجھے بہت سی چوٹیں لگیں، میں زخمی ہوگئی، اور ایک گہرے زخم کی وجہ سے میرا آپریشن کرنا پڑا۔ معاملہ کچھ ایسا ہوگیا تھا کہ آپریشن ضروری تھا اور اس آپریشن کے بعد میں ماں نہیں بن سکتی۔“ نجمہ نے رک رک کر بتایا تو ثاقب دم بخود رہ گیا۔

نجمہ ماں نہیں بن سکتی تھی۔ جبکہ ریحانہ نے شرط رکھی تھی کہ اگر ایک سال تک نجمہ کے اولاد نہ ہوئی تو وہ اسے طلاق دے دے گا۔ نجمہ نے اپنی حقیقت بیان کر کے اس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی۔

”کیا یہ حقیقت ہے؟“ ثاقب نے پوچھا۔

”تم ڈاکٹر ہو، میرے پاس وہ تمام رپورٹس موجود ہیں اور آپریشن کرنے والے ڈاکٹر کی تیار کی ہوئی فائل بھی ہے، جب تم مجھے ملے تو اپنی خوشی اور تمہیں پانے کی چاہ میں میں یہ حقیقت بتا نہیں سکی۔ مجھے یہ سب پہلے بتا دینا چاہیے تھا۔ مجھ سے یہ غلطی ہوئی ہے۔“

”نہیں کوئی بات نہیں۔ تم ایسا مت کہو۔ بس یہ خیال رکھنا کہ تم جو چاہو ریحانہ سے بات کرو۔ جو چاہو اپنے بارے میں بتاؤ بس دو باتیں نہ بتانا۔ ایک بچہ نہ ہونے کی حقیقت اور دوسری یہ کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔“ ثاقب نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ نجمہ نے آہستہ سے کہا۔

ثاقب اپنی جگہ سے اُٹھا اور پریشانی کے عالم میں دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ نجمہ کی حقیقت نے اسے پریشان کردیا تھا۔ اس نے ریحانہ سے وعدہ کیا تھا۔ وہ وعدہ خلافی نہیں کرسکتا تھا اور اگر اس نے وعدہ خلافی کرنے کی کوشش کی تو ریحانہ اسے چھوڑ کر جا سکتی تھی۔ ریحانہ اپنے قول کی پکی تھی۔ وہ جو ایک بار کہہ دیتی تھی وہ اسے پورا کر کے چھوڑتی تھی۔

انہی خیالوں میں وہ نیچے آ گیا تو ریحانہ اسے دیکھتے ہی مسکراتی ہوئی بولی۔ ”تم اکیلے ہی آ گئے ہو، نجمہ کو ساتھ لے کر نہیں آئے۔ میں تم دونوں کا ناشتے کے لیے انتظار کر رہی ہوں۔“

ریحانہ کی بات سن کر ثاقب چونکا۔ ”ہاں میں اسے کہہ کر آیا ہوں۔ میں اسے ابھی لے کر آتا ہوں۔“

ثاقب الٹے قدم اوپر گیا اور نجمہ کو ناشتے کے لیے نیچے لے آیا۔ تینوں نے مل کر ناشتا کیا، ریحانہ نے خوب مسکرا مسکرا کر ان سے باتیں کیں اور ثاقب کے جانے کے بعد بھی وہ ڈھیروں باتیں کرتی رہیں کہ دوپہر تک وہ اچھی دوست بن چکی تھیں۔

☆......☆

کلینک سے واپسی پر جب ثاقب کمرے میں ریحانہ کے

ساتھ باتیں کر رہا تھا تو ریحانہ نے ایک ڈائری کھول کر ثاقب کے آگے رکھ دی۔ ایک صفحے پر کل کی تاریخ اور دن لکھا ہوا تھا۔

”میں نے تمہاری شادی کی تاریخ اور دن لکھ دیا ہے۔ اگر نجمہ کے بھی اولاد نہ ہوئی تو تم اسی تاریخ کو اسے طلاق دے دو گے۔“

”ریحانہ...... فرض کرو اگر اولاد نہیں ہوتی؛ اور میں اپنے وعدے کے مطابق اسے طلاق دے دیتا ہوں تو کیا یہ اس سے زیادتی نہیں ہوگی؟“ ثاقب نے کہا۔

”میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ جب میرا مقصد ہی حل نہیں ہوگا تو میں سوکن کا بوجھ کیوں اُٹھاؤں گی۔ اگر تم اپنے وعدے سے مکرنا چاہتے ہو تو مجھے ابھی بتا دو، اپنے دل کا کھوٹ ابھی نکال کر میرے سامنے رکھ دو؛ تاکہ میں ابھی کوئی فیصلہ کرلوں۔“ ریحانہ سنجیدہ تھی۔

”میں محض ایک بات کر رہا ہوں۔“ ثاقب نے کہا۔

”تم محض ایک بات نہیں کر رہے ہو۔ تمہارے دل میں نجمہ بس چکی ہے۔ اب تم کو یہ فرق نہیں پڑے گا کہ وہ ماں بنتی ہے کہ نہیں۔“ ریحانہ اس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

”اچھا چھوڑو ان باتوں کو...... ابھی شادی کو چند ہفتے ہی تو ہوئے ہیں اور ہم ایسے ہی الجھ رہے ہیں۔“ ثاقب نے بات ختم کرنی چاہی۔

”ثاقب مجھے ایک بات بتاؤ۔“ ریحانہ کے لہجے میں پہاڑ جیسی متانت تھی جسے ثاقب نے بھی محسوس کیا تھا۔

”کیا پوچھنا چاہتی ہو؟“

”جب میں نے یہ شرط رکھی تھی کہ اگر تمہاری دوسری بیوی ایک سال کے اندر ماں نہ بنی تو تم اسے طلاق دے دو گے، ایسی کیا مجبوری تھی کہ تم کو میری یہ شرط ماننی پڑی اور تم نے شادی کرلی۔ حالانکہ تم تو دوسری شادی سے مسلسل انکار کرتے رہے تھے؟“

ثاقب کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ پہلے اس نے نظریں چرائیں اور پھر بولا۔ ”تمہاری خواہش کو دیکھتے ہوئے میں یہ ماننے کے لیے بھی تیار ہوگیا تھا۔“

”کیا یہ سچ ہے؟“

”تو کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔“

ریحانہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اپنی جگہ سے اُٹھی اور اپنے لہجے کی متانت کو معدوم کر کے بولی۔

”تم دونوں کہیں گھومنے نہیں گئے۔ نجمہ بھی سارا دن گھر میں رہتی ہے۔ تم دونوں ایسا کرو کہ آج رات کا کھانا کھانے باہر چلے جاؤ۔“

”ٹھیک ہے تم دونوں تیار رہنا ہم رات کا کھانا باہر کھائیں گے۔“ ثاقب نے کہا۔

”صرف تم دونوں جاؤ گے۔“

”تم بھی چلو......“

”ابھی تم دونوں کی نئی شادی ہوئی ہے اس لیے تم دونوں ہی جانا۔ جاتے ہوئے تم نجمہ کو کہہ دینا تاکہ وہ تیار رہے۔“

”میں کہہ دیتا ہوں۔“

”وقت پر آ جانا اور اسے ساتھ لے جانا...... کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ انتظار کرتی رہے اور جب تم آؤ تو سیدھے بیڈروم میں چلے جاؤ۔“ ریحانہ نے باتوں باتوں میں اسے یاد دلا دیا کہ جب ثاقب نے اسے ڈنر باہر کرنے کا کہا تھا تو وہ بھوکی اس کا انتظار کرتی رہی تھی، ثاقب آیا تھا تو اس نے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ اس نے کھانا بھی کھایا ہے کہ نہیں اور سونے کے لیے بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔

ثاقب کو معلوم تھا کہ ریحانہ نے یہ بات کیوں کی ہے۔ وہ چپ چاپ باہر چلا گیا۔ اور ریحانہ نے معنی خیز سی مسکراہٹ اپنے چہرے پر عیاں کردی۔

☆......☆

ڈنر کے دوران ثاقب نے اپنی پریشانی کا اظہار نجمہ کے آگے کردیا کہ اگر وہ ایک سال کے اندر ماں نہ بنی تو اسے اپنے وعدے کے مطابق اسے طلاق دینی پڑے گی۔ ثاقب نے جب سے یہ سنا تھا کہ نجمہ ماں نہیں بن سکتی تو وہ دن رات اسی بارے میں سوچتا رہتا تھا کہ وہ اب کیا کرے۔ جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اس نے سب کچھ نجمہ کے آگے منکشف کردیا۔

نجمہ یہ سن کر کھانا پینا بھول گئی۔ وہ پریشان دم بخود ثاقب کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ کبھی ماں نہیں بن سکتی تھی۔ ثاقب کے وعدہ نبھانے کی صورت میں وہ اسے ایک سال کے بعد طلاق دے دے گا۔

”اب کیا کرو گے؟“

”یہی سوچ سوچ کے پاگل ہوگیا ہوں۔“ ثاقب پریشانی کے عالم میں بولا۔

”تم اپنا وعدہ نبھاؤ گے ثاقب؟“ نجمہ نے رک رک کر اپنا سوال مکمل کیا۔

ثاقب کچھ سوچنے کے بعد بولا۔ ”مجھے ہر صورت وعدہ نبھانا ہی ہوگا۔ ہم نے ایک دوسرے سے پہلی رات ہی عہد کیا

تھا کہ ہم ایک دوسرے سے کیا ہوا وعدہ ہر حال میں نبھائیں گے۔ میں ریحانہ سے بھی محبت کرتا ہوں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ آپ مجھے چھوڑ دیں گے؟“ نجمہ نے تشویش ظاہر کی۔

”میں تمہیں بھی چھوڑنا نہیں چاہتا۔ میں نے تم کو چھوڑنے کے لیے تم سے شادی نہیں کی تھی۔ اب حالات ایسے ہوگئے ہیں کہ میں مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ اگر اپنا وعدہ نہیں نبھاؤں گا تو وہ گھر چھوڑ کر چلی جائے گی۔ وعدہ نبھاتا ہوں تو پھر تم میرے پاس نہیں رہوگی۔“

”تم شوہر ہو ثاقب...... دوٹوک کہہ دینا کہ تم مجھے نہیں چھوڑ رہے، اولاد کا ہونا، نہ ہونا خدا کے اختیار میں ہے۔“

”اگر میں دوٹوک کہہ دوں تو وہ گھر سے چلی جائے گی اور جب وہ چلی جائے گی تو میں بے گھر ہو جاؤں گا۔ وہ گھر جس میں ہم رہ رہے ہیں، وہ کلینک جہاں میں کام کرتا ہوں۔ میرا بینک بیلنس ریحانہ کے نام پر ہے، کیونکہ میرا انکم ٹیکس کے ساتھ ایک مسئلہ چل رہا تھا، مجھے اپنے اکاؤنٹ بند کرنے پڑے تھے، جایداد کو ریحانہ کے نام پر منتقل کرنا پڑا تھا۔“ ثاقب کچھ توقف کے بعد پھر بولا۔ ”اگر یہ سب کچھ ریحانہ کے نام پر نہ بھی ہوتا تو بھی میں تم دونوں کو چھوڑنے کا کوئی راستہ اختیار نہیں کرتا لیکن اب میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں کیا کروں۔“ ثاقب الجھن کا شکار ہوگیا تھا۔

نجمہ چپ ہو کر سوچنے لگی۔ نجمہ نے سوچا اس نے کئی سال ثاقب کا انتظار کیا تھا، وہ اپنے انتظار کا پھل طلاق کی شکل میں لینا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ثاقب کے ساتھ اپنی آخری سانس لینا چاہتی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ریحانہ کے سامنے ثاقب کے لیے یہ انکار کرنا کہ وہ نجمہ کو نہیں چھوڑے گا۔ اتنا آسان نہیں ہے۔ کئی مشکلیں کھڑی ہو جائیں گی اور بہت سے الجھنیں بڑھ جائیں گی۔ ریحانہ کے پاس سب کچھ تھا اور نجمہ تہی دست محض اس کی بیوی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ ہم کو اس معاملے میں سوچ بچار کے بعد کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔ جس سے سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔“ نجمہ بولی۔

”میں بھی یہی چاہتا ہوں۔“

نجمہ بولی۔ ”تم نے میرے ساتھ بھی وعدہ کیا تھا کہ تم مجھے زندگی کے کسی موڑ پر نہیں چھوڑو گے۔“ نجمہ نے بھی اسے اپنا وعدہ یاد دلا دیا۔

”مجھے تمہارے ساتھ کیا ہوا وعدہ بھی یاد ہے۔“ ثاقب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

جب سے وہ ثاقب کی بیوی بن کر اس گھر میں آئی تھی پہلی بار اسے ریحانہ سے نفرت سی ہونے لگی تھی۔ وہ اسے ایک دم سے بری لگنے لگی تھی۔ ریحانہ سوکن سے زیادہ اسے اپنی دشمن دکھائی دینے لگی تھی۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے کا وقت تھا جب ثاقب اور نجمہ گھر پہنچے تھے۔ ریحانہ اپنے کمرے میں جاگ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی اپنے کمرے میں آئی تھی۔

نجمہ اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی اور ثاقب کا رخ ریحانہ کے کمرے کی طرف ہوگیا تھا۔

”جاگ رہی ہو؟“ تھوڑا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکتے ہوئے ثاقب نے پوچھا۔

”یہیں سے پوچھ کر جانے کا ارادہ ہے؟“ ریحانہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ ثاقب کمرے میں چلا گیا۔

”ایسی بات نہیں ہے۔“

”آج تم اسی کمرے میں سو جاؤ۔“ ریحانہ نے کہا۔ ثاقب تذبذب کے انداز میں بولا۔

”یہیں سو جاتا ہوں۔ میں نجمہ کو بتا آؤں۔“

”وہ سمجھ جائے گی۔ تم چینج کرلو۔“ ریحانہ نے اُٹھ کر دروازہ مقفل کر دیا۔ ثاقب نے کپڑے تبدیل کیے اور بیڈ پر بیٹھا ہی تھا کہ ریحانہ نے کہا۔

”تمہاری شادی کو آج پورے پچاس دن ہو گئے ہیں۔“

”میں نے دن گنے نہیں ہیں۔“

”میں ایک ایک دن گن رہی ہوں۔ ایک بات پوچھوں ثاقب۔“ ریحانہ نے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا بات پوچھنی ہے؟“

”تم دونوں ایک دوسرے کو کب سے جانتے تھے؟“ ریحانہ کے سوال نے ثاقب کو چونکا دیا۔

”کیا مطلب...... کب سے جانتے ہیں؟“

”سادہ سا سوال ہے۔ تم دونوں شادی سے پہلے ایک دوسرے کو کب سے جانتے تھے؟ دیکھو سچ بتانا۔ مجھ سے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ ریحانہ نے کہا۔

”یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔“

”اچھا میں سوال بدل لیتی ہوں۔ میرے ساتھ شادی سے بھی پہلے تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے ناں؟“

ریحانہ کے سوال نے ثاقب کو لاجواب سا کر دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔ وہ حیران تھا کہ

ریحانہ اس سے یہ سب کیوں پوچھ رہی ہے، اسے کسی بات کے شک نے ایسا سوال کرنے پر مجبور کیا ہے یا پھر وہ کچھ جان گئی ہے جس کا علم اسے نہیں ہو سکا۔

”تم کیا جاننا چاہتی ہو...... تمہارے دل میں کیا ہے مجھ سے کھل کر بات کرلو۔“ ثاقب نے جواب دینے کی بجائے یہ جاننا چاہا کہ ریحانہ کے دل کی زمین پر اگنے والی فصل حقیقت بھری ہے کہ وہ محض اپنے شک کی بنیاد پر اندھیرے میں تیر چھوڑ رہی ہے۔

”جس دن میں نے شرط رکھی تھی اور تم سے اولاد نہ ہونے پر طلاق دینے کا وعدہ کیا تھا اور تم مان گئے تھے میں اسی دن سمجھ گئی تھی کہ تم اسے ہر حال میں اپنانا چاہتے ہو اور تمہارا اس سے رشتہ پرانا ہے۔ آج میں سب کچھ جان گئی ہوں۔ تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے، تمہاری شادی اس کی بجائے مجھ سے کیوں ہوئی یہ میں نہیں جانتی لیکن تم اور نجمہ اجنبی نہیں تھے۔“

ریحانہ کی اس حقیقت کو سن کر ثاقب متحیر اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ ریحانہ پھر بولی۔ ”میں بات کو طول نہیں دینا چاہتی...... بہتر ہے کہ تم کل صبح اسے طلاق دے کر گھر واپس بھیج دو ورنہ میں یہ گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہوں۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ ابھی شادی کو پورے دو مہینے نہیں ہوئے ہیں اور تم کہہ رہی ہو کہ میں اسے طلاق دے دوں۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ میں ایک سال سے پہلے یہ مطالبہ کیوں کر رہی ہوں؟ اب ایک سال انتظار کرنا فضول ہے۔“ ریحانہ نے کہا۔

”ریحانہ تم ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو۔“ ثاقب نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

ریحانہ جلدی سے بولی۔ ”تم کل صبح نجمہ کو طلاق دے کر اس کے گھر بھیج دو گے ورنہ میں گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔“ ریحانہ کا لہجہ درشت تھا۔

”تم فضول ضد کر رہی ہو۔“ ثاقب نے کہا۔

”میں فضول ضد نہیں کر رہی ہوں۔ ایک سال تک انتظار کرنا فضول ہے کیونکہ نجمہ کبھی ماں نہیں بن سکتی۔“ ریحانہ کا لہجہ تیز ہو گیا تھا۔ ثاقب یہ جانتے ہی دم بخود رہ گیا۔

ریحانہ بغیر توقف کے بولی۔ ”جب وہ ماں ہی نہیں بن سکتی تو ایک سال کا انتظار کرنا غلط ہے۔ میں تم دونوں کی موجودگی میں نجمہ کے کمرے میں گئی تھی، تم دونوں کی پرانی تصویریں دیکھیں اور اس کی میڈیکل رپورٹ بھی پڑھی۔ اب میرا فیصلہ ہے کہ تم اسے کل اس کے گھر بھیج دو۔“

”ریحانہ تم سمجھنے کی کوشش کرو۔“ ثاقب نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ریحانہ کا غصہ دوچند ہو گیا۔

”ثاقب میں پھر کہہ رہی ہوں کہ وہ کبھی ماں نہیں بن سکتی اس لیے وہ اس گھر میں نہیں رہ سکتی...... میں نے جو کہہ دیا بس کہہ دیا...... یہ میرا دوٹوک فیصلہ ہے۔ کل وہ اپنے گھر جائے گی، یا پھر میں اس گھر میں نہیں رہوں گی۔“

”ریحانہ......“ ثاقب نے بولنا چاہا۔

ریحانہ نے بات کاٹتے ہوئے اُٹھ کر دروازہ کھولا اور بولی۔ ”تم اس کے کمرے میں چلے جاؤ۔ اب فیصلہ کل ہوگا...... تم اسی کے ساتھ رہو گے، یا پھر میرے ساتھ۔“

ریحانہ کا چہرہ غصے میں تپ رہا تھا۔ ثاقب نے بھی مناسب سمجھا کہ وہ کچھ کہنے کی بجائے کمرے سے چلا جائے۔ صبح تک ریحانہ کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور وہ اطمینان سے اس سے بات کرے گا۔

ثاقب کے باہر نکلتے ہی ریحانہ نے دروازہ بند کر دیا۔ ثاقب جونہی سیڑھیوں کی طرف بڑھا وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ سیڑھیوں میں نجمہ کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پانی کی بوتل تھی اور ریحانہ نے دروازہ کھول کر جو بات تیز لہجے میں کہی تھی وہ اس نے سن لی تھی۔ اور باقی کی باتیں وہ ثاقب کے منہ سے سننا چاہتی تھی۔

☆......☆

سب کچھ جاننے کے بعد نجمہ چپ اور اداس ہو گئی۔ اس نے کوئی احتجاج اور اپنا حق جتلانے کی بات نہیں کی اور محض اتنا بولی۔ ”میں کل واپس اپنے بھائی کے گھر چلی جاؤں گی...... ریحانہ کو جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”میں تم کو نہیں جانے دوں گا۔“ ثاقب تڑپ کر بولا۔

”تم روک سکو گے!؟“ نجمہ نے اس کی طرف دیکھا۔

”میں ریحانہ کو سمجھاؤں گا۔“

”اب اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ بہتر ہے کہ میں تمہاری رفاقت کے ان دنوں کی یاد کو اپنے سینے میں دبا کر چلی جاؤں۔“ نجمہ کہہ کر بیڈ کے ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔

اس رات تینوں میں سے کوئی بھی سکون سے نہیں سو سکا۔ تینوں ہی اپنی اپنی جگہ سوچوں کے کانٹوں پر لوٹتے رہے۔ ریحانہ کی طبیعت بھی خراب ہو گئی تھی۔ اس نے ایک بار بھی ثاقب کو نہیں بلایا...... وہ اب اس سے اسی صورت بات کرنا چاہتی تھی جب وہ نجمہ کو چھوڑ دیتا...... اسے اس بات پر

بھی غصہ تھا کہ ثاقب نے اس سے نجمہ کے تعلق کے بارے میں اس سے چھپایا......اس نے اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی......اپنی خراب طبیعت کے باوجود وہ کمرے میں بند رہی اور جب اس کا دل زیادہ گھبرانے لگا تو وہ اُٹھ کر لاؤنج میں چلی گئی اور اسی چہل پہل میں رات گزر گئی۔

☆......☆

ثاقب کوئی فیصلہ کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اس نے محض یہ سوچا تھا کہ وہ ریحانہ کو سمجھائے گا......ریحانہ کا غصہ بھی وہ جانتا تھا۔ وہ پھنس گیا تھا۔

ثاقب جب نیچے گیا تو اس وقت ریحانہ اپنا ہینڈ بیگ کندھے سے لٹکائے باہر جارہی تھی۔

”کہاں جارہی ہو ریحانہ؟“ ثاقب نے پوچھا۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں ڈاکٹر کے پاس جارہی ہوں۔“ ریحانہ نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔

”کیا ہوا ہے؟ ادھر آؤ میں چیک کروں۔“ ثاقب تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

”اس شہر میں تم ہی ایک ڈاکٹر نہیں ہو۔ جب تک تم نجمہ کو اس کے گھر سے نہیں بھیجو گے میں تم سے بات نہیں کروں گی۔ میرے آنے تک وہ اس گھر میں دکھائی نہ دے، ورنہ میں الٹے قدم واپس چلی جاؤں گی۔“ ریحانہ نے درشت لہجے میں کہا اور باہر نکل گئی۔ ثاقب اسی جگہ کھڑا رہا۔ اس نے جان بوجھ کر ریحانہ کو روکنے کی زیادہ ضد نہیں کی تھی کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ ریحانہ باہر نکل کر فریش ہوجائے اور اسے مزید سوچنے کا موقع مل جائے۔

☆......☆

نجمہ نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ گھر چھوڑ کے چلی جائے گی۔ وہ اپنے حق کے لیے بالکل نہیں لڑے گی۔ اس نے سوٹ کیس پیک کرلیا تھا۔ ثاقب نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اسے گھر نہیں جانے دے گا۔ اس نے کہہ تو دیا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس صورت میں ریحانہ کا شدید ردِعمل اس کے سامنے آئے گا۔

نجمہ متانت سے بولی۔ ”ہمارا ساتھ یہاں تک کا ہی تھا۔ میں نہیں چاہتی کہ جس عورت نے تمہارے ساتھ سالوں گزارے ہیں وہ اس گھر سے جائے۔ میرے لیے تمہارے ساتھ گزرے یہ چند دن ہی بہت ہیں۔ ویسے بھی میں تم کو کچھ نہیں دے سکتی۔ میں نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا ہے، وہ چاہے گا تو اس گھر میں رہنے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ کھول دے گا، اللہ نہیں چاہے گا تو میں اس گھر میں نہیں رہ سکوں گی۔ مجھے اسی پر بھروسا ہے۔“

”نجمہ تم مجھے ریحانہ سے بات کرنے دو۔“ ثاقب نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ ایک دھماکے سے کمرے کا دروازہ کھلا اور ریحانہ نمودار ہوئی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور وہ ثاقب کی طرف مسلسل دیکھے جارہی تھی۔ نجمہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور اس نے اپنے سوٹ کیس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا تھا۔

ریحانہ تیزی سے ثاقب کی طرف بڑھی اور پھولی ہوئی سانس اور خوشی سی بھرے لہجے میں بولنے لگی۔

”ثاقب......ثاقب......قدرت ہم پر مہربان ہوگئی......میں......میں ماں بننے والی ہوں۔“

خوشی میں لبریز لہجے کے ساتھ ریحانہ نے ثاقب کو بتایا اور ہاتھ میں پکڑی اپنی رپورٹ بھی اسے تھما دی۔ ثاقب نے رپورٹ دیکھی اور مسکرا کر بولا۔

”اتنی بڑی خوشخبری......تم ماں بننے والی ہو......اب اس گھر میں خوشیاں کھیلیں گی......اس گھر کی تنہائیاں ختم ہوجائیں گی۔“

”میں بہت خوش ہوں ثاقب......بہت خوش ہوں۔“ ریحانہ کہتی ہوئی ثاقب کے گلے سے لگ گئی۔ نجمہ نے اپنا سوٹ کیس اُٹھایا اور دھیرے دھیرے چلتی وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ بھیگی آنکھوں اور مردہ قدموں کے ساتھ سیڑھیاں نیچے اترنے لگی۔ اب کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ثاقب اور ریحانہ اس اچانک ملنے والی خوشی میں مگن تھے۔

اچانک نجمہ کے عقب سے ریحانہ کی آواز آئی۔ ”تم کہاں جارہی ہو نجمہ......“

نجمہ رک گئی اور گردن گھما کر اس کی طرف اوپر دیکھا۔ ریحانہ کے پیچھے ثاقب بھی کھڑا تھا۔ ریحانہ نیچے اتری اور اس کے پاس جا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”اب تم کہیں نہیں جاؤ گی......تمہارے مبارک قدم اس گھر میں پڑے تو ہمیں یہ خوشی ملی ہے۔ ہم تینوں کی یہ خوشی ہے......تم کہیں نہیں جاؤ گی......میرا خیال رکھو گی......اسی گھر میں رہو گی۔“

ریحانہ نے اسے گلے سے لگالیا۔ نجمہ زیرِ لب مسکرائی اور ثاقب کی طرف دیکھا جو خوشی سے دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نجمہ نے سوچا خدا اپنے پر بھروسا کرنے والوں کو تنہا نہیں چھوڑتا۔

ہیروئن

محترم معراج رسول
سلامِ تہنیت
میں کوئی قلم کار نہیں ہوں اور نہ زیادہ پڑھا لکھا۔ بس اردو انگریزی پڑھ لیتا ہوں۔ سرگزشت میرا پسندیدہ ڈائجسٹ ہے۔ کافی عرصے سے سوچ رہا ہوں اپنی آپ بیتی لکھ کر آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ اب اگر اس میں الفاظ کا ردّوبدل کرنا ہے تو آپ کرا لیں لیکن شائع ضرور کریں تاکہ لوگ سبق حاصل کریں۔

ناصر
(کراچی)

”ناصر......ناصر......بھئی گرین ٹی لا کر دو مجھے جلدی سے۔“ اچانک مجھے فارعہ میم کی آواز سنائی دی۔ میں باس کے روم میں صفائی کر رہا تھا۔ فارعہ میم کی آواز سنتے ہی میرے ہاتھوں میں بجلی بھر گئی اور میں تیزی سے کام نمٹا کر روم سے باہر آگیا۔

فارعہ میم ابھی ابھی آئی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح ان کا چہرہ تر و تازہ گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا۔ بال بھی کھلے ہوئے تھے۔ گہرے نیلے لباس میں ان کی گوری رنگت آنکھوں کو

خیرہ کررہی تھی۔ میں تیزی سے ان کے پاس پہنچا۔
''جی میم صاحب! مجھے بلایا تھا آپ نے؟'' میں نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔
وہ اپنا بیگ ٹٹول رہی تھیں۔ انہوں نے بال جھٹک کر گردن گھمائی اور سرسری انداز میں مجھے دیکھ کر کہا۔''ہاں مجھے گرین ٹی لادو اچھی سی مگر ذرا جلدی۔'' انہوں نے بیگ میں سے موبائل نکال کر چارجنگ پر لگاتے ہوئے کہا۔ ''آج بہت کام ہے پھر ٹائم نہیں ملے گا۔ باس کو کام دینا ہے بارہ بجے تک۔''
''بس پانچ منٹ میں لایا میم صاحب۔'' میں نے انہیں موبائل کی طرف متوجہ پاکر بھرپور نظروں سے دیکھا پھر ایک دم سنبھل کر گردوپیش کا جائزہ لیا۔ تھوڑی دور رضوان اپنی سیٹ پر بیٹھا مجھے گھور رہا تھا۔
''ہمیں بھی پوچھ لیا کر ہیرو، ہم بھی اسی آفس میں کام کرتے ہیں۔'' رضوان نے طنزاً مجھ سے کہا۔
''آپ کو چائے لاکردوں؟''
''لادے بھائی...... تیری بڑی مہربانی۔''
میں کچن میں آگیا۔ رضوان کے لیے چائے اور فارعہ میم کے لیے گرین ٹی تیار کرکے انہیں سروکی۔ اتنے میں اور بھی لوگ آفس آگئے تھے پھر میں ان کے کاموں میں مصروف ہوگیا۔
مجھے اس آفس میں کام کرتے ہوئے چار سال ہوگئے تھے۔
میرے سامنے ہی اس پروڈکشن ہاؤس نے قدم جمائے تھے۔ یہاں میں بڑا خوش تھا کیونکہ یہاں میں ان اداکار اور اداکاراؤں کو آتے جاتے دیکھتا تھا جنہیں لوگ ٹی وی ڈراموں میں دیکھا کرتے تھے۔ میں اپنے دوستوں کے سامنے رعب جمایا کرتا تھا کہ آج میں نے فلاں اداکار کو دیکھا وہ میرے آفس آیا تھا۔ اس کے ساتھ میں نے تصویر بھی لی ہے پھر میں اپنے موبائل پر انہیں تصویر دکھاتا تھا۔ میرے دوست مجھ پر رشک کیا کرتے تھے۔
کئی دوستوں نے تو مجھ سے کہا تھا کہ اگر ان کے لیے آفس میں نوکری ہو تو لگوادے۔
''ابھی تو بندے پورے ہیں، کوئی جگہ نکلی تو بتادوں گا۔ اتنی آسانی سے تو نہیں رکھ لیتے نا کسی کو۔'' میں انہیں آسرا دیتا۔
میرے دیکھتے ہی دیکھتے یہاں کتنے ہی افراد آئے اور کتنے ہی چھوڑ گئے۔ زیادہ تر اوپر والا اسٹاف لمبے عرصے کے لیے رکتا نہیں تھا۔ کسی اور جگہ سے زیادہ تنخواہ کی آفر ہوتی تو وہ چھوڑ کر جانے میں تاخیر نہیں کرتے تھے۔ نیچے والا اسٹاف تقریباً وہیں کا وہیں تھا۔ ہم جیسے لوگوں کو مواقع شاذ و نادر ہی میسر آتے تھے اور جو ہے جیسی ہے کی بنیاد پر اپنی جگہ سر جھکائے خاموشی سے نوکری کرتے رہتے تھے۔
پروڈکشن ہاؤس کا مالک ہی وہاں کا باس تھا۔ وہ خود بڑا مشہور اداکار تھا۔ اسے پہلے میں ٹی وی کے ہر چینلز پر دیکھتا تھا۔ کبھی خواب میں نہ سوچا تھا کہ اس کے پاس نوکری کروں گا۔ میرا باس بہت اچھا اور پُراخلاق انسان تھا، زیادہ تر مصروف ہی رہتا تھا۔ میں بھی اس کے ایک اشارے کا منتظر رہتا تھا۔
ان چار سالوں میں وہاں بہت سی لڑکیاں آئیں مگر میں نے کبھی ان پر کوئی توجہ نہ دی تھی۔ میں اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ البتہ وہاں موجود لوگوں کے جملے ضرور سن لیتا تھا جو وہ لوگ لڑکیوں کے بارے میں کرتے تھے۔ میں معمولی ملازم تھا۔ ایک ادنیٰ سا آفس بوائے۔ انہیں کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ سر جھکائے اپنے کام میں مصروف رہتا تھا۔ انہیں بھی مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا میری موجودگی میں بھی وہ لڑکیوں کے بارے میں بے ہودہ اور غلیظ گفتگو کرتے تھے۔ میں حیران ہوتا تھا کہ یہ کس قسم کے پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ اتنے نفیس اور مہنگے کپڑے پہنتے تھے۔ کاروں میں آتے ہیں۔ اس قدر قیمتی موبائل اور لیپ ٹاپ ہیں ان کے پاس۔ انگریزی بھی بولتے ہیں۔ کمپیوٹر پر کام کرتے ہیں۔ کوئی مہمان آتا ہے تو بڑے مہذبانہ انداز میں ملتے ہیں لیکن لڑکیوں کے بارے میں جس قسم کی باتیں کرتے ہیں وہ میں بخوبی جانتا ہوں۔''
رات کو جب اپنے علاقے میں پرانے دوستوں کے ساتھ بیٹھتا تھا تو انہیں آفس کے قصے سناتا تھا۔ وہ لوگ بھی میری باتیں سن کر حیران رہ جاتے۔
''ابے لعنت ہے ایسے پڑھے لکھے جاہلوں پر۔ ان سے اچھے تو اپن ہیں، دکھاوا تو نہیں کرتے۔ جیسے ہیں ویسے ہی رہتے ہیں۔'' میرے پرانے دوست نثار نے ایک دن کہا تھا۔
''یار ناصر تو نے کبھی سمجھایا نہیں ان لوگوں کو۔'' اکبر نے پوچھا۔
''کیا نہیں سمجھایا؟'' میں نے الٹا سوال کیا۔

''اپنے آفس والوں کو وہ جو لڑکیوں کے بارے میں گندی گندی باتیں کرتے ہیں۔''
''مرنا ہے کیا مجھے۔'' میں نے کہا۔ ''دو منٹ لگیں گے مجھے چلتا کرنے میں۔''
''کیسے نکالیں گے، تُو تو بولتا ہے کہ باس بڑا اچھا آدمی ہے۔'' نثار نے کہا۔ ''وہ تو تیری حمایت کرے گا۔''
''وہ سب ایک ہو کر بولیں گے۔ ایسے میں باس میری کہاں مانیں گے اور یار میں ایک معمولی سا چپڑاسی وہ میری بات پر یقین کریں گے یا ان سب کی۔''
میری بات پر وہ لوگ سر ہلانے لگے تھے۔
میرے دوست بھی میری ہی طرح معمولی ملازمتیں کرتے تھے۔ کوئی کسی چھوٹے موٹے آفس میں ملازم تھا تو کوئی کسی دکان پر کام کرتا تھا۔
میں جس علاقے میں رہتا تھا وہ لوئر مڈل کلاس لوگوں کا علاقہ کہلاتا تھا۔ وہاں امیر لوگ زیادہ تر وہ سمجھے جاتے تھے جو سفید پوش طبقہ تھا۔ باقی مزدور، دکاندار وغیرہ ہی رہتے تھے۔ میرا گھر بھی وہیں تھا۔ والد نے زندگی بھر محنت مزدوری کی تھی۔ بس اتنا ضرور ہوا کہ ایک بڑا سا مکان ہم لوگوں کے لیے بنالیا۔ ہم دو بھائی تھے اور ایک چھوٹی بہن زینب۔ مجھ سے بڑے بھائی عامر کی شادی ہوچکی تھی۔ ان کے دو بچے تھے۔ وہ اوپری منزل پر اپنی فیملی کے ساتھ رہتے تھے۔ نیچے میں، زینب اور اماں رہتے تھے۔ عامر بھائی کی بازار میں کریانے کی دکان تھی۔ وہ بس نارمل سا کما لیتے تھے۔ اپنی فیملی کے علاوہ اماں کے ہاتھ میں بھی تھوڑی رقم رکھ دیتے تھے۔ گھر میں تعلیم کا کوئی سسٹم تھا ہی نہیں۔ بس میں نے کسی نہ کسی طرح آٹھ جماعتیں پڑھ لی تھیں، اس کے بعد باپ دادا کے نقش قدم پر چل نکلا اور پڑھائی کے خیال کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا۔
ابا کے مرنے کے بعد جب خود عملی زندگی میں قدم رکھنا چاہا تو معلوم ہوا کمانا آسان نہ تھا جتنا میں نے سمجھا تھا۔ بغیر تعلیم کے کوئی معقول نوکری نہیں ملتی تھی۔ مجبوراً ایک دو جگہوں پر چھوٹی موٹی نوکریاں کرنی پڑیں پھر قسمت نے زور مارا تو ایک جاننے والے کی توسط سے پروڈکشن ہاؤس میں پیون کی نوکری مل گئی۔ وہ جگہ مجھے اچھی لگی۔ مجھے فلمیں، ڈرامے دیکھنے کا شروع سے ہی شوق تھا۔ لہٰذا وہاں اداکار اور اداکاروں کو دیکھتا تو بہت خوشی ہوتی تھی پھر یہ قصے میں اپنے دوستوں کو سناتا تھا۔
فارعہ میم پہلی ہی نظر میں مجھے اچھی لگی تھیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی شکل میری ایک پسندیدہ فلمی ہیروئن سے ملتی تھی۔ جب میں نے انہیں پہلی بار دیکھا تو لگا کہ میری ہیروئن میرے سامنے آگئی ہے۔ ان کی نوکری ہوگئی اور اگلے روز سے فارعہ میم نے آفس آنا شروع کردیا تھا۔ میں چور نظروں سے آتے جاتے انہیں دیکھتا رہا تھا۔ ان کی ٹیبل پر ڈراموں کے اسکرپٹ اور پتا نہیں کیا کیا رکھا تھا۔ وہ سارا دن اسے پڑھتی رہتیں۔ اس روز سے آفس کے باقی لوگ بھی فارعہ میم کے لیے آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ جب میں ان لوگوں کے پاس کسی کام سے جاتا یا چائے دینے جاتا تو ان کی بعض باتیں سن بھی لیتا۔ اس دن عامر، رضوان سے بول رہا تھا۔
''بنی بنائی سونالی لگ رہی ہے۔ اونچی پارٹی ہے بیٹا۔ موبائل دیکھا ہے اس کا۔ لاکھ سے اوپر والا ہے نیا ماڈل۔''
رضوان نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''یار ایمان سے میرا تو دل ہی آگیا ہے۔ پہلی بار آفس میں کوئی اے ون کلاس کی بندی آئی ہے۔''
''ابے مسلسل کیوں تاڑے جارہا ہے۔ اس نے دیکھ لیا تو تیری کیا عزت رہ جائے گی۔'' عامر نے اسے ٹوکا۔
میں ان سے چند قدم کے فاصلے پر عشرت صاحب کی ٹیبل صاف کررہا تھا۔
''او چل بھئی۔ ہوگئی تیری صفائی۔'' رضوان نے مجھے دیکھ کر چٹکی بجاتے ہوئے جانے کا اشارہ کیا۔ ''ساری صفائی آج ہی کرلے گا کیا۔ بہانے بہانے سے باتیں سنتا رہتا ہے۔''
میں نے اسے دیکھا اور وہاں سے ہٹ گیا۔ سچی بات ہے۔ پہلے جب یہ لوگ آفس کی لڑکیوں کے بارے میں ایسی ویسی باتیں کرتے تھے تو مجھے ان لوگوں پر حیرت اور افسوس ہوتا تھا۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ جب ان لوگوں نے فارعہ میم کے بارے میں کمنٹس پاس کیے تو مجھے اندر ہی اندر بہت غصہ آیا تھا۔ وہ کسی شریف اور پڑھے لکھے گھرانے کی لگتی تھی اور شاید اس سے بڑھ کر یہ کہ مجھے اچھی لگتی تھی۔
تھوڑے ہی دنوں میں فارعہ میم نے اپنے کام اور قابلیت سے وہاں جگہ بنالی تھی۔ میں نے باس کے علاوہ اور بھی کئی لوگوں کے منہ سے ان کی تعریفیں سنی تھیں۔ ان کی تعریفیں سن کر میں بہت خوش ہوا تھا۔ شام کے وقت آفس

ٹائم سے پہلے ہی ہڈحرام اٹھ کر چلے جاتے تھے۔ باقی کچھ افراد سر جھکائے اپنے کاموں میں مصروف ہوتے تھے۔ ان میں فارعہ میم بھی ہوتی تھیں۔ اس روز مجھے موقع مل گیا۔ وہ اس جگہ اکیلی ہی بیٹھی تھیں۔ میں آہستگی سے ان کے قریب جا پہنچا۔ فارعہ میم نے سر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ شاید انہیں میری موجودگی کا احساس نہیں ہوا تھا۔

''میم صاحب!'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

''آں...... ہاں...... ہاں...... ناصر...... بولو...... کیا ہوا۔ کوئی کام ہے؟'' میری آواز سے ان کی محویت کا شیشہ ٹوٹ گیا اور وہ فائل رکھ کر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔

''آپ...... آپ جا نہیں رہیں۔'' میں تھوڑا گڑبڑا گیا۔ ''ٹائم زیادہ ہو گیا ہے۔''

''نہیں ابھی نہیں۔ ابھی تو ایک گھنٹا مزید لگے گا۔''

''چائے وائے لاؤں آپ کے لیے؟'' میں نے پوچھا۔

''اتنے اشتیاق سے پوچھ رہے ہو تو پھر لے آؤ۔'' فارعہ میم نے مسکرا کر کہا۔

اندر ہی اندر میں جھوم کر رہ گیا۔

''میم صاحب ایک بات بتاؤں آپ کو؟''

''کیا؟''

''پتا ہے باس آپ کی بڑی تعریفیں کر رہے تھے اور بھی کئی لوگ بول رہے تھے کہ آپ بہت محنتی اور ذہین ہیں۔ میم صاحب ایمان سے مجھے بہت اچھا لگا تھا کہ سب آپ کو اچھا بول رہے تھے۔'' میں بڑی معصومیت سے بولتا ہی چلا گیا۔

تب ایک جھٹکے سے میں بولتے بولتے رک گیا۔ جب دیکھا کہ میم صاحبہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنس رہی تھیں۔ میں تھوڑا گڑبڑا گیا پھر کھسیا کر رہ گیا۔ بوکھلاہٹ میں خود بھی دانت نکالنے لگا۔

''اف...... ناصر...... مائی گاڈ......'' وہ کھلکھلا رہی تھیں۔

''آپ ہنس کیوں رہی ہیں؟''

''جس انداز میں تم نے بتایا ہے اس پر ہنس رہی ہوں۔ تم بڑے بھولے ہو ناصر...... بہت اچھے ہو تم۔'' میم صاحب نے ہنستے ہنستے کہا۔

اور میری آنکھوں کے سامنے دنیا گھوم کر رہ گئی۔

رگ و پے میں ایک سرور آمیز لہر دوڑنے لگی۔ دل چاہا کہ خوشی کے مارے زور زور سے چلاؤں۔ اس سے پہلے ہی بہت لوگ میری تعریفیں کرتے آئے ہیں لیکن فارعہ میم کے منہ سے اپنی تعریف سننے کا نشہ ہی اور تھا۔

''اب چائے نہیں لاؤ گے کیا؟'' دفعتاً فارعہ میم کی آواز نے چونکا ڈالا اور میں دوبارہ اس دنیا میں آ گیا۔

''ابھی...... ابھی لایا...... دو منٹ میں۔'' میں اڑتا ہوا وہاں سے کچن میں آ گیا۔

وہ رات میں نے جاگتے ہوئے گزاری تھی۔ کھلی آنکھوں نہ جانے کیا کیا خواب دیکھ رہا تھا۔ اپنی پسند کے بہت سے گانے گائے تھے۔ اس پر بھی چین نہ آیا تو آدھی رات کو گھر کی چھت پر ٹہلتے ہوئے میم صاحب کا چہرہ چاند میں دیکھنے لگا۔ ان کے الفاظ بار بار دماغ میں گونج رہے تھے۔

''بہت اچھے ہو تم...... بہت اچھے ہو تم۔''

یہ رس گھولتی آواز میری نس نس میں سرائیت کر گئی تھی۔

یہ سوچ سوچ کر گھبرا رہا تھا کہ اب میں میم صاحب کا سامنا کیسے کروں گا اور دل کر رہا تھا کہ جلدی سے رات گزر جائے اور میں آفس پہنچ کر میم صاحب کا دیدار کر سکوں۔ ایسا میں نے کئی فلموں میں دیکھا تھا جن میں میم صاحب کو اپنے ملازم سے محبت ہو جاتی ہے اور اس کی خاطر وہ زمانے کی پروا نہیں کرتی۔ آخر میں محبت جیت جاتی ہے اور وہ دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ چھت پر ٹہلتے ہوئے چاند تاروں کو تکتے ہوئے میں نے بھی اپنی اور میم صاحب کی فلم شروع سے آخر تک چشمِ تصور سے دیکھ لی تھی۔ ہیرو ہیروئن کے علاوہ اس میں ولن بھی تھا۔ آفس والے رضوان کو میں نے ولن بنایا تھا۔ اسے ولن کے روپ میں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی تھی تب اچانک مجھے نازو بھی نظر آئی۔

''اوہ...... اسے تو میں بھول ہی گیا ہوں۔'' میں نے سوچا۔

''جب سے فارعہ میم آفس میں آئی ہیں میں نے نازو کو تو بالکل بھلا ہی دیا تھا۔''

جب فارعہ میم نہیں تھیں تو میرے خوابوں اور خیالوں میں صرف اور صرف نازو کا راج تھا۔ بچپن سے ہم ساتھ پلے بڑھے تھے۔ ساتھ جوان ہوئے۔ نازو کا گھر میرے گھر کے سامنے تھا۔ میں نے کبھی اس کی طرف خاص انداز میں توجہ نہیں کی تھی مگر جب نازو نے اپنی جوانی کا احساس دلایا تو

مجھے معلوم ہوا کہ اب ہم بچے نہیں رہے تھے۔ بڑے ہو گئے ہیں پھر میں اس سے بات کرنے میں جھجکنے لگا تھا لیکن وہ بے جھجک جو کہنا ہوتا کہہ ڈالتی تھی۔

''تو مجھ سے بھاگتا کیوں ہے اب۔ میں کوئی تجھے کھا تو نہیں جاؤں گی رے۔'' نازو بولتی۔

''مجھے نہیں کرنی کوئی بات وات۔ اب ہم چھوٹے نہیں ہیں۔ بڑے ہو گئے ہیں۔ لوگ دیکھیں گے تو پتا نہیں کیا سمجھیں گے۔'' میں نظریں چراتے ہوئے بولا تھا۔

وہ ہنسی۔ ''کیا سمجھیں گے، ارے پاگل وہی سمجھیں گے جو سمجھنا چاہیے۔''

''دیکھو نازو۔ مجھے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتی ہیں۔'' میں نے اسے سمجھایا مگر میری زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ ''تو جانتی ہے مجھے اچھی طرح کیسا بندہ ہوں میں۔''

''بہت اچھی طرح جانتی ہوں اس لیے تو تو اچھا لگنے لگا ہے مجھے۔'' اس نے بے باکی سے کہا اور میرے پسینے چھوٹ گئے۔ میں وہاں سے کھسک لیا تھا۔ آہستہ آہستہ نازو بھی مجھے اچھی لگنے لگی تھی۔ وہ میرے گھر آتی جاتی رہتی تھی۔ اس پر کسی طرف سے کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ چھوٹی سی تھی جب سے میرے ہاں آتی تھی مگر پتا نہیں اماں کی جہاندیدہ نظروں نے تاڑ لیا تھا کہ اب نازو کے انداز و اطوار ہی بدلے ہوئے ہیں۔ وہ میری بہن زینب کی سہیلی بھی تھی۔ پہلے وہ زینب کے لیے آتی تھی اب جب بھی آتی تو اس کی نظریں اِدھر اُدھر بھٹک رہی ہوتی تھیں۔

ایک رات جب زینب سو گئی تو اماں نے مجھ سے پوچھ ہی لیا تھا۔ ''یہ میں کافی دنوں سے دیکھ رہی ہوں نازو کا آنا جانا کچھ زیادہ نہیں ہو گیا یہاں؟''

میں بنیان پہن رہا تھا کہ اماں کی بات سن کر بنیان ہاتھ میں پھنس گیا۔ میں نے جلدی سے سنبھالا لیا اور بنیان پہن کر انجان بنتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے کیا پتا اماں، اسی سے پوچھو۔ وہ تو پہلے بھی آتی تھی۔ اس میں کون سی نئی بات ہے۔''

''تجھے نہیں پتا بڑا بھولا ہے تو۔''

''زینب کے لیے آتی ہے۔ پوچھ لو اسے اٹھا کر۔'' میری آواز حلق میں پھنسنے لگی تھی۔ اماں کے ہونٹوں پر شریری مسکراہٹ مچل رہی تھی۔ جس کی وجہ سے اندر ہی اندر میرے چھکے چھوٹ رہے تھے کہ پھنس گیا بچو۔

''بیٹا ماں ہوں میں تیری۔ نظریں پڑھ لیتی ہوں۔

میں نے کسی جنگل میں عمر نہیں گزاری ہے۔ میرے آگے کے بچے ہو تم دونوں۔ ہاں سمجھ لے اچھی طرح اور یہ بھی سن لے کچھ کمانے دھمانے لگے گا تو تیرا بیاہ کروں گی۔ ایسے ہی کسی کی بچی کو فاقے کروانے نہیں لاؤں گی اس گھر میں۔"

"کما لوں گا اماں۔" میں نے اب بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ "میں کون سا ساری عمر چار پائی توڑتا رہوں گا۔ تو دعا کر۔ ابھی تو بس چھوٹی موٹی نوکری ہے۔ انشاء اللہ اچھی نوکری بھی لگ جائے گی ورنہ اپنا کوئی کام کروں گا۔" اس کے بعد بات گھر بھر میں پھیل گئی۔ اماں پیٹ کی ہلکی تھیں۔ زینب کو معلوم ہوا تو وہ خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ بھائی اور بھابی نے کوئی خاص ردِعمل کا مظاہرہ نہ کیا۔ وہ اپنی دنیا اور بچوں میں پھنسے ہوئے تھے۔

اماں نے جب عامر بھائی سے رائے لینی چاہی تو انہوں نے عام سے لہجے میں ہاتھ جھلا کر کہا۔ "ہاں ہاں ہمیں بھلا کیا اعتراض ہوگا۔ اگر اس کی خوشی اسی میں ہے تو کر دینا۔ دیکھی بھالی بچی ہے۔ لوگ بھی شریف ہیں۔ برسوں سے ہم جانتے ہیں ایک دوسرے کو۔"

اماں مطمئن ہو گئی تھیں۔

نازو اور میرا معاملہ بڑوں تک جا پہنچا تھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب آفس میں فارعہ میم نہیں آئی تھیں۔ ان کے آنے کے بعد میری نظروں سے نازو کی صورت دھندلانے لگی۔ مجھے اس کا پتا بھی نہیں چلا تھا۔ آہستہ آہستہ نازو کی تصویر کی جگہ فارعہ میم کے چہرے کے نقوش دل پر نقش ہونے لگے تھے۔ نازو اور فارعہ میم کا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ نازو واجبی سی شکل و صورت کی لڑکی تھی جب کہ فارعہ میم میری پسندیدہ ہیروئن جیسی تھیں۔ اجلی اجلی، چمک دار چہرے والی۔ لگتا تھا کہ کبھی کوئی غم، پریشانی، تکلیف ان کے نزدیک سے نہیں گزری ہے۔ اس دور میں پیسا تمام پریشانیوں اور مصائب کا تریاق ہے۔ فارعہ میم پیسے والی تھیں۔ کسی اونچے گھرانے کی۔ جنہیں آٹے، دال، گوشت کے بھاؤ تاؤ سے بھی کوئی سروکار نہیں ہوتا ہے۔ مہنگائی ان پر اثر انداز نہیں ہوتی ہے۔ میں فارعہ میم کا چہرہ دیکھتا تھا اور بس دیکھتا ہی رہتا تھا۔

میں آفس سے جب گھر پہنچتا تھا تو نازو ایک چکر لازماً لگاتی تھی۔ تھوڑی بہت باتیں کر لیتی تھی لیکن اب میں گھر آنے کے بعد نہا دھو کر اور کپڑے تبدیل کر کے باہر نکل جاتا تھا۔ اماں روکتی رہ جاتی تھیں کہ کھانا کھا لوں لیکن میں نہیں رکتا تھا۔ باہر آ کر اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ جاتا تھا۔

میرے پاس اچھا سا موبائل تھا۔ اکثر دوست فرمائش کرتے تھے۔

"یار وہ اپنی ہیروئن کی تصویر تو دکھا دے اتنی تعریفیں کرتا رہتا ہے۔ ہم بھی تو دیکھیں کیا پسند کی ہے تو نے۔" نثار نے ایک روز کہا۔

"ابے یار! ہمت نہیں پڑتی میری۔" میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "کیسے بولوں تصویر کا عجیب سا لگتا ہے۔"

"ابے کوئی بہانہ کر دے۔ چپکے سے بھی تصویر کھینچ سکتا ہے۔" اکبر نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"اور اگر کسی نے دیکھ لیا نا تو میری گردن کھینچ دے گا۔ نہیں یار، یہ نہیں ہوگا مجھ سے۔" میں نے صاف انکار کر دیا۔

"ابے جا لعنت ہے تیرے پے۔" نثار ہنسنے لگا۔ "ایک تصویر لینے پر تیرے غبارے سے ہوا نکل رہی ہے۔ بیٹا آگے کیسے بات بڑھائے گا رہنے دے۔ تیرے بس کی نہیں ہے۔ خواب دیکھنا چھوڑ دے اس کے۔ وہ جو ہے نا تیری پرانی والی نازو، بس وہی ہوگی تیری۔"

"خواب دیکھنے پر تو کوئی پابندی نہیں ہے نا یار۔" میں بھی ہنسنے لگا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر خواب تو اوقات کے مطابق دیکھا کر۔" اکبر نے بھرپور چوٹ کی، اس کی بات میرے دل پر لگی۔

"ابے اس میں اوقات کی کیا بات ہے، میں کون سا فقیر ہوں۔" مجھے اس کی بات پر ایک دم غصہ آ گیا تھا۔ "فضول بکواس کرتا ہے۔ آئندہ ایسی بات منہ سے نکالنے سے پہلے سوچ لینا۔"

"اچھا اچھا بس......بس......" نثار نے ہاتھ اٹھا کر کہا اور میرا ہاتھ دبایا۔ "بس ٹھنڈا ہو جا۔ اکبر تو ایسے ہی بول رہا تھا، تو خوامخواہ دل پر لے رہا ہے۔"

"چل اب یہ منہ سیدھا کر لے۔ آ تجھے چائے پلاتے ہیں اچھی سی۔" نثار نے کہا اور ہم دونوں کھڑے ہو گئے۔

جتنی بات اکبر نے کہی تھی میں نے وہاں تک سوچا بھی نہ تھا۔ بس خیالات میں فارعہ میم کا چہرہ دیکھتا تھا۔ ان کو اپنی ہیروئن دیکھتا تھا لیکن حقیقت میں ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس رات میں دیر میں گھر آیا تھا۔ طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر تھوڑا سا کھانا کھایا اور سوتا

بن گیا لیکن نیند نظروں سے کوسوں دور تھی۔ میں شاید بہت حساس تھا یا پھر بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ اکبر کا جملہ بار بار دماغ میں گونج رہا تھا۔ کبھی نظروں کے سامنے نازو کا چہرہ ابھرتا تو کبھی فارعہ میم کا۔ مجھے لگا کہ واقعی میں اوقات سے زیادہ سوچنے لگا ہوں۔ میں آفس میں ایک معمولی سا پیون ہوں اور فارعہ میم وہاں افسر ہیں۔ وہ مر کر بھی مجھے پسند نہیں کریں گی لیکن ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا۔ فلموں میں بھی تو سب کچھ ہوتے دیکھا ہے پھر میرے ساتھ کیوں نہیں ہو سکتا۔

میں لیٹے لیٹے اپنے خیالات کو رد و قبول کرتا رہا۔ اسی ادھیڑ بن میں رات گزر گئی۔ صبح نہ جانے کس وقت آنکھ لگی تھی۔ اگلی صبح آفس میں میری کوشش یہ تھی کہ فارعہ میم کے چہرے کی طرف نہ دیکھوں۔ جب انہوں نے گرین ٹی مانگی تو میں ان کی ٹیبل پر رکھ کر جانے کے لیے مڑا۔

''ناصر!'' دفعتاً فارعہ میم کی آواز نے میرے قدم جکڑ لیے۔

''جی...... جی میم صاحب۔'' میں نے پلٹ کر کہا لیکن میری نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

تب وہ ہنسنے لگیں۔ ''اوہو بھئی کیا ہو گیا۔ کیوں شرما رہے ہو مجھ سے؟''

''نن...... نہیں...... نہیں تو۔'' میں گڑبڑا گیا۔

''مم...... میں تو نہیں شرما رہا۔'' ''تو پھر یہ دولہے کی طرح نظریں جھکا کر نیچے کیا دیکھ رہے ہو۔ ناراض ہو مجھ سے؟ کوئی بات بری لگ گئی ہے کیا۔ شرمیلے میاں۔'' فارعہ میم شوخ لہجے میں بول رہی تھیں۔

''وہ...... وہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے میری۔'' میں نے بمشکل کہا۔

''پہلا بندہ دیکھا ہے جو طبیعت خراب ہونے پر شرماتا ہے۔'' فارعہ میم نے ہنستے ہوئے کہا پھر جلدی سے دوبارہ بولیں۔ ''اچھا اگر طبیعت خراب ہے تو چھٹی لے لو۔ میں بول دوں گی باس سے۔ جاؤ گھر جا کر آرام کرو۔''

''نہیں بس ٹھیک ہے بس میں ٹھیک ہوں۔''

اتنے میں رضوان کے کیبن سے اس کی آواز آئی۔ ''ہاں بھئی ہیرو۔ کیا ہو گیا ہے؟ کیا ہوا طبیعت کو کوئی الٹی سیدھی چیز تو نہیں کھالی۔''

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ رضوان، ثاقب اور عامر ایک جگہ جمع تھے۔ میں ان کے پاس سے گزرا تو ثاقب دھیرے سے بولا۔ ''بیٹا تیرے مزے ہیں۔ خوب گپیں لگا لیتا ہے۔ ہم تو بس دور دور سے نظارہ کرتے ہیں۔''

میں خاموشی سے چلا گیا۔ آفس میں اور بھی کئی لڑکیاں تھیں۔ وہ فارعہ میم سے باتیں بھی کرتی تھیں لیکن مجھے لگتا تھا کہ وہ اندر سے فارعہ میم سے جیلس ہیں۔ وجہ یہی تھی کہ فارعہ میم ان سب سے زیادہ خوب صورت تھیں۔ وہ لڑکیاں کافی بے باک قسم کے لباس پہن کر آتی تھیں۔ فارعہ میم کے کپڑے بہت سوبر اور شریفانہ ہوتے تھے۔ پھر بھی زیادہ تر مردوں کی توجہ فارعہ میم پر رہتی تھی۔ دوسری لڑکیاں اس بات کو نوٹ کرتی تھیں۔

اس سے اگلے روز کا ذکر ہے کہ فارعہ میم اس روز بہت حسین لگ رہی تھیں۔ انہوں نے خوب صورت کرتے پر جینز پہنی ہوئی تھی اور بالوں کا اسٹائل بھی بہت دیدہ زیب تھا۔ کرتے پر ڈیزائن والا اسکارف لیا ہوا تھا۔ میں اس وقت باقی لوگوں کو چائے سرو کر رہا تھا۔

فارعہ میم کو دیکھ کر رضوان نے ہونٹ سکیڑے اور ہلکی سی سیٹی بجائی۔ اس نے اپنے نزدیک بیٹھے ثاقب اور عامر کو معنی خیز انداز میں دیکھا۔

''آج تو تباہی لگ رہی ہے یار۔''

''میرا بھی ایمان ڈول رہا ہے ایمان سے۔'' عامر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سرد آہ بھری۔

میں ان کے قریب ہی صفائی کر رہا تھا۔ ویسے بھی انہیں میری پروا ہی کب ہوتی تھی۔

''ذرا شانت ہو جاؤ۔ وہ ہم جیسوں کو گھاس بھی نہیں ڈالتی۔ سالی ہماری نظروں کو سمجھتی ہے۔'' ثاقب نے دبی آواز میں کہا۔

''یار اب نظروں کو بھی کیسے روکیں۔ وہ ہے ہی ایسی......'' رضوان نے آگے بڑی گندی سی بات کہہ ڈالی۔

صفائی کرتے کرتے میرا ہاتھ رک گیا۔

''سر ایسی بات مت بولیں۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ میری آواز بھی بلند تھی۔ ''وہ کسی کی بہن بیٹی ہیں۔ آپ کی بھی بہن ہوگی۔ کوئی اس کے بارے میں ایسا بولے تو کیسا لگے گا آپ کو؟'' میں غصے میں بولتا چلا گیا۔ پتا نہیں اتنی ہمت مجھ میں کہاں سے آگئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میں اپنے آپے میں ہی نہیں ہوں۔ فارعہ میم کے بارے میں ایسے گندے ریمارکس سن کر میرا دماغ الٹ گیا تھا۔

تھوڑی دیر کو میں بھول گیا تھا کہ اس آفس میں میری کیا حیثیت ہے۔ بس مجھ سے برداشت نہیں ہوا تھا۔

وہ تینوں اپنی اپنی جگہوں پر ساکت و جامد بیٹھے رہ گئے تھے۔

رضوان تو ایسا سٹپٹا گیا تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اچانک مجھے ہوا کیا ہے۔ اس کے سان و گمان میں نہ تھا کہ ایک پیون اس سے ایسے لہجے میں بول سکتا ہے۔ وہاں موجود باقی افراد بھی اپنی نشستوں سے کھڑے ہو کر تماشا دیکھنے لگے تھے۔ فارعہ میم اور دوسری لڑکیاں بھی حیران پریشان نظر آرہی تھیں۔ اب تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اصل معاملہ ہے کیا۔ رضوان پر سے حیرت کی اونچی لہر گزر گئی تو اسے حالت کی نازکی کے ساتھ اپنی بے عزتی کا شدت سے احساس ہوا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھ گیا۔

''کیا بکواس کر رہا ہے تُو سالے دو کوڑی کے انسان۔ جاہل اوقات میں رہ کر بات کر۔ کیا بکواس کر رہا تھا تو ابھی۔ پی پلا کر تو نہیں آگیا۔ دو منٹ میں آفس سے باہر کردوں گا ابھی۔'' رضوان بھپرے ہوئے لہجے میں بولا۔

عشرت صاحب اٹھ کر ہمارے درمیان آگئے۔

''پہلے آپ نے بات کہی تھی فارعہ میم کے بارے میں۔ میں نے تو صرف اتنا بولا تھا کہ آپ کو ایسی بات نہیں کرنی چاہیے۔'' میں نے ہمت کر کے کہا۔

''بکواس مت کر جاہل انسان۔'' رضوان نے میری طرف لپکنا چاہا مگر عامر اور ثاقب نے اسے پکڑ لیا۔

''چھوڑ یار دفع کر۔'' ثاقب نے اسے سمجھایا اور میری طرف قہر آلود نظر ڈالی۔ ''اسے ہم دیکھ لیں گے۔''

''اسے میں نوکری سے نکلوا دوں گا۔'' رضوان بکھر رہا تھا۔

''بلاوجہ الزام لگا رہا ہے۔ سالے پتا نہیں کہاں کہاں سے آفسوں میں آجاتے ہیں غنڈے موالی۔''

''تم جاؤ۔ جاؤ شاباش۔'' عشرت صاحب نے مجھے نرمی سے دھکیلا۔ ''ابھی چلے جاؤ یہاں سے ورنہ معاملہ اور بگڑ جائے گا۔''

میں وہاں سے کچن کی طرف آگیا۔

معاملہ باس تک پہنچ گیا۔ مجھے ایسا لگا کہ بس اب میری ملازمت گئی لیکن پھر حیرت انگیز طور پر کچھ نہ ہوا اور سب کچھ ایسے ختم ہو گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ معاملہ رفع دفع کیسے ہوا۔ پورے آفس کو معلوم ہو

میر ضمیر اور ان کے معاصرین نے مرثیے کو ایک مستقل فن کی صورت دے کر تمام شعری محاسن اس میں جمع کر دیے۔ ان کی تخلیقی کوششوں کے بعد انیس و دبیر کا کام صرف اتنا رہ گیا کہ وہ ہیئت کی پرداخت پر توجہ دیے بغیر مضامین میں تنوع اور وسعت پیدا کریں۔ یہ حقیقت ہے کہ میر انیس اور مرزا دبیر نے مرثیے میں اتنا تنوع اور وسعت پیدا کی کہ مرثیے کو رونے رلانے کی حدود سے آگے بڑھا کر فن کی بلندیوں کا مظہر بنا دیا۔ اول الذکر نے تمام ادبی روایات کو نچوڑ کر ترقی کے تمام امکانات اپنے مرثیے میں اس طرح سمو دیے کہ اس میں تازگی، وسعت اور عظمت پیدا ہو گئی۔ اب انیس کی تخلیقات کا جواب اس وقت تک کوئی پیدا نہیں کر سکتا جب تک اردو زبان کا مزاج نہ بدل جائے۔

اقتباس: پاکستانی ادب کے معمار
از: ڈاکٹر سید محسنہ نقوی

گیا تھا کہ میرا اور رضوان کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ زیادہ تر افراد رضوان کی طرف داری ہی کر رہے تھے۔ ظاہر ہے ایک معمولی پیون کی حمایت کون کرے گا۔ میرے ساتھی آفس بوائز مجھے سمجھا رہے تھے کہ ان بڑے لوگوں کے معاملات میں ٹانگ مت اڑایا کرو۔ ایسا ویسا کچھ دیکھو تو اندھے بن جاؤ...... سنو تو بہرے۔

''وہ فارعہ میم کے لیے بڑی گندی بات کر رہا تھا۔'' اس وقت ہم لنچ کے لیے آفس کے ایک مخصوص حصے میں بیٹھے تھے۔ یہاں پیونز کے علاوہ اور کوئی نہیں آتا تھا۔ میرے ساتھ میرے سینئر ساتھی شاہد بھائی بیٹھے تھے۔

''تم اس آفس میں پرانے ہو مگر میں ایسے کئی آفسوں میں کام کر چکا ہوں۔'' شاہد بھائی سمجھا رہے تھے۔ ''بیسیوں ایسے معاملات دیکھ چکا ہوں مگر کیا ہے کہ......'' یہ کہہ کر انہوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔

''بس شاہد بھائی۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا تھا۔'' میں نے سر جھکا لیا۔

''آئندہ خیال کرنا وہ تو تیرا نصیب ہے کہ نوکری بچ گئی ورنہ میں تو سمجھا تھا کہ تو گیا کام سے۔''

میں نے سمجھنے والے انداز میں سر کو جنبش دی۔

اگلے روز فارعہ میم آفس نہیں آئیں۔ میرا دل بے چین ہوگیا۔ پتا نہیں کیوں نہیں آئیں۔ کہیں انہوں نے آفس چھوڑ تو نہیں دیا۔ سارا دن میں وسوسوں کے گھیرے میں رہا۔ رضوان، عامر اور ثاقب کے کام بھی نمٹائے، انہیں چائے بھی سرو کی لیکن کوئی بات نہیں کی۔ وہ لوگ بھی کچھ نہ بولے البتہ رضوان کینہ توز نظروں سے مجھے دیکھتا رہا تھا۔

تیسرے روز میں معمول کے مطابق وقت پر آفس آگیا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشگوار حیرت کا جھٹکا لگا کہ فارعہ میم آج صبح ہی صبح آفس آگئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ دل فریب انداز میں مسکرانے لگیں۔ میں بلانے سے پہلے ان تک جا پہنچا۔

''میم صاحب آپ...... اتنی صبح......؟'' میری زبان لکنت کھا رہی تھی۔ ''اور...... اور آپ کل نہیں آئی تھیں۔ خیریت تو تھی نا؟ آپ کی طبیعت......''

''ہاں خیریت تھی اور خیریت ہے۔'' انہوں نے میری بات کاٹتے ہوئے بتایا۔ ''بس ایسے ہی چھٹی کرلی تھی۔''

''اچھا!'' میں بلاوجہ مسکرانے لگا۔ ''میں تو پتا نہیں کیا کیا سمجھ رہا تھا۔ پر آپ آج اتنی صبح کیسے آگئیں؟''

''بس تم سے بات کرنے کے لیے۔'' ان کی اس بات پر میں چونک گیا۔ ''ورنہ تو پھر اور لوگ بھی آجاتے ہیں۔ ٹائم ہی نہیں ملتا۔ میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں ناصر۔ تم نے میری وجہ سے جھگڑا کیا لیکن تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''مم...... مگر...... میم صاحب...... وہ...... وہ آپ کے لیے......'' میں ہکلانے لگا تھا۔

''بولنے دو بولنے سے کیا ہوتا ہے۔'' انہوں نے کرسی کی نشست سے ٹیک لگالی۔ ''پتا نہیں لوگ تو کیا کیا بولتے رہتے ہیں۔''

''مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔

''تھینک یو ناصر۔'' فارعہ میم ایک جھٹکے سے سیدھی ہو کر کھڑی ہوگئیں۔ ''تم بہت اچھے ہو۔ تم جیسے انسان اس معاشرے میں کم ہی نظر آتے ہیں۔ تم جیسے لوگ مجھے دل سے پسند ہیں۔''

میرا تو رواں رواں خوشی کے مارے جھوم رہا تھا۔ میں کھڑے کھڑے جھینپ رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ خوشی اور جھینپ کے ملے جلے تاثرات کی وجہ سے میری شکل عجیب مضحکہ خیز لگ رہی ہوگی لیکن ہزار کوشش کے باوجود میں خود کو نارمل کرنے میں ناکام ہی رہا۔ فارعہ میم کی ہنسی چھوٹ گئی پھر انہوں نے اپنا موبائل نکالا اور کہا۔ ''چلو اس خوشی میں تمہارے ساتھ ایک یادگار سیلفی ہو جائے۔''

پھر انہوں نے میرے ساتھ ایک اچھی سی سیلفی لی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا میرا وجود پگھلتا جا رہا ہے۔ خوشی کے مارے دل چاہ رہا تھا کہ باہر بھاگ جاؤں اور چلا چلا کر لوگوں کو بتاؤں کہ فارعہ میم مجھے کتنا پسند کرتی ہیں۔

میں نے اپنا موبائل نکال کر انہیں دیا۔ ''ایک اس سے بھی۔''

''ہاں کیوں نہیں۔'' انہوں نے میرے موبائل سے بھی سیلفی لے لی۔

میرے ہاتھ تو خزانہ ہی لگ گیا تھا۔ کتنی مشکلوں سے دن گزارا۔ میرا دل ہی جانتا ہے۔ چھپ چھپ کر بہانے بہانے سے پچاس مرتبہ موبائل میں تصویر دیکھی تھی۔ چھٹی کے بعد گھر پہنچا اور جلدی جلدی کھانا کھا کر دوستوں سے ملنے چلا آیا۔

''آج میں ایک زبردست چیز دکھاؤں گا تمہیں۔'' میں نے دوستوں سے کہا۔

''ایسی کیا چیز ہے جو تیری باچھیں چوڑی ہو رہی ہیں۔'' اکبر نے استفسار کیا۔ تب میں نے انہیں تصویر دکھائی۔ اکبر اور نثار فارعہ میم کی تصویر دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

''نہیں کر یار۔ یہ ہے تیری ہیروئن۔'' دونوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ ''ایمان سے قاتل ہے قاتل۔ ابے یہ تو انگلش فلموں والی ہیروئن لگ رہی ہے۔ وہ فلم دیکھی تھی نا ہم نے دی ممی۔ اس کی ہیروئن میں مل رہی ہے۔''

''اب بولو بیٹا۔'' میں ہنسنے لگا۔

''بڑا لکی ہے یار تو۔'' نثار نے مان لیا۔

''اور پتا ہے آج میم صاحب نے بولا تھا کہ تم جیسے لوگ مجھے دل سے پسند ہیں۔''

''ابے جا جا...... پھینک نہیں۔ اب زیادہ ہی پھیل گیا ہے تو۔ اسے دیکھ اور خود کو دیکھ۔'' اکبر میرا مذاق اڑانے لگا۔

''سچی میں...... میں سچ بول رہا ہوں۔'' میں نے فخریہ انداز میں کہا۔

رات میں سونے سے پہلے بار بار موبائل پر تصویر دیکھتا رہا اور پھر پتا نہیں کب آنکھ لگ گئی۔ اگلی صبح جب میں آفس جانے کے لیے اٹھا تو سرہانے موبائل نہیں تھا۔ میں گھبرا گیا۔

''اماں!'' میں آواز لگاتا ہوا کمرے سے نکلا۔ ''اماں میرا موبائل کہاں ہے؟''

''مجھے کیا خبر۔'' اماں کی آواز باورچی خانے سے ابھری۔

''میرے بستر پر ہی تو رکھا تھا۔''

اتنے میں زینب میرے کمرے میں گئی اور موبائل لے کر باہر آئی۔ میں نے جلدی سے موبائل چھین لیا۔ ''یہ کہاں رکھا تھا؟''

''وہ...... اوپر...... کپڑوں کی الماری پر۔'' زینب ہچکچا کر بولی۔ میں نے اسے گھورا تو وہ نظریں چرانے لگی۔ پھر آہستہ سے بولی۔ ''بھائی یہ تصویر والی کون ہے؟''

''کون...... کون سی تصویر؟''

''میں نے دیکھ لی ہے۔'' وہ سنجیدہ ہوگئی تھی۔

''اچھا تو پھر دیکھ لی تو دیکھ لی۔ آفس میں کام کرتی ہے وہ۔'' اب میں نے چھپانا مناسب نہ سمجھا۔

''اس لیے اب تم نازو سے کترا رہے ہو۔ نازو بھی بول رہی تھی کہ پتا نہیں تمہارے بھائی کو کیا ہو گیا ہے۔ نہ ملتا ہے نہ بات کرتا ہے۔''

''پاگل ہے وہ تو......'' مجھ سے کوئی جواب نہ بن پایا تھا۔

☆......☆

میرے دن سرشاری میں گزرنے لگے تھے۔ فارعہ میم مجھ سے بہت اچھے انداز میں باتیں کرتی تھیں اور جب کوئی اور نہیں ہوتا تو بے تکلفی بڑھ جاتی تھی۔ وہ اپنے اور گھر والوں کے بارے میں بتایا کرتی تھیں۔ ایک بار باتوں باتوں میں مجھ سے پوچھا۔ ''ناصر تمہیں کوئی لڑکی پسند تو ہو گی؟''

میرا دل اچھل پڑا۔ ''مم مجھے نن...... نہیں تو۔''

''ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔'' انہوں نے انکار میں سر ہلایا۔

''ایمان سے کوئی نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میرے ماتھے پر پسینا آگیا۔

''جھوٹ...... سچ بتاؤ نا۔'' وہ ضد کرنے لگیں۔

''ہے...... ہے ایک...... مگر......'' میں نے اتنا کہا تھا کہ وہ تالی بجا کر بولیں۔

''وہ مارا...... یہ ہوئی نا بات۔'' پھر کچھ سوچ کر کہنے لگیں۔ ''پتا ہے میں بھی ایک کو پسند کرنے لگی ہوں۔''

''جج...... جی......'' میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''جی ہاں۔ وہ بھی مجھے پسند کرتا ہے۔'' انہوں نے لگاوٹ سے میری آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

مجھے لگا کہ میرا دل سینہ توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ اتنے میں آفس میں لوگ آنا شروع ہوگئے اور ہماری بات درمیان میں ہی رہ گئی۔

مجھے لگ رہا تھا کہ میں خوشی سے پاگل ہو جاؤں گا۔ ایک ایک کرکے میں ان فلموں کو یاد کرنے لگا جن میں غریب ہیرو آخر کار اپنی حسین ترین اور بڑے گھر کی ہیروئن کو پالیتا ہے۔ زمانے والے دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

ایک شام جب گھر آیا تو نازو سے سامنا ہوگیا۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ زینب نے تصویر کے بارے میں اسے بتا دیا تھا۔

''اگر اب تمہیں کوئی اور اچھی لگنے لگی ہے تو...... ٹھیک ہے مگر ایک بار اپنے منہ سے بتا دو مجھے۔ خدا کی قسم، دوبارہ اپنی شکل تمہیں دکھاؤں گی۔'' اس نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ میں گنگ رہ گیا تھا۔ زبان تالو سے جا چپکی تھی۔

''بتاؤ! میں سب سننے کے لیے تیار ہوں۔'' اس نے دوبارہ کہا۔ لگتا تھا کہ اس نے اپنے نصیب سے سمجھوتا کرلیا ہے۔

''ایسا ہی سمجھ لو۔'' بمشکل میرے منہ سے نکلا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی دکھ یا ملال نہ تھا۔ بس ایک عجیب سا احساس تھا۔ کہنا نہیں چاہ رہا تھا مگر کہہ ڈالا۔

نازو نے ایک لمحے میری شکل دیکھی اور پلٹ کر گھر سے باہر چلی گئی۔ اب مجھے اس کی پروا نہ تھی۔

☆......☆

اگلے مہینے مجھے تنخواہ ملی تو میں اپنے لیے نئے کپڑے لے کر آیا۔ ساتھ ہی میں نے فارعہ میم کے لیے مہنگی گھڑی بھی خرید لی۔ موقع پا کر میں نے انہیں چپکے سے گھڑی دی۔

''ارے یہ کیا؟''

''آپ کے لیے۔''

''کیوں میرے لیے کیوں؟''

''بس...... ایسے ہی...... دل کر رہا تھا۔ میں نے لے

لی۔"

"اچھا واہ بھئی۔" انہوں نے گھڑی لے لی۔ "ویسے تحفہ اسے دیا جاتا ہے جسے انسان دل سے لائیک کرتا ہے۔"

"جی جی......جی ہاں۔" میرے پیر من من کے ہو گئے تھے۔

"تمہارا یہ تحفہ میں ہمیشہ سنبھال کر رکھوں گی ناصر۔" فارعہ میم نے گھڑی اپنے بیگ میں رکھ لی۔ "اور ہاں......کل میں تمہیں ایک بات بتاؤں گی مگر...... کسی کو ابھی بتانا نہیں۔"

"نہیں بتاؤں گا۔" میں نے متجسانہ لہجے میں کہا۔

"ویسے بات کیا ہے؟"

"ابھی نہیں کل مجھے یقین ہے کہ سب سے زیادہ تمہیں خوشی ہوگی۔" فارعہ میم نے بڑی ادا سے جواب دیا۔

وہ دن اور رات بڑی مشکل سے گزاری۔ رات میں لیٹے لیٹے چشم تصور سے دیکھتا رہا کہ فارعہ میم نے بات بتانے سے پہلے میرا ہاتھ بڑے پیار سے تھام لیا۔

"میں تم سے پیار کرتی ہوں ناصر۔"

مجھے لگا کہ میں کھڑے کھڑے ہوا میں اڑ گیا ہوں۔ انبساط کی سرور انگیز لہریں میرے سراپے میں سرائیت کر گئی تھیں۔ فارعہ میم محبت پاش نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ انہیں کسی کا کوئی ڈر نہیں ہے۔ آفس کے تمام لوگ ہم دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ رضوان، عامر اور ثاقب کے منہ کھلے ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ان کے جسموں سے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہے۔

"بولو ناصر۔" فارعہ میم نے نرمی سے میرا ہاتھ ہلایا۔

"کیا تم بھی مجھ سے پیار کرتے ہو؟"

میں نے ہاں میں جواب دینا چاہا لیکن آواز سوکھے حلق سے باہر نہ آسکی۔ میں نے گردن ہلا دی۔

"مجھ سے شادی کرو گے تم؟"

میرا جسم لرز کر رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں ہاں کرتا۔ ایک آواز آئی۔

"اٹھ جا ناصر......آفس نہیں جانا آج۔" یہ اماں کی آواز تھی۔ خواب شیشے کی طرح چھناکے سے ٹوٹ کر بکھر گیا۔

میں بڑی تیزی سے تیار ہو کر آفس بھاگا۔

آفس میں لوگ آچکے تھے۔ اب بات کا موقع نہیں تھا۔ لنچ کے وقت موقع ملا تو میں فارعہ میم کے پاس پہنچ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ "مجھے معلوم تھا کہ تم بے چین ہو رہے ہو گے کہ آخر کیا بات ہے۔"

میں نے دانت نکال دیے اور اپنے جسم پر طاری کپکپاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

"میں نے بتایا تھا ناں کہ میں کسی کو پسند کرنے لگی ہوں، کیونکہ وہ بھی مجھے پسند کرتا ہے۔" انہوں نے آگے ہو کر تھوڑا دھیمے لہجے میں بتایا۔ "پتا ہے وہ کون ہے۔ وہ ہمارے باس ہیں۔"

"تڑخ۔" سے میرا دل ٹوٹ گیا۔ میں پتھرائی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھتا چلا گیا۔ مجھے لگا کہ میں فرش پر گر کر بے ہوش ہو جاؤں گا۔ فارعہ میم کی اس بات نے مجھے گویا اندھے کنویں میں دھکیل دیا تھا اور میں ہاتھ پیر ہلاتا ہوا گرتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے ایک دم سے چکر آ گئے۔ میں نے جلدی سے ٹیبل پر ہاتھ رکھ دیے۔

"ارے ارے......" میری کیفیت دیکھ کر وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔

"کیا ہو گیا ناصر......طبیعت تو ٹھیک ہے نا...... بیٹھو......بیٹھ جاؤ۔ آرام سے بیٹھو چیئر پر۔"

میرا دل خون ہو گیا تھا۔ میری حالت بری ہو گئی تھی۔ منہ سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ میں نے ہانپتے کانپتے ہوئے خود کو سنبھالا اور پلٹ کر وہاں سے چل دیا۔ پتا نہیں کیسے گھر پہنچا اور کمرے میں جا کر خوب رویا۔ اتنا رویا کہ میرا وجود ہی گویا آنسوؤں میں بہہ گیا۔ میرا موبائل بجتا رہا۔ اماں اور زینب پوچھتی رہ گئیں مگر میں صرف روتا ہی رہا۔

غلطی سراسر میری تھی۔

میں بہت زیادہ خوش فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔ اپنی اوقات بھول گیا تھا کہ میں ایک معمولی سا پیون ہوں۔ فارعہ میم تھوڑا ہنس بول کر بات کرنے لگی تھیں تو میں انہیں اپنی ہیروئن سمجھنے لگا تھا۔ میرا اور ان کا کوئی جوڑ ہی نہیں تھا۔ میں اپنی فلمی دنیا میں چلا گیا تھا۔ جب کہ حقیقت بہت الگ تھی۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں اپنی حقیقی ہیروئن نازو کو بھی کھو بیٹھا ہوں۔ وہ بہت ضدی ہے۔ اب بھی مجھے اپنی شکل نہیں دکھائے گی لیکن نہیں، میرا دل ٹوٹنے پر سب سے زیادہ وہی خوش تھی، اس نے خوشی کے اظہار کے لیے تاریخ مانگنے اپنی ماں کو بھیج دیا تھا۔

اتنے سال گزر گئے۔ فارعہ میم اب بھی دفتر آتی ہیں کیونکہ اب وہ اس دفتر کی سیکنڈ باس ہیں اور میرے گھر کی باس نازو ہے۔

چہرہ

مکرمی مدیر
السلام علیکم
ایک سچ بیانی ارسال خدمت ہے۔ یہ میری اپنی کہانی ہے۔ اسے میں صرف اس لیے بھیج رہا ہوں کہ لوگ اپنے چہروں پر چڑھے ملمع کو ہٹا کر کبھی اپنا چہرہ بھی دیکھ لیں۔

محمد مکرم حیات
(کراچی)

کیا لڑکی تھی کہ جس کو دیکھ کر سانسیں تیز ہونے لگی تھیں۔

حسن کے بارے میں میرا یہ تجربہ ہے کہ حسن دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جو بہت آہستہ آہستہ جسم و جان میں سرائیت کرتا رہتا ہے اور دوسرا وہ جو ذرا سی دیر میں بھڑکا کر رکھ دیتا ہے۔

وہ لڑکی دوسری قسم سے تعلق رکھتی تھی۔ ایک بھڑکتا ہوا شعلہ، ایک لمحے میں تباہ کر دینے والا۔

میں اس فلیٹ میں نیا نیا شفٹ ہوا تھا۔

ایک تو اس شہر میں کرائے کا مکان ملنا عذاب ہوتا جا رہا

ہے۔ اگر مل بھی جائے تو مالک کی یہ شرط ہوتی ہے کہ فیملی والا ہونا چاہیے۔

اب میرے ساتھ پرابلم یہ تھی کہ ماں باپ تھے نہیں۔ شادی ہو نہیں سکی تھی اس لیے اکیلا ہی تھا۔ یہ اور بات ہے کہ بہت سی لڑکیاں میری زندگی میں آ کر جا چکی تھیں یا اب تک میرے ساتھ تھیں جن سے ملاقاتیں رہتی تھیں لیکن بیوی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

اس لیے جہاں بھی مکان ملتا بہت دشواریوں سے ملتا تھا۔ یہ فلیٹ بھی کافی پریشانیوں سے ملا تھا۔ فلیٹ کی یونین والوں کو یقین دلانا پڑا تھا کہ میں ایک شریف آدمی ہوں اور میرے پاس سوائے بھانجیوں اور بھتیجیوں کے اور کوئی لڑکی نہیں آئے گی۔

میں نے انہیں بتایا تھا کہ میری کئی بہنیں اور بھائی ہیں۔ جن کی بہت ساری بیٹیاں ہیں۔ بس وہی آیا کریں گی۔ (ظاہر ہے کہ میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ اپنی کسی دوست لڑکی کو بھانجی اور کسی کو بھتیجی ظاہر کرنا ہے۔)

وہ لڑکی مجھے ایک سپر اسٹور میں دکھائی دی تھی۔

جس طرح میں اسے دیکھ کر مبہوت ہو گیا تھا بالکل اس طرح وہ بھی مجھے دیکھتی رہ گئی تھی۔ خود میں اس کی محویت دیکھ کر میری رگوں میں لہو کی گردش تیز ہونے لگی تھی۔

یہ ایک پرانا نسخہ ہے کہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال دو۔ اس طرح بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ سامنے والی کو ایسا لگتا ہے جیسے اس شخص نے اس کو اپنی آنکھوں کے راستے اپنے دل میں اتار لیا ہو۔

کچھ دیر بعد وہ جیسے ہوش میں آ گئی اور ایک طرف چل دی لیکن اس نے اسٹور سے باہر نکلتے ہوئے کئی بار مجھے مڑ کر دیکھا تھا۔

میں نے اپنی خریداری کی اور خود بھی بہت تیزی سے اسٹور سے باہر آ گیا لیکن وہ جا چکی تھی۔ کم از کم آس پاس تو کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

میں گہری سانسیں لیتا ہوا دوبارہ اسٹور میں داخل ہو گیا۔

لیکن جب ارادہ ہو اور خواہش مضبوط ہو تو پھر کہیں نہ کہیں ٹکراؤ ہو ہی جاتا ہے۔ اس کے اور میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

وہ لڑکی ایک بار پھر دکھائی دے گئی۔

اس بار اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر مرد بھی تھا۔ دونوں کے چلنے اور بات کرنے کے انداز سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ دونوں باپ بیٹی ہیں۔

اس بار اس لڑکی نے پھر مجھے دیکھ لیا۔ اس بار بھی اس کا محویت کا یہی عالم تھا۔ اس نے جیسے مجھ پر اپنی نگاہیں گاڑ دی تھیں۔

اور میرا حال یہ تھا کہ میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اتنی خوب صورت لڑکی جب اتنی بے خود ہو جائے تو اپنی قسمت پر ناز ہی ہو سکتا ہے اور میں تو ویسے بھی اس میدان کا پرانا کھلاڑی تھا۔

اس کے باپ نے کچھ کہا اور وہ لڑکی سنبھل کر باپ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ وہ اگر مخاطب نہیں کرتا تو وہ نہ جانے کب تک مجھے دیکھتی رہتی۔

خدا جانے وہ کہاں رہتی تھی۔ میرے لیے اب اس کا سراغ لگانا ضروری ہو گیا تھا۔ اس لڑکی کے سلسلے میں زیادہ جدوجہد کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو خود ہی میرے پاس چلی آ رہی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ جب ارادے اور خواہش شدید ہوں تو وہ مل ہی جاتا ہے جس کی خواہش ہو رہی ہو۔ وہ لڑکی مجھے اپنے ہی فلیٹ کی بلڈنگ کی چہار دیواری میں دکھائی دے گئی۔

اس کے ہاتھ میں دو تین شاپرز تھے اور وہ برابر والے بلاک کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا رہی تھی۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اسی پروجیکٹ میں رہتی تھی، جہاں میں تھا۔

کتنی عجیب بات تھی منزل خود ہی چلتی ہوئی میرے قریب آ گئی تھی۔

کچھ دنوں کے بعد ایک بار پھر اسے اس بلاک کی سیڑھیاں اترتے ہوئے دیکھ لیا۔ میں بھی اس وقت اپنے بلاک کی سیڑھیوں کی طرف جا رہا تھا۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا تھا اور اس بار بھی اس کا وہی حال ہوا تھا جو اس سے پہلے ہوتا آیا تھا۔

خدا کی پناہ، وہ جیسے مجھے دیکھ کر پتھر کا مجسمہ بن جاتی تھی۔ دیکھتی ہی رہتی تھی۔

اس قسم کی کوئی ایکٹی ویٹی فلیٹ کے احاطے میں خطرناک ہو سکتی تھی لیکن میں نے اپنا پرانا داؤ آزمایا۔ اس کو اس قسم کا اشارہ کیا جیسے میں اس سے ملنا چاہتا ہوں پھر میں نے بلاک کی سیڑھیاں چڑھیں اور گیٹ سے باہر نکل گیا۔

میں نے اپنی رفتار زیادہ نہیں رکھی تھی۔ میں اس کو قریب آنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے میرا اشارہ دیکھ اور سمجھ لیا ہے اور اگر اس کے دل میں کوئی بات ہو گی تو وہ ضرور آئے گی۔

اور یہی ہوا۔

وہ گیٹ سے نکل کر اس طرف آتی ہوئی دکھائی دی جس طرف میں گیا تھا اور آگے چل کر میں ایک درخت کے پاس رک گیا۔ میں اپنے فلیٹ کی بلڈنگ سے بہت فاصلے پر نکل آیا تھا۔

وہ بھی آئی اور کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔

شاید وہ ہچکچا رہی تھی۔ اب مجھے اس کے پاس جانا تھا۔ اس لڑکی نے اتنی ہمت کا ثبوت تو دے دیا تھا۔

میں ٹہلتا ہوا اس کے پاس چلا گیا۔ ''میرا نام مکرم ہے۔'' میں نے اپنا تعارف کروایا۔ یہ میرا ایک اور حربہ تھا۔

''کیا آپ سلطان اسکوائر میں رہتے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' میں نے بتایا۔ ''ابھی کچھ دنوں پہلے ہی شفٹ ہوا ہوں۔''

''میں ملیحہ ہوں۔'' اس نے اپنا نام بتایا۔ ''اسٹوڈنٹ ہوں۔''

''جی ہاں وہ تو آپ کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''اچھا میں چلتی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''اس طرف بلڈنگ والے آتے جاتے رہتے ہیں۔''

''جی ہاں میں خود بھی نہیں چاہتا کہ کوئی ہمیں دیکھ لے۔'' میں نے اپنی جیب سے اپنا کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''اس پر میرا موبائل نمبر ہے۔ اگر آپ کا دل چاہے تو کبھی بات کر لیجیے گا۔''

اس نے شکریہ کہہ کر میرا کارڈ لے کر رکھ لیا اور واپس چل دی۔ میں بھی بہت سرشار سا واپس آ گیا تھا۔

اس بلڈنگ میں آنے کے بعد میں نے بہت احتیاط برتی تھی۔ اب تک اپنے کسی دوست کو مدعو نہیں کیا تھا۔ حالانکہ یونین والوں کو میں مطمئن کر چکا تھا پھر بھی احتیاط ضروری تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اب یہاں سے بھی نکلنا پڑ جائے۔

لیکن اس کے فون آنے سے پہلے ایک اور ایسا واقعہ ہو گیا جس نے میری جیت مکدر کر دی تھی۔ یہ معاملہ تھا نیہا کا۔ وہ ایک غریب گھر کی لڑکی تھی جس سے میری ملاقات دو مہینے پہلے ہی ہوئی تھی۔

ان گھرانوں کی لڑکیوں کا معاملہ بھی کچھ اور ہوتا ہے۔ یہ دوستی کو دوستی نہیں سمجھتیں بلکہ جیون بھر کا بندھن سمجھنے لگتی ہیں۔

میں اسے دو تین بار اچھے ہوٹل میں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ایک دو بار تھوڑی شاپنگ کروا دی تھی۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے شادی کے خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے جب کہ میں ان جھنجٹوں سے ابھی دور رہنا چاہتا تھا۔

میں ایک صبح دفتر پہنچا تو وہ میرے کمرے میں پہلے سے موجود تھی۔ اس کو دیکھ کر ایک الجھن سی ہو گئی تھی۔

''ہاں بھئی کیسے آنا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''مکرم! میں نہیں جانتی تھی کہ تم اتنے بے وفا نکلو گے۔'' اس نے گلا کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں کیا بات ہو گئی۔'' میں اپنی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

''تم نے اپنا گھر بدل لیا اور مجھے خبر بھی نہیں دی۔''

''اب میں ڈھنڈورا پیٹ کر تو گھر نہیں بدلوں گا۔'' میں نے روکھے انداز میں کہا۔

وہ کچھ اداس ہو گئی تھی۔

''میں مجبوراً تمہارے دفتر آئی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''کیونکہ مجھے تم نے ہی اپنے دفتر کے بارے میں بتایا تھا۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ تم پہلی بار آ گئی ہو آیندہ مت آنا۔ میں اسے پسند نہیں کرتا۔'' میں نے کہا۔ ''خیر بتاؤ کیا ضرورت پیش آ گئی اگر پیسے چاہئیں تو میں اس وقت کچھ نہیں دے سکوں گا۔''

''مکرم! یہ تم کس انداز میں اور کیسی باتیں کر رہے ہو۔''

''دیکھو نیہا یہ میرا مزاج ہے۔ میں ایک ڈھول کو زیادہ دنوں تک اپنے گلے میں نہیں لٹکاتا۔''

میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ایک لمحے کے لیے افسوس بھی ہوا تھا پھر خیال آیا کہ اگر اس وقت کسی کمزوری کا مظاہرہ کیا تو پھر وہ میرے گلے ہی پڑ جائے گی۔

میں میز پر رکھی ہوئی ایک فائل اٹھا کر دیکھنے لگا۔ وہ کچھ دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔ پھر اٹھ کر چلی گئی۔ دراصل اب میری توجہ کا مرکز وہی لڑکی ہو گئی تھی جس نے اپنا نام ملیحہ بتایا تھا اور جو مجھے خود آ کر دیکھا کرتی تھی۔

وہ لڑکی ایسی تھی کہ میری آوارہ فطرت اور مزاج کے باوجود وہ مجھے اتنی اچھی لگی کہ میں نے اپنے طور پر اس کو ہمیشہ کے لیے اپنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے ضرور فون کرے گی۔ میرے لیے اس کی بے خودی یہی بتا رہی تھی کہ وہ میرے سحر میں گرفتار

ہو چکی ہے ورنہ کون اس طرح سب کچھ بھول بھال کر کسی غیر کو دیکھا کرتا ہے۔

چار دنوں کے بعد آخر اس کا فون آ ہی گیا۔

میں نے فوراً اس کی آواز پہچان لی تھی اور جو خوشی ہوئی وہ بتا نہیں سکتا۔

”بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔“ میں نے کہا۔

”جی میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“

”محترمہ میں تو اس دن سے آپ کے فون کے انتظار میں تھا جس دن میں نے آپ کو اپنا نمبر دیا تھا۔“

”ارے ہاں۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”ایک بات بتاؤں میں بھی آپ کو دیکھنے کے لیے بے چین رہی ہوں۔“

”خوش قسمتی ہے میری۔“ میں نے کہا۔ ”تو ہم کب مل رہے ہیں؟“

”دو دنوں کے لیے تو میں اپنی خالہ کے پاس جا رہی ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”دو دنوں کے بعد آ کر آپ کو فون کروں گی۔“

”میں آپ کے فون کا انتظار کروں گا۔“

دو دنوں کے لیے میں نے اپنے آپ کو کہیں اور الجھا لیا۔ اس کہانی کو اب تک پڑھنے والوں کو میرے مزاج کا اندازہ ہو ہی گیا ہوگا۔ یعنی میں خالی نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

اس بار میں اس لڑکی کو بے فکر ہو کر اپنے نئے فلیٹ میں لے آیا تھا کیونکہ مجھے اطمینان تھا کہ کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔ یونین والوں کو میں پہلے ہی ایک کہانی سنا چکا تھا۔

وہ دو دنوں تک ملحق بلڈنگ کے احاطے میں یا آس پاس بھی دکھائی نہیں دی۔ یعنی وہ واقعی کہیں جا چکی تھی۔ شاید اپنی خالہ کے یہاں۔

اس کا فون دو دنوں کے بعد آ گیا۔

”ارے کہاں رہ گئی تھیں۔“ میں جیسے ایک دم سے پھٹ پڑا تھا۔

میرے بے تابی کا اندازہ کر کے وہ ہنس پڑی۔ ”میں نے بتایا تھا نا کہ میں اپنی خالہ کے پاس جا رہی ہوں۔“ اس نے کہا۔

”تو یہ بتاؤ کہ تم سے ملاقات کب ہو رہی ہے۔“

”آج ہی۔“ اس نے کہا۔ ”آج آپ سے ملنا میرے لیے بہت ضروری ہو گیا ہے۔“

”ہاں ہاں شام کو ضرور ملو۔“

”آپ کو اگر اعتراض نہ ہو تو میری ایک دوست بھی میرے ساتھ ہوگی۔“ اس نے کہا۔

”اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ لے آنا اس کو بھی۔“

میرا وہ پورا دن بہت ترنگ میں گزرا تھا۔ وہ شام کو آنے والی تھی۔ پتا نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے۔ ایسی بے قراری تو میں نے کبھی کسی کے لیے محسوس نہیں کی ہوگی۔

اس نے بھی یہی کہا تھا کہ مجھ سے ملنا اس کے لیے ضروری ہو گیا ہے۔

شام کو میں وقت سے پہلے وہاں پہنچ گیا جہاں ملاقات ہونی تھی۔ ملیحہ اپنی ایک دوست کے ساتھ آئی تھی۔ وہ بھی بہت طرحدار لڑکی تھی۔ ملیحہ نے اس کا نام رعنا بتایا تھا۔

رعنا بھی مجھے دیکھتی رہ گئی تھی۔

”مکرم صاحب آج میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں۔“ ملیحہ نے کہا۔

”کس بات کا شکریہ؟“

”میں نے شاید آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میں ایک آرٹ اسکول کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ پینٹنگ سیکھ رہی ہوں۔ مجھے یہ ٹاسک دیا گیا تھا کہ میں شیطان کو پینٹ کروں۔ اب شیطان کو دیکھا ہو تو پینٹ کرتی۔ اتفاق سے آپ دکھائی دے گئے اس لیے میں حیران ہو کر آپ کو دیکھتی رہ گئی تھی۔“

”جی ہاں مکرم صاحب۔“ رعنا نے کہا۔ ”میں بھی آپ کو دیکھ کر اس لیے حیران رہ گئی کہ آپ کا چہرہ بالکل کسی شیطان جیسا ہے، میرا مطلب ہے شیطان کو اگر انسانی شکل مل جائے تو آپ ہی جیسا ہوگا۔“

میں اس وقت سناٹے کے عالم میں بیٹھا رہ گیا تھا۔ رعنا بول رہی تھی۔ ”مکرم صاحب! سروری اور نیہا دونوں ہی ہماری دوست ہیں۔ ان کے ساتھ آپ نے جو سلوک کیا ہے وہ آپ کے چہرے پر لکھا ہے۔“ وہ دونوں میرا شکریہ ادا کرتی ہوئی رخصت ہو گئیں۔

وہ دن ہے اور آج کا دن میں اپنے چہرے کی یہ خباثت دھونے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں نے جب بہت مجبور ہو کر بے قرار ہو کر ایک بزرگ سے رجوع کیا تو انہوں نے بھی یہی بات بتائی اور سورہ رحمٰن کی ایک آیت سنائی تھی جس کا ترجمہ ہے۔ ”بدکار اپنے چہروں ہی سے پہچانے جائیں گے۔“

اب تو یہی دعا ہے کہ خدا میرے چہرے سے خباثت کے یہ نقوش صاف کر دے تا کہ میں قیامت میں شرمندہ نہ ہوں۔

▼▼▼

مفید غیر مفید

محترم معراج رسول

السلام علیکم

یہ میری داستان نہیں میرے دوست کی ہے۔ اس کا ایک اپنا مزاج تھا لیکن اب اس نے اپنا مزاج بدل لیا ہے، کیسے اور کیوں بدلا یہ اسی کی لفظی تصویر کشی ہے۔

انجم پرویز کیانی

(کراچی)

وہ ایک فضول آدمی تھا۔

میں کئی بار اس کے گھر جا چکا تھا۔ دونوں میاں بیوی بہت خوش اخلاق تھے۔ فیاض نے زندگی گزارنے کا اپنا ایک نظریہ بنا رکھا تھا۔ جس پر وہ بہت سختی سے عمل کیا کرتا۔

وہ مجھ سے بھی کہا کرتا۔ ”پرویز تم ایک رائٹر ہو۔ تمہاری اپنی زندگی ہے۔ ایک طرز حیات ہے بلکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ تمہارا روزگار بھی یہی ہے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو، میں کچھ لکھ لیتا ہوں تو پیسے ملتے ہیں ورنہ کون پیسے دیتا ہے۔“

”تو پھر تمہارے مزاج میں یہ مروت کیسی! کیا تمہیں احساس ہے کہ تمہارا کتنا وقت ضائع ہوتا ہے۔“

اس کی یہ باتیں بالکل درست تھیں۔ واقعی میں مروت

کے ہاتھوں مارا جا رہا تھا۔ کسی جگہ سے کچھ لکھنے کا کام ملا ہے اب میں نے لکھنا شروع ہی کیا ہے کہ کوئی مہمان آدھمکا۔

اب ہوتا یہ تھا کہ میں اس کے ساتھ مصروف ہو جاتا اور اس طرح میرا وقت برباد ہو جاتا۔ میں کوئی کام نہیں کر پاتا۔

فیاض اس بات کے لیے مجھ پر ناراض ہوا کرتا تھا۔

”آخر کس بات کی مروت۔ صاف صاف کہہ دیا کرو کہ پلیز۔ اس وقت چلے جاؤ۔ میں ضروری کام کر رہا ہوں۔“

”یہی تو پرابلم ہے دوست کہ میں یہ کہہ نہیں پاتا۔“

”تو پھر اسی طرح پریشانیوں میں دن گزارتے رہو۔“ وہ کیا کرتا۔ ”تم نے ہم میاں بیوی کو دیکھا۔ ہم پُرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے پاس برباد کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ میں بھی تمہاری طرح بے وقوف ہوا کرتا تھا۔ لوگ میرے پاس صرف وقت گزارنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ پھر میں نے اپنے جاننے والوں کی دو کیٹیگری بنا لی۔ جانتے ہو یہ دو کیٹیگریز کیا ہیں۔“

”تم ہی بتا دو۔“

”دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک پروڈیکٹو اور دوسرے ان پروڈیکٹو۔ پروڈیکٹو وہ ہوتے ہیں جن سے تمہیں کچھ حاصل ہوتا ہے۔ پہلے تمہارے فیلڈ کے لوگ پبلشر، ایڈیٹر اور پروڈیوسر وغیرہ۔ ظاہر ہے تمہیں ان کو وقت دینا چاہیے۔ کیونکہ ان کا ... دیا ہوا وقت تمہارے کام آتا ہے اور دوسرے وہ لوگ ہوتے ہیں۔ ان پروڈیکٹو، جو صرف اس لیے تمہارے پاس آتے ہیں کہ تمہارا وقت ضائع کر سکیں تو ایسے لوگوں سے مروت ختم کر دو۔ صرف اس وقت ان کو وقت دو جب تمہارے پاس فالتو وقت ہو۔“

”لیکن یہ تو انسانوں کے ساتھ کمرشل رویہ ہوا نا۔“ میں نے کہا۔

”ہاں کمرشل سہی، لیکن کامیاب رویہ ہے۔ یہ وقت بہت تیز رفتار ہوتا جا رہا ہے۔ تم کو وقت سے آگے نکلنا ہو گا۔ سروائیو کرنے کے لیے اس قسم کے دقیانوسی تکلفات کو ختم کرنا بہت ضروری ہے ورنہ کچھ بھی نہیں کر سکو گے۔“

میں سوچا کرتا کہ فیاض ٹھیک ہی کہتا تھا۔

وقت بہت قیمتی شے ہے اور وقت کو برباد کرنے والا خود برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔ آپ چاہے خود اپنا وقت برباد نہ کریں۔ لیکن کوئی اور آ کر برباد کر جاتا ہے۔

فیاض کہا کرتا کہ جس سے کوئی فائدہ نہ ملے۔ اس سے آہستہ آہستہ دامن چھڑا لو، کیونکہ جب وہ تمہیں کچھ دے نہیں سکتا تو پھر تمہارے لیے اس کا وجود غیر حقیقی ہے۔

نرمی سے منع کر دو کہ پلیز اس وقت چلے جاؤ یا پھر کب آئے گا اور اگر وہ واقعی تمہارا مخلص ہو گا تو کبھی برا نہیں مانے گا بلکہ تمہاری بھلائی کے لیے تمہارے پاس سے چلا جائے گا۔

میرے سامنے منصوبے کی مثالیں تھیں۔ وہاں لوگ وقت برباد نہیں کیا کرتے اس لیے وقت ہی ان کا ساتھ دے رہا ہے۔

میں ہفتے میں صرف ایک بار یعنی اتوار کے دن ان کے یہاں جایا کرتا تھا۔ دوپہر کا کھانا عام طور پر ان ہی کے ساتھ کھاتا۔ وہ دن ان دونوں کی فرصت کا دن تھا۔

اس دن ان کا گھر مہمانوں کے لیے کھلا رہتا تھا لیکن مہمان بھی بہت مخصوص ہوا کرتے تھے۔ وہ لوگ جو کسی طرح فیاض کے لیے کارآمد ہوتے۔

اس کے کاروباری ساتھی یا اس قسم کے دوسرے۔ صرف ایک میں تھا جس سے اس کا تعلق ذرا مختلف تھا۔ یعنی ہم تینوں کالج کے زمانے کے ساتھی تھے۔ میں، فیاض اور اس کی بیوی رعنا۔

کالج ہی کے زمانے میں رعنا اور فیاض ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔ پھر بعد میں دونوں کی شادی بھی ہو گئی۔ رعنا بھی فیاض ہی کے مزاج کی تھی۔

اس لیے شادی سے پہلے بھی دونوں کی بہت اچھی بنتی تھی اور شادی کے بعد دونوں ایک ہی اسٹائل کی زندگی گزار رہے تھے۔

رعنا کا اپنا بیوٹی پارلر تھا جو بہت کامیابی سے چل رہا تھا۔ دونوں میاں بیوی اپنی اپنی جگہ خوش حال تھے اس لیے گھر میں بھی خوش حالی تھی۔

سب کچھ تھا ان کے پاس گھر، گاڑی، بینک بیلنس اور اپنا اپنا کاروبار۔ ایسا بہت کم ہوا کرتا ہے اور اس کامیابی کی وجہ رہی تھی۔ یعنی وہ ایسوں سے ملتے ہی نہیں تھے جن سے کچھ حاصل نہیں ہو پاتا ہو۔

ان کے خاندان کے بہت سے لوگ ان کی ان باتوں سے ناراض بھی ہو گئے تھے لیکن آہستہ آہستہ ان کے مزاج کا پتا چل گیا تھا اور اب خاندان میں ان کی کامیابی کی مثالیں دی جاتی تھیں۔

ایک اتوار معمول کے مطابق میں ان کے گھر گیا تو گھر کا ماحول بہت مختلف تھا۔ وہ ہر دم ہنسنے اور خوش رہنے والا جوڑا ڈرائنگ روم میں منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے گھر میں

کوئی پرابلم ہو۔

”خیریت تو ہے نا۔“ میں نے فیاض سے پوچھا۔ ”آج تم دونوں بہت پریشان دکھائی دے رہے ہو۔“

”یہ ساری پریشانی ان کے ماموں نفیس صاحب کی وجہ سے ہے۔“ رعنا نے فیاض کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔

”میں نہیں سمجھا۔ کون سے ماموں! کیسے ماموں اور ان کی وجہ سے کیا پریشانی ہو گئی ہے۔“

”پرویز میرے ایک ہی ماموں ہیں۔“ فیاض نے بتایا۔ ”بوڑھے ہو چکے ہیں۔ شادی انہوں نے کی نہیں۔ پہلے تو کہیں اور رہتے تھے اب اپنا بوریا بستر لے کر ہمارے پاس ہی آ گئے ہیں۔“

”مصیبت یہ ہے کہ ہم ان کو بھگا بھی نہیں سکتے۔“ رعنا نے کہا۔ ”کیونکہ وہ فیاض کے اکلوتے ماموں ہیں۔ ان سے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ پلیز کہیں اور جا کر رہیں۔“

”ان کے آنے کی وجہ سے ہم دونوں ڈسٹرب ہو کر رہ گئے ہیں۔“ فیاض نے بتایا۔ ”تم تو جانتے ہو کہ ہمارا لائف اسٹائل کیا ہے۔ ہم کس طرح اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ ہمارے یہاں ایسے کسی شخص کی تو گنجائش ہی نہیں ہے جس سے کوئی فائدہ نہ ہو، جو ہمیں کچھ دے نہ سکے۔ یعنی نان پروڈیکٹو لوگ۔“

”اس کا طریقہ یہ ہے کہ نرمی اور خوش دلی کے ساتھ ان سے کہہ دو۔“ میں نے کہا۔

”یہی تو پرابلم ہے کہ یہ نہیں کیا جا سکتا۔ پورا خاندان ہنگامہ کر دے گا کہ سگے ماموں کے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے۔ ماں کی ایک ہی نشانی تھی۔ اس کے لیے بھی گھر میں گنجائش نہیں نکلی وغیرہ وغیرہ۔“

”تو دوسرا کام یہ ہو سکتا ہے کہ ان سے کہہ دیا جائے کہ وہ تم دونوں کو ڈسٹرب نہ کیا کریں۔ صرف رات کے کھانے کے وقت ان سے ملاقات کرو۔“

”کاش ایسا ہو سکتا۔“ فیاض بے بسی سے بولا۔

”سرکار ایسا کیوں نہیں ہو سکتا۔“

”پرابلم یہ ہے کہ وہ بہت کم سنتے ہیں۔“ رعنا نے بتایا۔ ”یعنی ان کی قوتِ سماعت بہت کم ہے۔ حالانکہ وہ آلہ بھی لگاتے ہیں۔ اس کے باوجود ان سے چیخ چیخ کر بولنا پڑتا ہے۔“

اس دوران ایک صاحب کھٹ کھٹ کرتے اندر آ گئے۔ وہی فیاض کے ماموں تھے۔

میرے اندازے کے مطابق ان کی عمر ستر سے کچھ زیادہ ہی ہو گی۔ چہرے پر بلا کی ملاحت، خوب صورت سی داڑھی، عینک لگائے ہوئے۔ یعنی وہ ہر طرح سے ایک کلچرڈ انسان دکھائی دے رہے تھے۔ آلۂ سماعت بھی ان کے کانوں میں لگا ہوا تھا۔

انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا تھا۔

فیاض نے بلند آواز میں بتایا۔ ”ماموں! یہ میرے بہت پرانے دوست ہیں پرویز حمید۔“

”کیا کہا گل ریز۔“

”گل ریز نہیں پرویز۔“ اس بار فیاض کی آواز کچھ زیادہ بلند تھی۔

”اچھا اچھا میں سمجھ گیا، پرویز۔“ بڑے میاں نے مصافحے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ ”میاں میں فیاض کا ماموں ہوں۔ محمود نام ہے میرا۔ کسی زمانے میں سرکاری آفیسر ہوا کرتا تھا لیکن اب کچھ بھی نہیں ہوں۔“

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ بے چارے فیاض اور رعنا کے دلوں پر کیا گزر رہی ہو گی۔ ایک تو ان دونوں کا ایسا مزاج اور اوپر سے محمود صاحب کی باتیں۔ کہاں وہ دونوں جو اپنے وقت کے ایک ایک لمحے کا حساب رکھا کرتے اور کہاں یہ شخص جس کے پاس فرصت ہی فرصت تھی اور ان دونوں میاں بیوی کے نقطۂ نظر سے بڑے میاں ایک نان پروڈیکٹو انسان تھے۔ جن سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں تھا۔

بڑے میاں کچھ دیر تک مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر اٹھ کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد فیاض نے مجھ سے کہا۔ ”دیکھ لیا تم نے۔ ہم دونوں ان بڑے میاں کی وجہ سے کس اسٹیج پر آ کر کھڑے ہو گئے ہیں۔“

”ہاں دیکھ لیا۔“ میں نے اپنی گردن ہلائی۔ ”بہرحال اب برداشت کرو اور کیا کر سکتے ہو۔“

”پرویز بھائی، ایک بات بتائیں۔ کیا آپ کی نظر میں کوئی اچھا سا اولڈ ہوم ہے جہاں ہم ان کو رکھ سکیں۔“ رعنا بولی۔

”پیسوں کا کوئی ایشو نہیں ہے۔“ فیاض نے کہا۔ ”جتنا بھی خرچ ہو وہ ہم دینے کو تیار ہیں۔“

”کیونکہ ہمارے پاس اب کوئی آپشن نہیں ہے۔“ رعنا غصے سے بولی۔ ”آپ کو معلوم ہے ان کے چکر میں کئی دنوں سے اپنے بیوٹی پارلر بھی نہیں جا پا رہی ہوں۔“

”اوکے۔“ میں نے گردن ہلائی۔ ”میں کسی مناسب اولڈ ہوم کا پتا چلانے کی کوشش کروں گا۔“

”یار یہ کیسی ستم ظریفی ہے۔“ فیاض بے بسی سے ہنس رہا تھا۔ ”خود سوچو ان بڑے میاں نے یہاں آ کر ہمارے اصولوں

کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی ایسے شخص کو برداشت ہی نہیں کیا جس کا ملنا وقت کی بربادی ہو۔ جو کچھ دے نہ سکے اور یہاں یہ حال ہے کہ یہ ماموں ہمارے سروں پر آ کر بیٹھ گئے ہیں۔"

"پرویز بھائی! مروت اور محبت کی بھی ایک لیمٹ ہوتی ہے۔" رعنا نے کہا۔ "اب ہم اس سے زیادہ اور کیا کر سکتے ہیں کہ اولڈ ہوم کے اخراجات اٹھاتے رہیں۔"

"چلو یہ بھی بہت ہیں۔" میں دھیرے سے بولا۔

اس کے بعد کئی دنوں تک میں اپنے کاموں میں مصروف رہا۔ تھوڑی فرصت ملی تو اولڈ ہوم کی تلاش شروع کروں۔ کچھ لوگوں کو فون کیا ایک دو سماجی اداروں سے رابطہ کیا۔ بالآخر ایک اولڈ ہوم کا پتا چلا لیا۔ ان کا فون نمبر بھی مل گیا تھا۔

میں نے اپنے طور پر انہیں فون کر کے ان سے معاملات طے کر لیے۔ ان کے چارجز بھی بہت مناسب تھے اور ان کے کہنے کے مطابق وہاں دیکھ بھال بھی بہت اچھی ہوتی تھی۔

اولڈ ہوم والوں سے بات کرنے کے بعد میں نے فیاض کو فون کیا۔ وہ میرے فون کا انتظار ہی کر رہا تھا۔

"ارے یار میں تو خود تمہیں فون کرنے والا تھا۔ آج رات کی فلائٹ سے میں انگلینڈ جا رہا ہوں۔"

"خیریت!"

"ہاں ہاں سب خیریت ہے۔ ایک اچھا چانس مل گیا ہے اس کی ڈیل کرنے جا رہا ہوں۔" اس نے بتایا۔

"پھر تو ضرور جاؤ۔"

"تم یہ بتاؤ تم نے کسی اولڈ ہوم کا معلوم کیا۔"

"ہاں معلوم کر لیا ہے اور ان سے بات بھی ہو گئی ہے۔ میں آ رہا ہوں تمہارے پاس۔ تمہاری فلائٹ کس وقت کی ہے۔"

"گیارہ بجے کی۔ لیکن نو بجے میں ایئرپورٹ کے لیے نکل جاؤں گا۔" اس نے بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ میں پہنچ رہا ہوں۔"

میں ایک کام میں الجھ گیا۔ بہرحال جب میں پہنچا تو فیاض جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ اس کا سامان گاڑی میں رکھا جا چکا تھا۔ رعنا اور فیاض کے ماموں بھی گاڑی کے پاس کھڑے تھے۔

"بھائی بالکل صحیح وقت پر آئے۔ میں تو بس نکل ہی رہا تھا۔" اس نے کہا۔

"کتنے دنوں کا پروگرام ہے۔"

"زیادہ نہیں پندرہ بیس دنوں کا۔" اس نے بتایا۔ پھر پوچھا۔ "یہ بتاؤ بڑے میاں کا کیا بندوبست ہوا۔"

میں نے اسے اولڈ ہوم کے بارے میں بتا دیا۔ رعنا بھی اس وقت ہمارے پاس کھڑی تھی۔ "تھینکس گاڈ، کوئی تو راستہ نکلا۔"

اور اس وقت فیاض کے ماموں نے بولنا شروع کر دیا۔ "بیٹا تم سفر پر جا رہے ہو۔ میری ساری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ خدا تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ خیریت سے جاؤ بیٹا اور خیریت سے واپس آؤ اور میں نے جو آیت الکرسی کا ورد بتایا ہے۔ وہ کرتے رہنا۔ اس طرح اللہ کی حفاظت کے حصار میں رہو گے۔"

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے فیاض سے کہا۔ "فیاض تم پروڈکٹو اور نان پروڈکٹو کے چکر میں رہتے ہو، یہ بتاؤ تمہارے یہ ماموں صاحب تمہارے لیے مفید ہیں یا غیر مفید۔"

"یار! یہ اب کیا پوچھ رہے ہو، ظاہر ہے کہ یہ بالکل غیر مفید ہیں۔"

"نہیں فیاض تم غلطی پر ہو۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے پورے دوستوں میں، سارے کاروباری حلقوں میں اور سارے جان پہچان والوں میں سے کوئی بھی ان کے جیسا مفید نہیں ہو گا۔ یہ بتاؤ کیا تمہیں اتنی دعائیں دینے والا، تمہیں اتنے خلوص سے رخصت کرنے والا، تمہارے لیے اتنی فکر کرنے والا کوئی اور ہو گا۔ یہ جو دعائیں دے رہے ہیں، یہ انمول ہیں۔ ان کی قیمت کا اندازہ کوئی لگا ہی نہیں سکتا۔ اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم ان کو مفید سمجھتے ہو یا غیر مفید۔"

فیاض نے اپنی گردن جھکا لی تھی۔ اس کے جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ اس نے ماموں کی طرف دیکھ کر اپنے بازو پھیلا دیے۔ ماموں نے اسے گلے سے لگا لیا۔ میں نے دیکھا کہ اس وقت فیاض کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ مجھ سے گلے ملا، پھر اس نے رعنا کی طرف دیکھا۔ "رعنا، ماموں اب کہیں نہیں جائیں گے۔ ان کو بھی اسی گھر میں ہمارے ساتھ رہنا ہے۔ تم ان کا خیال رکھنا، خدا حافظ۔"

فیاض چلا گیا۔ میں بھی رعنا کو خدا حافظ کہہ کر واپس آ گیا۔ اب اس گھر میں ایک ایسا غیر مفید شخص رہ رہا ہے جس کے پاس دعاؤں کی جو دولت ہے اس کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ رعنا کو بھی اب ماموں کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو گیا ہے۔

محترمہ عذرا رسول

السلام علیکم

یہ سچ بیانی میری نہیں، میرے ایک جاننے والے کی دختر نیک اختر کی ہے۔ امید ہے کہ قارئین کو اس کے انوکھے پن کی وجہ سے یہ سچ بیانی پسند آئے گی۔

حبیب الرحمن
(کراچی)

میں ہر قسم کے رویوں اور سلوک کی عادی ہو چکی تھیں۔ شاید اس لیے کہ میں قدرت کا عجیب شاہ کار تھی۔ کوئی مجھے دیکھتا تو اش اش کر اٹھتا اور کوئی مجھے دیکھتا تو دوبارہ مڑ کر دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتا تھا۔ بہت کم سنی میں دکھانے اور چھپانے کے احساس کا اتنا خیال نہیں تھا لیکن جوں جوں عمر کی منازل طے ہوتی گئیں کچھ چھپانے اور کچھ دکھانے کا خیال شدت اختیار کرتا رہا۔ نوبت یہاں تک آ گئی کہ میری بہت قریبی سہیلیاں تک اس بات سے بے بہرہ رہیں کہ میں کیا

کچھ چھپا کر رکھتی ہوں کیونکہ مجھے اس بات کا خوب اندازہ تھا کہ اگر میں نے وہ سب کچھ ان پر ظاہر کر دیا جو کچھ میں پورے زمانے سے چھپا کر رکھنا چاہتی ہوں تو شاید ان کی اور میری محبت و قربت میں کچھ نہ کچھ فرق آجائے گا اور بہت ممکن ہے کہ وہ حقیقتاً مجھ سے دوری اختیار کر لیں اور پھر میں اچھی ہمجولیوں سے محروم ہو جاؤں جو مجھے ذرا بھی گوارہ نہیں تھا۔

نہ میری کوئی بہن تھی اور نہ ہی کوئی بھائی۔ میں، میری والدہ اور میرے والد، گھر میں یہی تین افراد ہوا کرتے تھے۔ والدین تو والدین ہی ہوتے ہیں۔ وہ تو اپنے ان بچوں کو جو نہ چل سکتے ہیں، نہ بات کر سکتے ہیں، نہ سوچ سکتے ہیں، نہ کسی دکھ کا اظہار کر سکتے ہیں، ان سے بھی محبت کرتے ہیں، ان کی دن رات خدمت کرتے ہیں اور مکمل انسانوں سے بھی کہیں بڑھ کر ان سے پیار کرتے ہیں۔ میں تو ہر لحاظ سے ایک مکمل انسان تھی، تندرست و توانا، عام لوگوں سے ذہین، باشعور، سلیقہ مند۔

میری ددھیال اور میری ننھیال کافی لمبی چوڑی تھی لیکن اللہ کا احسان دیکھیے کہ میرے والدین چونکہ ملک سے باہر تھے اس لیے میرے بڑے ہونے باشعور اور ذہنی پختگی تک بھی پاکستان میں آ ہی نہیں سکے جس کی وجہ سے ننھیال اور ددھیال کو یہ علم ہی نہ ہو سکا کہ میں اپنے آپ کو اتنا لپیٹ لپاٹ کر کیوں رکھتی ہوں۔

پاکستان آکر بھی ہم اپنے آبائی شہر میں نہیں رہ سکے کیونکہ والد صاحب کو پاکستان آکر جو ملازمت ملی وہ آبائی شہر سے کوسوں دور تھی اور وہ بھی ایک غیر معروف شہر میں۔ پاکستان آکر بھی وہی نوکری ملی تھی جو بابا باہر کرتے تھے مگر تنخواہ کم تھی۔

جہاں ہم قیام پذیر تھے وہاں ویسے بھی کسی کا آنا آسان نہیں تھا اور پاکستان آکر بھی وہی نوکری ملی تھی جو بابا باہر کرتے تھے مگر تنخواہ کم تھی۔

والد صاحب کی ملازمت کیونکہ ایک معمولی درجے کی تھی اس لیے ان کے پاس بھی اتنی بچت نہیں ہو پاتی تھی کہ وہ سال بہ سال اپنے قریبی عزیز و اقارب سے ملنے جا سکیں۔ یہ بھی نہیں کہ وہ اپنوں سے بالکل ہی کٹ کر رہ گئے تھے۔ جب جب بھی گنجائش نکلتی، وہ ہم سب کو لے کر اپنے آبائی شہر ضرور جایا کرتے تھے، زیادہ چھٹیاں نہ ملنے کی وجہ سے یہ دورہ بہت ہی مختصر ہوا کرتا تھا اور لوگوں کی پُر تجسس نظروں کے باوجود انہیں اس بات کی خبر اب تک نہیں ہو سکی تھی کہ آ[illegible] وہ کیا چیز ہے جو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھنا چاہتی ہوں۔

ابتدائی تعلیم مڈل ایسٹ میں حاصل کرنے کے بعد ثانوی تعلیم سے آگے بڑھتے ہوئے اب میں کالج میں پہنچ چکی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان میں بے پناہ تبدیلیاں آجاتی ہیں۔ میں جب بہت چھوٹی تھی تو مجھے خود ہی اس بات کا ہوش نہیں تھا کہ کون سی چیز چھپانے کی ہوتی ہے اور کون سی نہیں لیکن بچہ خواہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، اسے دوسروں کی نظروں کا خوب اندازہ ہو جاتا ہے کہ کون اس کو خوش ہو کر دیکھ رہا ہے، کون ناراضگی کے ساتھ، کس کی نگاہوں میں محبت ہے اور کس کی نگاہوں میں نفرت، کس میں اجنبیت ہے اور کس میں اپنائیت۔ یہی وجہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹا بچہ بھی ہر کس و ناکس کے جانب نہیں لپکتا اور اگر کوئی مہمان آجائے تو وہ بار بار اپنے والدین یا گھر میں موجود افراد کی جانب مڑ مڑ کر دیکھتا ہے اور اس بات کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا ہے کہ مہمانوں کے آجانے سے گھر والے مطمئن ہیں یا ناخوش۔ اسی کیفیت کا میں اپنے بچپنے میں بھی شکار رہتی تھی اور مجھ میں یہ سوچ لاشعوری طور پر پروان چڑھتی رہی کہ میرے ساتھ ضرور کوئی معاملہ ہے اور اس معاملے کا شعور بھی مجھے اپنی بہت چھوٹی عمر میں ہی ہو گیا تھا۔ اب یہ بات الگ ہے کہ میرا بچپن ایک اجنبی ملک میں گزرا اس لیے قریبی عزیز و اقارب کی تیز نظروں کا مجھے سامنا نہیں کرنا پڑا اور جب کرنا پڑا تو میں خود ہی اس بات کو چھپانے کی اس حد تک عادی ہو چکی تھی کہ کیا مجال کہ سوتے ہوئے بھی مجھ سے کوئی بھول ہوئی ہو۔

جس چیز کو میں اپنی عام زندگی میں بڑی کامیابی کے ساتھ پوشیدہ رکھنے میں کامیاب رہتی رہی تھی وہ کالج میں کسی سے چھپالینا اور بھی سہل ثابت ہوا۔ میرا گھرانا کوئی بہت زیادہ مذہبی نہیں تھا اور میں از خود بھی نہ تو مذہبی خیالات کی حامل تھی اور نہ ہی حد سے زیادہ موڈرن ازم کا شکار، لیکن کالج میں جس انداز میں ڈھک ڈھکا کر رہتی تھی وہ دوسروں کے لیے ایک مثال بنتا جا رہا تھا۔ میں اس بات سے بہت اچھی طرح واقف تھی کہ میں اپنے چہرے کو اسکارف میں اس لیے نہیں چھپاتی کہ میرے مذہب کا تقاضا ہے جبکہ اگر میں اس کی نیت کر لیتی تو مجھے ایسا کرنے کا ثواب بھی ملتا لیکن میں جانتی تھی کہ میں نے ایسی کوئی نیت نہیں کی تھی لیکن میرے

اس انداز کو کالج میں آنے والی دیگر لڑکیوں نے بہت پسند کیا اور میرا یہ انداز اچھی خاصی مقبولیت اختیار کرتا گیا اور اس طرح ایک اور ہی ماحول میرے اردگرد بنتا گیا جو میرے لیے ایک خوش کن بات تھی۔

مجھے جس کالج میں داخلہ ملا وہ مخلوط کالج تھا۔ اس کالج میں، میں نے دیکھا کہ لڑکیاں ہوں یا لڑکے، سب ایک دوسرے میں دلچسپی لیتے تھے۔ اس میل جول پر مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن جو بات میرے لیے وجہ اذیت تھی وہ یہ تھی کہ ان میں شاید ہی کوئی ایک دوسرے کے لیے سنجیدہ دکھائی دیا ہو۔ تضیع اوقات کے علاوہ مجھے اس میں کوئی اور بات نظر نہیں آئی۔ میں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ میں خوبصورت ہوں اور بلاشبہ جنس مخالف کے لیے بہت کشش کی حامل بھی لیکن مجھ میں اللہ تعالیٰ نے اتنا کچھ دینے کے باوجود ایک ایسا عیب بھی رکھ دیا تھا کہ جونہی یہ کسی کے علم آجاتا تو میرا سارا حسن نہ صرف گہنا کر رہ جاتا بلکہ شاید مجھ میں دلچسپی لینے والا مجھ سے دوبارہ ملنا بھی گوارہ نہ کرتا لیکن یہ تو تب ہی ہوتا جب میں اس عیب کو کسی کے سامنے عیاں کرتی۔ اپنی اس کمزوری کو چھپا کر اتنی پُرکشش دکھائی دینے کے باوجود بھی میں نے اپنا رویہ رکھا ہی ایسا تھا کہ کسی کو مجھ سے قریب ہونے کی جرأت نہیں ہو سکی۔ نہ تو ساری لڑکیاں کسی منفی سوچ کی حامل ہوتی ہیں اور نہ ہی سارے لڑکے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ ایک دوسرے کے قریب ہونے والے لازماً منفی سوچ ہی رکھتے ہوں لیکن بعض اوقات معاشرے کی مداخلت مزاجوں میں کسی ضد کا سبب بن جاتی ہے اور دوسروں کے دل کے پار اترتے الفاظ اور دل و جگر کو چیرتی ہوئی نظریں اس جانب چلنے پر مجبور کر دیتی ہیں جن راہوں پر چلنے کی سوچ نے جنم بھی نہ لیا ہو۔

ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں وہ معاشرہ کچھ ایسا ہے کہ بہت سے معاملات میں بیجا سختی اور جبر سے کام لیا جاتا ہے جس کی وجہ سے زندگی اذیتناک بن جاتی ہے، جبکہ یہ ہمارا بہت بڑا محافظ بھی ہے۔

اگر ایمانداری سے غور کریں تو شاید دین و مذہب کسی کی اتنی محافظت نہیں کرتے جتنی حفاظت ہمارا معاشرہ ہماری کرتا ہے۔ جہاں تک دین و مذہب کا معاملہ ہے، بلاشبہ اس کی تعلیمات ہمیں ہر برائی سے بچنے کا درس دیتی ہیں لیکن اس کے باوجود ایک سخت نگراں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں یہ ہر چھوٹے بڑے کو بیشمار غلط کاموں کے کرنے اور بھٹکا دینے والی راہوں پر چلنے سے روکتے ہیں۔ یہی نہیں اگر اڑوس پڑوس میں بھی کوئی نامناسب بات ہو رہی ہو اس پر بھی ان کی کڑی نظر ہوتی ہے۔

آج میں اس بات پر بہت شدت کے ساتھ غور کر رہی تھی کہ جس عیب کو میں دنیا سے چھپاتی آئی ہوں، کیا مزید چھپا سکوں گی؟ ایک نہ ایک دن تو اس بات کی خبر دنیا کو ہو ہی جائے گی، پھر یہ بھی خیال شدت سے ستانے لگا تھا کہ جب میں اپنے عیب کو چھپاتی پھر رہی ہوں تو اپنے آپ کو کیوں نہیں چھپا کر رکھتی۔ یہ حسن بے پناہ بھی تو ایک ایسی برائی ہے جس سے کسی بھی وقت کوئی بڑا فتنہ پھیل سکتا ہے۔ اس بات کا احساس کالج میں داخلے کے فوراً بعد ہی ہونے لگا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میرا اپنا رویہ ایسا نہیں تھا کہ کوئی پیش قدمی کی ہمت کر سکے لیکن کالج کے طالب علم میری جانب متوجہ تو ہوتے ہی تھے اور یہ توجہ غلط انداز نظر میں بدل سکتی تھی۔

اب میں کالج کے دوسرے سال میں داخل ہو چکی تھی۔ سیشن شروع ہوئے بھی دو ماہ گزر چکے تھے۔ پہلے سال کی طرح دوسرا سال بھی اپنے معمول کے مطابق چل رہا تھا لیکن اس دن جب میں معمول کے مطابق کلاس فیلوز کے ساتھ کالج سے باہر نکل کر اپنی اس کوچ کی جانب بڑھ رہی تھی جس میں آیا جایا کرتی تھی تبھی میری سہیلی نے میرا بازو ہلاتے ہوئے ایک جانب متوجہ کیا۔ میں پہلے تو اس کے توجہ دلانے پر کچھ نہ سمجھی، لیکن ذرا زور سے کہا گیا تو اس سمت نگاہ کی جہاں کا اشارہ تھا۔ ایک پرانی لیکن اچھی حالت کی ایک کار میں بیٹھا ہوا ایک لڑکا مجھے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ ایسا ہونا کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن شاید مسلسل دیکھنا ہی وہ عمل رہا ہوگا جس کی وجہ سے میری سہیلی نے میری توجہ اس جانب مبذول کرائی تھی پھر یہ بھی ہوا کہ جب میں نے اس جانب توجہ دی تو اس نے آنکھوں میں لگے سیاہ سن گلاسز اتار کر ایک بھرپور نگاہ ڈالی لیکن ایسا کرنے کے بعد نہ صرف زیرلب کچھ کہتے ہوئے نگاہ پھیر لی بلکہ اپنی گاڑی تیزی سے آگے بڑھا لی اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ یہ انداز ایسا تھا کہ کچھ دیر کے لیے میں الجھن میں آگئی۔ میری ساتھیوں نے بھی میرا بھرپور جائزہ لیا لیکن کچھ پوچھا نہیں۔ پوچھتیں بھی تو میرے پاس کہنے اور بتانے کو کیا تھا سوائے حیرانی کے۔

میں کہہ نہیں سکتی کہ میری ساتھیوں نے اس بات کا کیا

مطلب لیا ہوگا بس اتنا احساس ہوا کہ وہ سب شاید میرے لبوں سے ہی کچھ سننا چاہتی ہوں لیکن اس وقت اپنی اپنی گاڑیوں یا کوچوں میں بیٹھنے کی جلدی میں سب کی سب کچھ پوچھے بغیر ہی ایک دوسرے سے اجازت لے کر روانہ ہو گئیں اور میں اپنی ”کوچ“ میں آبیٹھی۔

سارے راستے تو جو حالت رہی سو رہی لیکن رات بہت دیر تک اسی سوچ میں گزر گئی کہ وہ آخر تھا کون۔ اپنی جانب متوجہ ہوتے اور اکثر اوقات گھورتے لوگوں کو تو کافی مرتبہ پایا لیکن یہ انداز تو بہت ہی خطرناک تھا۔ اس حد تک دیکھنا کہ سہیلیوں کو توجہ دلانا پڑے۔ حالانکہ مجھے اس کی نگاہوں میں کہیں سے بھی غلط نگاہی کا تاثر نہیں ملا۔ تو پھر وہ سب کیا تھا؟ ہوگا کچھ، میں نے زور سے سر کو جھٹکا دیا اور تکیہ میں سر کو چھپا کر ایسی لیٹی کہ پھر اگلی صبح ہی بیدار ہوئی۔

”دیر سے سو کر حسب معمول اٹھ تو گئی تھی لیکن بے خوابی کی کیفیت یقیناً میرے چہرے اور آنکھوں سے ضرور عیاں ہو رہی ہوگی جو میری ماں سے چھپ نہ سکی۔ انہوں نے غور سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا کیوں بیٹا طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ کیا رات نیند نہیں آئی؟“

”نہیں میں رات کچھ زیادہ ہی دیر تک پڑھتی رہی ہوں۔“ میں نے بات تو بنائی لیکن مجھے اچھی طرح احساس ہو گیا تھا کہ اس بات کو انہوں نے سچ نہیں مانا البتہ مجھ سے دوسرا سوال بھی نہیں کیا۔

اگلے دن کالج میں میری فیلوز نے مجھے بری طرح گھیر لیا۔ ہر ایک کچھ نہ کچھ بول رہی تھی کہ کون تھا وہ؟، ہم بھی کچھ دیر ٹھہر کر ضرور دیکھتے، احوال لیتے اس طرح گھورے جانے کا سبب تلاش کرتے مگر ہماری کوچ نے وقت نہ دیا، وغیرہ وغیرہ۔

جس بات کی مجھے بھی خبر نہیں تھی اس بات کا میں ان سب کو کیا جواب دیتی۔ بڑی مشکل سے جان چھڑائی۔ پیریڈ بھی شروع ہونے والا تھا اس لیے وقتی طور پر جان چھوٹ گئی لیکن چھٹی کے وقت پھر جان عذاب میں پھنس گئی۔ یہ سلسلہ کئی دن تک چلا لیکن آخر کہاں تک چلتا البتہ میری چپ ایک معما ضرور بن گئی۔ کالج سے نکلتے ہوئے ہر روز میری نگاہیں بے ساختہ اسی سمت اٹھ جایا کرتی تھیں جہاں چار ہوئی تھیں لیکن وہ نہ تو اس سے پہلے دیکھا گیا تھا اور نہ ہی اس کے بعد لیکن تصور میں کچھ ایسے نقوش جما گیا تھا کہ مٹنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ میری جانب اس طرح اٹھنے والی نگاہیں اور یک ٹک دیکھنے والے جانے کتنے ہی تھے جن سے ہر روز ہی واسطہ پڑتا تھا لیکن اس کا انداز جداگانہ تھا۔ اس میں نہ تو مجھے کوئی آوارگی کی جھلک دکھائی دی تھی اور نہ ہی کوئی غلط نگاہی بس عجیب سا انداز تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ مجھے پہچان لینا چاہتا ہے اور بس۔ اس بس سے زیادہ میں اس کو آج تک کوئی نام تو نہ دے سکی لیکن وہ چہرہ میرے تصور میں کچھ یوں نقش ہو گیا تھا جیسے چٹان پر تراشیدہ کوئی مورت ہو اور مجھے یقین تھا کہ اگر میں نے اس کو برسوں بعد بھی دیکھا تو پہچان لوں گی۔

پہچان لوں گی مگر کیوں؟ میں نے بے ساختہ خود سے ہی سوال کیا لیکن میرے پاس سوائے شرما جانے کے اور کوئی جواب نہ تھا۔

اس بات کو جس کو میں ایک حادثہ کہتی ہوں، کئی ماہ گزر چکے تھے لیکن اس کے بعد ایک طویل سناٹا سا تھا۔ ذہن اکثر سائیں سائیں کرنے لگتا تھا۔ مجھے خود اس بات پر حیرت تھی کہ آخر اس سائیں سائیں کا میرے پاس کیا جواب ہے لیکن کوئی سوال ہوتا تو جواب بھی آتا۔ جب جب ایسی کیفیت ہوتی مجھے اپنا عیب یاد آجاتا اور پھر مجھ پر ایک اور ہی کیفیت طاری ہو جاتی لیکن ایسی کیفیت پہلے تو کبھی نہ ہوئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ جو بھی میرے چہرے کو پورا دیکھے گا اس کی ہمت ہی نہیں ہوگی کہ وہ مجھے اپنا سکے۔ اللہ نے مجھے حسن بے پناہ بھی دیا تو ادھورا دیا۔ یہ بات کسی کے لیے بھی قابل قبول ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ وہ چاند کو بھی قبول کرے اور اس کے گہن کو بھی۔ جب میں ہوں ہی ایسی تو پھر خوامخواہ یہ کسک کس لیے۔ وہ اگر دوبارہ مل بھی گیا تو بات تو میرے حسن کی طرح ادھوری ہی رہ جائے گی۔ ایک عجب کشمکش تھی جو میرے اور میرے دل و دماغ کے بیچ جاری تھی۔ میں اس کشاکش سے جتنا باہر نکلنا چاہتی تھی اتنی ہی کشاکش بڑھتی جاتی تھی۔

ایک روز جب میں اپنے کالج سے گھر لوٹی تو معمول کے خلاف اپنی اماں کو گھر کے دروازے پر منتظر پا کر حیران رہ گئی۔ میں جب کالج سے گھر آتی تو کوچ سے اترنے سے قبل ہی کوچ مناسب آواز سے ایک مرتبہ ہارن ضرور بجا دیا کرتی۔ یہ معمول محض میرے لیے مختص نہیں تھا۔ اگر کسی لڑکی کے گھر کا دروازہ کوچ کے راستے پر پڑتا اور وہ ڈراپ ہونے لگتی تو ڈرائیور ایسا ہی کیا کرتا تھا۔ میں اترتی، ہارن بجتا لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اماں دروازے پر ہی موجود میری منتظر

ہوں، میں گھر کے دروازے پر لگی بیل کے بٹن کو پش کرتی تھی تب ماں کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی اور دروازہ کھل جایا کرتا تھا۔ سلام ودعا کے بعد میں اپنے کمرے میں جاتی، حلیہ انسانوں کا سا بناتی تھی اتنی دیر میں کھانا کھانے کی میز پر سج جایا کرتا تھا۔ البتہ اماں اس وقت تک کھانا نہیں کھاتی تھیں جب تک میں کالج سے واپس نہ آجاؤں پھر ہم دونوں ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ میں کالج میں گزرا دن اور اماں گھر کے کام کاج کی تفصیل بتایا کرتی تھیں۔

آج غیر معمولی طور پر اماں دروازہ پر منتظر تھیں۔ جو میرے لیے ایک بالکل ہی نئی بات تھی۔ میں شاید اس کو بھی ایک اتفاق سمجھ لیتی لیکن میں ان کی آنکھوں میں ایک خاص چمک دیکھ چکی تھی۔ دروازہ کھولنا، وہ آنکھوں کی چمک، میں حسب معمول یونیفارم بدلنے کے لیے گھر میں پہننے کے کپڑے سنبھالے واش روم میں داخل ہو چکی تھی لیکن یہ دونوں خلاف معمول باتیں میرا پیچھا نہ چھوڑ سکیں۔ میں تمام کاموں سے فارغ ہو کر حسب معمول کھانے کی میز تک پہنچی تو اماں کو حسب سابق کھانے پر اپنا منتظر پایا۔ کھانے کی میز پر بے شک وہ حسب سابق ہی موجود تھیں لیکن میں ایک تبدیلی ضرور محسوس کر رہی تھی اور وہ ان کی مسکراتی آنکھیں تھیں جس میں مجھے کوئی کہانی جھلکتی نظر آرہی تھی۔ میں نے عہد کر لیا تھا کہ میں خود سے کوئی سوال نہیں کروں گی۔ اگر کوئی کہانی ہے تو کتنا اچھا ہوگا کہ خود میری اماں مجھے سنائیں۔

شام کے کھانے پر کچھ مہمان آرہے ہیں ذرا اچھی طرح تیار ہو جانا۔ کھانے کے دوران اماں نے کہا۔ ”کچھ مہمان“؟ ”تیاری“ جیسے الفاظ کس جوان لڑکی کو سمجھ میں نہیں آتے ہوں گے۔ میرا آخری نوالہ میرے حلق میں پھنستے پھنستے رہ گیا۔ میں نے انجان بنتے ہوئے کہا کہ ہم اس شہر میں کتنے اجنبی ہیں پھر بھی مہمان؟

”ہاں!“ اماں نے کہا۔ ”لیکن یہ ہاں مجھے ”آہ“ جیسی لگی۔ آنکھوں کی چمک بھی کچھ معدوم ہوگئی اور آواز میں پہلے جیسی پختگی بھی نہ رہی۔ مجھے اللہ نے چہرہ پڑھنے، آوازوں کا مدوجزر ان کے اتار چڑھاؤ کو جانچنے کی بڑی صلاحیت دی تھی۔ مجھے وہ انداز اور آنکھیں بھی یاد تھیں جب میں آج گھر میں داخل ہوتے ہوئے اماں میں دیکھ چکی تھی اور ابھی بدلتی ہوئی صورت حال بھی میرے سامنے تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی اور سوال کرتی، میری ماں نے دھیمے لہجے میں کہا کہ آج کچھ لوگوں نے جو تمہارے ابو کے ملنے والے ہیں، اس بات کی خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ ہمارے گھر تمہیں دیکھنے کے لیے آئیں گے۔ یہ سن کر تمہارے ابو نے انہیں رات کے کھانے پر مدعو کیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تم جتنی خوبصورت ہو اتنا ہی بڑا عیب تمہارے اندر موجود ہے۔ اگر ان کو معلوم ہو گیا تو شاید وہ ہی کیا کوئی بھی تمہیں قبول نہیں کرے گا۔ یہ بات تمہارے والد بھی اچھی طرح جانتے ہیں، میں بھی اور تم بھی۔ میں نے تمہارے والد سے اس مسئلے پر بات کی تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ کہنے لگے کہ پہلے انھیں آنے تو دو۔ کچھ بات آگے بڑھے تو کوشش کریں گے کہ ان کو تمہارے عیب سے آگاہ کریں۔ چھپائی تو کوئی بات نہیں جائے گی لیکن اگر اس بات کو یک دم نہیں بتایا جائے تو کیا حرج ہے۔ میں ان کی باتیں سن کر سناٹے میں آگئی۔

میں بیشک بہت مذہبی تو نہیں تھی لیکن اللہ کا اتنا خوف ضرور رکھتی تھی کہ لین دین کے وقت مال کے اچھے اور برے سارے پہلو خریدار کے سامنے ہونے چاہئیں۔ دھوکا کسی بھی صورت میں نہیں ہونا یا دینا چاہیے۔ بے شک شادی تجارتی مال کی طرح لینے اور دینے جیسا معاملہ نہیں ہوتا لیکن خوبی کو ظاہر کرنا اور عیب کو چھپانا ایک نہایت ناپسندیدہ فعل ہے جس کو کسی صورت نہیں ہونا چاہیے۔

میں نے اپنی نگاہیں نیچی کرتے ہوئے اپنی والدہ سے کہا کہ کیا ایسا کرنا درست ہوگا؟ کیا بات شروع کرکے اور کسی حد تک آگے بڑھانے کے بعد سچ کو سامنے رکھنے سے کسی قسم کے کوئی برے نتائج سامنے آنے کے امکان نہیں؟ کیا اس طرح دوسروں کے دل میں ہماری جانب سے کوئی میل نہیں آئے گا؟ کیا یہ بات پھر دور دور تک نہیں پھیلے گی؟

کیا معلوم مجھے یہ باتیں اتنی صاف گوئی سے کہنی چاہیے تھیں یا نہیں لیکن میں ایک ہی سانس میں کہتی چلی گئی اور ماں بھی پتھر کی مورت کی طرح میرا منہ تکتی رہ گئیں۔ انھوں نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر بعد بس اتنا کہا کہ زندگی بچانے کے لیے اگر مردار بھی کھانا پڑ جائے تو وہ گناہ نہیں ہوتا۔ یہ کہہ کر وہ کھانے کی میز سے اٹھ گئیں اور بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے اپنے بیڈ روم کی جانب روانہ ہو گئیں۔ اس طرح ان کا اپنے بیڈ روم میں جانا بھی معمول کے خلاف تھا۔ وہ جب تک سارے برتن سمیٹ کر اور ان کو دھو نہ لیتی تھیں کبھی آرام نہ کرتیں۔

آج مجھے بہت ہی دکھ ہوا اور میری آنکھوں میں

آنسوؤں کا سیلاب سا امڈ آیا۔ والدین اپنی اولاد کے لیے کتنے فکر مند ہوتے ہیں اور خاص طور سے اپنی بچیوں کے لیے کتنے پریشان رہتے ہیں، مجھے آج اس کا اندازہ اور بھی شدت سے ہوا۔ شادیاں تو ان کی بھی ہو جاتی ہیں جو معذور ہوتے ہیں، سماعت سے محروم ہوتے ہیں، جسمانی عیب کا شکار ہوتے ہیں، عقل سے پیدل ہوتے ہیں، نابینا ہوتے ہیں، لیکن میں تو ایک مکمل، عاقل، بالغ، ذہانت سے بھرپور، مکمل ہاتھ پاؤں والی ہوں، بس ایک عیب ہے۔ بے شک وہ عیب ایسا ہے کہ اس پر نظر پڑتے ہی میری ساری خوبیاں اس کے آگے ماند ہو کر رہ جائیں گی۔ میں نے اپنے ہوش و حواس میں آج تک اس کو کسی پر آشکار نہیں ہونے دیا۔ چھوٹی عمر میں ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ مجھ میں کوئی ایسی بات ضرور ہے، جس کی وجہ سے کوئی چھوٹا بڑا مجھے اپنے قریب نہیں آنے دیتا۔ بچے لوگوں کی نگاہیں اور رویوں کی جتنی سمجھ رکھتے ہیں شاید بڑے نہیں رکھتے اسی لیے کافی چھوٹی عمر سے ہی میں اپنے چہرے کو اس خوبی سے ڈھانپ کے رکھنے کی عادی ہو چکی تھی کہ شاید ہی کوئی میرا چہرہ دیکھ سکتا ہو۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ عادت اس قدر پختہ ہو گئی تھی کہ مجال ہے جو کوئی مجھے دیکھ سکا ہو۔ پھر ہوا یہ کہ والد صاحب پاکستان آگئے اور آئے بھی اپنے آبائی شہر میں لیکن جلد ہی وہ اپنے آبائی شہر سے بہت دور چلے آئے۔ ان کی روزی روٹی شاید اسی شہر میں ہی لکھی گئی تھی۔ میں ان کے دوسرے شہر میں آجانے سے بہت ہی مطمئن تھی۔ سب کے ساتھ رہنے میں مجھے اس بات کا خوف ہر وقت رہتا تھا کہ نہ جانے میرا عیب کب میری کزنوں یا رشتے کے بھائیوں کے علم میں آجائے اور مجھے ناحق زحمت اٹھانا پڑے۔ میں آج سوچ رہی تھی کہ اس طرح اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنے کی عادت اور دوسروں کی نگاہوں سے اپنے قدرتی عیب کو چھپا کر میں نے شاید زندگی کی بہت بڑی حماقت کی ہے۔ وہ سارے بچے اور بچیاں جن کی معذوری اور عیوب کا میں نے ذکر کیا ہے آخر وہ بھی کسی نہ کسی کے ہو ہی جاتے ہیں اور ایسا ہو جانے میں جو بات اہم ہوتی ہے وہ یہی ہوتی ہے کہ وہ جیسے بھی ہوتے ہیں سب کے سامنے ہوتے ہیں۔ ان کی کوئی کمزوری، کوئی کمی اور کوئی معذوری کسی سے پوشیدہ نہیں ہوتی۔ یہی وہ بات ہے، جس کی وجہ سے ان کے اپنے اپنے ٹھکانے بن ہی جاتے ہیں۔ میں نے اپنی کمزوری کو اس بری طرح پوشیدہ کیا کہ کسی اپنے یا غیر کو احساس تک نہیں ہونے دیا کہ میرے بھرپور حسن کے ساتھ کتنا بڑا اور برا عیب لگا ہوا ہے۔ اگر میں اپنی پوری حقیقت کے ساتھ سب کے سامنے بلاتکلف آتی جاتی رہتی تو لوگوں کو قبول کرنے یا رد کرنے میں کسی کو کوئی تردد نہ ہوتا۔ مجھ میں اب اتنی ہمت ہی پیدا نہیں ہو رہی تھی کہ اپنے آپ کو اپنی حقیقی صورت میں پیش کر سکوں۔ یہ میں نے بہت ہی برا کیا۔ زیر لب یہی الفاظ بڑبڑاتے ہوئے میں نے اپنے آنسوؤں کو اپنے آنچل سے خشک کیا اور کھانے کے برتن سمیٹ کر کچن میں پہنچائے۔ جس طرح اماں کھانے کے بعد پلیٹیں دھو کر، کچن اور کھانے کی میز کو چمکا دیا کرتی تھیں، آج زندگی میں پہلی مرتبہ یہ کام میں نے خود کیا۔ کام ختم کر کے میں اماں کے کمرے میں گئی، وہ سو رہی تھیں لیکن مجھے لگا کہ وہ سونے سے پہلے شاید روتی بھی رہی ہیں۔ ان کے چہرے پر دوپٹا لپٹا ہوا تھا اور ہاتھ آنکھوں پر تھا۔ مجھے بھی رونا آنے لگا لیکن میں اپنے آنسو پیتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب چلی گئی۔ جا کر لیٹی ہی تھی کہ گہری نیند نے مجھے آدبوچا۔

''اٹھو بیٹا، اٹھو۔'' والدہ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ مجھے اٹھتا دیکھ کر وہ کمرے سے چلی گئیں۔ میں نے دیکھا کہ شام کے سائے کافی گہرے ہو چکے ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ آج گھر میں کسی کی آمد آمد ہے جس کی وجہ سے کام کچھ زیادہ ہی ہوگا۔ اس سے قبل بھی کبھی کبھی میری نیند گہری ہو جایا کرتی تھی لیکن اماں نے کبھی کچی نیند سے نہیں اٹھایا۔

ہاتھ منہ دھو کے میں باہر آئی اور مہمانوں کی خاطر داری کرنے کی تیاری میں اماں کا ہاتھ بٹانے لگی۔ میں تو سوچ میں گم تھی ہی لیکن اماں نے بھی اس دوران کسی قسم کی گفتگو میں حصہ نہیں لیا۔ ظاہر ہے وہ میری ماں تھیں اور میرے دکھ سے اچھی طرح واقف تھیں۔ قدرت سے کون لڑ سکتا ہے۔ یہ نہ میرے بس کی بات تھی اور نہ ہی اماں یا والد کے بس کی بات۔ ہمارے اختیار میں بس یہی تھا کہ اس صورتِ حال کا مقابلہ کیا جائے۔ مگر کس طرح؟

خاطر داری کی ساری تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ امی نے اپنے کپڑے تبدیل کر لیے تھے۔ میں بھی تیار ہو چکی تھی لیکن کسی قسم کے اہتمام کے بغیر۔ اماں نے بھی کسی خاص تیاری کے لیے نہیں کہا تھا۔ مہمان آچکے تھے۔ ہماری ہی طرح لگتے تھے۔ میری اماں بھی گھر میں پردے وردے کا زیادہ خیال نہیں رکھتی تھیں البتہ باہر جاتیں تو ان کی آنکھوں

کے سوا کچھ بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ شاید آنے والے بھی ایسے ہی تھے اسی لیے سب ڈرائنگ روم میں ہی تھے۔ وہیں والد بھی تھے۔ والدہ ڈرائنگ روم کی جانب جاتے جاتے رکیں۔ مجھے پیار بھرے دکھ کے ساتھ دیکھا۔ پھر کہا کہ پندرہ بیس منٹ کے بعد تم مشروبات اور دیگر لوازمات لے کر آجانا اس طرح آنے والے تم کو دیکھ بھی لیں گے البتہ کھانے کا سامان میں خود ہی لے کر جاؤں گی۔ یہ کہہ کر وہ مڑی ہی تھیں کہ میں نے آہستہ سے کہا۔ ''رکیں۔''

وہ رکیں اور پلٹ کر میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔

''اماں! آپ نے بتایا ہی نہیں یہ کون لوگ ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور کون کون ہیں۔''

''یہ سب غیر ہیں، شہر کے مضافاتی علاقے سے آئے ہیں، میرے لیے بالکل غیر ہیں البتہ تمہارے والد کے دوستوں میں سے ہیں، وہ خود آئے ہیں، ان کی وائف ہیں اور ایک شادی شدہ بیٹی بھی ہے لیکن جس لڑکے کے لیے رشتہ مانگنے آئے ہیں وہ ان کا بیٹا نہیں بلکہ ان کے دوست کا بیٹا ہے اور بیٹے کے والد ایک عرصہ دراز سے ملک سے باہر ہیں۔ ان کا کبھی کبھی پاکستان آنا ہوتا ہے۔'' مختصر مختصر جملوں میں اماں نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا اور مجھے ورطہ بےخودی جیسی کیفیت میں چھوڑ کر ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گئیں۔ ایک لمحے کو میں سن سی ہو کر رہ گئی۔ ان کی کئی باتیں تشریح طلب تھیں لیکن وہ رکتیں تو تشریح بھی پوچھتی۔ بھلا کیا بات ہوئی کہ ابا کے دوست کے بھی دوست کا بیٹا۔ کیا ضرورت پڑی تھی دوست کے دوست کو کہ وہ ان کا نمائندہ بن کر ٹپک پڑے پھر ان کو میرے بارے میں کیسے پتا چلا۔ کس نے مشورہ دیا کہ وہ میرے گھر جا کر میرے لیے بات کریں۔ اماں جن سے واقف نہیں۔ گھر آنا جانا نہیں تو میں کہاں دیکھ لی گئی۔ کیا میں ٹی وی چینلوں پر آتی ہوں، ریڈیو پر خبریں سناتی ہوں، کھیل کے میدانوں میں میرا ڈنکا بجتا ہے۔ کون سا میرا شہرہ چار سو ہے کہ پاکستان سے باہر سے حکم صادر کر دیا کہ جاؤ اور اپنے دوست (میرے ابو) سے میرے لیے بات کو آگے بڑھاؤ۔ کیا یہ سب باتیں وضاحت طلب نہیں تھیں؟ لیکن اب میں ہواؤں سے تو یہ سب کچھ معلوم کرنے سے رہی۔ جن سے وضاحت طلب کی جا سکتی تھی وہ تو مجھے ہکا بکا چھوڑ کر ڈرائنگ روم جا چکی تھیں۔

اس ادھیڑ بن میں پندرہ بیس منٹ گزر جانے کا پتا بھی نہ چلا۔ میں نے اندر لے جانے والی چیزیں ٹرالی میں سجانا شروع کیں۔ انسان اگر ایک مرتبہ سچ بولنے یا سچ ظاہر کرنے کا فیصلہ کر لے تو سچائی کمزور سے کمزور کو بھی تندرست و توانا کر دیتی ہے۔ میں نے بھی آج فیصلہ کر لیا تھا کہ میں آنے والوں سے کچھ بھی نہ چھپاؤں گی لیکن ایسا انداز اختیار کروں گی کہ میرے والدین کو یہ گمان بھی نہ گزرے کہ ایسا سب کچھ میں جان بوجھ کر کر رہی ہوں۔ میں خود تو صدمہ اٹھا لوں گی لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ والدین اس عمر میں کوئی صدمہ اٹھائیں۔ نہ معلوم وہ سہہ سکیں یا نہیں۔ جنہوں نے مجھے بے پناہ توجہ اور محبت دی، ناز و نعم سے پالا اور اپنا سب کچھ مجھ پر وار دیا میں ان کو کوئی دکھ نہیں دینا چاہتی تھی لیکن اللہ کی ناراضگی بھی مول نہیں لینا چاہتی تھی اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جو حقیقت ہے اسے پوشیدہ نہیں رکھوں گی لیکن یہ سب کچھ اس طرح کروں گی کہ والدین کو میری ذات سے کوئی اذیت نہ ہو۔ رہی یہ بات کہ میری اس حرکت کے نتیجے میں جو کچھ ہوگا اللہ اس پر والدین اور مجھے صبر دے۔

اس عہد کے ساتھ ہی جیسے ڈھارس سی بندھ گئی تھی اور میں اپنے اندر بہت مضبوطی محسوس کرنے لگی تھی۔ خاطر داری کی ساری اشیا ٹرالی میں رکھنے کے بعد میں نے اپنا جائزہ لیا، دل کو مضبوط کیا اور ٹرالی پکڑ کر ڈرائنگ روم کی جانب روانہ ہو گئی۔ پردہ سرکا کر میں ٹرالی سمیت ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ سب لوگ باتوں میں مصروف تھے۔ مجھے دیکھا تو سب کی نگاہیں جیسے مجھ پر گڑ سی گئیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ جیسے ہر نگاہ میں زنجیر سی پڑ گئی تھی تو بے جا نہ ہوگا۔ گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ چکا تھا اور الفاظ جیسے نوک زبان پر آکر جم سے گئے تھے۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ میں تھی ہی ایسی۔

میں نے دھیمی آواز سے سب کو سلام کیا، جواب ملا مگر سانسیں بحال ہونے پر۔ ٹرالی ڈرائنگ روم کے وسط تک پہنچا کر میں کچھ اس طرح پلٹی کہ میرے چہرے پر لپٹا ہوا اسکارف ٹرالی کے ایک کونے میں اٹک کر کھل گیا۔ اسکارف کیا کھلا ڈرائنگ روم میں موجود ہر فرد کے ہونٹ گول ہو گئے اور وہ زنجیر جو ہر نگاہ میں پڑ کر رہ گئی تھی تسبیح کے دھاگے کی طرح ٹوٹ گئی۔ میرے دائیں کان کی جگہ گوشت کا ایک چھیچھڑا یوں لٹکا ہوا تھا جیسے کسی نے تازہ تازہ گوشت کا لوتھڑا کاٹ کر چپکا دیا ہو اور جس سے خون بس ٹپکا ہی چاہتا ہو۔ میں نے بوکھلاہٹ کی کامیاب اداکاری کرتے ہوئے اسکارف کو سنبھالا اور ٹرالی کو ڈرائنگ روم کے وسط میں چھوڑ کر باہر نکل کر اپنے کمرے میں جا گھسی۔ مجھے اچھی طرح احساس ہے کہ ڈرائنگ روم کا ہر فرد ایک ہیجانی کیفیت کا شکار ہو چکا تھا اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ آنے والے مہمان تھوڑی ہی دیر بعد بغیر کھانا کھائے ہی گھر سے روانہ ہو چکے تھے۔

اچھا ہی ہوا، دوسری صبح جب میں کالج جانے کے لیے تیار ہو کر ناشتا کرنے کھانے کی میز پر پہنچی تو میری اماں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”کیا یہ اچھا ہوا۔“

”اچھا ہی ہوا تم نے کچھ چھپانے کی بجائے سب کچھ ان پر عیاں کر دیا۔“

”نہیں اماں میں نے بالکل بھی جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔ نہ تو ٹرالی میں اسکارف الجھتا اور نہ میرا چہرہ کھلتا۔“ میں نے زندگی میں پہلی بار اپنی اماں سے جھوٹ بولا اور وہ بھی اتنے اعتماد کے ساتھ کہ میں نے ان کی آنکھوں میں شک کی ہلکی سی جھلک بھی محسوس نہیں کی۔

”یہ پھر بھی اچھا ہی ہوا کہ آنے والے حقیقت حال سے واقف ہو گئے۔ تم ٹھیک ہی سوچتی ہو کہ اگر وقتی طور پر کچھ عرصے کے لیے کسی عیب کو چھپا بھی لیا جائے تو آخر کو اسے ظاہر ہونا ہی ہوتا ہے۔ سوچتی ہوں کہ آخر ہر لحاظ سے معذور، مختلف نعمتوں سے محروم اور فاتر العقل لڑکے اور لڑکیوں کی بھی شادی ہو ہی جاتی ہے تو تمہاری کیوں نہیں ہو سکتی۔“ اماں نے یہ جملہ کچھ اس طرح دہرایا جیسے وہ اپنے آپ ہی سے کلام کر رہی ہوں۔

”اماں، بات یہ ہے کہ وہ دنیا کی نظروں سے کچھ نہیں چھپا رہے ہوتے لیکن میں نے بچپن ..... سے ہی اپنی کمزوری کو اس طرح چھپا کر رکھا کہ کل سے پہلے اس بات کا کسی کو علم ہی نہیں ہو سکا۔“ اتنا کہہ کر اور ماں کو سوچوں میں غرق چھوڑ کر میں کالج جانے کے لیے گھر سے باہر نکل آئی اس لیے کہ کالج کوچ کے ہارن کی جانی پہچانی آواز مجھے سنائی دے گئی تھی۔

میں کالج سے اب یونیورسٹی میں آ چکی تھی۔ میرے ساتھ کالج کی صرف ایک لڑکی نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ باقیوں میں سے کچھ گھر بیٹھ گئی تھیں کہ ان کے گھر والوں کے نزدیک یہ بھی بہت تھا کہ وہ انٹر پاس ہو گئی تھیں، کچھ پیا گھر سدھار گئی تھیں۔ میں بھی کب کا پیا گھر جا چکی ہوتی اگر میرے چاند کو گہن نہ لگا ہوتا۔ میرے گھر شادی کی غرض سے آنے والے وہی آخری مہمان تھے جنھوں نے مجھے پوری حقیقت کے ساتھ دیکھنے کے بعد پلٹ کر دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا۔ انہیں آئے ہوئے بھی دو سال ہونے کو آئے تھے۔ یونیورسٹی کیونکہ میرے اس شہر میں نہیں تھی جس میں والدین رہائش پذیر تھے اس لیے میں ہاسٹل ہی میں قیام پذیر تھی اور وہ بھی اپنے پوری حقانیت کے ساتھ اس لیے مجھے اس کے مخلوط ہونے پر کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ یہ پریشانی تو میری اپنی خود کی لائی ہوئی تھی کہ میں نے اپنی حقیقت کو چھپائے رکھا تھا۔

بعض اوقات مذہبی تہواروں کی وجہ سے کافی چھٹیاں اکٹھی مل جایا کرتی ہیں۔ محرم کی نو دس کچھ اس انداز میں آئیں کہ محض چار چھٹیاں لینے سے نو دنوں کی چھٹیاں مل گئیں۔ میں یہ چھٹیاں گزارنے گھر پہنچ گئی۔ یوں تو میرے آنے پر گھر میں والد اور والدہ بہت ہی خوش ہوا کرتے تھے لیکن اس مرتبہ دونوں کی خوشیاں چھپائے نہیں چھپ رہی تھیں۔ میں سہم گئی کہ پھر کوئی رشتہ لے کر نہ آ گئے ہوں اور پھر مجھے دیکھ کر وہ پلٹ کر دیکھنا بھی گوارہ نہ کریں۔

مجھے جز بز دیکھ کر اماں نے کہا۔ ”ہم مڈل ایسٹ میں جہاں رہتے تھے وہاں ہمارا آنا جانا ایک گھر میں بہت تھا۔ تم بہت چھوٹی ہوا کرتی تھیں اس لیے شاید تمہیں وہ یاد نہ رہے ہوں۔ تمہارے والد کے وہ دوست یہاں آئے ہوئے ہیں، اسی شہر میں، تمہارے والد سے مل چکے ہیں، ان کی وائف بھی کل تک آ جائیں گی۔ وہ چند دنوں کے لیے آئے ہیں۔ پرسوں وہ ہمارے گھر آئیں گے۔ بس یہ خوشی اسی بات کی ہے۔ برسوں بعد جب کوئی بہت اچھے ملنے والے ملیں تو اس کی خوشی ہی کچھ اور ہوتی ہے اور ہاں کچھ ایسے اشارے ضرور ملے ہیں کہ وہ شاید تم کو بھی دیکھیں۔ اگر ایسا ہے تو کم از کم ایک بات ضرور اطمینان بخش ہے کہ وہ تمہیں تمہاری ہر

حقیقت کے ساتھ دیکھے ہوئے ہیں۔ یہ بس میرا اندازہ ہے کیا معلوم صحیح ہو کیا معلوم غلط۔“

یہ کہہ کر اماں اپنے معمول کے کاموں میں مصروف ہو گئیں لیکن مجھے سوالیہ نشان بنا کر چھوڑ گئیں۔ مجھے یقیناً وہ سارے افراد اور ان کے چہرے کیا خاک یاد رہتے یا میں ان کو اتنے ماہ و سال کے فاصلہ پر کیا پہچان پاتی لیکن اتنا تو میری یادداشت میں محفوظ تھا کہ اماں قریب میں آباد ایک گھر میں ضرور آیا جایا کرتی تھیں۔ غیر ملک میں اگر کوئی ملکی مل جائے تو وہ رشتے داروں سے بھی زیادہ عزیز ہو جاتے ہیں اور اگر ہم مزاج بھی ہوں تو سونے پر سہاگا ہو جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی اماں ان کے گھر جایا کرتی تھیں، مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ان کے گھر میری ہم عمر ایک لڑکی بھی ہوا کرتی تھی اور ایک اس کا بڑا بھائی۔ بہن اور بھائی کی عمر میں ...... سات سال کا فرق تھا۔ یہ بات بھی اکثر گھر میں ہونے والی باتوں سے علم میں آئی تھی۔ بچھڑے دوست ایک دوسرے کو یاد تو کیا ہی کرتے ہیں لہٰذا اماں اور ابو کے درمیان ان کا ذکر اکثر و بیشتر ہوتا ہی رہتا تھا اور اسی طرح کے تذکروں سے ہی مجھے یہ اندازہ ہوا تھا کہ ان دو گھرانوں کے بیچ انسیت اور محبت کا رشتہ بہت گہرا ہے اور اس رشتے کی گہرائی کا آج مجھے ثبوت بھی مل رہا تھا۔ ابو اماں بہت خوش تھے اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ”پرسوں“ کا بہت شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔

☆......☆

جب میں مشروبات کی ٹرالی لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو انکل اور آنٹی نے میرا استقبال کھڑے ہو کر کیا اور میرے سر پر دست شفقت پھیر کر اپنے بھرپور پیار کا اظہار کیا۔ میں ان کے سامنے بے شک ڈھک چھپ کر آئی تھی لیکن کچھ اس انداز میں کہ میری حقیقت بھی آنچل کے اندر سے چھلکتی رہے۔ مجھے اس بات پر بہت حیرت ہوئی کہ میں نے ان کی آنکھوں میں کوئی ناگواری دیکھی اور نہ کوئی حیرت۔ تھوڑی دیر کے لیے تو مجھے حیرانی ہوئی لیکن مجھے اماں کی وہ بات یاد آ گئی کہ انہوں نے بچپن میں مجھے دیکھا ہوا ہے۔ مجھے بیٹھنے کا کہا گیا۔ میں بیٹھ گئی لیکن چند منٹ بعد میں باہر آ گئی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ڈرائنگ روم سے کبھی ہلکی اور کبھی تیز باتوں کی آوازیں آتی رہیں۔ آوازیں دھیمی آئیں یا اونچی دونوں میں ایک قدر مشترک ضرور تھی اور وہ یہ تھی کہ سارا انداز خوشگوار ہی تھا۔ ملے بھی تو ایک طویل عرصے کے بعد تھے۔

امریکی سول وار 65-1860

یہ شمالی فیڈرل ریاستوں اور جنوبی ریاستوں کے درمیان لڑی گئی جنوبی ریاستیں اپنے علاقے الگ کروانا چاہتی تھیں لیکن شمالی ریاستیں اکٹھا رہنا چاہتی تھیں شمالی ریاستیں جیت گئیں۔ اس کے نتیجے میں غلامی ممنوع قرار دی گئی اور بڑے پیمانے پر معاشی ترقی ہوئی۔

شاہد محمود ڈوگر کی تصنیف ”کون کیا ہے سے“ اقتباس

انتخاب: مسرت افتخار۔ فوجیوں والا

مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ والد و والدہ کے انگ انگ سے خوشی ٹپک رہی تھی۔ میں بھی ان کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھی اور پھر جس انداز میں انکل اور آنٹی ملے تھے وہ بھی میرے لیے بہت ہی خوش کن تھا۔ ملنے کو تو مجھ سے کافی آنے جانے والے ملا کرتے تھے اور بہت خوشی کا اظہار کیا کرتے تھے لیکن جب سے میں اپنی سچائیوں کے ساتھ سامنے آنے لگی تھی، ان کی نگاہوں میں وہ پہلی سی چمک نظر نہیں آتی تھی۔

میں، والد اور والدہ کھانے کی میز پر ایک ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ جیسے ابو نے میری والدہ کو کوئی اشارہ کیا ہو۔ وہ کھانے کے برتنوں کے سمیٹنے کے بہانے کچھ برتن اٹھا کر کچن کی جانب چلی گئیں۔ ابو نے پہلے تو میرے چہرے کا جائزہ لیا پھر دھیمی آواز میں مجھے مخاطب کر کے کہا۔

”بیٹے، یہ تمہیں مانگنے آئے تھے۔“

”کیا مجھے؟ اس حالت میں؟“ میں نے اپنے عیب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں، ایسا ہی ہے۔ وہ تو ہمیں بہت برسوں سے جانتے ہیں۔ تمہیں تو گود میں کھلایا ہوا ہے۔ وہ لڑکی جو تمہارے ساتھ کھیلا کرتی تھی اس کی دو سال قبل شادی ہو چکی ہے اور وہ کینیڈا سدھار چکی ہے۔ بیٹا بسلسلۂ تعلیم کافی عرصے سے پاکستان ہی میں ہے۔ ہم جس شہر میں آج کل آباد ہیں یہ اسی شہر کے رہنے والے ہیں۔ ہماری طرح ہی کے ہیں۔“ ایک ہی سانس میں وہ ساری باتیں کہہ گئے اور میں سر جھکائے سنتی رہی۔

”لیکن سوال تو یہ ہے کہ وہ مجھے اس حالت میں قبول

کرنے کے لیے کیوں تیار ہیں؟"

ابو نے ایک طویل سانس کھینچی۔ کچھ توقف سے کام لیا اور بولے۔ "بیٹا! اللہ کی یہ دنیا ہر طرح کے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ میرا بیٹا بے عیب ہے۔ قابل ہے، لائق فائق ڈاکٹر ہے اور پڑوسی شہر میں ایک درمیانے درجے کا اسپتال بہت کامیابی کے ساتھ چلا رہا ہے لیکن بقول ان کے وہ ہاتھوں اور پیروں کے عیب کا شکار ہے۔ معذور نہیں ہے لیکن عیب تو عیب ہی ہوتا ہے۔ اگر آپ لوگ قبول کریں تو وہ بات آگے بڑھا سکتے ہیں۔"

میں ابھی اپنے لرزتے جسم پر قابو بھی نہیں پا سکی تھی کہ انہوں نے کہا۔ "ان کو کہیں سے یہ خبر ملی تھی کہ ہم اس شہر میں اس محلے میں رہتے ہیں تو انہوں نے تصدیق کے لیے اپنے ایک دوست کو ہمارے گھر بھیجا تھا۔ انہی کے ذریعے ہی معلوم ہوا تھا کہ وہ ہم ہی ہیں اور بچی کے اسکارف کھل جانے سے تصدیق ہوگئی تھی۔ جب سے ہم نے مڈل ایسٹ چھوڑا ہے اس وقت سے لے کر آج تک وہ جواب ایک قابل ڈاکٹر ہے ہماری بیٹی کو یاد کرتا ہے۔ جب بھی شادی کی بات کی جاتی ہے تو وہ یہی کہتا ہے کہ وہ شادی کرے گا تو اسی سے کرے گا۔ عیب سے پاک اللہ کی ذات ہے اور وہ عیب جو قدرت دے اس میں انسان کا کیا قصور لیکن میرا بیٹا پیدا تو بے عیب ہی ہوا تھا لیکن؟" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگئے اور اٹھ گئے کہ مجھے انکار میں جواب ملے یا اقرار میں، ہماری محبت میں انشا اللہ کوئی فرق نہیں آئے گا۔

جوں جوں والد صاحب چھوٹے چھوٹے جملوں میں کہانی کو کوزے میں بند کرتے گئے توں توں میرے بدن کی کپکپی کم ہوتی چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے لیے میں اس بات کو بھول ہی چکی تھی ایک بڑا گہن میرے اپنے چاند میں بھی ہے۔ یہ تو اس دنیا میں ہوتا ہی ہے۔ ایک دوسرے کی کمی ایک دوسرے کی قربت بن جایا کرتی ہے۔ والد صاحب تو مجھے میرے خیالوں میں غلطاں و پیچاں چھوڑ کر جا چکے تھے لیکن میں سوچوں کے بھنور میں گھر چکی تھی۔ مجھے وہ لوگ تو یاد نہ تھے لیکن اتنا تو یاد تھا کہ کوئی گھر ہوتا تھا، آنٹی اور انکل بھی ہوتے تھے۔ میری طرح ایک ننھی بچی بھی تھی اور ایک کافی بڑے بھائی لیکن شکلیں کسی کی بھی یاد نہیں تھیں۔ میں ابھی اپنا ماضی کرید ہی رہی تھی کہ امی کی آمد نے مجھے چونکا دیا۔ میرے کندھوں پر ہولے سے ہاتھ رکھ کر انھوں نے کہا۔

"تمہارے ابو نے تمہارے سامنے ساری باتیں رکھ دی ہیں۔ تم پر کوئی دباؤ نہیں۔ جلدی البتہ ضرور ہے۔ ایک دو دن ہیں۔ جتنا غور کر سکتی ہو کر لو۔ اللہ سے رجوع کرو پھر جو مناسب ہو جواب دے دو۔"

وہ رات کیسی گزری، یہ میرا اللہ جانتا ہے۔ میں نے ایک پختہ کار خاتون کی طرح ہر پہلو کا جائزہ لیا۔ جس زمانے کی یہ بات ہے اس زمانے کے لحاظ سے میں ویسے بھی بڑی عمر کی ہی گنی جاتی تھی۔ اچھے سے اچھے اور سمجھدار سے سمجھدار گھرانوں میں بھی بارہ تیرہ سال کی عمر میں ہی بچیوں کے لیے مائیں پریشان ہو جایا کرتی تھیں۔ مجھ جیسی لڑکیاں تو "گھوڑیاں" کہلایا کرتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے جس جس پہلو پر بھی غور کیا وہ "گھوڑی" بن کر کیا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ مجھے بھی خوشی رضامندی کا اظہار کر دینا چاہیے۔ یہی کیا کم اطمینان کی بات ہے کہ انکل، آنٹی اور ان کے "صاحب زادے" ایک دم انجان نہیں اور ابو امی بھی ان کے دوست ہیں۔ فیصلہ کرنے کے بعد یوں لگا جیسے دل ٹھہر سا گیا ہو اور یہ ٹھہراؤ ہی اس بات کی علامت تھا کہ شاید قدرت کی منشا بھی میرے فیصلے کی شریک ہے۔

یونیورسٹی کو الوداع کیا اور چند ماہ میں ہی سارے مراحل طے ہوگئے اور میں دلہن بنی حجلۂ عروسی میں پیا کی آہٹوں پر کان لگائے بیٹھی تھی۔ قدموں کی ہر چاپ کے ساتھ میرے دل کی دھڑکنیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ میرا دل سینے کی بجائے کنپٹی میں دھڑکنے لگا ہے۔ قدموں کی چاپ بالکل میرے سامنے، چند قدم کے فاصلے پر آ کر تھم چکی تھی اور اس کے بعد خاموشی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں جھجکتے ہوئے کھولیں اور سر کو تھوڑا سا اٹھایا تو میرے سامنے ایک مکمل اور مضبوط ہاتھ پاؤں والا نوجوان کھڑا ہوا تھا اور اس کا چہرہ روایتی سہرے کے اندر چھپا ہوا تھا۔ کیا یہ نظر آنے والے ہاتھ پاؤں ہاتھی کے دانت ہیں۔ مجھے تو یہ بتایا گیا تھا کہ وہ دونوں نعمتوں سے معذور ہے۔ یہ مصنوعی ہاتھ پاؤں والا مجھے متوجہ پا کر دو قدم آگے آیا جس میں کوئی بھی لنگ نہیں تھا۔ پھر دونوں ہاتھ کسی معذوری کے بغیر اٹھے اور روایتی سہرا چہرے سے ہٹا دیا گیا۔ چہرے پر نظر پڑتے ہی میں اپنے بیڈ پر عملاً اچھل پڑی۔ یہ تو وہی حضرت تھے جو ایک درمیانے درجے کی کار میں کالج کے گیٹ پر کار کی کھڑکی سے سر نکال کر مجھے ایک ٹک یوں گھور رہے تھے جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں مگر یہ مضبوط ہاتھ پاؤں، والد کا بیان کہ صاحب زادے ہاتھ اور پاؤں سے

معذور ہیں، یہ سب کیا ہے۔ میری نگاہوں کے سامنے پورا کمرا اور اس کا ہر منظر یوں گھومنے لگا جیسے میں موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلا رہی ہوں۔ آنکھوں کے سامنے آہستہ آہستہ اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ مکمل تاریکی سے پہلے دو مضبوط ہاتھوں نے مجھے تھام لیا تھا۔ شادیٔ مرگ کسے کہتے ہیں؟، یہ بات مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔

مجھے ابھی تک اتنا ہوش نہیں آسکا تھا کہ میرے اردگرد کھڑے لوگ یہ سمجھ سکیں کہ میں ایک بہت گہری نیند سے بیدار ہونے والی ہوں۔ میرے کانوں میں قریب کھڑے لوگوں کی آوازیں آرہی تھیں لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ آوازیں بہت دور سے آرہی ہوں۔ میں بے ہوش تھی یا ہوش میں آنے والی تھی لیکن ان کی باتیں میرے ہوش ٹھکانے لگائے دے رہی تھیں۔ میرے سسر میرے والد کے آگے معذرت خواہانہ انداز میں کہہ رہے تھے کہ یہ میری ہی خطا تھی کہ میں نے اپنے بیٹے کو ہاتھ پاؤں سے معذور کہا۔ دل و دماغ اور آنکھوں کا احوال تو اللہ ہی جانتا ہے لیکن جو بات پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں نے آج تک اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے کوئی غلط کام کرتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہ ہی غلط راہوں کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے، اس لیے میں نے اسے معذور کہا تھا۔ دوسرا قصور یہ ہے کہ میں نے شادی سے قبل دونوں کو نہیں ملوایا کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں۔ ڈاکٹر اس نیند کو ''شادیٔ مرگ'' کا نتیجہ کہہ رہے ہیں۔ ویسے اللہ کا شکر ہے کہ حالت خطرے سے باہر ہے اور اُمید ہے کہ جلد ہی بیداری کی جانب لوٹ آئے گی۔ بس اس کے بعد شاید میں دوبارہ گہری نیند سو گئی ہوں گی۔

آنکھ کھلی تو میرے سامنے ڈاکٹروں کے مخصوص ڈریس میں خود میرے شوہر کھڑے تھے۔ میں شاید دوبارہ بیہوش ہی ہونے والی تھی کہ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ خدا کے لیے اب مت بیہوش ہو جانا۔ اب تم بالکل نارمل ہو اور میرے ہی اسپتال میں ہو۔ تمہاری بیہوشی سے ایک فائدہ اٹھاتے ہوئے تمہارے ساتھ ایک اور بھی ''حادثہ'' کیا گیا ہے۔ اس سے قبل کہ میں اس ''حادثے'' کی خوشخبری سناؤں دو باتیں تمہارے علم میں لانا چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ میرے والد نے تمہارے والد سے بہت بہت معذرت طلب کی ہے اور وہ اس بات کی ہے...... ابھی انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ کر بہت نحیف آواز میں کہا کہ مجھے معلوم ہو چکا ہے۔

''کیا؟'' یہ کہہ کر وہ بہت زور سے چونکے۔

میں نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ اب آپ بیہوش نہ ہو جائیے گا۔ میں شاید کچھ دیر کے لیے ہوش میں آئی تھی لیکن گہری نیند میں تھی۔ میں نے آپ کے والد اور اپنے والد کے درمیان ہونے والی گفتگو کو سن لیا تھا۔

''اوہ!'' ان کے منہ سے بیساختہ نکلا۔ ''اب آپ وہ بات بتائیں جو اس کے بعد بتانے والے تھے۔'' میں نے بہت کمزور آواز میں کہا۔

''وہ بتانے کی نہیں بلکہ دکھانے کی ہے لیکن پہلے وعدہ کرو کہ دوبارہ بیہوش تو نہیں ہو جاؤ گی؟''

''کیا مطلب؟'' میں نے کہا۔

''بات ہی ایسی ہے اس لیے وعدہ ضروری ہے۔ اچھا ٹھیک ہے تم اپنا دل مضبوط کرو میں آئینہ منگواتا ہوں۔ یہ کہہ کر انہوں نے کال بیل پر انگلی رکھی اور کہنے لگے۔ ''دوران بیہوشی جب میرے اسپتال کے حساس آلات تمہارا معائنہ کر رہے تھے تو یہ بات میرے علم میں آئی کہ تمہارا کان اصل شکل میں اس لوتھڑے کے پیچھے چھپا ہوا ہے جو تمہارے کان کے گرد قدرتی طور پر لپٹا ہوا ہے۔ بس ایک محتاط آپریشن کرنا پڑا کان باہر آگیا لیکن یقین مانو، میں نے تمہیں اپنے بچپن سے تمہاری حقیقت کے ساتھ تمہیں قبول کیا تھا۔ شاید یہ میرا سچا عشق تھا جس کے بدلے میرے اللہ نے مجھے یہ تحفہ عنایت کیا ہے۔''

میں بے یقینی کے ساتھ یہ ساری باتیں سن رہی تھی اور مجھے پورا یقین تھا کہ یہ سب کچھ شاید اسی طرح کی باتیں ہیں جو میرے شوہر کے متعلق میرے سسر کرتے رہے ہیں۔ میں ابھی یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں ہی تھی کہ ایک نرس بڑا سا آئینہ لیے کمرے میں داخل ہوئی، شاید اسے پہلے ہی ایسا کرنے کا کہا گیا ہوگا اس لیے کہ بیل کے جواب میں کوئی ہدایت لینے اندر تو نہیں آیا تھا۔ میرے مسیحا شوہر نے وہ آئینہ میرے سامنے کر دیا۔ اپنی شکل دیکھ کر میں چیخ سی پڑی۔ میرا حسن مکمل ہو چکا تھا۔ چاند گہن سے باہر آچکا تھا۔ ایک مرتبہ پھر کمرا گھومنے لگا تھا کہ دو مضبوط ہاتھوں نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ میں بس اتنا دیکھ سکی کہ آئینہ لانے والی نرس کمرے سے باہر جا چکی تھی۔

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں مس عرشی؟''

میں اور میری دوست کوثر کھانا کھانے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہے تھے کہ اچانک یہ آواز سن کر ہم دونوں چونک گئے۔ میں نے دیکھا ہمارے نزدیک محسن اپنی پلیٹ ہاتھ میں اٹھائے کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''کیوں......اور کوئی جگہ نہیں ہے؟'' میں نے تڑختے ہوئے لہجے میں کہا۔

بدروحیں

محترم مدیراعلیٰ

سلام مسنون

لوگ دوسروں کی کہانیاں لکھتے ہیں لیکن میں نے اپنی آپ بیتی لکھی ہے۔ پلیز اسے شاملِ اشاعت کرلیں تاکہ میری طرح کوئی اور لڑکی خواب کی تعبیر پانے کی کوشش میں اپنی زندگی برباد نہ کر بیٹھے۔ میری التجا ہے کہ اسے ہر لڑکی پڑھے اور سبق حاصل کرے۔

عرشی

(کراچی)

آس پاس کے لوگ میری آواز پر متوجہ ہو گئے تھے۔ محسن کی شکل دیکھنے والی ہو گئی تھی۔ وہ خجالت آمیز نظروں سے گردوپیش کا جائزہ لینے لگا پھر وہ جھینپی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں تو ایسے ہی معلوم کر رہا تھا۔''

''کیوں معلوم کر رہے تھے۔ بلاوجہ فری ہونے کے لیے۔ سب معلوم ہے مجھے تم جیسے اسی طرح کی حرکتیں کرتے ہیں دوستی کرنے کے لیے۔ جائیں آپ کسی اور جگہ جا کر بیٹھیں۔'' میں نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔

وہ کھسیا کر وہاں سے چلا گیا۔

''یار عرشی! کم از کم لہجہ تو ٹھیک کر لیا کرو اپنا۔ ایسے بات کرتے ہیں کیا؟'' کوثر دبے لہجے میں بولی۔ ''تم تو ایک دم لٹھ مار دیتی ہو۔ طریقے سے بھی منع کر سکتی تھیں۔''

''یہ لوگ اس قابل نہیں ہوتے کہ ان سے ڈھنگ سے بات کی جائے۔'' میں نے دور بیٹھے ہوئے محسن کو گھورتے ہوئے جواب دیا۔ ''اب بھی تو مل گئی جگہ...... بس بہانہ چاہیے تھا یہاں بیٹھنے کا...... چھچھورا کہیں کا۔''

''یہ تو مرد کی فطرت ہوتی ہے۔ سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اس میں غلط کیا ہے۔ ہاں اگر آپ کو کوئی بات اچھی نہیں لگتی تو آپ صاف صاف منع کر دیں مگر پیار سے بھی منع کیا جا سکتا ہے۔'' کوثر فلسفہ جھاڑنے لگی۔

''ذرا سا بھی پیار سے بات کر لی تو دن رات کا پیچھا لے لیں گے۔ ویسے بھی یہ کون سا پرستان کا شہزادہ ہے جو پیار سے بولتی۔'' میں نے سر جھٹک کر کہا اور کھانے میں مصروف ہو گئی۔

''پتا نہیں وہ کون ہو گا جو تمہیں پسند آئے گا۔'' کوثر نے لمبی سانس لے کر کہا۔

''چپ چاپ کھانا کھاؤ۔'' میں نے اسے ٹوک دیا۔

کوثر مجھے ایسے دیکھنے لگی، جیسے بول رہی ہو کہ عرشی تم نہیں سدھرو گی۔ وہ میری سب سے اچھی دوست ہے۔ دھیمے مزاج کی صلح جو، ملنسار اور خوش گفتار۔ میری کیا، کسی کی بھی بات کا برا نہیں مانتی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ میں ایک بدمزاج اور مشکل لڑکی ہوں۔ اسی لیے مجھ سے کسی کی دوستی زیادہ عرصہ چل نہیں پاتی تھی۔ میں اپنے غصے اور تند مزاجی کی وجہ سے مشہور تھی۔ مجھے اپنی اس عادت کا علم تھا لیکن کیا کرتی۔ ہزار کوشش کے باوجود غصے پر قابو نہیں پاتی تھی۔ کسی کی کوئی بات ناگوار گزر جاتی تو پھر اس کی خیر نہیں ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ لڑکیاں کانوں کو ہاتھ لگاتی ہوئی مجھ سے دور ہو جاتی تھیں اور دوبارہ سامنا کرنے سے بھی گریز کرتی تھیں۔

قدرت نے مجھے ایسا رنگ روپ دیا تھا کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جاتے تھے۔ مجھے اس کا بہت اچھی طرح ادراک تھا۔ اپنی خوب صورتی پر مجھے ناز تھا۔ اچھی اور معقول شکل و صورت کی لڑکی بھی میرے حسن کے سامنے ماند پڑ جاتی تھی۔ میری تنک مزاجی کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی۔

اس کمپنی میں نوکری کرتے ہوئے مجھے تین سال ہو گئے تھے۔ میرا تعلق ایک عام گھرانے سے ہے۔ ہم چار بہنیں اور ایک بھائی ہے۔ سب سے بڑے بھائی جان ہیں۔ ابا ایک چھوٹی موٹی نوکری کیا کرتے تھے جو چند سال پہلے فوت ہو گئے تھے اور اب امی ہم لوگوں کے رحم و کرم پر تھیں۔

بھائی جان معقول نوکری کرتے تھے اور شادی کے بعد اپنی زندگی مزے سے گزار رہے تھے۔ ان کے دو لڑکے تھے جو اسکول جاتے تھے۔ بھابی نے سب سے پہلا کام یہ کیا تھا کہ بھائی جان کو لے کر الگ ہو گئیں تا کہ بھائی جان کی تنخواہ بہنوں اور امی پر خرچ نہ ہو۔ مجھ سے بڑی بہنیں ناصرہ اور نجمہ پہلے ہی نوکریاں کر رہی تھیں۔ بھائی جان کے الگ ہونے کے بعد اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے مجھے بھی نوکری کے لیے نکلنا پڑا۔ نوکری کے حصول کے لیے زیادہ تگ و دو نہیں کرنا پڑی تھی۔ جھٹ سے نوکری مل گئی تھی۔ رکھنے والوں نے میری تعلیم پوچھی نہ قابلیت، بس میری صورت دیکھ کر فوراً رکھ لیا۔ یہی نہیں بلکہ محض دو سال بعد سپروائزر نے سفارش کر کے میری تنخواہ بھی دگنی کروا دی۔

سپروائزر امجد جوان آدمی تھا۔ رکھ رکھاؤ والا اور نرمی سے پیش آنے والا۔ بعد میں معلوم ہوا تھا کہ اس کی بیوی شادی کے دو سال بعد مر گئی تھی۔ اس کے بعد سے امجد صاحب نے اب تک شادی نہیں کی تھی۔ وہ مجھ پر ضرورت سے زیادہ مہربان ہونے لگے تھے۔ مرد چاہے شریف ہو یا نہ ہو، وہ مرد ہی ہوتا ہے۔ امجد صاحب نے اشارے کنایوں میں کئی بار اپنا مقصد مجھ پر واضح کرنا چاہا تھا لیکن میں نے کبھی ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی بلکہ تھوڑا کھنچی کھنچی رہنے لگی تھی تا کہ ان پر میری بات واضح ہو جائے کہ مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے، وہ میرے خواب دیکھنا چھوڑ دیں۔ ڈرپوک آدمی تھے مگر سمجھ دار بھی۔ جلد ہی پیچھے ہٹ گئے۔ اب صرف ان سے کام کے سلسلے میں ہی بات ہوتی تھی۔ مجھ سے چھوٹی نرگس تھی۔ وہ کالج میں زیر تعلیم تھی۔ ہم سب بہن بھائیوں میں ایک

عادت مشترک تھی۔ بدزبانی اور غصے کی تیز۔ حتیٰ کہ اکثر گھر میں ہم معمولی معمولی باتوں پر آپس میں بلیوں کی طرح لڑ پڑتی تھیں۔ چلا چلا کر ایک دوسرے کو وہ مغلظات بکتیں کہ محلے والے بھی کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے۔ امی سر پکڑے ایک جگہ بیٹھ جاتی تھیں۔ اگر کبھی غلطی سے وہ کسی جھگڑے کے درمیان بول پڑتیں تو ان کی شامت آ جاتی تھی۔ جھگڑا کرنے والیاں اپنا جھگڑا چھوڑ کر امی پر الٹ پڑتی تھیں اور انہیں اتنا برا بھلا کہتی تھیں کہ ان کے آنسو نکل آتے تھے۔ جھگڑا یہاں رک جاتا تھا لیکن لڑنے والیوں کی ناراضی کافی دنوں تک جاری رہتی تھی۔ سرد مہری کا یہ عالم ہوتا تھا کہ ایک دوسرے کی شکل تک دیکھنے کی روادار نہیں ہوتی تھیں۔ بھائی جان سے لے کر نرگس تک کوئی کم نہ تھا۔ لوگ ہم لوگوں کو پیٹھ پیچھے آگ کا پتلا کہتے تھے۔ منہ پر بولنے کا رسک کوئی نہیں لیتا تھا۔

فیکٹری میں امجد صاحب کے بعد بھی کئی مردوں نے بے تکلف ہونا چاہا لیکن میں نے انہیں دس افراد کے سامنے ذلیل کر کے رکھ دیا تھا۔

ایک بار میں، کوثر اور کئی دوسری لڑکیاں چھٹی کے بعد فیکٹری کے دروازے کے پاس کھڑی تھیں۔ ہمیں لانے لے جانے والی بس اچانک ہی خراب ہو گئی تھی۔ باقی علاقوں کی بسیں بھی جا چکی تھیں۔ بس کی خرابی دور کرنے کے لیے مکینک مصروف تھے۔ اتنے میں ہمارے قریب ایک لڑکا آیا، وہ انگلی میں اپنی کار کی چابی گھماتا ہوا آیا تھا۔ نزدیک آ کر اس نے مجھ پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔

''اب یہ ہیرو بنے گا۔'' میں نے قدرے اونچی آواز میں اسے سنانے کے لیے کوثر سے کہا۔

آس پاس کھڑی لڑکیاں ہنس دی تھیں۔ وہ بھی مجھے اچھی طرح جانتی تھیں۔

''چپ کر جا یار، اچھی بات نہیں ہے۔'' کوثر آواز دبا کر بولی۔ ''میں جانتی ہوں اسے۔''

''میں بھی جانتی ہوں۔ اکاؤنٹ ڈپارٹمنٹ میں ہوتا ہے۔ کار کا بھرم مار رہا ہے جاہل۔'' میں نے نفرت سے ہونٹ سکیڑے۔

''کیا ہوا، بس خراب ہو گئی ہے کیا آپ کی؟'' فہیم نے بس کی جانب دیکھا اور پھر ہم سے مخاطب ہو کر دریافت کیا۔

''اسی لیے تو کھڑے ہیں۔'' کوثر نے مجھ سے پہلے جواب دیا۔

''ورنہ ہمیں کوئی شوق نہیں ہے اپنی نمائش کرانے کا۔'' میں نے تڑخ کر کہا۔

''میرا خیال ہے یہ جو ہر ٹاؤن کی طرف جانے والی بس ہے۔ وہ میرے راستے میں پڑتا ہے اگر محسوس نہ کریں تو میں راستے میں آپ کو ڈراپ کر سکتا ہوں۔'' فہیم نے آفر کی۔

''آپ کی اس ہمدردانہ پیشکش سے ہم رتی برابر بھی متاثر نہیں ہوئے۔ کسی اور کے پاس جا کر لائن ماریں۔'' میں نے سابقہ لہجہ برقرار رکھا۔

فہیم کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ اسے اس قسم کے جواب کی توقع نہ تھی۔ میرا لہجہ میرے جملے، میری شخصیت اور خوب صورتی سے میل نہیں کھاتے تھے۔ چند لمحوں کے لیے اس کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا، وہ حیران حیران کھڑا میرا منہ تکتا رہ گیا۔ قریب کھڑی لڑکیاں چہ میگوئیاں کرنے لگی تھیں۔

''محترمہ! میں ایسا نہیں ہوں جیسا آپ سمجھ رہی ہیں۔'' آخر اس نے قفل خاموش کھولا۔

''سب اندر سے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ اوپر سے اچھا اچھا بن کر ڈرامے کرتے ہیں۔'' میں نے کوثر کا ہاتھ جھٹک کر کہا۔ وہ میرا ہاتھ دبا کر مجھے چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں مسلسل بولتی رہی۔ ''مہربانی فرما کر آپ اپنی قیمتی کار میں تشریف لے جا سکتے ہیں اور ہاں مجھے اچھی طرح پہچان لیں، دوبارہ بھرم مارنے کی کوشش نہیں کرنا۔''

وہ عجیب نظروں سے مجھے دیکھتا ہوا چلا گیا۔

''عرشی...... بہت غلط بات...... کتنا سمجھایا ہے تمہیں...... اپنا رویہ اور لہجہ ٹھیک رکھا کرو لیکن تمہاری سمجھ میں ہی نہیں آتی۔ میں جانتی ہوں اسے۔ شریف اور پڑھا لکھا ہے۔ اچھی نوکری بھی ہے اور پھر بڑے گھرانے سے تعلق ہے۔'' کوثر کا لیکچر شروع ہو گیا۔

''تو تم اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں...... جاؤ۔ ابھی وہ زیادہ دور گیا نہیں ہے...... چلی جاؤ اس کے ساتھ بیٹھ کر۔'' میں نے کوثر پر نزلہ گرا دیا۔ وہ بے چاری جز بز ہو کر رہ گئی۔ پھر کھسیا کر ہنسنے لگی۔

''بے وقوف کبھی عقل سے بھی کام کر لیا کر۔ آخر شادی بھی تو کرنی ہے نا۔ ہر کسی سے اس بری طرح پیش آئے گی تو کون کرے گا شادی یا پھر ہمیشہ فیکٹری میں ہی

نوکری کرتی رہے گی۔“

ابھی میں جواب دینے ہی والی تھی کہ بس اسٹارٹ ہو گئی اور ڈرائیور لڑکیوں کو آوازیں دینے لگا تھا۔

یہ اس نوعیت کا کوئی پہلا واقعہ نہیں تھا۔ ایسے بے شمار واقعات پیش آچکے تھے۔ جس لڑکے نے بھی میری جانب پیش قدمی کی اسے میں نے ذلیل کردیا۔ گھر میں بھی آئے روز ہم بہنیں لڑتی رہتی تھیں۔ بھائی جان کو بہنوں کے مستقبل کی کوئی فکر نہ تھی۔ وہ اپنی دنیا بسا کر خوش و خرم زندگی بسر کررہے تھے۔ اب تو زیادہ آتے جاتے بھی نہیں تھے۔ بھی کسی روز بھولے بھٹکے آگئے تو مصروفیات اور ٹائم نہ ملنے کا بہانہ کرنے لگتے تھے۔

امی کو ہم بہنوں کی شادیوں کی فکر دیمک کی مانند کھائے جارہی تھی۔ ناصرہ اور نجمہ بھی ابھی کسی شہزادے کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ قدرت نے ہم چاروں بہنوں کو غضب کے حسن سے نوازا تھا لیکن کوئی انسان مکمل نہیں ہوتا ہر کسی میں کوئی نہ کوئی کمی یا خامی ضرور ہوتی ہے۔ امی نے محلے اور رشتے داروں سے رشتوں کا کہا ہوا تھا۔ محلے والوں کے علاوہ رشتے دار بھی ہم بہنوں کی عادت سے بخوبی واقف تھے۔ امی کو دلاسے تو سب نے دیئے، لیکن کبھی کوئی رشتہ لے کر نہیں آیا۔ حالانکہ خاندان میں بہت سے جوڑ کے لڑکے تھے۔ شروع شروع میں خاندان سے ہمارے لیے کچھ رشتے آئے تھے مگر جس کے لیے بھی رشتہ آیا اس نے ناک بھوں چڑھالی کہ اس لڑکے کی شکل دیکھی ہے یا فلاں تو معمولی سی نوکری کرتا ہے۔ کوئی نہ کوئی کیڑا نکالنا ناصرہ اور نجمہ تو اپنے سنہرے اور بھرپور نوجوانی والے دن نکال چکی تھیں۔ اب ان کے چہروں پر پکا پن جھلکنے لگا تھا پھر بھی وہ بڑھتی ہوئی عمریں ماننے کو تیار ہی نہ تھیں۔

ایک شام میں فیکٹری سے گھر پہنچی تو دیکھا کہ امی کے ساتھ ثریا خالہ بیٹھی ہیں۔ وہ سارے زمانے میں مشہور تھیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان کا گھر کہاں تھا کسی کو علم نہ ہوسکا نہ ثریا خالہ نے کبھی بتایا۔ کبھی کسی نے پوچھا بھی تو بات گول مول کرجاتی تھیں بلکہ اب تو یہ سوال ہی ثریا خالہ کی چڑ بن گیا تھا۔ انہیں زچ کرنے کے لیے شرارتاً ان سے پوچھا جاتا۔

”خالہ...... تمہارا گھر کہاں ہے؟“

اور ثریا خالہ سوال کرنے والے پر الٹ پڑتی تھیں۔

”کہیں پر بھی ہے تمہیں اس سے کیا غرض پولیس بھیج کر چھاپا پڑوانا ہے کیا۔ میں نے تمہارا قرض کھالیا ہے۔ جائیداد دبالی ہے کیا؟ مجھ سے مطلب ہے یا میرے گھر سے۔ کہیں نہ کہیں تو ہے نا میرا گھر۔ کسی ہوٹل میں تھوڑی رہتی ہوں یا گراؤنڈ میں تو نہیں سوتی ہوں۔ کام سے کام رکھا کرو۔“ ثریا خالہ کے منہ کی مشین چل پڑتی تھی۔

جب میں گھر میں داخل ہوئی تو امی اور خالہ کو صحن میں کھسر پھسر کرتے پایا۔ دروازہ کھلا تھا۔ لہٰذا میں اندر آگئی تھی۔ مجھے دیکھ کر امی چونک کر سیدھی ہوگئیں۔

میں نے دھیرے سے سلام کیا اور پاس سے گزر کر جانے لگی۔

”ماشاء اللہ...... ماشاء اللہ......!“ ثریا خالہ مجھے دیکھتے ہی مسکرا کر کہنے لگیں۔ ”نوکری پر سے آرہی ہو بیٹا۔“

”ہاں!“ میں نے مختصر جواب دیا۔ مجھے اندازہ تو ہو گیا تھا کہ خالہ یہاں کس لیے براجمان ہیں، یا تو خود کوئی رشتہ لائی ہیں یا پھر امی نے بلوایا ہے۔

”اس کے لیے بول تو میرے پاس ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ ہے۔“ ثریا خالہ کی آواز مجھے کمرے تک سنائی دے رہی تھی۔

”پہلے دونوں بڑی نمٹ جائیں خالہ۔ اس کی مجھے اتنی فکر نہیں ہے۔ پہلے ناصرہ اور نجمہ کے رشتے آجائیں۔“ امی نے انہیں پریشانی سے آگاہ کیا۔

”دیکھ بہن...... یہ پہلے بڑیوں کے چکر میں رہو گی تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ جس کا پہلے ہورہا ہے آنے دو۔ سمجھیں میری بات۔ آج کل ہر جگہ لوگ کم عمر لڑکی کا رشتہ مانگتے ہیں میں تو بولوں اللہ کرے پہلے بڑی والوں کے رشتے نمٹ جائیں، مگر جس کا رشتہ آئے بسم اللہ کردینا۔ جو جو رشتے بتائے ہیں ان کے بارے میں سوچ کر بتادینا۔ کل یا پرسوں پھر چکر لگالوں گی۔ لڑکی والے بہت ہیں ہر جگہ درجنوں لڑکیاں بھری پڑی ہیں۔ معقول لڑکوں کے رشتے کم ہیں۔ جتنی جلدی جس کا رشتہ سمجھ میں آئے نمٹادو۔“ خالہ کی زبان چل پڑتی تھی تو وضاحت و تشریح کے بعد ہی رکتی تھی۔

اس دوران ناصرہ اور نجمہ بھی اپنی ڈیوٹیوں سے گھر آگئیں۔ ہم سبھی ثریا خالہ کو جانتے تھے۔ ان دونوں نے ثریا خالہ کو سلام بھی نہ کیا اور اپنے اپنے کمروں میں چلی گئیں۔ ثریا خالہ انہیں تیز نظروں سے دیکھتی رہ گئیں۔ امی کو اس بات کا احساس ہوگیا تھا۔ بات برابر کرنے کے لیے انہوں نے عذر لنگ تراشا۔

”سارا دن مارا ماری میں گزرتا ہے پھر اتنا لمبا سفر کرکے آتی ہیں تو تھکن کے مارے برا حال ہوتا ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے پر سلام کرنے کے لیے صرف زبان ہی تو ہلانی پڑتی ہے۔ خیر میں ایسی باتوں کا برا نہیں مانتی۔“ ثریا خالہ نے جوتا بھی ماردیا اور انجان بھی بن گئیں۔ ان کے جانے کے بعد کچن میں، میں نے امی سے پوچھا۔ ”کس کا رشتہ لائی تھیں ثریا خالہ؟“

”تین چار رشتے بتائے ہیں۔“ امی نے روٹی توے پر ڈالتے ہوئے بتایا۔ ”اچھے ہیں، اچھا کماتے بھی ہیں۔ دیکھ لو جس کی سمجھ میں آئے میں کردوں گی رشتہ، بیٹا ایک ایک دن مجھ پر بھاری گزر رہا ہے۔ تم لوگوں کو ماں کے احساسات سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ چاروں اپنے گھروں کی ہوجاؤ تو میں آرام سے مرسکوں گی۔“

”تصویریں دی ہیں خالہ نے؟“ میرے دل میں تجسس پیدا ہوگیا۔

”ہاں ہاں رکھی ہیں میرے پاس۔“ امی خوش ہو گئیں۔ انہیں توقع نہیں تھی کہ میں اس طرح فوراً ہی دلچسپی کا مظاہرہ کروں گی۔ ”تو چل میں روٹیاں ڈال کر آتی ہوں۔ پھر ایک ساتھ تمہیں تصویریں بھی دکھادوں گی لڑکوں کی۔“

میں وہاں سے نکل آئی۔ رات کھانے کے بعد امی نے ہم بہنوں کو لڑکوں کی تصویریں دکھائیں۔

”ان میں لڑکوں کی تصویریں کہاں ہیں؟“ ناصرہ نے تصویریں دیکھ کر بیڈ پر پھینک دیں۔ نجمہ انہیں اٹھا کر دیکھنے لگی۔ نرگس بھی اس کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔

”یہی تو لڑکے ہیں۔“ امی کی آواز میں بے بسی تھی۔

”یہ چالیس چالیس سال کے لڑکے......“ ناصرہ برہمی سے بولی۔ ”چار چار لڑکوں کے ابا لگ رہے ہیں۔ یہ ثریا خالہ بھی کتنی ہیں پوری کی پوری...... اچھے اچھے رشتے اِدھر اُدھر کروا کر یہاں تیلی تنبولیوں کے رشتے لے آتی ہیں اس لیے ان کو سلام کرنے کو بھی دل نہیں کرتا ہے۔“

”یہ ایک فوٹو کے پیچھے لکھا ہے۔ شمس الدین شمشو، عمر 32 سال۔“ نجمہ ایک تصویر دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولنے لگی۔ ”شکل سے 45 سال کا لگ رہا ہے۔ شمشو صاحب کی درزی کی دکان ہے۔ مین کلاتھ مارکیٹ میں۔“

”ایک کی محلے میں پرچون کی دکان ہے۔ نام وحید خان عمر بتائی ہے 35 سال۔“ نرگس نے دوسری تصویر کے پیچھے لکھا ہوا ڈیٹا پڑھا اور ہنسنے لگی۔

”یہ اب دوبارہ گھر میں نظر نہ آئے۔“ لڑکوں کی تصویریں دیکھ کر میرا پارہ بھی چڑھ گیا تھا۔ ”اتنے بڑے لڑکوں سے تو ثریا خالہ خود بھی بیاہ رچاسکتی ہیں۔ ہم کوئی اتنے گئے گزرے ہیں۔ دارالامان میں رہتی ہیں ہم بہنیں۔“

امی نے شرمندہ ہوتے ہوئے تمام فوٹوز سمیٹ لیں۔ اور چپ چاپ کمرے سے نکل گئیں۔ وہ تو خوش تھیں کہ ہم میں سے کسی نہ کسی کو کوئی لڑکا پسند آجائے گا مگر انہیں ہم بہنوں کے اتنے برے رویے کی امید ہرگز نہ تھی۔ ایک لمحے کو مجھے امی کا احساس تو ہوا تھا لیکن اب ہم آنکھوں دیکھی مکھی تو نگل نہیں سکتے تھے۔ غصہ مجھے ثریا خالہ پر آرہا تھا کہ وہ پتا نہیں کہاں کہاں کچرے میں سے رشتے لے کر چلی آئی تھیں اور امی کو قائل کرلیا تھا کہ یہ شہزادے ہیں۔ شومئی قسمت سے دو دن بعد جب میں آئی تو ثریا خالہ اسی طرح امی کے ساتھ بڑے ٹھسے سے بیٹھی نظر آئیں۔ باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ وہ چائے کے کپ میں پھونکیں مارتی ہوئی بلند آواز میں چسکیاں بھی لے رہی تھیں۔

”لو وہ آگئی۔ ماشاء اللہ ماشاء اللہ بڑی عمر ہے۔ بالکل ابھی ابھی تمہارا نام ہی لیا تھا میں نے، آجا بیٹھ ذرا میرے پاس۔ آجا شاباش۔“ ثریا خالہ نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلایا۔

امی مضطربانہ انداز میں دوپٹے کا کونا انگلی پر لپیٹ رہی تھیں۔ ان کے چہرے سے پریشانی ہویدا تھی۔ میرے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر وہ سمجھ گئی تھیں کہ آج ثریا خالہ کی خیر نہیں ہے۔

”خالہ وہ رشتے والوں کی تصویریں آپ ہی لائی تھیں ناں؟“ میں نے اسٹارٹ لیا۔

”ہاں ہاں تو اور کون لائے گا۔“ ثریا خالہ نے اب بھی میرے تاثرات غور سے نہیں دیکھے تھے۔ چائے کے ساتھ امی نے بسکٹ کی پلیٹ بھی رکھی ہوئی تھی۔ اس وقت ایک بسکٹ ثریا خالہ کے منہ میں بری طرح پھنسا ہوا تھا۔

”یہ زمانے بھر کے جاہلوں کے رشتے لانے کے لیے ایک ہمارا ہی گھر نظر آیا تھا آپ کو؟“ میری آواز ایک دم اونچی ہوگئی۔

ثریا خالہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ پھر انہوں نے جلدی سے منہ بند کرکے بسکٹ نگلا اور بولائی ہوئی آواز میں بولیں۔

”کک کیا کیا ہوگیا ان کو۔ کیا خرابی ہے لڑکوں میں۔“

"وہ لڑکے ہیں......چالیس پینتالیس سال کے اونٹ اور اوپر سے چھانٹ کے بدشکل......خبردار جو آیندہ یہاں نظر آئیں۔ ایسے جاہلوں سے شادی کرنے سے بہتر ہے کہ انسان زہر کھالے۔" میرا لہجہ برقرار رہا تھا۔

خالہ گھبرا کر اٹھ گئیں اور ہکلاتے ہوئے بولیں۔

"پسند نہیں ہیں تو میں اور رشتے لے آؤں گی۔"

"بھاڑ میں جائیں آپ اور آپ کے رشتے۔" میں چلائی۔

تب ثریا خالہ کو شدید بے عزتی کا احساس ہوا۔ امی نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ کھینچا۔ "اچھا......اچھا بس کر عرشی، بڑی ہیں وہ۔ ایسے نہیں کہتے۔"

"ایسوں کو ایسے ہی کہتے ہیں۔" میں نے امی کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"توبہ توبہ......زبان دیکھو اپنی۔" ثریا خالہ گال پیٹنے لگی تھیں۔ "شکل صورت سے ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ تہذیب بھی ہونی چاہیے۔ یہی زبان رہی تو جس گھر میں بھی گئی وہ جوتے مار کر نکال دے گا دو دن میں۔ ہونہہ۔"

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" میں آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑی اور زبان لاوا اگلنے لگی۔ "حرام سن بڑھیا، کھانے چاٹنے آجاتی ہے پیسے کی بھوکی۔ دفعان ہو جا!"

"عرشی، عرشی! خدا کے لیے چپ ہو جا۔" امی رونے لگی تھیں۔ میرے آگے ہاتھ جوڑ رہی تھیں۔

ثریا خالہ بکتے جھکتے چلی گئیں۔ میرا چہرہ لہو رنگ ہو رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ اس حرافہ بڈھی کی گردن دبا کر پاپڑ کی طرح توڑ ڈالوں۔ ویسے ہی سارے دن کی مغز پچی کے بعد دماغ آؤٹ ہو رہا تھا اوپر سے آتے ہی اس کی شکل دیکھ لی۔

اس روز کے بعد میں نے کبھی ثریا خالہ کو اپنے گھر میں نہیں دیکھا۔ ایسے ہی وقت گزرتا جا رہا تھا۔ ہمیں ماہ و سال کے گزرنے کا کوئی احساس نہیں تھا۔ میرے ساتھ فیکٹری میں کام کرنے والی کتنی ہی لڑکیوں کی شادیاں ہو گئیں۔ خود کوثر بھی بیاہ کر چلی گئی۔ جب میں نے اس کا شوہر دیکھا تو ششدر رہ گئی تھی۔ کوثر گوری چٹی اور کھڑے کھڑے نقوش کی خوب صورت لڑکی تھی، جب کہ اس کا شوہر گہرا سانولا اور واجبی سی شکل کا تھا۔ عمر میں بھی کوثر سے دس سال بڑا تھا۔ میں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھی کہ کوثر کیا اندھی ہو گئی تھی۔ اس نے ایسے آدمی سے کیسے شادی کر لی، جس سے اس کا کوئی جوڑ ہی نہیں بن رہا تھا۔ مجھ سے رہا نہ گیا تھا۔ ایک روز کوثر سے پوچھ ہی لیا جواب میں وہ ہنسنے لگی اور بولی۔ "جو نصیب میں لکھا ہوتا ہے وہ تو پورا ہو کر رہے گا اور میں ایک بات بتاؤں۔ میں اس کے ساتھ بہت خوش ہوں۔ وہ میرا بہت خیال رکھتا ہے۔ کھانے پینے کا، پہننے اوڑھنے کا گھمانے پھرانے کا......اور کیا چاہیے ایک لڑکی کو۔ اتنی محبت کرنے والا شوہر ملا ہے۔ میں تو خود کو خوش نصیب سمجھتی ہوں۔"

"ہمارے تو اس سے بہتر رشتے آئے لیکن ہم بہنوں نے منع کر دیا۔ یار شادی ایک بار ہی ہوتی ہے۔ ذرا بندہ تو ڈھنگ کا ہو۔ میں تیرے شوہر کی بات نہیں کر رہی، میں بس ویسے ہی اپنی سوچ بتا رہی ہوں۔" میں نے وضاحت کی۔

"میں تمہاری بات کا برا نہیں مانتی۔" کوثر نے میرے گلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے ہنس کر کہا۔ "اور میری بات بھی مان لو کہ جو بہتر رشتہ لگے تم بھی جلد شادی کر لو۔ کب تک ایسے ہی رہو گی۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ امی کے رشتے دار رشید صاحب ایک دن گھر آئے۔ امی کے منہ سے کئی بار ان کا ذکر سنا تھا۔ وہ سالوں پہلے لاہور جا بسے تھے۔ اس طرح امی سے رابطہ تقریباً ختم ہی ہو کر رہ گیا تھا۔ اب وہ دوبارہ کراچی شفٹ ہوئے تو امی سے ملنے چلے آئے۔ ان کے ساتھ ان کا بیٹا عدیل بھی تھا۔ لمبا تڑنگا، خوب صورت، شرمیلا سا۔ اسے دیکھ کر مجھے اچھا لگا۔

وہ چھٹی کا دن تھا۔ ہم سب بہنیں گھر میں تھیں۔ امی نے کھانا بنا لیا تھا۔ رشید ماموں کھانے پر امی سے باتیں کرتے رہے۔

"بچیوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ بہت وقت گزر چکا ہے۔ ان کو بہت چھوٹا سا دیکھا تھا۔" رشید ماموں ہم بہنوں کو دیکھ کر بول رہے تھے۔ "اب تو ماشاء اللہ سب بڑی ہو گئی ہیں۔"

"میں تھی اس وقت؟" نرگس نے پوچھا۔

رشید ماموں ہنس پڑے۔ "تم گود میں تھیں، بہت چھوٹی سی۔"

وہ لوگ باتیں کر رہے تھے کہ یکایک میری نظر عدیل پر پڑی۔ وہ کھانا کھاتے ہوئے چوری چوری مجھے دیکھ رہا تھا۔ جب میری نظریں اس کی نظروں سے ٹکرائیں تو وہ گڑبڑا گیا اور کھانسنے لگا۔

"ارے ارے کیا ہوا۔" امی گھبرا اٹھیں۔ "پانی، لو پانی......یہ لو......آرام سے۔" امی نے پانی کا گلاس بھر کر اسے دیا۔ وہ غٹا غٹ پی گیا۔ یہ شروعات ثابت ہوئی۔ پھر عدیل اکثر ہمارے گھر آنے لگا۔ وہ مجھ میں دلچسپی لے رہا تھا۔ اس کا علم سبھی کو ہو گیا تھا۔ امی بھی اندر ہی اندر خوش تھیں۔ انہیں بھلا کیا اعتراف ہو سکتا تھا۔ ان کے لیے سب سے زیادہ مسرت انگیز بات یہ تھی کہ میں بھی عدیل میں بھرپور دلچسپی لے رہی تھی۔ ناصرہ اور نجمہ عدیل سے بڑی تھیں، اس لیے انہوں نے اس معاملے سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ عدیل ایک نارمل سی نوکری کرتا تھا لیکن ساتھ ساتھ اس نے تعلیم جاری رکھی ہوئی تھی۔ اب تک بات ایک دوسروں کو پسند کرنے تک محدود تھی۔ باقاعدہ ہم نے ایک دوسرے سے اظہار نہیں کیا تھا۔ رشید ماموں بہت دور نہیں رہتے تھے۔ عدیل کے پاس بائیک تھی وہ بائیک پر اکثر رات میں آجاتا تھا۔ جب عدیل آتا تھا تو ناصرہ اور نجمہ دوسرے کمرے میں چلی جاتی تھیں یا ٹی وی پر شادی بیاہ والے ڈراموں میں مگن ہو جاتی تھیں۔ امی گھر کے کاموں میں مصروف ہوتی تھیں۔ وہ جان بوجھ کر تخلیہ فراہم کر دیتی تھیں۔ رہے بھائی جان تو وہ کسی کام سے ہی گھر آتے تھے۔ بھابی خود آتیں نہ بچوں کو آنے دیتی تھیں۔

ایک شام جب میں گھر پہنچی تو عدیل وہاں پہلے سے موجود تھا۔ کمرے میں صرف نرگس اور عدیل ہی تھے۔ مجھے دیکھتے ہی نرگس بولی۔ "یہ دیکھو......میرا گفٹ۔" اس نے ایک پیکٹ دکھاتے ہوئے کہا اور ہنسنے لگی۔

"تمہارا گفٹ؟" میں نے بیگ رکھتے ہوئے کہا۔ "کس نے دیا ہے؟"

"عدیل نے۔" نرگس نے شریر نظروں سے عدیل کو دیکھا۔

"جی نہیں۔" عدیل نے دھیمی آواز میں کہا۔ اس کی عادت تھی وہ ہلکی آواز میں ہی بات کرتا تھا۔ "یہ میں تمہارے لیے نہیں بلکہ عرشی کے لیے لایا ہوں۔"

"اِدھر لاؤ۔" میں نے ہاتھ بڑھایا۔

نرگس نے پیکٹ پیچھے کر لیا۔ "جی نہیں یہ میرا ہے۔"

"مذاق نہیں کرو نرگس۔" عدیل نے اسے سمجھایا۔

"میں تمہیں بعد میں لا دوں گا لاؤ......یہ دو۔"

میں نے آگے بڑھ کر نرگس کے ہاتھ سے پیکٹ تقریباً چھین لیا۔ اس میں ایک خوب صورت ریڈی میڈ سوٹ تھا۔ ساتھ ہی ایک رسٹ واچ بھی تھی۔

"ارے واہ، یہ تو دونوں چیزیں بڑی خوب صورت اور مہنگی ہیں۔" میں خوش ہو گئی اور سوٹ جسم پر لگا کر خود کو آئینے میں دیکھنے لگی۔

عدیل مسکراتے ہوئے مجھے دیکھ رہا تھا۔ یکایک میری نظریں نرگس پر پڑیں۔ اس کے چہرے کے تاثرات ہی بدلے ہوئے تھے پیشانی پر بل بھی پڑے ہوئے تھے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ ٹپ ٹپ کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ یہ کوئی ایسا واقعہ نہیں تھا کہ میں اس پر کوئی خاص توجہ دیتی۔ میں تو اس وقت گفٹ ملنے پر خوشی سے سرشار تھی۔ زندگی میں پہلی بار کسی لڑکے نے محبت سے مجھے تحفہ دیا تھا۔ میرا خوش ہونا تو لازمی بنتا تھا۔

"اچھے ہیں نا......گھڑی اور سوٹ؟" عدیل نے جھکتے ہوئے اپنی مخصوص آواز میں پوچھا۔

"ہوں......ٹھیک ہیں۔" میں نے شرارتاً کہا۔

عدیل کی شکل اتر گئی۔ "یعنی......یعنی زیادہ اچھے نہیں لگے؟"

میں کھلکھلا اٹھی۔ "ارے بھئی میں تو ایسے ہی مذاق میں بول رہی تھی۔ آپ بھی سنجیدہ ہو گئے۔ بہت اچھے ہیں۔ بہت ہی اچھے۔"

اتنا کہہ کر میں خاموش ہو گئی۔ عدیل خوش تو ہو گیا تھا لیکن اس کی زبان جیسے تالو سے جا چپکی تھی۔ درمیان میں خاموشی کی چادر تن گئی تھی۔ اس وقت مجھے شدت سے انتظار تھا کہ آج عدیل مجھ سے کچھ کہے۔ کچھ پوچھے اور کچھ بولے۔ مگر وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ لڑکی اپنے منہ سے نہیں بولتی۔ پہل کرنے میں فطری حیا مانع ہوتی ہے لیکن عدیل بھی اپنی جگہ خاموش رہا۔ شاید اس کی ہمت نہیں ہو پا رہی تھی۔ ابھی ہم دونوں ہی ایک دوسرے کی طرف سے پہل کے انتظار میں تھے کہ امی آگئیں۔

"چلو بیٹا آجاؤ، کھانا کھا لو۔" امی کی نظر سوٹ اور گھڑی پر نہیں پڑی۔ وہ اتنا بول کر دوبارہ چلی گئیں اور بات جہاں کی تہاں رہ گئی۔ معاملات اسی نہج پر چلتے رہے۔ عدیل نے منہ سے کبھی اظہار محبت نہ کیا تھا مگر اس کی ایک ایک ادا ایک ایک جنبش سے محبت جھلکتی تھی میں نے کوثر کو بھی بتا دیا تھا وہ بہت خوش ہوئی تھی۔

"شکر ہے......کوئی تو تمہیں پسند آیا۔ بس اب دیر نہ کرنا۔ شادی کر لو جلدی سے۔ اتنا پیسا جمع کر رکھا ہے تم نے خوب دھوم سے شادی کرنا۔"

"موصوف منہ سے اقرار تو کرلیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "یا پھر رشتہ ہی بھجوادیں۔"

"بھجوادے گا۔ تھوڑا صبر کرلو۔"

میں مسکرادی۔

ایک روز چھٹی والے دن دوپہر میں بھائی جان گھر آگئے۔ ہم اپنے کمروں میں تھیں۔ امی کپڑے دھو رہی تھیں۔ نرگس ان کے ساتھ مدد کروا رہی تھی۔

بھائی جان آتے ہی امی کے پاس پہنچے اور سخت برہمی سے بولے۔ "یہ آخر ہو کیا رہا ہے اس گھر میں...... کیا ڈرامے بازی لگائی ہوئی ہے تم لوگوں نے؟"

"کیا ہوگیا بیٹا۔ خیریت تو ہے نا؟" امی حیران پریشان رہ گئیں۔ نرگس بھی بھائی جان کو دیکھنے لگی۔ میں اپنے کمرے سے نکل آئی تھی۔ ادھر ناصرہ اور نجمہ بھی باہر آگئیں۔ ماحول میں ایک دم تناؤ ہوگیا تھا۔

"واہ امی، آپ کو پتا ہی نہیں واہ۔" بھائی جان کا بلڈ پریشر مزید تیز ہوگیا۔ "آپ کی ناک کے نیچے سب کچھ ہو رہا ہے اور آپ کو دنیا کا پتا ہی نہیں ہے۔ کمال کردیا بھئی۔"

"کچھ پتا تو چلے مجھے۔ کس بات پر چلّا رہے ہو تم؟" امی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

"یہ عدیل نے کیوں اتنا آنا جانا لگا رکھا ہے یہاں۔" آخر بھائی جان کے منہ سے نکل ہی گیا۔ "کیا لینے آتا ہے اِدھر؟"

"بیٹا وہ، وہ میرے بھائی کا بیٹا ہے، منہ بولا ہی سہی مگر ہے تو بھائی اس کے یہاں آنے میں حرج ہی کیا ہے آخر...... یہ اس کی پھوپی کا گھر ہے۔" امی نے تولیے سے ہاتھ خشک کیے۔

"اور جو سارے زمانے میں لوگ باتیں بنا رہے ہیں اس کا معلوم ہے آپ کو؟" بھائی جان کے منہ سے آگ نکل رہی تھی۔ تب انہوں نے ایک قہر آلود نظر مجھ پر ڈالی۔ "بے غیرتی کی بھی حد ہوتی ہے۔ یہاں گھر میں غیر مرد کو بلوا کر عشق لڑایا جارہا ہے۔ میں یہ سب برداشت نہیں کرسکتا۔"

"میں نے کوئی بے غیرتی نہیں کی ہے۔" میرا دل بھی سلگ اٹھا تھا۔ "اور یہ اچانک آپ کو ہمارا خیال کیسے آگیا۔ کبھی آپ نے پلٹ کر دیکھا ہے کہ چار چار جوان بہنیں گھر میں بیٹھی ہیں۔ سوچا ہے کبھی ایک روپیا بھی ہاتھ پر رکھا ہے۔ گھر میں کبھی دکھ بیماری بھی ہوتی ہے۔ تب تو آپ آکر جھانکتے تک نہیں۔ آج بڑے بن کر چلے آئے۔" میں بولتی چلی گئی۔

"اُلو کی پٹھی، بے شرم، بے غیرت، بتاتا ہوں تجھے۔ جان سے ماردوں گا۔" بھائی جان نے لپک کر میرا بازو پکڑا اور کئی ہاتھ جڑ دیے۔ امی چیختی ہوئی مجھے بچانے لگیں۔ ناصرہ اور نجمہ بھی دوڑی آئیں۔ ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا تھا۔ بھائی جان کے منہ سے گالیوں کی بارش ہورہی تھی۔ ساتھ ہی ان کے ہاتھ بھی چل رہے تھے۔ امی نے ان کے آگے ہاتھ جوڑے۔ وہ بری طرح رو رہی تھیں۔ تب بھائی جان کو ہوش آیا اور وہ ہانپتے ہوئے گالیاں بکتے ہوئے چلے گئے۔

لازماً محلے والوں نے بھی یہ چیخ پکار سنی ہوگی اور وہ اپنے گھروں سے نکل کر گلی میں جمع ہوگئے ہوں گے لیکن کسی میں ہمت نہ ہوئی کہ وہ ہمارے گھر آکر معاملہ پوچھ سکے۔ سب ہم بہنوں کی عادت سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہیں اپنی عزت پیاری تھی، لہٰذا گلی میں ہی کھڑے ہوکر ایک دوسرے سے کھسر پھسر کرتے رہے۔

اس واقعے کے بعد میرے دل میں جہاں بھائی جان کے لیے نفرت بیٹھ گئی تھی وہیں ان کا مزید خوف بھی پیدا ہوگیا تھا۔ جیسے بھی تھے آخر بڑے بھائی تھے۔ امی بھی ان کے سامنے مجبور تھیں۔ وہ کچھ بھی کرسکتے تھے۔ محلے والوں نے عدیل کو آتے جاتے دیکھا ہوگا تو یقیناً کسی نہ کسی نے بھائی جان کے کان بھر دیے ہوں گے۔ میرے دماغ میں لے دے کر ثریا خالہ کا نام ہی آیا تھا۔ ایسا ہی ہوا ہوگا۔ انہوں نے "بے عزتی" کا بدلہ خوب نکالا تھا۔ ویسے ہی ان کا کام کیا تھا۔ دنیا جہان میں پھرنا اور اِدھر اُدھر کی سن گن لینا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب موبائل نہیں آئے تھے۔ لہٰذا رابطے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ کسی سے ملنا ہوتا تو اس کے گھر یا دفتر جاکر ملنا پڑتا تھا۔ اتفاق سے تین چار دن عدیل بھی نہیں آیا۔ مجھے فکر لاحق ہوگئی کہ نہ جانے کیا ہوا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ بھائی جان عدیل کے گھر پہنچ گئے ہوں اور انہوں نے اسے ڈرا دھمکا دیا ہو۔ وہ ویسے ہی شریف اور شرمیلا تھا۔ کیا معلوم بے عزتی کے ڈر سے نہ آرہا ہو۔

چھٹی والا دن آیا تو شام کے وقت عدیل آگیا۔ ہم شام کی چائے پی رہے تھے۔ اسے دیکھ کر امی کے چہرے پر رونق آئی لیکن پھر فوراً ہی رفو ہوگئی۔ اس کی جگہ تشویش اور فکرمندی نے لے لی۔

"کیسی ہیں آپ پھوپی جان! سب خیریت تو ہے

نا؟" عدیل، امی کے پاس بیٹھ گیا۔ میں کچن میں تھی۔ نجمہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور ناصرہ ٹی وی دیکھتے ہوئے چائے پی رہی تھی۔ نرگس اندر کمرے میں کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔

"ہاں بیٹا ہاں، میں ٹھیک ہوں۔ تم بیٹھو۔ میں دروازہ بند کرکے آتی ہوں۔" امی تخت پر سے اٹھ گئیں اور آواز لگائی۔

"عرشی، عدیل بیٹا کے لیے بھی چائے نکال لانا۔" امی دروازہ بند کرکے آگئیں۔ "کہاں غائب تھے بیٹا اتنے دنوں سے؟"

"بس پھوپی جان! وہ پڑھائی چل رہی تھی پھر نوکری بھی دیکھنا پڑتی ہے۔ ایسا پھنسا کہ آنا ہی نہ ہوا۔ آج تھوڑی فرصت ملی تو سوچا کہ چکر لگا لوں۔" عدیل نے جواب دیتے ہوئے متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

میں نے چائے لاکر عدیل کو دی۔ امی کی گھبراہٹ قائم تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس طرح عدیل کو گھر آنے سے منع کریں۔ ویسے عدیل کے تاثرات اور لب و لہجے سے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ چار دن پہلے کے واقعے سے لاعلم ہے۔ یہ کم ازکم میرے لیے باعث اطمینان تھا۔ امی سے بولا نہیں گیا۔ پھر وہ کھانا پکانے کا بہانہ کرکے چلی گئیں پھر میں عدیل کے ساتھ کمرے میں آگئی۔ وہاں نرگس بھی تھی۔

"کچھ ٹینشن سی لگ رہی ہے مجھے۔" بالآخر عدیل نے محسوس کرلیا۔

"ہاں...... ہے تو۔" تب میں نے اسے تمام بات بتادی۔

"اوہ...... یہ تو بہت برا ہوا ہے۔" عدیل بڑبڑایا۔

"تم نہیں جانتے بھائی جان کی عادت۔ غصے میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتے اگر کچھ کرسکتے ہو تو کرلو۔" میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

عدیل نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ میری بات کی تہہ تک جا پہنچا ہے پھر اس نے گردن گھمائے بغیر کتاب پڑھتی ہوئی نرگس کو کن انکھیوں سے دیکھا جو کتاب کے مطالعے میں غرق تھی لیکن یقیناً ایک ایک لفظ سن رہی تھی۔

اس کے بعد عدیل زیادہ دیر وہاں نہیں بیٹھا اور چلا گیا۔ مزید کئی دن ایسے ہی گزر گئے۔ عدیل نہیں آیا۔ اس بار مجھے زیادہ تشویش ہورہی تھی۔ بھائی جان کے بجائے عدیل کی جانب سے فکر لاحق تھی کہ کہیں وہ خوف زدہ تو نہیں ہوگیا۔ جب مزید کئی روز گزر گئے تو میں نے ایک روز فیکٹری سے چھٹی کی اور امی کے ساتھ رکشے میں رشید ماموں کے گھر جا پہنچی۔ لیکن دروازے پر تالا دیکھ کر مجھے جھٹکا لگا۔

میں نے برابر والے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ تب ایک خاتون دروازے پر آئیں۔ "جی کس سے ملنا ہے؟" اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ہمیں یہ برابر والوں سے ملنا تھا۔ میرے ماموں کا گھر ہے مگر یہاں تالا لگا ہوا ہے۔ آپ کو پتا ہے کہاں گئے ہیں یہ؟"

"یہ تو ابھی تین چار دن پہلے گھر چھوڑ گئے ہیں۔ کرائے پر رہتے تھے۔ اب کہاں گئے ہیں یہ نہیں پتا۔" عورت نے لاعلمی کا مظاہرہ کیا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔

"یہاں اور کس کو پتا ہے؟" امی نے پوچھا۔

"اس کا تو مجھے نہیں معلوم۔" عورت نے انکار میں سر ہلایا۔

میں نے پلٹ کر امی کو دیکھا۔ "اللہ جانے کہاں چلے گئے اچانک۔" یہ سن کر عورت ایک دم بولی۔ "اچانک نہیں وہ کچھ دن پہلے ایک آدمی آیا تھا۔ پتا نہیں کس بات پر جھگڑا کرکے گیا ہے۔ بہت چیخ پکار مچائی تھی اس نے۔ ہماری تو سمجھ میں نہیں آیا کہ بات کیا ہوئی ہے۔ بڑا ہنگامہ کیا تھا اس نے۔"

"اوہ۔" میں نے پریشان کن نظروں سے امی کی جانب دیکھا۔ پھر کہا۔ "اچھا آپ کا شکریہ۔"

ہم دوبارہ گھر چلے آئے۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ اس روز عدیل کے ہمارے گھر آنے کی خبر بھی بھائی جان کو ہوگئی تھی اس لیے وہ لڑنے کے لیے یہاں بھی آگئے تھے۔ رشید ماموں اور عدیل بالکل دھیمے مزاج کے، لڑائی جھگڑوں سے دور رہنے والے انسان تھے اس لیے انہوں نے یہاں سے چلے جانے میں ہی سب کی بہتری جانی تھی۔ میں نے بمشکل خود کو سنبھالے رکھا مگر رات کی تنہائی میں منہ دبا کر خوب روئی۔ برسوں بعد آنکھوں سے آنسو نکلے تھے۔ دکھ کا زہر پورے بدن میں سرایت کرگیا تھا۔ میرے سسکنے کی آوازیں سن کر نرگس بستر سے اٹھ کر مجھے دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا...... رو کیوں رہی ہو؟"

"نہیں نہیں تو...... رو تو نہیں رہی۔" میں نے چپکے سے آنسو صاف کرلیے۔ "بس سر درد کی وجہ سے نیند نہیں آرہی تھی۔"

"دراز میں سر درد کی گولی رکھی ہے۔" نرگس دوبارہ لیٹ گئی۔ "وہ کھا کر سوجاؤ۔"

نہ جانے رات کے کون سے پہر اپنی قسمت کی طرح

میں بھی سو گئی تھی۔ کوثر کو بتایا تو وہ بھی افسوس کرنے لگی تھی پھر میری زندگی میں خوشیوں کے باقی ماندہ پھول بھی مرجھاتے چلے گئے۔ دن، تاریخ تو دور کی بات۔ مجھے سالوں کا علم نہیں ہوتا تھا کہ یہ کون سا سن چل رہا ہے۔ چند سال بعد امی کا انتقال ہو گیا تھا۔ انہیں کوئی بیماری نہیں تھی۔ بس ہماری شکلیں دیکھ دیکھ کر ان کا وجود اندر سے کھوکھلا ہو گیا تھا۔ ناصرہ اور نجمہ تو بہت پہلے اپنی زندگیوں سے مایوس ہو گئی تھیں کہ ان کے نصیب میں تنہائیاں ہی لکھی ہیں۔ امی کے بعد میں بھی مایوسی اور اکیلے پن کے کنویں میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ ہم اپنی نوکریوں پر جاتے تھے۔ آنے کے بعد بھی ایک دوسرے سے بات تک نہیں کرتے۔ گھر میں صرف ٹی وی ہی بولتا تھا۔ نرگس بھی گھر سے چلی گئی تھی۔ اس نے کسی آفس میں ملازمت کر لی اور پھر اپنے ایک آفس کولیگ سے شادی کر لی۔ گھر والوں کو صرف اطلاع کی تھی۔ اجازت لینے کی زحمت نہیں کی۔ بھائی جان میں بھی اب دم خم نہیں رہا تھا۔ ان کے بچے بھی جوان ہو گئے تھے۔

ایک روز اچانک کوثر مجھ سے ملنے گھر آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک سترہ اٹھارہ سال کا لڑکا بھی تھا۔ اس نے ملازمت برسوں پہلے چھوڑ دی تھی۔ ہماری ملاقات برسوں بعد ہوئی تھی۔

''یہ کون ہے کوثر؟'' میں نے لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔

''میرا بیٹا ہے کاشان۔'' کوثر نے محبت پاش نظروں سے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ اس نے مجھے سلام کیا۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کوثر ایک گھنٹا بیٹھی تھی۔ افسوس ہی کرتی رہی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے خود کو آئینے میں بہت عرصے بعد غور سے دیکھا۔ آج مجھ پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ جوانی تو کب کی رخصت ہو گئی تھی۔ آئینے میں ایک ادھیڑ عمر سوکھی سی عورت دکھائی دے رہی تھی جو بڑھاپے کی سرحد پر کھڑی تھی۔ میں ڈر کے مارے آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی اور بیڈ پر لیٹ کر رونے لگی۔

☆......☆

''چند روز بعد شام کو میرے آفس کی بس نے مجھے اپنی گلی سے کافی دور سڑک پر اتار دیا کیونکہ آگے کھڈے کھدے ہوئے تھے۔ میں دھیرے دھیرے گھر کی جانب چلنے لگی۔ میرے نزدیک سے گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ اچانک مجھے کسی نے آواز دی۔

''عرشی......عرشی......''

میں رک کر آواز کی جانب دیکھنے لگی۔ ایک کار سڑک کے کنارے رکی ہوئی تھی۔ پھر اس میں سے ایک جوان آدمی اتر کر تیزی سے میری جانب بڑھا۔ میں اسے پہچان نہ سکی لیکن وہ قریب آیا تو مجھے اس کی شکل مانوس سی لگی۔

''عرشی......پہچانا مجھے۔'' وہ میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔

تب میں نے پہچان لیا۔ وہ عدیل تھا۔ وہ تو اب تک جوان ہی تھا۔ پہلے سے زیادہ تر و تازہ۔ صحت بھی اچھی ہو رہی تھی۔ چہرے سے مالی آسودگی جھلک رہی تھی۔ اس نے قیمتی سوٹ پہنا ہوا تھا۔ گردشِ ایام نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ جب کہ اس کے سامنے میں بوڑھی لگ رہی تھی۔

''ت......تم......ع......عدیل......'' میرے منہ سے کپکپاتی ہوئی آواز نکلی۔

''ہاں......میں......آؤ...... میرے ساتھ آؤ۔'' عدیل نے مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں منع نہ کر سکی۔ تھوڑی دیر میں ہم دونوں ایک ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ عدیل بول رہا تھا اور میں خاموشی سے سن رہی تھی۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

''میں......میں ڈر گیا تھا عرشی لیکن کسی اور سے نہیں۔ تمہاری بہن نرگس سے......جب کہ وہ جانتی تھی کہ......کہ میں......میں تم میں دل چسپی لیتا ہوں مگر وہ میرے پیچھے ہی پڑ گئی تھی۔ اور جب......جب اس نے دیکھا کہ میں اس کی طرف توجہ نہیں کر رہا ہوں تو......تو اس نے تمہارے بھائی کو پتا نہیں میرے بارے میں کیا کیا بتایا کہ......پھر سب کچھ ختم ہو گیا۔ تمہارے بھائی جان کو میرے گھر کا راستہ بھی اسی نے دکھایا تھا۔ ابو بہت شریف انسان تھے۔ انہوں نے عزت، بچانے کے لیے وہ گھر ہی چھوڑ دیا۔ میں اپنے گھر والوں کو کیسے چھوڑتا۔ ایک تو نرگس تھی، پھر تمہارے بھائی جان راہ میں رکاوٹ تھے۔ نرگس کھیل نہ سکی تو اس نے کسی کو کھیلنے بھی نہ دیا۔ پھر میں امریکا چلا گیا۔ شادی کر لی۔ اب دو بچے ہیں۔ وہ بھی بڑے ہو رہے ہیں۔''

میرا سر بدستور جھکا ہوا تھا۔

''قصور میرا بھی ہے عرشی، میں بزدل تھا مگر مجبور بھی تھا۔''

میرے آنسو ٹیبل پر ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔

آج بھی ہم تینوں بہنیں بدروحوں کی طرح گھر میں پڑی رہتی ہیں۔ اب تو صرف موت کا انتظار ہے۔ اپنی سچ بیانی لکھ کر دل کا بوجھ تھوڑا ہلکا کر لیا ہے کہ شاید کوئی اس سے سبق حاصل کر لے۔

▲▲▲

زنداں

محترم ایڈیٹر
السلام علیکم
ایک اور سچ بیانی بھیج رہی ہوں گو کہ یہ مجھ بیتی نہیں ہے۔ یہ روداد ایک بیوہ مائی رحمتے کی ہے۔ ہم خود اس کی داستان سن کر حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ اُمید ہے یہ سچ بیانی پڑھ کر آپ بھی محوِ حیرت رہ جائیں گے۔

ملک رحمت
(میانوالی)

رات کا آخری پہر تھا۔ بادلوں کی گھن گرج اور بجلی کی کڑک اسے مزید خوفناک بنا رہی تھی۔ نیم تاریک کمرے میں موجود نازیہ اپنے بستر پر بیٹھی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ وہ اس موسم سے بہت خوفزدہ رہتی تھی۔ بچپن میں تو وہ ہمیشہ اپنے بستر میں دبک کر تھر تھر کانپنے لگتی۔ بجلی کی ہر کڑک اس کے وجود میں ایک لرزہ خیز سنسنی دوڑا دیا کرتی تھی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ جاتا اور وہ گڑگڑا کر موسم کے معمول پر آنے کی دعائیں مانگنے لگتی۔

آج بھی موسم ویسا ہی تھا لیکن نازیہ ساکت بیٹھی تھی۔آج اسے کوئی بھی شے خوفزدہ نہیں کررہی تھی۔خوف،خوشی،غم،اداسی،موسم کی شدت محسوس کرنے کا تعلق ہمیشہ انسان کی اندرونی کیفیات سے ہوتا ہے اور نازیہ کے اندر اس سے بھی بڑا طوفان برپا تھا۔اس کی ہستی،شناخت اور عزت نفس مسخ کردی گئی تھی۔

"جانے کون لوگ ہوتے ہیں جن کی زندگی ان کے لیے سکھ اور خوشیاں لاتی ہے۔میں آخری دفعہ کب ہنسی تھی؟ آخری دفعہ کب خوش ہوئی تھی بھلا؟" اس نے ذہن پر بہت زور دیا لیکن ایسی کوئی بات یاد آکے ہی نہ دی۔

بوجھل دل سے وہ بستر سے نیچے اتر آئی۔فرش پر بچھا قالین بھی موسم کی شدت سے یخ تھا۔وہ اس ٹھنڈک سے بے نیاز کمرے کی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی اور شیشے سے بنا ایک پٹ نیم وا کردیا۔ٹھنڈی ہوا کا ایک برفیلا جھونکا اس کے جسم میں پھریری دوڑا گیا۔وہ اس وقت کسی بھی چادر یا سوئیٹر سے بے نیاز تھی۔اس کی نظریں نیچے صحن پر جمی تھیں۔صحن کا وہ حصہ دانستہ طور پر کچا رکھا گیا تھا اور اس کے متعلق بہت سے قصے بھی منسوب تھے۔حویلی والوں کے معتوب اور گناہگار افراد کی لاشیں یہیں گاڑی جاتی تھیں۔حویلی کی عورتوں کے کمرے خصوصی طور پر اس جانب بنوائے گئے تھے تاکہ صحن اور اس سے منسوب قصے انہیں حویلی کی روایات سے کبھی بھی باغی نہ ہونے دیں۔

کچے صحن کی مٹی بارش کے پانی کے ساتھ بہتی چلی جارہی تھی۔یہ منظر دیکھ کر نازیہ کے ذہن میں ایک نئی سوچ نے سر ابھارا۔

"جیتے جی تو یہ لوگ اس زندان سے نکل نہ سکے لیکن مرنے کے بعد اس مٹی کی صورت میں یہاں سے رہائی پارہے ہیں۔خوش قسمتی زندگی میں نہ مل سکی لیکن مرنے کے بعد قسمت شاید مہربان ہوجایا کرتی ہے۔" اس کے ذہن میں اُمید کی ایک ننھی سی کونپل پھوٹی۔

"موت کا تصور خوفناک سہی لیکن اگر یہ ایسی مہربانیاں لے کرآتی ہے تو پھر لوگ اس سے اتنے خوفزدہ کیوں رہتے ہیں؟ ہم جیسے جبری زندگی جینے والوں کے لیے تو موت ایک تحفہ ہوئی ناں۔" وہ خیالات کی ایک نئی رو میں بہتی چلی گئی۔بارش اور بادلوں کی گرج میں مزید اضافہ ہوگیا۔ان ہولناک آوازوں پر ایک مدھر،خوش الحان آواز حاوی ہوگئی۔پندرہ سالہ رفیق حسبِ معمول رقت آمیز انداز میں اذان دے رہا تھا۔

"الصلوۃ خیر من النوم۔۔الصلوۃ خیر من النوم۔"

"اس کی یہ آواز اور ان عظیم حروف کی ادائیگی ہمیشہ دلوں کے قفل کھول دیا کرتی ہے لیکن یہاں رہنے والے اپنی انا اور جہالت کے قفل جانے کب توڑیں گے؟" نازیہ نے کھڑکی بند کرتے ہوئے سوچا۔وضو کرنے کے بعد نماز ادا کی تو کافی دیر سے رکے آنسو ایک تواتر سے بہتے چلے گئے۔دعا میں ہاتھ اٹھے تھے لیکن الفاظ کہیں کھو چکے تھے۔آج آنسو ہی دعا تھے اور التجا بھی۔جائے نماز لپیٹ کر رکھنے کے بعد وہ لحاف میں جالیٹی۔اسے صبح کا انتظار تھا۔وہ صبح جو اس کی تاریک زندگی پر مزید سیاہی ملنے کے لیے طلوع ہوئی تھی۔

☆......☆

حویلی کے اس خاص کمرے میں اونچے شملے والی پگڑیوں،نوکدار مونچھوں اور چہرے پر خوفناک سختی والے افراد بیٹھے تھے۔ان کی آنکھوں میں سرخی تھی جو کسی رت جگے کی وجہ سے نہیں بلکہ شراب وشباب کے سنگ گذرے لمحات کی بدولت تھی۔ان کے جثے طاقتور تھے اور تاثرات نہایت درشت۔

"اس قصہ کو آج یہیں ختم ہوجانا چاہیے بختیار! حویلی کی عزت ہی اس کی عزت سے کھلواڑ کررہی ہے اور اگر ہم نے کوئی نرمی یا رعایت دکھائی تو آنے والی نسلیں ہمارے نام پر تھوکنا بھی پسند نہیں کریں گی۔" بختیار کے سامنے بیٹھے چوہدری شہریار نے اپنے بھاری بھرکم لہجے اور کرخت آواز میں کہا۔بختیار اس کا چھوٹا بھائی تھا۔سخت مزاجی اور سفاکی میں وہ اس سے دو ہاتھ آگے ہی تھا لیکن شہریار اس پر ہمیشہ اپنا دباؤ برقرار رکھنا ضروری سمجھتا تھا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو بھائیا جی!! ہماری حویلی میں ایسا گندخانہ نہیں کھلنا چاہیے۔" بختیار نے جواب دیا۔

"اگر آج اس فساد کی جڑ کو یہیں ختم نہ کیا گیا تو کل کلاں کو ہماری آیندہ نسل میں کمی کمینوں کا خون بھی شامل ہوجائے گا۔اور ہم اپنی لاعلمی میں اس غلاظت کو چومنے چاٹنے پر مجبور ہوں گے۔" دائیں جانب بیٹھے چوہدری اشرف نے حقارت سے کہا۔وہ بختیار کا برادر نسبتی تھا۔

"اوئے! تم لوگوں نے مجھے کیا بے غیرت سمجھ رکھا ہے جو زنانیوں کی طرح طعنے دے کر اکسانے کی کوشش کررہے ہو۔" بختیار بھڑک اٹھا۔بڑے بھائی کے سامنے تو وہ ایسی کوئی بات نہیں کرسکتا تھا لیکن اشرف کو ہمیشہ بے خوفی سے رگید دیا کرتا تھا۔وہ کبھی اس کے سامنے اف بھی نہیں کرپاتا تھا۔

"بے فکر رہ اشرفے! بے فکر رہ!! مجھے اپنے ٹکے بھرا کا پتا ہے۔وہ غیرت کے ان معاملات میں ہمیں کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دے گا۔" شہریار نے مونچھوں کو تاؤ دیا۔"اس کا جگرا تو شیر سے بھی بڑا ہے۔تجھے یاد ہے کہ بھول گیا؟"

"یاد ہے چوہدری صاحب! سب یاد ہے۔" اشرف نے بھی معنی خیزی سے جواب دیا۔

اس وقت کمرے میں موجود جالی دار دیوار کے عقب میں سرسراہٹ سی پیدا ہوئی۔تینوں افراد کے انداز میں واضح تبدیلی پیدا ہوئی۔گردن میں تناؤ اور چہرے کی سختی مزید خوفناک ہوگئی تھی۔

"کہاں ہے وہ بدبخت؟ اسے فوراً یہاں حاضر کرو۔" بختیار نے دروازے کے بیرونی جانب کھڑی ملازمہ کو کہا۔

حویلی کی ملازمائیں یہاں نسل در نسل رہائش پذیر تھیں۔ایک دفعہ اگر حویلی کی ملازمت اختیار کرلی جاتی تو بیرونی دنیا سے رابطہ زندگی بھر کے لیے ختم ہوجاتا تھا۔وہ حویلی کی دہلیز سے باہر قدم بھی نہیں رکھ سکتی تھیں۔یہی حال مرد ملازمین کا بھی تھا۔یہ روایت سالہا سال سے چلی آرہی تھی جسے ہر آنے والی نسل نے بہت اہتمام سے نبھایا تھا۔اس صورت میں حویلی کا کوئی بھی راز بیرونی دنیا میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ڈھلوال کا چوہدری گھرانا علاقہ کے باسیوں پر اپنا رعب و دبدبہ برقرار رکھے ہوئے تھا۔

جالی دار دیوار کے عقب میں سرسراہٹ خوف زدہ سرگوشیوں میں ڈھلنے لگی۔تھوڑی ہی دیر میں ایک ملازمہ نازیہ کو اپنے ساتھ لے کر چلی آئی۔وہ ایک بڑی سی چادر میں لپٹی تھی۔چہرہ بھی اسی چادر کی اوٹ میں پوشیدہ تھا۔بختیار نے ملازمہ کو واپس جانے کا اشارہ کردیا۔وہ اپنے جسم کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے الٹے قدموں لوٹ گئی اور دروازہ بند کردیا۔

"ہاں چھوکری!! تو جانتی ہے ناں کہ تجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟" شہریار نے پوچھا۔

"جی ہاں! میں جانتی ہوں۔" گھونگھٹ کی آڑ سے آواز آئی۔

"تیری ہمت کیسے ہوئی حویلی میں یہ پاکھنڈ مچانے کی؟" بختیار غرّا کر بولا۔بیٹی کو دیکھتے ہی اس کے وجود پر لگے کئی پرانے زخموں کے منہ بھی کھل گئے تھے۔

"میں بے گناہ ہوں۔" نازیہ نے سکون سے کہا۔

"اوئے! تیری ایسی کی تیسی۔ہمارے سامنے مکر کرتی ہے۔منہ پر ہی جھوٹ بولتی ہے۔کہاں سے آیا تھا وہ کڑا تیرے پاس؟" اشرف نے بھی بھرپور کرختگی سے کہا۔

"میرے پاس بہت سے زیور موجود ہیں۔میں نے ان کا حساب کبھی نہیں رکھا۔" اس کی آواز کا ٹھہراؤ ان تینوں کو جھلسا رہا تھا۔شہریار نے طاق میں رکھا غلاف میں لپٹا قرآن پاک اٹھایا اور اسے نازیہ کے سامنے کردیا۔

"اس مقدس کتاب کی قسم اٹھاؤ اور پھر کہو کہ میں بے گناہ ہوں۔"

"ٹھیک ہے! میں یہ بھی کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ یہ قسم یہاں پر کوئی اور بھی اٹھائے گا۔" اس نے تن کر کہا۔شہریار اس کی جرأت پر دنگ تھا۔بختیار ایک جھٹکے سے اٹھا اور زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر مارا۔وہ لڑکھڑا کر گری۔اس کا سر وہاں موجود ایک منقش میز سے ٹکرا گیا۔

"مجھ سے پہلے اس مقدس کتاب کی قسم کوئی اور بھی اٹھائے گا اور وہ یہیں اسی کمرے میں موجود ہے۔اصل گناہ گار میں نہیں کوئی اور ہے۔" نازیہ نے بے خوفی سے کہا۔بختیار کو مزید طیش آگیا۔اس نے میز پر رکھا اپنا پستول اٹھایا اور جھٹکے سے اس کی جانب مڑا۔

"نہیں!! خدا کے لیے یہ ظلم نہ کرو۔اس کی بات تو سن لو پہلے۔" جالیوں کے عقب سے ایک بلکتی ہوئی آواز آئی۔یہ نازیہ کی تائی تھی جس نے پانچ سال کی عمر میں اس کی ماں کی وفات کے بعد اسے ماں ہی کی طرح پالا تھا۔

"چپ کرو تم لوگ! اگر یہاں کسی نے ہچر مچر کی تو اس بندوق کا سارا بارود اس کے سینے میں اتار دوں گا۔" شہریار نے سردمہری سے کہا۔بڑے بھائی کا خاموش اشارہ پاتے ہی بختیار نے ٹریگر دبایا اور تین گولیاں نازیہ کے سر اور جسم میں اتار دیں۔اس کا وجود چند ثانیوں کے لیے پھڑکا اور پھر ایک جھٹکے سے ساکت ہوگیا۔

"اس ماسٹر کو بلواؤ۔" بختیار نے چلّا کر ملازم سے کہا۔اس کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا۔سیاہ پستول کی

نال مزید لہو چاٹنے کے لیے بے تاب نظر آرہی تھی۔

☆......☆

نازیہ کی لاش وہاں سے اٹھوادی گئی۔ حویلی کی سب خواتین اب وہاں سے جاچکی تھیں۔ ان خواتین میں اشرف کی دو بیویوں کے علاوہ شہریار اور بختیار کی تین تین بیویاں بھی شامل تھیں۔ اولاد کے معاملہ میں البتہ وہ خاصے قحط کا شکار تھے۔ شہریار کے دو ہی بیٹے تھے جو تعلیم حاصل کرنے کے لیے شہر میں رہتے تھے۔ اشرف کی ایک ہی بیٹی تھی جس کی عمر ابھی پانچ سال ہی تھی۔ ان دنوں وہ سنجیدگی سے تیسری شادی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ نازیہ بختیار کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس سے پہلے اس کا ایک بیٹا کسی زہریلے جانور کے کاٹنے سے سات سال کی عمر میں یہ دنیا چھوڑ چکا تھا۔

شہریار کے حکم پر ایک ملازم کمرے میں شراب کی چند بوتلیں رکھ گیا۔ بختیار نے اپنے لیے ایک پیگ بنایا اور اس آتشیں سیال سے اپنے وجود میں بھڑکنے والی آگ کو ختم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک ادھیڑ عمر شخص دوسرے ملازم کے ساتھ اندر چلا آیا۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ سر کے بال خضاب زدہ تھے۔ آنکھوں میں ہمہ وقت سرمہ لگائے رکھتا تھا۔

''آؤ ماسٹر صاحب!! ہم تمہیں ہی اُڈیک رہے تھے۔'' اشرف نے اکھڑ انداز میں کہا۔

''دیکھ بھئی ماسٹر!! ہم جو پوچھیں گے اس کا سچ سچ جواب دینا ورنہ تیری بوٹیاں چیل کوؤں کو کھلادیں گے۔'' بختیار نے کہا۔

''میں سچ کہوں گا سرکار...... قسم مولا کی۔''

''تو نے وہ کڑا کس کے ہاتھ میں دیکھا تھا؟''

''مولوی کے بیٹے رفیق کے ہاتھ میں۔ اس روز میری طبیعت کچھ خراب تھی۔ میں دھوپ میں جا کر لیٹ گیا تھا۔ بچے آس پاس ہی موجود تھے۔ میں ذرا غنودگی میں گیا تو وہ بے فکر ہو کر اپنی بات چیت میں مشغول ہو گئے۔ میں نے بھی کچھ کہنے سے پرہیز ہی کیا۔ مجھے آرام کی سخت ضرورت تھی۔ اسی وقت میں نے رفیق کو اپنے ایک دوست سے بات کرتے ہوئے سنا۔ وہ اسے کسی کڑے کے متعلق بتا کر کہہ رہا تھا کہ یہ ایک خاص لڑکی نے اسے تحفہ دیا ہے۔ کہتی ہے یہ ہمارے پیار کی نشانی ہے۔ ایک تم پہن کر رکھنا۔ دوسرا میری بانہہ میں رہے گا۔ تم پاس نہیں ہو گے تو اسی کو تمہارا وجود سمجھ کر دل بہلا لیا کروں گی۔ دوست اس لڑکی کا نام پوچھتا رہا لیکن رفیق نے کہا وقت آنے پر بتاؤں گا۔ اس کی باتوں سے لگتا تھا کہ یہ سلسلہ بڑے لمبے عرصہ سے جاری ہے اور وہ چھپ چھپا کر ملتے بھی رہتے ہیں۔ کڑا بہت قیمتی تھا۔ مجھے تشویش ہوئی تو بڑے چوہدری صاحب کے علم میں لے آیا کہ کہیں چوری چکاری کا سلسلہ نہ ہو۔ بس اتنی سی بات ہے سرکار!'' ماسٹر نے گھگھیا کر کہا۔

ماسٹر شرافت علی اس علاقے کے ایک کمرا پر مشتمل اسکول کا اکلوتا استاد تھا۔ حکومت کی وجہ سے وہ اس اسکول کو علاقہ میں برداشت کرنے کے لیے مجبور تھے۔ ماسٹر ان کا وفادار تھا اس لیے مزید تعلیم کے لیے بچوں کو کبھی نہیں اکساتا تھا۔ ڈھلوال میں تعلیم جیسی بنیادی ضرورت پر بھی صرف چوہدریوں کا ہی حق اور قبضہ تھا۔

''اب کیا کرنا ہے بھائیا جی؟'' اشرف نے ماسٹر کو بھیجنے کے بعد پوچھا۔

''اس مولوی اور اس کے لونڈے رفیق کا سارا خاندان یہاں حاضر کرو۔ ان کا یوم حساب بھی کر دیتا ہوں۔'' بختیار کے سلگتے انداز پر شہریار کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ اس نے اپنے لیے بھی ایک پیگ بنالیا۔

وہ تینوں شراب سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مولوی اور رفیق کا انتظار کر رہے تھے۔ بختیار کی رگوں میں خون ابلتے ہوئے لاوے کی مانند کھول رہا تھا۔ دو روز قبل جب اسے نازیہ کے پاس ایک کڑے اور کچھ مشکوک معاملات میں شامل ہونے کی خبر ملی اسی وقت سے وہ جلتے انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ اسے سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ رفیق نے حویلی میں نقب کس طرح لگائی۔ وہ مولوی بشارت کی غیر موجودگی یا طبیعت خراب ہونے کی صورت میں اشرف کی بیٹی کو سیپارہ پڑھانے آیا کرتا تھا۔ گھر کی خواتین کا تلفظ زیادہ بہتر نہیں تھا۔ اس لیے بختیار کی والدہ اپنی زندگی میں ہی یہ ذمہ داری مولوی بشارت کے سپرد کر گئی تھیں۔ تمام معاملہ پر گہرائی سے سوچنے کے بعد وہ اسی نتیجہ پر پہنچا تھا کہ گھر میں کوئی دوسرا فرد بھی ان دونوں کی مدد کرتا رہا ہے۔ عشق محبت کے یہ معاملات کسی کے تعاون اور مدد کے بغیر کبھی پروان نہیں چڑھ سکتے۔ آتشیں سیال اپنے معدے میں انڈیلتے ہوئے وہ اس درمیانی کڑی کو بھی تلاشنے میں مگن تھا۔ مولوی بشارت کی آمد نے اس کے خیالات میں توقف پیدا کر دیا۔

''اس ناچیز کو کیسے یاد کیا چوہدری

صاحب؟'' بشارت نے وقار سے کہا۔

''ایک اہم دینی معاملہ میں تم سے مشورہ درکار تھا۔ زانی کی دین میں کیا سزا ہے؟'' شہریار نے پوچھا۔

''کوڑوں کی سزا ہے۔ سنگسار کرنے کا بھی حکم ہے۔'' بشارت کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ دینی معاملہ میں مشورہ کے لیے اس کی بیوی اور رفیق کی موجودگی کی شرط کیوں رکھی گئی تھی۔

''یعنی سخت ترین سزا......'' اشرف نے پوچھا۔

''جی! درست فرمایا۔''

''بہت شکریہ مولوی!! تو نے تو سارا سیاپا ہی ختم کر دیا۔'' بختیار نے ہذیانی قہقہہ لگایا اور رفیق کے سر میں ایک گولی داغ دی۔

''یہ...... کک...... کیا...... کیا؟'' بشارت کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ رفیق کی والدہ غش کھا کر وہیں گر گئی تھی۔

''اس بدبخت نے ہماری عزت پر ہاتھ ڈالا تھا اور ہماری طرف سے ہلکی ترین سزا بھی موت ہوا کرتی ہے۔'' بختیار غرآیا۔ ''ایسی مردود اولاد کے باپ کو بھی جینے کا کوئی حق نہیں۔'' اس نے دوسری گولی بشارت پر چلادی۔

شہریار نے اپنے خصوصی گارڈز کو بلوا کر لاشیں اٹھانے کا حکم دیا اور نہایت سختی سے تلقین کی کہ؛

''انہیں چوراہے میں موجود درخت کے ساتھ لٹکا دو۔ پورے گاؤں میں اس بات کا اعلان کر دینا کہ یہ دونوں باپ بیٹا حویلی میں زیورات چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے۔ انہیں کفن، غسل یا کوئی قبر نصیب نہیں ہوگی۔ اگر کسی کو ہمدردی کا بخار چڑھا تو ان کی قبر میں اس کو زندہ گاڑ دیں گے۔ لاشیں وہیں لٹکی رہیں گے اور چیل کوے ہی ان سے اپنا پیٹ بھریں گے۔''

''اس عورت کا کیا کرنا ہے بھائیا جی؟'' اشرف نے فرش پر بے ہوش پڑی سکینہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

''یہ آج سے میرے حرم میں رہے گی۔ اپنے بیٹے کے گناہ کا تاوان ادا کر کے آخرت میں اس کی بخشش کا سامان بہم کیا کرے گی۔'' بختیار نے جواب دیا۔

''جیو میرے شیر!! یہ ہوئی ناں بات۔'' شہریار اس کی بات پر خوشی سے پھڑک اٹھا۔

''اس کے کمرے میں کوئی ملازمہ یا گھر کی کوئی عورت نہیں جائے گی ورنہ اس کے بدانجام کا ذمہ دار مجھے نہ ٹھہرایا جائے۔'' بختیار کا لہجہ پتھریلا تھا۔ اس قتل وغارت کے بعد اس کا شملہ مزید بلند ہو گیا تھا۔

☆......☆

ماسٹر شرافت علی اپنے اسکول کے اکلوتے کمرے میں ہی چارپائی بچھا کر لیٹا تھا۔ اس کے ذہن پر دو روز سے چوراہے پر لٹکتی لاشیں اور ان کی درگت آسیب کی طرح سوار تھی۔ ان لاشوں نے پورے گاؤں میں خوف وہراس کی فضا پیدا کر دی تھی۔ مولوی اور اس کے بیٹے پر چوری کے الزامات بھی ایک خوفناک عمل تھا۔ کسی کو بھی ان سے ایسی حرکت کی توقع ہی نہیں تھی لیکن چوہدری خاندان کے معتوب افراد کے متعلق کوئی بات بھی کیسے کی جاسکتی تھی۔ اس لیے ہر طرف خوفزدہ سرگوشیوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

ماسٹر بھی انہی خیالات اور اپنے مستقبل کے متعلق سوچنے میں غرق تھا۔ دروازے پر ہونے والی آہٹ نے اسے چونکا دیا۔ نو وارد کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔

''آپ یہاں؟ مجھے بلوا لیا ہوتا۔'' اس نے خوشامد/

انتظار حسین کا سب سے بڑا حوالہ افسانہ نگاری ہے۔ 1952ء سے لے کر 2004ء تک آپ کے فسانوں کے 9 مجموعے بازار میں آچکے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ناول نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ 1953ء سے 1995ء کے درمیانی عرصے میں انتظار حسین کے 5 ناول بھی شائع ہوئے ہیں، مختلف اخبارات میں کالم نویسی بھی کرتے ہیں۔ انتظار حسین نے 1942ء میں انٹرمیڈیٹ، 1944ء میں بی اے 1946ء میں میرٹھ کالج سے اردو میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ انتظار حسین کی شخصیت میں کئی رنگ اور کئی کیفیات ہیں جن کو انہوں نے اپنی تحریروں میں ڈھالا ہے۔ انہوں نے مختلف مضامین، سفر نامے، تراجم کی صورت میں بھی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔ انتظار حسین کی شخصیت اور ان کے کام پر پاکستان کی مختلف جامعات پر ایم اے کے مقالے بھی لکھے گئے ہیں۔ آپ پر مختلف ادبی رسائل وجرائد نے خاص نمبر بھی شائع کیے ہیں۔ یہ پروفیسر کرار حسین کی شخصیت سے بہت متاثر رہے اور محمد حسن عسکری کے اثرات بھی انہوں نے قبول کیے۔ افسانے کی کشش آپ کو کرشن چندر سے ملی اور ان کے بہترین دوستوں میں ناصر کاظمی، مظفر علی سید، احمد مشتاق، حنیف رامے، سید محمود اور دیگر شامل رہے۔

کی۔

’’پیاسا خود کنوئیں کے پاس چل کر آتا ہے۔‘‘ نو وارد نے کہا۔

’’گناہ گار مت کیجیے۔ میں تو غلام ہوں آپ کا۔‘‘

’’یہ لو تمہارا انعام۔ آئندہ بھی یونہی کام لیتا رہوں گا تم سے۔‘‘ اس نے نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی جیب سے نکال کر پھینکی اور باوقار انداز میں چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ بھاری رقم دیکھ کر ماسٹر کی رال ٹپکنے لگی تھی۔

☆......☆

نازیہ کی موت کو ایک ہفتہ گذر چکا تھا۔ سکینہ مکمل طور پر بختیار کے رحم و کرم پر اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہی تھی۔ بختیار کے علاوہ شہریار اور اشرف نے بھی اسے پامال کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس درندگی اور غیر انسانی سلوک کے خلاف کوئی بھی احتجاجی صدا بلند نہیں کرسکتا تھا۔ وہ تینوں اپنے اختیارات کی لامتناہی حدود سے واقف تھے اس لیے کھل کر کھیلنے میں مگن تھے۔ اپنے عیش و طرب میں مشغول وہ حویلی میں ایک ایسے فرد کی سرگرمیوں سے بے خبر تھے جو ان کی گردن دبوچنے کے لیے نہایت خاموشی سے سرنگ بنانے میں مصروف تھا۔ شاید قدرت کی جانب سے ان کی دراز کی گئی رسی کھینچنے کا وقت قریب ہی تھا۔

☆......☆

اشرف کی تیسری شادی کا دن آپہنچا تھا۔ حویلی میں ایک نیا ہنگامہ جاگ اٹھا۔ ان ہنگاموں کو دیکھ کر محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ دس روز قبل ان در و دیوار نے تین لاشوں کے علاوہ ایک صوم و صلوٰۃ کی پابند عورت کی پامالی بھی دیکھی ہے۔ مردانے کی رونقیں اپنے مکمل جوبن پر تھیں۔ ہر رات شہر سے آنے والی طوائفیں محفل سجاتیں۔ شراب کے جام لنڈھائے جاتے اور ایک طوفان بدتمیزی برپا ہوجاتا۔

برأت کے روز صحن میں شامیانے لگے تھے۔ سہرابندی کی رسم شروع ہوچکی تھی۔ اسی دوران ایک سایہ تیزی لیکن مکمل احتیاط سے باورچی خانہ کی طرف گیا اور ایک جانب موجود بڑے سے پتیلوں میں کسی بوتل سے ڈھیروں سفوف انڈیل دیا۔

ان پتیلوں میں بادام اور کھوئے سے تیار کردہ خصوصی دودھ تھا جو حویلی کی روایات کے مطابق سہرابندی کے بعد مہمانوں کے علاوہ اہلخانہ بھی نوش کرتے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد وہاں چند ملازمین آئے اور دودھ شیشے کے گلاسوں میں منتقل کرنے لگے۔ یہ گلاس جہازی سائز ٹرے میں رکھ کر باہر بھیجے جانے تھے۔ مردانے میں ڈھول تاشوں کی آواز بلند ہونے لگی۔ ڈھول کی تیز ہوتی یہ تھاپ دلوں میں ترنگ جگا رہی تھی۔ اشرف اور شہریار کے خصوصی دوستوں کے علاوہ فہیم اور کلیم کے کئی شہری دوست بھی ڈھلوال کی روایات سے بھرپور اس شادی سے لطف اندوز ہونے آئے تھے۔ باادب ملازمین نے ڈھول کی لے ذرا آہستہ ہوتے ہی دودھ سے لبریز گلاس پیش کرنے شروع کردیے۔ ایک ٹرے زنان خانہ میں بھی بھجوائی گئی تھی جہاں اس وقت ایک ماتمی سی کیفیت تھی۔

اگلے پندرہ منٹ میں ریفریشمنٹ کا یہ دور ختم ہوا تو ڈھول کی تھاپ ایک بار پھر جوبن پر آگئی۔ خوشی سے بڑھکیں مارتے وہ دیوانہ وار بھنگڑے ڈال رہے تھے۔ اسٹیج پر بیٹھا اشرف ان مناظر سے بہت لطف اندوز ہورہا تھا۔ اس کے پہلو میں بختیار اور شہریار بھی موجود تھے۔ بختیار کے ذہن میں بھی اپنی اگلی شادی کی منصوبہ بندی پروان چڑھ رہی تھی۔ اسی دوران اسے اپنی نظروں کے سامنے چہرے دھندلاتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ اس کا دل تیزی سے ڈوب رہا تھا۔ اپنی اس کیفیت پر قابو پانے کے لیے وہ سامنے میز پر موجود جگ سے مزید دودھ انڈیل کر پینا چاہتا تھا لیکن ہاتھوں میں اتنی سکت ہی باقی نہ تھی کہ گلاس تھام سکتا۔ اس نے چہرہ گھما کر شہریار کو پکارنا چاہا تو وہ بھی اپنی گردن سہلاتے ہوئے بے تحاشا کھانستا ہوا نظر آیا۔ اب آخری سہارا اشرف ہی باقی تھا۔ بختیار نے اپنی ساری قوت مجتمع کرکے اسے پکارا۔ اگلے ہی لمحہ اشرف کا وجود لڑھک کر کرسی سے نیچے گر گیا۔ اس کے منہ سے خون ابل رہا تھا۔ بختیار کو بھی اپنے حلق اور زبان پر کسی سیال مادے کا احساس ہونے لگا۔ اس کا دل متلایا۔ وہ یکدم دہرا ہوا اور قے کردی۔ اس کے اردگرد خون کا ننھا سا تالاب بن چکا تھا۔ ڈوبتے ذہن اور دھندلاتی بصارت میں آخری مناظر سامنے موجود مہمانوں کے کھانسنے اور گرنے کے تھے۔

☆......☆

ٹرین ریلوے پٹری کے سینے پر دندناتی اپنے مخصوص ساز و آواز سے چلتی جارہی تھی۔ پچھلے اسٹیشن پر بہت سے مسافر اتر گئے تھے اور اب اس بوگی میں صرف دو ہی افراد بچے تھے۔ ٹرین کی چھک چھک چھکا چھک کا بلند آہنگ ان

کے دل کی دھک دھک کے طوفان میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

ساٹھ سالہ رحمتے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔اس کے سامنے بارہ سالہ پوتا اسلم سکڑا سمٹا سا موجود تھا جس کے چہرے پر خوف اور دہشت ثبت ہو چکی تھی۔وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا اور خوفزدہ نظروں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگتا۔

''اماں! ہم نے کہاں جانا ہے؟ سب مسافر تو اتر گئے ہیں۔''

''جہاں یہ قسمت لے جائے۔'' رحمتے بولی۔

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔وہ ہمیں پکڑ تو نہیں لیں گے۔''

''وہاں اب کوئی بچا ہی نہیں تو پکڑے گا کون؟'' رحمتے کی آواز آنسوؤں سے بھیگی تھی۔

''اماں! تم نے کیوں کیا ایسا؟ تم نے اسی لیے وہ گولیاں منگوائیں تھیں کیا؟ مجھے اگر پتا ہوتا تو کبھی بھی نہ لا کر دیتا۔اگر بڑے چوہدری صاحب کو علم ہو گیا تو وہ مجھے بھی رفیق کی طرح چوک میں لٹکا دیں گے۔'' اسلم کی حالت خستہ ہو رہی تھی۔

''خاموش ہو جا!!! اگر ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو میں تجھے اسی ٹرین سے نیچے دھکا دے دوں گی۔'' رحمتے نے سرد مہری سے کہا تو اسلم مزید سہم گیا۔''خانہ خراب کہیں کا!!! غلامی میں اندھا بہرا ہو چکا ہے۔اسے سمجھ ہی نہیں آ رہی کہ اس منحوس حویلی میں اب کوئی بھی زندہ نہیں بچا ہوگا۔سب فرعون' مجبور ملازم اور بزدل بیبیاں اس زندان سے آزاد ہو چکی ہوں گی......سب اسی قابل تھے وہ......ہاں! اسی قابل تھے۔'' وہ ہذیانی انداز میں بڑبڑاتی جا رہی تھی۔

اسلم اب خاموش ہو چکا تھا۔رحمتے کھڑکی سے باہر بھاگتے دوڑتے مناظر دیکھنے لگی۔اس کی آنکھوں اور تصور میں بھی ایسے ہی کئی مناظر اچھل کود کر رہے تھے۔حویلی میں گذری زندگی اپنی تمام تر نحوست کے ساتھ اسے اب بھی یاد تھی۔

رحمتے بائیس سال کی عمر میں اپنے شوہر کے ساتھ ڈھلوال آئی تھی۔وہ دونوں ہی دس جماعتیں پاس تھے۔سلیم نے چوہدری خاندان کی حویلی میں ملازمت کی صورت میں ایک آسودہ زندگی کے بہت سے قصے سن رکھے تھے۔اسے بتایا گیا تھا کہ ملازمین بیرونی دنیا سے کٹ جاتے ہیں لیکن انہیں اندرون خانہ بہت سی آسائشیں میسر ہوتی ہیں۔بے روزگاری سے بیزار سلیم کے لیے یہ ملازمت بہت پُرکشش تھی۔اسے ڈرائیونگ بھی آتی تھی۔چوہدری اسفندیار نے معقول تنخواہ' رہائش اور دیگر سہولتوں کے ساتھ ملازمت عطا کر دی۔وہ بہت خوش تھے۔آغاز میں چند سال بہت اچھے گذرے لیکن بعد میں معاشرتی زندگی سے محرومی ستانے لگی۔حویلی کی اندرونی زندگی بھی دھیرے دھیرے اپنی اصلیت ظاہر کرنے لگی تھی۔یہ خانوادہ عیش و عشرت کا دلدادہ تھا۔چوہدری اسفندیار کی کئی بیویاں تھیں اور ان کے باوجود وہ ملازمین کی بیویوں یا بیٹیوں پر دست درازی سے باز نہیں آتا تھا۔خود رحمتے بھی جانے کتنی بار اس مردود کے ہاتھوں پامال ہوئی تھی۔سلیم کو بتانے کی صورت میں وہ اس کی زندگی کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی: اس لیے خاموش ہو کر رہ گئی۔

اسفندیار کے دونوں بیٹے بھی بچپن ہی سے باپ کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ملازمائیں ان کی دست درازی سے بھی محفوظ نہیں تھیں۔رحمتے ہمیشہ شکر ادا کرتی تھی کہ وہ بیٹی کی پیدائش سے محروم تھی۔اس جنگل نما جگہ پر وہ بیٹی کا تحفظ کرتی بھی تو کیسے؟ اس کا ایک ہی بیٹا تھا جسے بیس سال کی عمر میں ہی بیاہ دیا گیا۔

ادھیڑ عمری تک پہنچتے رحمتے نے اس حویلی میں ایسے حادثات دیکھے جن کا تصور اسے آج بھی ہولا دیتا تھا۔چوہدری شہریار نے اپنے باپ ہی کی طرح کئی شادیاں کی تھیں لیکن ایک معاملہ میں وہ باپ سے بھی چار ہاتھ آگے تھا۔اس کی بوالہوسی نے بختیار کی بیوی کو اپنی زد میں لے لیا۔وہ کرموں جلی اپنی بپتا بیان کرتی بھی تو کسے؟ شوہر تو خود ہر روز غیر عورتوں کے ساتھ داد عیش میں مگن ہوتا تھا۔شاہدہ پہلے تو خاموش رہی لیکن جب شہریار نے اس پامالی کو اپنا معمول بنا لیا تو اس نے بختیار کو جیٹھ کی حقیقت سے آگاہ کر دیا۔شہریار نے نہایت اطمینان سے شاہدہ کو ہی گناہ گار ٹھہرا دیا۔

''یہ بہت بدکردار عورت ہے۔کئی بار مجھے اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کر چکی ہے۔میں صرف تیری عزت کی خاطر خاموش رہا کہ شاید اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے لیکن اس نے مجھے ہی ذلیل کر دیا۔'' شہریار کے واویلے سے متاثر ہو کر بختیار نے بیوی کو قتل کر کے لاش پچھلے صحن میں!

گاڑ دی۔

رحمتے سے کوئی بھی بات پوشیدہ نہیں تھی۔مزید چند سال گذرے تو اس کی عمر کے پیش نظر باورچی خانے کا انچارج بنا دیا گیا۔حویلی کے ہر کمرے میں وہ آزادانہ آمد و رفت کر لیا کرتی۔یہی وہ وقت تھا جب اسے کئی گھناؤنے حقائق سے آشنائی ہوئی تھی۔اسے علم ہوا کہ وہ حویلی نہیں بلکہ گدھ نما افراد کا ایک جنگل تھی جہاں اخلاقیات اور انسانیت کی ہر روز دھجیاں اڑائی جاتیں۔

بختیار کی دوسری بیوی زبیدہ کا بھائی اشرف بھی وہیں رہتا تھا۔بوالہوسی میں وہ ان سب کا سردار تھا۔رحمتے اس کی نظروں میں چھپی گندگی اور مکروہ عزائم دیکھ کر کانپ جایا کرتی۔وہ جانتی تھی کہ چوہدری اشرف اس حویلی کی تاریخ میں ایک نہیں بلکہ بہت سے گھناؤنے باب رقم کرے گا۔وہاں خواتین گھونگھٹ کے بغیر زنان خانے سے باہر نہیں نکل سکتی تھیں لیکن وہ اپنی بدنظری کی تسکین کے لیے کوئی نہ کوئی راہ ڈھونڈ ہی لیا کرتا تھا۔چند ماہ قبل اشرف کو نازیہ کے کمرے سے برآمد ہوتے دیکھ کر اس کے دل پر قیامت گذر گئی تھی۔شکاری نے ایک عقاب کی طرح چڑیا کو اپنے پنجے میں دبوچ لیا تھا۔اس کی تڑپ اور پھڑپھڑاہٹ محسوس کرنے والا کوئی بھی نہ تھا۔

رحمتے دن رات کربناک سوچوں میں گھری رہتی۔بے حیائی کا یہ سلسلہ نسلوں پر محیط تھا اور جانے کب تک ایسے جاری رہتے ہوئے کن حدود تک پہنچتا تھا۔انہی دنوں مولوی بشارت کی بیماری کے باعث حویلی میں رفیق کی آمد شروع ہوئی۔چودہ پندرہ سالہ وہ لڑکا اپنے معصوم چہرہ' سیرت اور کردار کی وجہ سے رحمتے کو بہت اچھا لگتا تھا۔وہ قرآن پاک کا حافظ تھا اور مسجد میں اکثر اذان بھی دیا کرتا تھا۔اسے دیکھ کر رحمتے کے دل میں نہ جانے کیوں ایک خواہش سی بیدار ہونے لگتی کہ اس کا پوتا اسلم بھی اسی کی طرح دینی اور دنیاوی تعلیم حاصل کر سکے۔اس کا بیٹا باپ ہی کی جگہ ڈرائیونگ کرتا تھا اور کار کے ایک حادثے میں تین سال پہلے وفات پا چکا تھا جبکہ بہو اسلم کی پیدائش کے فوری بعد ہی جاں بحق ہو گئی تھی۔رحمتے کی زندگی کا محور صرف اسلم ہی تھا اور وہ اس کے مستقبل کے لیے بہت فکرمند رہتی۔ایک روز اس نے رفیق سے بات کرنے کی ٹھان لی۔

''رفیق پتر! تو مجھ پر ایک احسان کرے گا؟''

''حکم کریں اماں جی! آپ میری بزرگ ہیں۔آپ پر احسان کیسا؟''

''جیوندا رہ پتر! میری بڑی خواہش ہے کہ میرا پوتا اسلم بھی تیری ہی طرح اچھا بچہ بنے۔اگر میں چوہدری صاحب کی تر لے منتیں کر لوں تو کیا تو اسے پڑھا دیا کرے گا۔''

''چوہدری صاحب کو کوئی اعتراض نہ ہو تو مجھے کوئی مسئلہ نہیں۔'' اس نے ادب سے جواب دیا تھا۔

''میری تو یہ بھی بڑی خواہش تھی کہ اسلم اسکول میں پڑھ لیتا۔پڑھ لکھ کر وہ کچھ بن جاتا تو شاید غلامی کا یہ سلسلہ ختم ہو ہی جاتا۔''

''اماں جی! ایسا سوچنا بھی مت۔اسلم کو کبھی اسکول مت بھیجنا۔آپ کو سوہنے رب کا واسطہ۔'' وہ بے چین ہو گیا تھا۔

''کیوں پتر؟ تو بھی تو جاتا ہے ناں اسکول؟''

''جاتا ہوں اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ماسٹر شرافت بہت گندا آدمی ہے۔وہ بچوں سے بہت غلط باتیں کرتا ہے۔کوئی بچہ انکار کرے تو اپنی بید کی چھڑی سے اس کی چمڑی ادھیڑ دیا کرتا ہے۔''

''کیا تجھے بھی اس نے......؟'' رحمتے لرز گئی۔

''میں نے اس کی بات نہیں مانی۔میں نے اسے بولا کہ ابا جی کو بتا دوں گا پھر وہ سارے گاؤں میں اس کی پول کھول دیں گے۔ابا جی کی بات تو گاؤں میں سبھی مانتے ہیں۔اس کے بعد مجھے اس نے کچھ نہیں کہا۔بس ہر وقت غصے میں گھورتا رہتا ہے۔''

''اللہ سوہنا تجھے اپنی حفظ و امان میں رکھے۔'' وہ خلوص سے بولی۔

رفیق کے اس انکشاف نے اسے لرزا دیا تھا۔وہ شہریار سے اسلم کے متعلق بات کرنے کی منتظر ہی رہی اور اسی دوران وہاں ایک اور محاذ کھل گیا۔

زنان خانے میں روزانہ رات کو دودھ پہنچانے کی ذمہ داری مختلف ملازماؤں کی تھی لیکن نازیہ کو وہ ہمیشہ خود ہی دودھ دینے جاتی تھی۔بن ماں کی یہ بچی اسے اپنے دل کے بہت قریب محسوس ہوتی تھی۔اس نے باپ کے زندہ ہوتے ہوئے بھی یتیموں کی سی زندگی ہی بسر کی تھی۔

اس رات نازیہ کی طبیعت بہت خراب تھی۔رحمتے اس کی زرد رنگت اور آنکھوں تلے حلقے دیکھ کر سمجھ گئی کہ گناہ کا ایک اور باب سامنے آنے کے لیے تیار ہے۔اس نے

ڈھکے چھپے لفظوں میں نازیہ کو اس مصیبت سے نجات کے لیے اپنی مدد کی پیشکش کی مگر وہ بری طرح بپھر چکی تھی۔

''نہیں اماں رحمتے! یہ بچہ اس دنیا میں ضرور آئے گا۔ چوہدریوں کو اپنے گناہ کا بوجھ خود اٹھانا ہوگا۔ میرے اونچے شملے والے باپ کو بھی تو علم ہو کہ جب اولاد کو پیدا کرکے پھینک دیا جائے تو وہ چوراہے کی ہانڈی بن جاتی ہے جس میں ہر جانور منہ مارتا گذر جاتا ہے۔''

''ایسا نہ کر میری دھی۔ ایسا نہ کر۔ یہ بڑے ظالم لوگ ہیں۔ انسان کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیتے ہیں۔''

''مجھے کوئی پرواہ نہیں۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔

رحمتے کو اس حویلی کے در و دیوار میں ایک نئے طوفان کی آمد سنائی دے رہی تھی اور اگلے چند دن میں ہی اس طوفان نے کئی زندگیاں اجاڑ دیں۔ ماسٹر شرافت نے شہریار کو رفیق کے پاس ایک قیمتی کڑے کی موجودگی اور کسی خوشحال گھرانے کی لڑکی سے معاشقہ کی خبر سنائی۔ شہریار نے اپنے خدشات کے تحت سبھی خواتین کے کمروں کی تلاشی کروائی اور نازیہ کے کمرے سے ویسا ہی ایک کڑا برآمد ہوا۔ معاملہ اب صاف ہو چکا تھا۔ نازیہ قابل معافی ہرگز نہیں تھی۔

اشرف اور شرافت ...... اپنی ملی بھگت سے رفیق اور نازیہ پر الزامات لگا کے انہیں موت کے گھاٹ اتارنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس روز رحمتے کو اپنے وجود سے نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے اب تک بہت سے گناہ ہوتے آئے تھے لیکن تین افراد کا یوں قتل اور مولوی بشارت کے گھرانے کی اس بے حرمتی نے اسے پہلی مرتبہ اپنی عاقبت کے متعلق بہت خوفزدہ کیا۔ یہ خوف اس قدر طاقتور تھا کہ چوہدریوں کی سالہا سال سے قائم دہشت کا بت ایک ہی پل میں پاش پاش ہوگیا۔ نازیہ کی موت کے بعد وہ ایک نئے ہنگامہ میں مصروف ہوئے تو رحمتے کے دل سے رہا سہا ڈر بھی ختم ہو کے شدید نفرت میں تبدیل ہوگیا۔ وہ حویلی کے چپے چپے سے واقف تھی۔ اسے علم تھا کہ ایک گودام میں سارے سال کے لیے رکھے گئے اناج، گندم، چاولوں کے لیے خصوصی گولیوں کے علاوہ بستروں کو چوہے اور دیگر کیڑے مکوڑوں سے محفوظ رکھنے کے لیے گولیاں بھی موجود تھیں۔ بڑھاپے اور لاچاری کے باعث وہ اس دو چھتی سے یہ مواد حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے اسلم کی مدد لی اور موقع ملتے ہی ان زہریلی گولیوں کو سفوف میں تبدیل کرکے دودھ میں ملا دیا۔ اپنے مختصر سامان کی ایک گٹھڑی اس نے پہلے ہی تیار کرلی تھی۔ حویلی کی وہ روایت اس کے لیے بہت مددگار ثابت ہوئی۔ اس روز دروازے پر موجود دربان بھی موت کے اس مشروب سے محفوظ نہ رہ پائے۔ موقع ملتے ہی اسلم کو ساتھ لیے وہ رات کے اندھیرے میں چھپتی چھپاتی گاؤں کی حدود سے باہر نکل آئی۔ اسٹیشن سے ٹکٹ خرید کر وہ دونوں ایک نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوگئے تھے۔ سہرا بندی کے وقت حویلی میں موجود چوہدری شہریار، بختیار، اشرف، ماسٹر شرافت اور ان تمام لوگوں کو خون کی قے کرتے دیکھ کر اس کے بوڑھے جسم میں بلا کی توانائی پیدا ہوگئی تھی۔ ان کا بچنا بالکل ناممکن تھا اور موت کی خبر پھیلنے کے بعد جب گاؤں کے دوسرے لوگ وہاں آتے تو اتنے ملازمین کے ہجوم میں کسے علم ہوتا کہ رحمتے اور اسلم ان لاشوں میں موجود نہیں ہیں۔ اس نے ایک رسک لیا اور اس میں کامیاب بھی رہی۔

ہاتھی خواہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو اس کی موت ایک معمولی سی چیونٹی کی وجہ سے بھی ہو جایا کرتی ہے۔ چاند نگر کے اس فرعون خانوادے کے لیے رحمتے بھی ایک ایسی ہی چیونٹی ثابت ہوئی تھی۔

''ہر زندان کے مقدر میں تباہی لکھی ہوتی ہے۔ اگر اس ظلم کے خلاف خود زندان کے اسیر آواز نہ اٹھا پائیں تو وہ بھی اسی تباہی کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔'' رحمتے نے کھڑکی سے نظریں ہٹا کر سوچا۔ سکڑا سمٹا سا اسلم اب سو چکا تھا۔ محبت سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے اپنے مستقبل کا ایک خاکہ مرتب کرلیا۔

اچھی تعلیم کی بدولت وہ ایک ایسے دارالامان سے واقف تھی جہاں بوڑھے اور بے سہارا افراد کو پناہ مل جایا کرتی تھی۔ اسلم کے ساتھ دارالامان میں رہ کر وہ اس کے ذہن سے چاند نگر کا آسیب ختم کرنا چاہتی تھی۔

ڈھلوال کی حویلی اپنی تمام تر غلاظت کے ساتھ کئی لاشوں کا قبرستان بن گئی۔ چشم فلک نے یہ بھی دیکھا کہ اپنی زندگی کے باقی ماندہ سالوں میں اسلم کو ایک نئی شناخت اور زندگی کے سپرد کرکے رحمتے نے ایک اخبار نویس کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا۔

موت سے قبل وہ زندگی کا ہر قرض چکتا کر گئی تھی۔